

عام فہم زبان، مشکل الفاظ کے سلیس معانی، اور اختلافی مسائل کے محققانہ حل سے مزین تفسیر

الفوائد التفسیریۃ السلفیۃ



تالیف

محمد ابوسعید

ابن

شیخ القرآن

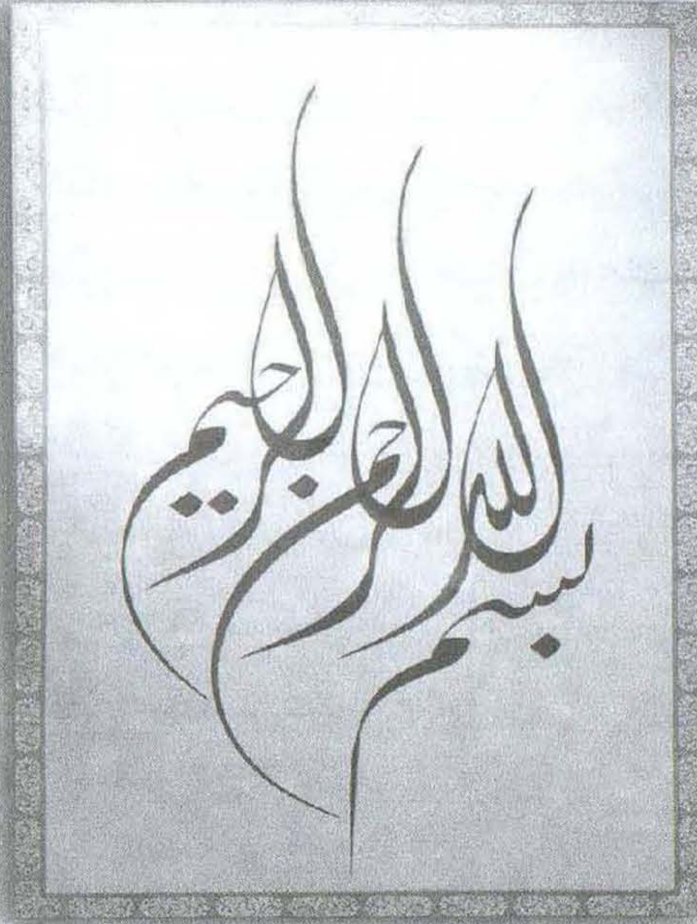
علامہ سید عبدالسلام رستمی

ناشر:

الجامعۃ العربیۃ

سیفن چوک کوہاٹ روڈ بڈھ بیر پشاور

091-2325499



اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے

بسم الله الرحمٰن الرحیم

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ﴾

الفـــــــوائــــــد

التفسيــــــرية السلفيــــــة

(یعنی سلفی علماء کی تفسیری فوائد)

ازافادات

شیخ القرآن و الحدیث **عبدالسلام** عبد الرؤوف الرستمی(حفظه الله تعالی)

جمع وترتیب

ابوسعید محمد ابن الشیخ

بسم الله الرحمٰن الرحیم

مقدمـــة التفسيـــر

ان الحمدلله نحمده ونستعینه ونستغفره ونعوذبالله من شرورانفسنا،وسیئات اعمالنامن یهده الله فلامضل له ومن یضلل فلاهادی له واشهدان لااله الا الله وحده لاشریک له واشهدان محمداعبده ورسوله.امابعد

پس ہرمسلمان پرفرض ہے کہ اپنے رب،معبودکو پہچانے،اس کی صفتوں کو جانے،اس کے حکم کومعلوم کریں،اس کی مرضی نامرضی سمجھ بوجھ لے،کیونکہ بغیراس کے بندگی نہیں ہوتی،اورجو بندگی بجانہ لائے وہ بندہ نہیں،گندہ ہے،اللہ تعالی کی پہچان علم سے آتی ہے،آدمی محض نادان پیدا ہوتا ہے،سب چیز سکھانے سے سیکھتا ہے، بتانے سے جان لیتا ہے، سو بتانے والے کتنی ہی تقریر کریں پھراس برابرنہیں ہوسکتی،جواللہ تعالی نے آپ بتائی ہے وہ ہدایت جواللہ کی کلام میں ہے، ہرگزکسی دوسرے کی کلام میں نہیں ہوسکتی،لیکن اللہ کا کلام عربی زبان میں ہے ہمارے لئے (پاک وہند کے رہنے والوں)اس کا سمجھنا محال ہے اس لئے پہلے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے فارسی ترجمہ قران مجید کالکھا،اس کا نام فتح الرحمٰن رکھا،پھرانکے فرزند شاہ عبدالقادر نے اردو میں ترجمہ کیا موضح القران کے نام سے،اس ترجمہ سے ہمیں بڑانفع ہوا۔

جبکہ عربی زبان میں قران شریف کی تفسیریں دنیامیں بے شمار ہیں، تیرہ سو(۱۳۰۰)تفسیروں کانام کتاب اکسیر میں درج ہیں،جبکہ اس کے بعد بھی عربی اوردیگر مختلف زبانوں میں قران کی تفسیریں لکھی گئی ہیں،بعض احباب نے مجھ سے یہ مطالبہ کیا کہ تم اردوزبان میں ایک ایسی تفسیر لکھ دو،جوکہ مختصر ہونے کے باوجود قران کا مطلب سمجھاوے کم علموں کو ہدایت کا راستہ بتاوے کافی اشغال کے باوجود میں نے ان بھائیوں کا مطالبہ پورا کرنے کاارادہ کیا۔اس واسطے کہ علماء پرواجب ہے کہ عوام کوکلام اللہ کا مطلب واضح کردیں اوراس کی صحیح تفسیر کریں اوراسے باقاعدہ اپنامحور علم بنائیں اسے سیکھیں اورسکھائیں۔جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایاہے:

وَإِذَ أَخَذَ اللّهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلاَ تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاء ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْاْ بِهِ ثَمَناً قَلِيْلاً فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ.(ال عمران:۱۸۷).

ہم نے کتاب والوں سے عہدلیا کہ وہ اسے بیان کرتے رہیں (اس کے احکامات نہ)چھپائیں لیکن ان

لوگوں نے اسے پیٹھ پیچھے ڈال دیا اوراس کے بدلے دنیا طلب کرنے لگے ان کا یہ بیوپار نہایت ہی برا ہے۔دوسری جگہ فرمایا ہے: إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيلاً أُوْلَـئِكَ لاَ خَلاَقَ لَهُمْ فِي الآخِرَةِ وَلاَ يُكَلِّمُهُمُ اللّهُ وَلاَ يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلاَ يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (ال عمران:۷۷)

جولوگ اللہ تعالی سے کے ہوئے عہداوراپنی قسموں کوتھوڑے تھوڑے مال کے بدلے بیچتے پھریں۔ان کے لئے اخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ان سے اللہ تعالی بات چیت نہیں کرے گا نہ ان کی طرف نظر رحمت سے قیامت کے دن دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔پس جولوگ جن کو ہم سے پہلے کتاب اللہ دی گئی تھی اورانہوں نے اس سے منہ پھیرلیا اور دنیا کے حاصل کرنے اوراس کے جمع کرنے میں مشغول ہوگئے اوراللہ تعالی کی منع کی ہوئی چیزوں کے پیچھے پڑکراللہ کی پاک کتاب کوچھوڑ دیا۔

پروردگار نے ان کی مذمت بیان کی ،مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ایسا نہ کریں جو مذمت کا سبب بنے بلکہ انہیں چاہئے کہ احکام الہی کی تعمیل میں دل وجان سے لگے رہیں اورقران پاک کے سیکھنے سکھانے ،سمجھنے اورسمجھانے میں مشغول رہا کریں،اللہ تعالی فرماتا ہے: اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴿۱۶﴾
کیاایمان والوں کے لئے ابتک وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالی کے ذکر سے اورجوان کی طرف حق اترا ہے اس سے کانپ اٹھیں اوران کی طرح نہ ہوجائیں جنہیں ان سے پہلے کتاب دی گئی لیکن کچھ زمانہ گذرتے ہی ان کے دل سخت ہوگئے اوراکثر لوگ نافرمان ہوگئے (سورت حدید)،اس آیت کے ترجمہ میں غور کروکس لطافت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ جس طرح بارش سے خشک زمین لہلہانے لگتی ہے اسی طرح ایمان اور ہدایت سے وہ دل جونافرمانیوں اور گناہوں کی باعث سخت ہوگئے ہوں نرم پڑجایا کرتے ہیں اللہ بزرگ وبرتر اور جوادوسخی سے قبولیت کی امید پرہم بھی دعا کرتے ہیں کہ وہ مالک ہمارے دلوں کوبھی نرم کردیں۔آمین۔

تفسیر کا بہترین طریقہ

جان لو:۔تفسیر کا بھترین طریقہ یہ ہے کہ اول تو قرآن مجید کی تفسیر قرآن ہی سے ہو۔اسلئے کہ ایک بیان کہیں مختصر ہے تو کہیں اسکی تفصیل بھی ہے۔اس کے بعد قرآن کی تفسیر حدیث سے ہوتی ہے۔اس لئے کہ حدیث قرآن کریم کی شرح اورتفسیر ہے بلکہ امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام احکام قرآن ہی سے سمجھے ہوئے

ہیں جیسا کہ۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ ولا تکن للخائنین خصیماً(النساء:۱۰۵)

ہم نے تم پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی ہے۔تا کہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کے سمجھائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلے کرسکو۔خبردار تم خیانت کرنے والوں کے طرف دار مت بننا۔ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے،،

وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لهم الذی اختلفوا فیه وهدی ورحمة لقوم یؤمنون(نحل ٦۴)

ہم نے تو تم پر اسی لئے یہ کتاب نازل فرمائی ہے کہ لوگوں کے اختلافات کا تصفیہ کر دیا کرو۔یہ کتاب ایمان داروں کیلئے ہدایت،رحمت ہے۔دوسری جگہ فرمایا ہے کہ:وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (النحل: ۴۴)اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تا کہ جو(ارشادات)لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو اور تا کہ وہ غور کریں۔اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث بھی مروی ہے:الا انی اوتیت القرآن ومثله معه (مسند الشامیین: ۴۵۱/۳)وغیرہ۔کہ مجھ کو یہ قرآن دیا گیا ہے اور اسی کے مانند ایک اور چیز بھی اس کے ساتھ دی گئی ہے(یعنی سنت)یہ یاد رہے کہ حدیثیں بھی اللہ کی وحی ہیں جس طرح قران پاک بذریعہ وحی اترا،اسی طرح حدیث رسول اللہ ﷺ بھی وحی الٰہی ہیں مگر قران وحی متلو ہے،اور حدیث وحی غیر متلو ہے امام شافعیؒ اور دوسرے بڑے بڑے ائمہ نے اس حقیقت کو دلائل سے ثابت کر دیا ہے،لیکن یہاں اس کے بیان کرنے کا موقع نہیں ،مقصد یہ ہے کہ قران پاک کی تفسیر اولا خود قران مجید پھر حدیث سے کرنی چاہئے جیسا کہ حدیث میں ہے:قال رسول اللہ ﷺ لمعاذ حین بعثه الی الیمن فیم تحکم؟ قال بکتاب اللہ ،قال فان لم تجد ؟قال بسنة رسول اللہ، قال فان لم تجد؟قال اجتهد رأیی، قال فضرب رسول اللہ ﷺ فی صدره وقال الحمدلله الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی رسول اللہ.وهذا الحدیث فی المسند والسنن باسناد جید کما هو مقرر فی موضعه (رواه الترمذی :۲۳۸/۴ وابو داود:۳۰۳/۳ والدارمی ۶۰/۱ وابن ماجة:۷۷۴/۲ واحمد:۲۳۰/۲ ،۲٦۵،۲۳٦ وصححه ابن القیم فی اعلام المؤقعین،وابن تیمیه فی الفتاوی :۳٦۴/۱۳ وخطیب البغدادی وکذا المبارک فوری فی تحفة الاحوذی: ۲۳۹/٦). رسول اللہ ﷺ نے جب معاذؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو دریافت کیا کہ حکم (فیصلہ) کس طرح کرو گے ؟جواب دیا کتاب اللہ سے ،فرمایا اگر اس میں نہ پاؤ تو کہا سنت رسول اللہ سے : کہا اگر اس میں بھی نہ پاؤ؟ کہا پھر اجتہاد کروں گا، نبی ﷺ نے یہ جواب سنکر ان کے سینے

پر ہاتھ رکھ کر فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے نبی کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جو اس کے نبی کو پسند ہے۔

اس بنا پر جب کسی آیت کی تفسیر قرآن، حدیث دونوں میں نہ ملے تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ وہ تفسیر قرآن کو بہت زیادہ جانتے تھے اس لئے کہ جو قرینے اور احوال اس وقت تھے ان کا علم انہی کو ہوسکتا ہے وہ اس وقت موجود اور حاضر تھے (کما قال ابن عباسؓ انا انزل علینا القرآن فقأناه وعلمنافیم نزل، وانه سیکون بعدنا اقوام یقرؤن القرآن ولایدرون فیم نزل، الحدیث، فضائل القران لابی عبیدة: ۱۰۳ ، والفصوی: ۱/ ۵۱۶ وعبدا لرزاق: رقم: ۲۰۳۶۸) علاوہ ازیں کامل سمجھ بوجھ صحیح علم اور نیک عمل بھی انہیں حاصل تھا بالخصوص ان بزرگوں کو جو ان میں بڑے مرتبہ کے اور زبردست عالم تھے۔ بلاشبہ چاروں خلفاء جو رشد اور ہدایت والے تھے یعنی ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان ذی النورین، علی رضی اللہ عنہم، علی ہذا القیاس عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: و الذی لا الہ غیرہ مانزلت ایة من کتاب الله الاوانااعلم فیم نزلت واین نزلت ولواعلم احداً اعلم بکتاب الله منی تناله المطایا لاتیته.

اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، کتاب اللہ کی کوئی ایت ایسی نہیں جسے میں نہ جانتا ہوں کہ یہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ اور کہاں نازل ہوئی؟ میں اگر جانتا؟ کہ کتاب اللہ کے علم سے متعلق کوئی مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور وہاں تک میں کسی طرح پہنچ بھی سکتا ہوں تو ضرور اس کی شاگردی میں اپنے آپ کو پیش کرتا۔ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ: کان الرجل منااذاتعلم عشرایات لم یجاوزھن حتی یعرف معانیھن و العمل بھن. ہم میں سے ہر شخص جب تک دس ایتوں کا پورا مطلب نہ جان لیتا اور ان پر عمل نہ کر لیتا گیارہویں آیت نہیں پڑھتا تھا۔

تابعی عبدالرحمن سلمیؒ فرماتے ہیں حدثنا الذین کانوا یقرأوننا انھم کانوایستقرئون من النبی ﷺ وکانوااذاتعلمواعشرآیات لم یخلفوھاحتی یعملوابمافیھامن العمل فتعلمنا القران و العمل جمیعا : کہ ہم نے جن سے قران سیکھا وہ ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے پڑھا جب تک ہم دس ایتوں کا علم وعمل نبی ﷺ سے نہ سیکھ لیتے آگے نہیں بڑھتے تھے، غرض قران کا علم اور قران پر عمل دونوں ہی ضروری ہے۔ کبھی کبھار بنی اسرائیل سے روایت لینا بھی جائز ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے بلغوا عنی ولو ایة وحدثوا عن بنی اسرائیل ولاحرج ومن کذب علی متعمدافلیتبوامقعده من النار. (بخاری: رقم: ۱۰۴) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری طرف سے پہنچادیا کرو اگرچہ ایک ایت ہی ہو اور بنی اسرائیل سے بھی روایت

لینے میں کوئی حرج نہیں اور مجھ پر قصداً جھوٹ بولنے والا قطعاً جہنمی ہے۔

اس وجہ سے عبداللہ بن عمرو نے جنگ یرموک میں دو بوریاں یہود ونصاری کی کتابیں پائی تھیں ان کی باتیں بھی وہ اس حدیث کو مدنظر رکھ کر نقل کر دیا کرتے تھے۔ یادرکھنا چاہئے کہ بنی اسرائیل کی یہ روایتیں صرف مسئلہ کی مضبوطی اور اس کی گواہی کے لئے لائی جاتی ہیں، خود ان سے مسائل ثابت نہیں کئے جاسکتے روایات بنی اسرائیل تین قسم کی ہیں:

ایک تو وہ جن کی تصدیق خود ہمارے ہاں موجود ہے (یعنی قران اور سنت میں) اس کی صحت میں تو کوئی کلام نہیں۔ دوسرے وہ جن کی تکذیب خود ہمارے ہاں موجود ہو (یعنی کسی ایت یا حدیث کے خلاف ہو) اس کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

تیسرے وہ جس کی نہ ہم تصدیق کرسکتے ہیں اور نہ تکذیب، اس بنا پر ہم اسے جھوٹ (غلط) یا صحیح نہیں کہہ سکتے۔ اور جب کسی ایت کی تفسیر قران، حدیث اور اقوال صحابہ تینوں میں نہ ملے تو اکثر ائمہ دین نے کہا ہے: کہ ایسے موقع پر تابعین کی تفسیر سے مدد لی جائے، جیسے مجاہد بن جبر، سعید بن جبیر، قتادہ، ضحاک وغیرہ۔ (ابن کثیر وفتاویٰ ابن تیمیہ :۱۳/۳۶۳) اور اپنی رائے سے تفسیر کرنا تو محض حرام ہے جیسا کہ ابوداؤد، ترمذی: ۲۸۷۶، میں روایت ہے عبداللہ بن عباس سے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''من قال فی القران برأیه او بمالایعلم فلیتبوأ مقعده من النا ر'' یعنی جو قران میں اپنی رائے کو دخل دے یا نہ جاننے کے باوجود جو کچھ کہہ دے تو اس نے اپنی جگہ جہنم میں بنالی۔

اسی طرح ابن جریر نے جندبؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من قال فی القران برأیه فقداخطأ اور ترمذی میں سہیل بن ابی حزم سے روایت ہے کہ من قال فی کتاب الله برأیه فاصاب فقداخطأ۔ یعنی قران کریم میں اپنے رائے سے جو کچھ کہے وہ خطاء کریگا۔ دوسری روایت کا معنی یہ ہے کہ جو اپنی رائے سے قران میں کوئی ٹھیک بات کہہ دے جب بھی وہ خطا کار رہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ سلف صالحینؒ کی ایک بڑی جماعت بلاعلم تفسیر کرنے سے بہت ڈرتی تھی۔ ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ ای ارض تقلنی وای سماء تظلنی اذاقلت فی کتاب الله مالااعلم۔ مجھے کونسی زمین اٹھائیگی، اور کونسا آسمان سایہ دے گا اگر میں قران مجید میں وہ بات کہوں جو نہیں جانتا۔

قران کریم کی جامعیت

اللہ تعالی نے فرمایا: ونزلناعلیک الکتاب تبیانالکل شیء وھدیً ورحمة وبشری للمسلمین

(سورۃ نحل:۷۹) یعنی اتاری ہم نے تجھ پر ایسی کتاب جو بیان کرتی ہے، ہر چیز کو اور ہدایت، رحمت اور مسلمانوں کے لئے خوشخبری ہے۔جبکہ دوسری مقام پر فرمایا: **مافرطنافی الکتاب من شی** (انعام:۳۸) ہم نے اس کتاب میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **ستکون فتنة،فقلت ما المخرج منها یارسول الله؟قال کتاب اللهفیه نبأماکان قبلکم وخبرمابعدکم وحکم مابینکم** [**الحدیث:ترمذی رقم:۲۹۰۶**] ۔یعنی عنقریب کچھ فتنے ہونے والی ہیں، میں نے سوال کیا ان سے بچاؤ کیوں کر ہوگی؟ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ کی کتاب پر عمل کرنے سے اس میں اگلی، پچھلی خبر، حال کا حکم ہے۔ابن مسعودؓ کہتے ہیں جو کوئی علم سیکھنا چاہے وہ قران کو حاصل کرے اس میں اولین اور آخرین کی خبر ہے، حسن بصری نے کہا ہے اللہ تعالی نے ایک سو چار(۱۰۴) کتابیں اتاریں سب کتابوں کا سارا علم ان چار کتابوں میں رکھا، تورات، انجیل، زبور، قران مجید۔پھر پہلی تین کتابوں کا سارا علم قران مجید میں محفوظ کیا جبکہ قران مجید کا سارا علم مفصل سورتوں میں رکھا پھر مفصل سورتوں کا علم فاتحۃ الکتاب میں سمایا۔جس نے سورت فاتحہ کو معلوم کر لی اس نے گویا کتب منزلہ کا علم حاصل کر لیا۔(الاتقان)۔

امام شافعیؒ سے نقل ہے کہ کچھ ائمہ دین کہتے ہیں وہ سب شرح ہے سنت کی، یعنی حدیث رسول اللہ کی ساری سنت شرح ہے قران کریم کی، بعض سلفؒ سے منقول ہے جو کوئی حدیث میں نے نہیں سنی مگر اس کے لئے ایک آیت کتاب اللہ کی ڈھونڈ نکالی۔

سعید بن جبیرؒ سے منقول ہے، کہ مجھ کو کوئی حدیث نہیں پہنچی صحیح سند سے مگر میں نے اس کا مصداق کتاب اللہ میں پایا۔ابن ابی حاتم اور اسی طرح عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے ابن جریر میں، کہ اس قران میں ہر علم اتارا گیا ہے اور ہم کو ہر چیز کا تمیز بخشا ہے (لیکن ہمارا علم دریافت سے بیان قران کے قاصر ہوا)۔ابو ہریرۃؓ سے منقول ہے کہ اللہ تعالی قران مجید میں اگر کسی چیز کو چھوڑتا تو لفظ ذرہ، خردلہ اور بعوضہ کو چھوڑ دیتا (ابوالشیخ)۔

امام شافعیؒ نے کہا ہے جو حکم نبی ﷺ نے دیا ہے وہ سب قرآن سے سمجھا ہے۔حدیث سلمانؓ میں مرفوعاً آیا ہے، میں حلال نہیں کرتا کسی چیز کو، مگر جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے (**رواہ الطبرانی فی الکبیر : ۶۰۰۱**) یہ بھی امام شافعیؒ کا قول ہے کہ دین میں کسی شخص پر کوئی حادثہ نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ایک راستہ ہدایت کا اس حادثے میں موجود ہوتا ہے۔بعض احکام ثابت ہونا سنت سے ابتداً معلوم ہوتا ہے درحقیقت وہ بھی کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہے اسلئے کہ کتاب اللہ نے اتباع رسول ﷺ ہم پر واجب کیا ہے، رسول اللہ کی بات پر چلنا ہم پر فرض ٹھرایا ہے. ایک بار امام

شافعیؒ نے مکہ معظّمہ میں یہ بات کہی تھی، کہ اے لوگو،تم جو چاہو مجھ سے پوچھو، میں ہر بات کا جواب قرآن کریم سے دونگا، کسی نے کہا بھلا بتاؤ محرم کو زنبور کاقتل کرنا جائز ہے یانہیں؟ انہوں نے کہا: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' قال اللہ ''وما اٰتکم الرسول فخذوہ ومانھٰکم عنه فأنتهوا''.

پھراپنی سند سے یہ حدیث حذیفہؓ روایت کی کہ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اقتدوا باللذین من بعدی، ابی بکر وعمر ، پھرایک دوسری حدیث بسند خود ذکر کی، جسکا مضمون یہ تھا کہ عمر بن خطابؓ نے محرم کو حکم قتل کرنے کا دیا ہے۔ بخاری نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یہ حدیث پڑھی ''لعن اللہ الواشمات والمستوشمات'' الحدیث ،ایک عورت نے اُسمیں گفتگو کی انہوں نے کہا بھلا جس پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی ہو اور وہ بات قرآن میں بھی موجود ہو، میں اُس پر کس طرح لعنت نہ کروں، اُسنے کہا میں نے تو سارا قرآن، جو درمیان ان دونوں لوحوں کی ہے، پڑھا مگر جو تم کہہ رہے ہو، وہ اسمیں کہیں نہیں پایا، اُنہوں نے کہا اگر تو پڑھتی تو ضرور پاتی، کیا تو نے یہ ایٰت نہیں پڑھی ہے ''ما اٰتکم الرسول فخذوہ ومانھٰکم عنه فأنتهوا'' اُس نے کہا ہاں پڑھی ہے کہا تو پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کاموں سے منع فرمایا ہے۔

ابن برجان کہتے ہیں، جو بات رسول اللہ ﷺ نے کہی ہے وہ یا تو خود قرآن میں موجود ہے یا قرآن میں اسکی اصل ہے قریب ہو یا بعید، جس نے سمجھا اُس نے سمجھا، اور جو اندھا رہا وہ اندھا رہا، اسی طرح ہر حکم وہر فیصلہ آپ ؐ کا قرآن میں موجود ہے، حدیث عائشہؓ میں آیا ہے ''کان خلقه القرآن'' غضب ہے کہ پیغمبر تو قرآن پر چلیں امت نہ چلے۔

بعض علماء نے کہا ہے ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کا نکالنا قرآن سے ممکن نہ ہو لیکن اُس شخص کو جسے اللہ نے سمجھ دی ہے یہاں تک کہ بعض علماء نے رسول اللہ ﷺ کی عمر تریسٹھ (۶۳) سال کی اس ایٰت سورۃ منافقون سے برامد کی ہے ''ولن یؤخر اللہ نفسا اذا جاء اجلها'' اس طرح پر کہ یہ ایٰت سر ہے تریسٹھ سورۃ کا اسکے پیچھے سورۃ تغابن ہے جسے نبی ﷺ کی مفقود ہونے پر افسوس ظاہر ہوتا ہے۔

ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ اگر ایک رسی اونٹ کی پاؤں باندھنے کی کھو جاوے، تو میں اُسکو کتاب اللہ میں پالونگا، پھر وہ علم صحابہ سے تابعین کی ارث میں آیا پھر ہمتیں گھٹ گئیں عزیمتیں سست پڑھ گئیں، اُمنگ جاتی رہی، اہل علم کم ہو گئے، جو بوجھ اُن علوم کا صحابہ وتابعین نے اٹھایا تھا، وہ اُنسے نہ اٹھ سکا اُنہوں نے علم کو نوع نوع کر ڈالا ہر گروہ ایک فن خاص کے ساتھ قائم ہوا۔

تلاوت قران پاک میں آسانی پیدا کرنے کے لئے اجزاء بنانا

تلاوت قران پاک میں آسانی پیدا کرنے کے لئے قران پاک کو احزاب، منزلیں اجزاء، پارے، اور رکوعات میں تقسیم کرنا

اکثر صحابہ کرام اور تابعین کا معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے ایک ختم قرآن کر لیتے تھے، اس مقصد کے لئے انہوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار مقرر کی ہوئی تھی، جسے، حزب، یا، منزل کہا جاتا ہے، اس طرح پورے قران کو کل سات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا (البرہان)

جیسا کہ ایک لمبی حدیث میں ذکر ہے: **قال اوس بن حذیفةؓ سئلت اصحاب رسول اللهﷺ کیف تحزبون القرآن ،قالوا ثلاث، وخمس ،وسبع ،وتسع ،واحدی عشرة ،وثلاثة عشرة، وحزب المفصل وحده. ابو داود: ۱۳۹۳ .**

رسول اللہﷺ کی حیات میں صحابہ کرام سے پوچھا گیا کہ قران کے وظیفے (پڑھنے کا مقرر مقدار) کس طرح کرتے ہیں ، تو فرمایا، پہلی تین سورتوں کی ایک منزل (سورۃ بقرہ ،آل عمران، اور سورۃ النساء) پھر ان کے بعد کی پانچ سورتوں کی دوسری منزل، سورت مائدہ ،انعام، اعراف، انفال، اور سورت التوبہ) پھر ان کے بعد کی ، سات سورتوں کی تیسری منزل (سورت یونس، ھود، یوسف، رعد، ابراھیم، حجر، اور سورۃ نحل) پھر ان کے بعد کی نو سورتوں کی چوتھی منزل ہے (سورت اسراء، کہف۔ مریم، طٰہٰ، انبیاء، حج، مومنون، نور اور سورۃ فرقان) پھر ان کے بعد کی گیارہ سورتوں کی پانچویں منزل (سورۃ الشعراء، نمل، قصص، عنکبوت، روم، لقمان، السجدہ، الاحزاب، سبا، فاطر۔ اور سورۃ یاسین) پھر ان کے بعد کی تیرا سورتوں کی چھٹی منزل ہے: (سورۃ الصافات، ص، زمر، غافر، فصلت، شوری، زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمد، فتح، اور سورۃ الحجرات) اور مفصل یعنی سورۃ ق سے لیکر آخر قران تک ساتویں منزل ہے۔ اس روایت کو مسند احمد: ۸۹/۲۶، اور ابوداؤد نے باب تحزیب القرآن میں نقل کیا ہے۔

اور آجکل قرآن کریم تیس اجزاء پر منقسم ہے جنہیں تیس پارے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں بلکہ بچوں کو پڑھانے کے لئے آسانی کے خیال سے تیس مساوی حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے، چنانچہ بعض اوقات بالکل ادھوری بات پر پارہ ختم ہوجاتا ہے، یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تیس پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض علماء کا خیال ہے کہ عثمانؓ نے مصاحف نقل کراتے وقت انہیں تیس مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا، لہذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانہ کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدرالدین زرکشیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے

تیس پارے مشہور چلے آتے ہیں اور مدارس کے قرآنی نسخوں میں ان کا رواج ہے (البرہان، مناہل العرفان) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہد صحابہ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، واللہ اعلم۔

قرون اولی کے قرانی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج تھا اور وہ یہ کہ ہر پانچ ایتوں کے بعد حاشیہ پر لفظ ''خمس'' یا ''خ'' اور ہر دس ایتوں کے بعد لفظ ،عشر، یا ''ع'' لکھدیتے تھے، پہلی قسم کی علامتوں کو اخماس اور دوسری قسم کی علامتوں کو اعشار کہا جاتا تھا (مناہل العرفان) علماء متقدمین میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض علماء ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے، یقینی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ علامتیں سب سے پہلے کس نے لگائیں؟ ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجد حجاج بن یوسف تھا اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ مامون نے اس کا حکم دیا تھا (البرہان) لیکن یہ دونوں اقوال اس لئے درست معلوم نہیں ہوتے، کہ خود صحابہ کے زمانے میں اعشار کا تصور ملتا تھا، چنانچہ مسروق فرماتے تھے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں ''اعشار'' کا نشان ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے (مصنف ابن ابی شیبہ)۔

''اخماس'' اور ''اعشار'' کے علامتیں تو بعد میں متروک ہوگئیں لیکن ایک اور علامت جو آج تک رائج چلی آتی ہے، رکوع کی علامت ہے اور اس کا تعین قران کریم میں مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلہ کلام ختم ہوا وہاں رکوع کی علامت (حاشیہ پر حرف عین بنادی گئی، احقر کو جستجو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہوسکا، کہ رکوع کی ابتداء کس نے اور کس دور میں کی؟ البتہ یہ بات تقریبا یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد ایات کی ایسی ایک متوسط مقدار کی تعین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے۔ اور اس کو رکوع اس لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہونچ کر رکوع کیا جائے، پورے قران میں ،۵۴۰، رکوع ہیں، اس طرح اگر تراویح کی ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھا جائے تو ستائیسویں شب میں قران کریم ختم ہوسکتا ہے۔ فتاوی عالمگیریہ: فصل التراویح۔

اور اسی طرح قران کریم کی تمام آیتین چھ ہزار ہیں اس سے اوپر اختلاف ہے۔ بعض تو اس پر زیادہ نہیں بتاتے مگر بعض دوسو چار آیتیں چھ ہزار سے زائد بتاتے ہیں۔ بعض دوسو چودہ آیتیں ،بعض دوسو انیس ،بعض دوسو چھبیس ،ابوعمرو دانی نے کتاب البیان میں یہی تفصیل لکھی ہے۔

قران شریف کے کلمات کی نسبت ،عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ ستتر ہزار چار سو انتالیس کلمات ہیں۔ حروف کی گنتی کی نسبت مجاہد سے مروی ہے کہ قران شریف کے حروف تین لاکھ ایکس ہزار ایک سواسی ہیں، فضل بن عطا بن یسار فرماتے ہیں، کہ کل حروف تین لاکھ تینتیس ہزار پندرہ ہیں۔ حجاج نے اپنے زمانے میں قاریوں، حافظوں، اور کاتبوں

کوجمع کر کے دریافت کیا، کہ قران کریم کی حروف کے گنتی کر کے مجھے بتاؤ، تو سب نے حساب کر کے بالاتفاق کہا، کہ تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس حروف ہیں، پھر حجاج نے کہا اچھا حروف کے اعتبار سے ادھا قرآن شریف کہاں ہوتا ہے؟ تو حساب سے معلوم ہوا کہ سورت کہف ''ولیتلطف'' کی ''ف'' پرٹھیک آدھا قران ہوتا ہے اور سورۂ براءت کی سو آیتوں پرقران کریم کا پہلا تہائی حصہ حروف کے اعتبار سے ختم ہوتا ہے۔اور دوسری تہائی سورۂ شعراء کی سو آیت کے سرے پر یا ایک سوایک کے سرے پر ختم ہوتی ہے اور تیسری تہائی آخر تک، اور اگر منزلوں کا شمار کیا جائے، یعنی سات حصے قران کریم کے کئے جائیں، تو پہلی منزل ''صد'' کی ''د'' پر ختم ہوتی ہے، جو اس آیت میں ''**فمنهم من امن به ومنهم من صدعنه**'' (**النساء: ۵۵**)۔ اور دوسری منزل ''**حبطت**'' کی ''ت'' پر ختم ہوتی ہے، جو سورۂ اعراف کی ایت: ۱۴۷، اور تیسری منزل ''اکلھا'' کے اخری ''الف'' پر جو سورۂ رعد: ۳۵، میں ہے، اور چوتھی منزل ''**جــعــلـنـــا**'' کے ''ا'' پر جو سورۂ حج کی آیت **جعلنامنسکا**: ۳۵، میں ہے اور پانچویں منزل ''**مومنة**'' کی ''ۃ'' پر جو سورۂ احزاب میں آیت: ۳۶ ''**وما کان لمومن ولامومنة**'' میں ہے اور چھٹی منزل '' **السوء** '' کی ''ؤ'' پر جو سورۂ فتح کی آیت: ۶ ''**الظانین باللہ ظن السوء**'' میں ہے، اور ساتویں منزل قران پاک کے خاتمہ پر ہے۔(البرہان)۔

ابومحمد سلام حمانیؒ، کا بیان ہے کہ ہم نے چار مہینے کی متواتر محنت سے یہ سب باتیں معلوم کر کے حجاج کو بتائیں۔ حجاج کا معمول تھا کہ ہر رات پاؤ (ربع) قراں شریف پڑھا کرتے تھے۔(یعنی چوتھا حصہ) اس لحاظ سے پاؤ قران سورۂ انعام کے خاتمہ پر ہوتا ہے، اور آدھا سورۂ کہف کے لفظ ''ولیتلطف'' پر اور پونا سورۂ زمر کے خاتمہ پر، اور پورا اختتام قرآن پر۔شیخ ابوعمرودانی نے اپنی کتاب ''البیان'' میں ان باتوں میں بھی اختلاف نقل کیا ہے۔بعض مفسرین نے قران کریم، بلحاظ تفسیر چار حصوں کو منقسم کیا ہے، حصہ اول سورت فاتحہ سے لیکر سورۂ مائدہ پر ختم ہوتا ہے، جبکہ دوسرا حصہ سورۂ انعام سے لیکر بنی اسرائیل پر ختم ہوتا ہے، تیسرا حصہ سورۂ الکہف سے لیکر سورۂ احزاب پر ختم ہوتا ہے، اور اخری حصہ سورت سبا سے لیکر قران کریم کی اخر پھر، یعنی سورت الناس پر ختم ہوتا ہے۔

سورة الفاتحة (مكية)

سورۂ فاتحہ کے بہت سے نام ہیں، جن میں سے ''ام القرآن'' سب سے زیادہ جامع اور مشہور ہے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ''ام'' کے معنی یہاں مغز اور خلاصے کے ہیں، یہ سورت چونکہ ان تمام مضامین کا خلاصہ ہے، جو سارے قرآن میں بالتفصیل مذکور ہیں، اس لئے یہ سورۂ مبارکہ ام القرآن کے نام سے موسوم کی گئی۔

اس کی دو تقریریں ہیں، مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے اس کی تقریر یہ فرمائی: کہ قرآن مجید میں چھ (٦) مضامین بیان کئے گئے ہیں: (١) توحید (٢) رسالت (٣) احکام (٤) قیامت (٥) ماننے والوں کے احوال اور (٦) نہ ماننے واالوں کے احوال۔

اور سورۂ فاتحہ میں یہ تمام مضامین بالاجمال موجود ہیں، ''الحمدللہ'' سے ''الرحمٰن الرحیم'' تک توحید، ''مالک یوم الدین'' میں قیامت ''ایاک نعبد'' اور ''اھدنا الصراط المستقیم'' میں احکام کا بیان ہے، کیونکہ ''نعبد'' میں عبادت کے تمام طریقے اور احکام کی طرف اشارہ ہے، اسی طرح '' الصراط المستقیم'' سے شریعت کے تمام احکام مراد ہیں، ''صراط الذین انعمت علیھم'' میں رسالت کا بیان ہے، کیونکہ ''منعم علیہم'' چار جماعتیں ہیں جن میں انبیاء علیہم السلام سرفہرست ہیں، جیسا کہ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَأُوْلَـئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاء وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُولَـئِكَ رَفِيْقاً ﴿٦٩﴾ دوسری طرف ماننے والوں کے احوال کی طرف اشارہ ہے، یعنی ماننے والوں کو ہر قسم کے انعام واکرام سے نوازا جائے گا، اور ''غیر المغضوب علیھم ولا الضالین'' میں نہ ماننے والوں کا ذکر ہے۔ اس طرح یہ سورۂ قرآن مجید کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے۔ اور اسی بناء پر اس کا نام اُمُّ القرآن رکھا گیا ہے۔

دوسری تقریر:۔ ہمارے شیخ مولانا حسین علیؒ کی ہے، آپ فرمایا کرتے تھے، کہ امام ربانی نے علیؓ سے نقل کیا ہے: نیز تفسیر مواہب الرحمٰن: ۱/۳، میں ہے کہ سارے اسمانی علوم اور قرآن مجید کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں موجود ہے، آہ، و(اتقان)۔ کیونکہ مضامین کے اعتبار سے قرآن مجید کے چار حصے ہیں، اور ہر حصہ '' الحمدللہ'' سے شروع ہوتا ہے۔

پہلا حصہ سورۂ فاتحہ سے سورۂ مائدہ کے اخر تک ہے اس حصہ میں زیادہ تر خالقیت کا بیان ہے یعنی ساری کائنات

کا پیدا کرنے والا صرف اللہ ہی ہے، اور کوئی نہیں۔

دوسرا حصہ سورۂ انعام سے سورۂ بنی اسرائیل کے اخر تک ہے، اس حصے کا مرکزی مضمون ربوبیت ہے، یعنی اس میں زیادہ تر یہ بیان کیا گیا ہے کہ، ہر چیز کو پیدا کرنے کے بعد اس کو حد کمال تک پہنچانے والا، اور ہر چیز کی دیکھ بھال کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

تیسرا حصہ سورۂ کہف سے سورۂ احزاب کے اخر تک ہے، اس میں زیادہ تر یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ تخت بادشاہی پر وہ خود متمکن ہے، وہی مالک ومتصرف اور مختار، وکارساز ہے، اور وہی برکات دہندہ ہے، اور وہ اپنی بادشاہی میں اپنے تصرفات اور اختیارات میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔

چوتھا حصہ سورۂ سبا سے قرآن مجید کے اخر تک ہے، اس حصے کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ قیامت کے دن مالک ومختار، صرف اللہ ہی ہوگا۔ اور اس کے سامنے کوئی شفیع غالب نہیں ہوگا۔ یہ چاروں مضامین جو پورے قرآن میں تفصیل سے مذکور ہیں، ان کا خلاصہ اور اجمالی خاکہ سورۂ فاتحہ میں موجود ہے، چنانچہ ''الحمدللہ'' حصہ اول کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ لفظ ''اللہ'' سے وصف مشہور مراد ہے، یعنی خالق بمطابق قاعدہ مشہورہ (لکل فرعون موسی) ای لکل مبطل محق۔ مشرکین عرب بھی اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کا اقرار کرتے تھے، جیسا کہ سورۂ زخرف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّى يُؤْفَكُونَ ﴿٨٧﴾ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ (ان کو) اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ﴿٢٥﴾ (لقمان) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ اسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔

دوسرا حصہ:۔ ''رب العالمین'' میں مذکور ہے، اور تیسرے حصہ کی طرف ''الرحمٰن الرحیم'' میں اشارہ ہے۔ یعنی مالک ومختار اور تخت حکومت پر وہی متمکن ہے، کیونکہ انتہائی رحمت اور غایت شفقت بادشاہوں ہی کی صفتیں ہیں، اور چوتھا حصہ ''مالک یوم الدین'' میں مذکور ہے۔

نیز عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے: ''لکل شیٔ لباب ولباب القرآن الحوامیم'' (خازن: ۶/۷۳) یعنی ہر چیز کا ایک خلاصہ ہوتا ہے، اور قرآن کا خلاصہ حوامیم ہیں۔ اور تمام حوامیم کا مبدأ سورۂ زمر ہے اور سورۂ زمر کا دعویٰ یہ

ہے کہ عبادت صرف اللہ ہی کی کرو، اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، چنانچہ سورۂ زمر میں ارشاد ہے: فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصاً لَّهُ الدِّيْنَ ﴿۲﴾ أَلَا لِلَّهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ﴿۳﴾

سو، آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ کی بندگی کرتے رہیئے، یادرکھو عبادت جو کہ (شرک) سے خالص ہو، اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے، اس آیت میں بقرینہ "فـــاعبـــد" الـدیـن، کے معنی عبادت کے ہیں اور عبادات سے مراد غائبانہ دعاو پکار ہے، جیسا کہ حم مومن، میں اس کی وضاحت کی گئی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: فَـادْعُـوا الـلَّــهَ مُخْلِصِيْنَ لَـهُ الـدِّيْـنَ ﴿۱۴﴾ سوتم سب خالص اعتقاد کر کے اس کو پکارا کرو، یہاں "اعبـدوا" کے بجائے "ادعـوا" فرما کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ عبادات سے مراد، دعا اور پکار ہے، اور پکار عبادت کا جزءِ اعظم ہے جیسا کہ نبی علیہ السلام کا ارشاد ہے" الدعاء هو العبادة" اور "الدعاء مخ العبادة" ۔(ترمذی:۳۲۹۳)

اسی طرح حم مومن، میں دوسری جگہ ارشاد ہے: وَقَـالَ رَبُّـكُـمُ ادْعُـونِـيْ أَسْتَـجِـبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِـرُونَ عَـنْ عِبَـادَتِـيْ سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ اور تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے: کہ مجھ ہی کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا، جو لوگ صرف میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب (مرتے ہی) ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے، نبی کریم ﷺ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "عـــــن عبـادتـی قـال عن دعائی" (ابن جریر) ۔یعنی عـن عبادتی میں عبادت سے مراد، دعاء اور پکار ہے، اور حوامیم سبعہ کا دعوی یہی ہے کہ حاجات ومشکلات میں غائبانہ صرف اللہ ہی کو پکارو، اور صرف اسی سے استمداد اور استعانت کرو، سورۂ زمر کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں "ایــاک نـعبد" میں آ گیا، اور حوامیم سبعہ کا خلاصہ سورۂ فاتحہ کے "ایــاک نستـعین" میں آ گیا، اس طرح سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں آ گیا۔

سورۂ فاتحہ کے خلاصہ اور دعوی کو سورۂ جن میں اس طرح بیان فرمایا ہے: قُـلْ إِنَّـمَا أَدْعُو رَبِّيْ وَلَا أُشْرِكُ بِـهِ أَحَـداً (۲۰) کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اپنے پروردگار ہی کو (غائبانہ حاجات میں) پکارتا ہوں (اور اس کی پکار میں) کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا ہوں۔

بعینہ اس مفہوم کو علامہ ابن کثیر نے اس طرح بیان فرمایا ہے: "الـفـاتـحة سـر القـرآن وسـرهـا، هذه الـكلمة ، (اياک نعبدو اياک نستعين). یعنی سورۂ فاتحہ تمام قرآن کا مغز ہے، اور سورۂ فاتحہ کا مغز "اياک نعبد

وایاک نستعین ‘‘ ہے۔ابن قیمؒ مدارج السالکین: ۱؍۴۷، میں لکھتا ہے،انزل اللہ مائة کتاب واربعة کتب،جمع معانیھافی التورات وا لانجیل و القرآن ،وجمع معانی ھذہ الکتب الثلاثة فی القرآن، وجمع معانی القرآن فی المفصل ،وجمع معانی المفصل فی الفاتحة، ومعانی الفاتحة فی، ایاک نعبد وایاک نستعین۔

فضائل السورة:۔

حدیث ابی ہریرۃؓ میں ایا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:الحمدللہ رب العلمین، ام القرآن، ام الکتاب ،سبع مثانی ،قرآن عظیم ،ہے(رواہ الترمذی وصححہ) اس کوفاتحہ اس لئے کہتے ہیں کہ قرآن میں پہلے سب سے یہی سورت لکھنے میں آتی ہے، قرأت نماز ہی اسی سے شروع ہوتی ہے، اس کو حمد ہی کہتی ہے،صلاۃ ہی بولتی ہیں،حدیث صحیح قدسی میں ایا ہے:’’ قسمت الصلاۃ بینی وبین عبدی نصفین‘‘ مراد’’الصلاۃ‘‘ سے اس جگہ یہی سورت مبارکہ ہے،اس لئے کہ یہ سورت شرط نماز ہے،بغیر اس کے پڑھے نماز نہیں ہوتی، اس کا ایک نام شفاء، بھی ہے، حدیث ابی سعید میں مرفوعا نزدیک دارمی کی آیا ہے کہ، فاتحۃ الکتاب، شفاء، ہے ہرزہر سے۔دوسری روایت میں اس کورقیہ فرمایاہے ایک شخص نے ایک سانپ کی کاٹے ہوئے پراس کو پڑھا تھا،فرمایا کہ تو نے کیونکر جانا کہ یہ رقیہ ہے،یعنی منتر زہر کا۔ابن عباسؓ اس کو’’اساس القران‘‘کہا کرتے تھے۔بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ،کو،اساس فاتحة الکتاب، بتلاتی تھے، یہ سورت مکہ میں اتری تھی، کسی نے کہا کہ دوبارا تری ہے،ایک بار مکہ میں،ایک بار مدینہ میں،اور کسی نے کہا ہے کہ ادھی مکہ میں اور آدھی مدینے میں، پہلی بات زیادہ ٹھیک ہے، اکثر علماء کا یہی قول ہے، اسی کو بغوی بیضاوی نے صحیح ترٹھرایا ہے،سب سورتوں کے نام اور سب سورتوں اور آیتوں کی ترتیب تو قیفی ہے،یعنی نقل پر رسول پاک ﷺ پر موقوف ہے۔

سورت،قرآن کی ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں،کبھی کسی سورت کا ایک ہی نام ہوتا ہے،کبھی کئی نام،جیسے سورۂ فاتحہ کی بہت نام ہیں،صحابہ نے مصاحف میں نام سورتوں کے نام نہیں لکھے تھے، یہ ایجاد حجاج نے کی ہے،اس سورت میں پچیس کلمے ایک سوتیرہ حرف ہیں۔

فائدہ:

رسول اللہ ﷺ نے ابوسعید بن المعلیؓ سے فرمایا، میں تجھے ایک بہت بڑی سورت قرآن کی سکھاؤں گا، پہلے اس کے کہ تو مسجد سے باہر آوے پھر سورت فاتحہ بتایا، کہا کہ یہی وہ سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے، جو مجھ کو دیا گیا ہے۔اس کو بخاری احمد، ابوداؤد، نسائی نے روایت کیا ہے، ابی بن کعبؓ سے کہا تو چاہتا ہے کہ میں تجھ کو ایک ایسی سورت سکھاؤں جو نہ تورات وانجیل میں اتری ہے، نہ زبور وفرقان میں، پھر فرمایا کہ وہ سورت یہی سورۃ الفاتحۃ ہے، اس کو احمد ونسائی نے روایت کیا ہے، ترمذی نے صحیح بتایا ہے۔حدیث عبداللہ بن جابرؓ میں، نزدیک احمد کی، بڑی خیر والی سورت ٹھرایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بعض سورتوں کو بعض سورتوں پر فضیلت حاصل ہے، اکثر علماء نے یہی کہا ہے، اگر چہ یوں تو سارا ہی اللہ کا کلام فاضل ہے، بلکہ نور علی نور۔

ابوہریرہؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **من صل صــــلاة لم يقرأ فيهاام القرآن فهى خداج، ثلاثا، غيرتام، فقيل لابى هريرةؓ، انانكون وراء الامام، قال اقرأبهافى نفسک، فانى سمعت رسول اللهﷺ يقول: قال الله عزوجل، قسمت الصلاة بينى وبين عبدى نصفين، ولعبدى ماسأل، فاذاقال العبد "الحمدلله رب العٰلمين" قال الله، حمدنى عبدى، واذاقال "الرحمٰن الرحيم" قال الله، اثنى علىّ عبدى، فاذاقال "مالک يوم الدين" قال، مجدّنى عبدى، وقال مرة، فوض الى عبدى، فاذاقال" اياک نعبدواياک نستعين" قال هذابينى وبين عبدى، ولعبدى ماسأل، فاذاقال" اهدِنَـــا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ ٥صِرَاطَ الَّذِينَ أَنعَمتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ المَغضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّين "قال هذالعبدى ولعبدى ماسأل. رواه النسائى ومسلم: رقم: ٥٩٨.**

یعنی جوشخص اپنی نماز میں ام القرآن نہ پڑھے اسکی نماز ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے، پوری نہیں ہے، ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ جب ہم امام کے پیچھے ہوں تو؟ فرمایا چپکے چپکے پڑھ لیا کرو، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ میں نے نماز (سورۃ فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھوں آدھ کردیا ہے، اور میرا بندہ مجھ سے جو مانگتا ہے وہ میں دیتا ہوں، جب بندہ کہتا ہے (الــحــمــدلله رب العــالمين) تو اللہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تعریف کی۔پھر بندہ کہتا ہے، (الرحمٰن الرحيم) اللہ تعالی

فرماتا ہے،اثنی علی عبدی میرے بندے نے میری ثناء بیان کی، پھر بندہ کہتا ہے،(مالک یوم الدین) اللہ تعالی فرماتا ہے،(مجدنی عبدی) میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ تعالی اسکے جواب میں فرماتا ہے،(فوض الی عبدی) میرے بندے نے خودکومیرے سپرد کردیا۔پھر بندہ کہتا ہے،(ایاک نعبد وایاک نستعین) اللہ تعالی فرماتا ہے، یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے،اور میرا بندہ مجھ سے جو مانگے گا میں دوں گا۔پھر بندہ اخرسورت تک پڑھتا ہے اللہ تعالی فرماتا ہے یہ سب میرے بندے کے لئے ہے،اور یہ جو مانگے گا وہ اس کے لئے ہے۔

حدیث ابی سعید میں جو کہ سعید بن منصور اور بیہقی نے نقل کیا ہے،اس سورت کو ہر قسم کی شفاء کہا ہے، دارمی اور بیہقی نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے، جس میں اس سورت کو ہر بیماری کی دوا فرمایا ہے، ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جبرئیل علیہ السلام بیٹھے تھے، کہ ناگہاں ایک آواز اُوپر سے سنی گئی، جبرئیل نے منہ بہ طرف اسمان کی، کہا یہ ایک دروازہ ہے جو آج تک کبھی نہ کھلا تھا،اس دروازے سے ایک فرشتہ نازل ہوا، تاکہ تم کو بشارت دے، دونور کی جو تم کو دی گئیں ہیں، تم سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں، ایک فاتحۃ الکتاب، دوسری خواتیم سورت البقرہ، تو کوئی حرف بھی ان دونوں کا نہ پڑھو گے، مگر وہ نور تجھ کو دیا جاوے گا۔اس روایت کو مسلم اور نسائی نے نقل کیا ہے۔(ملخص از تفسیر لطائف البیان)

قرأت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا

قرات سے پہلے استعاذہ کرنا جمہور کی نزدیک سنت ہے واجب نہیں، کہ اس کے نہ پڑھنے سے گناہ ہو۔عطاء بن ابی رباح کا قول ہے کہ جب کبھی قران پڑھے،استعاذہ کا پڑھنا واجب ہے خواہ نماز میں ہو خواہ غیر نماز میں۔امام رازیؒ نے یہ قول نقل کیا ہے کہ ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ پڑھ لینے سے وجوب ساقط ہو جاتا ہے، عطاءؒ کے قول کی دلیل ایت کی ظاہری الفاظ ہیں، کیونکہ اس میں ''فاستعذ'' امر ہے اور عربیت کے قواعد کے لحاظ سے امر وجوب کے لئے ہوتا ہے، اسی طرح رسول اللہ کا اس پر دوام کرنا بھی وجوب کی دلیل ہے، اور اس سے شیطان کا شر دور ہوتا ہے، اور اس کا دور کرنا واجب ہے، اور جس چیز سے واجب پورا ہوتا ہو وہ بھی واجب ہو جاتی ہے، اور استعاذہ زیادہ احتیاط والا ہے، اور وجوب کا ایک طریقہ یہ بھی ہے، بعض علماء کا قول ہے کہ ''اعوذ'' پڑھنا نبی ﷺ پر واجب تھا، آپؐ کی امت پر واجب نہیں، امام مالک سے یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ فرض نماز میں ''اعوذ'' پڑھے، اور رمضان شریف کی اول رات کی نماز میں

اعوذ پڑھ لے۔امام شافعیؒ ،املاء، میں لکھتے ہیں کہ ''اعوذ'' زور سے پڑھے اوراگر پوشیدہ پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں، اور''املاء'' میں لکھتے ہیں کہ بلنداورآہستہ پڑھنے میں اختیار ہے،اس لئے کہ ابن عمرؓ سے پوشیدہ پڑھنا،اورابو ہریرہؓ سے اونچی آواز سے پڑھنا ثابت ہے۔اعوذ، پڑھنا اللہ تعالیٰ کی طرف التجا کرنا ہے،اور ہر برائی والے کی برائی سے اس کے دامن میں پناہ طلب کرنا ہے''عیاذ'' کے معنی برائی دفع کرنے کے ہیں اور''لیاذ'' کے معنی بھلائی حاصل کرنے کے ہیں، متنبّی کا شعر ہے۔

یامن الوذبه فی ماأؤمّله ☆ ومن اعوذبه مما احاذره

لایجبر الناس عظماانت کاسره ☆ ولایهیضون عظماانت جابره

اے وہ پاک ذات،جس سے میری تمام امیدیں وابستہ ہیں،اوراے وہ پروردگار، کہ تمام برائیوں سے میں اس کی پناہ پکڑتا ہوں، جسے وہ توڑے اسے کوئی جوڑ نہیں سکتا،اور جسے وہ جوڑ دے اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔''اعوذ'' کے معنی یہ ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں، کہ شیطان رجیم مجھے دین ودنیا میں کوئی ضرر نہ پہنچا سکے،جن احکام کی بجا آوری کا مجھے حکم ہے، ایسانہ ہو کہ میں ان سے رک جاؤں، اورجن کاموں سے میں منع کیا گیا ہوں ،ایسانہ ہو کہ مجھ سے وہ بدافعال سرزد ہوجائیں۔

اعوذ باللہ کی تفسیراوراس کے احکام

قران پاک میں ہے:خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ﴿١٩٩﴾ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ(اعراف: ۲۰۰) الخ ،یعنی درگزر کرنے کی عادت رکھو، بھلائی کا حکم کیا کرو،اور جاہلوں سے منہ موڑلیا کرو۔اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آجائے ،تواللہ تعالیٰ سننے والے، جاننے والے، سے پناہ طلب کرلیا کرو، کہ اللہ تعالیٰ شیطان کے وسوسوں اوران کے حاضری سے ہم تیری مدد کے ذریعہ پناہ چاہتے ہیں اورسورۂ مومنون میں فرماتا ہے:ادْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَقُل رَّبِّ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ ﴿٩٧﴾ وَأَعُوْذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُوْنِ ﴿٩٨﴾ حَتَّى إِذَا جَاء أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿٩٩﴾

یعنی بھلائی کے ساتھ دفع کرو۔تم میں اورجس دوسرے شخص میں عداوت ہوگی وہ ایسا ہوجائے گا۔جیسے ولی دوست۔یہ کام صبر کرنے والوں اورنصیب داروں کا ہے، جب شیطانی وسوسہ اجائے تواللہ تعالیٰ سننے والے، جاننے والے،

کے ذریعہ، پناہ چاہو۔ان ایتوں میں حکم فرمایا ہے کہ انسانوں میں سے جو تمہاری دشمنی کرے، اس کی دشمنی کا علاج تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ سلوک اور احسان کرو، تاکہ اس کی انصاف پسند طبیعت خود اسے شرمندہ کرے، اور وہ تمہاری دشمنی سے نہ صرف باز رہے بلکہ تمہارا بہترین دوست بن جائے، اور شیاطین کی دشمنی سے محفوظ رہنے کے لئے اس نے ایسی پناہ پکڑی، سکھائی، کیونکہ یہ پلید، دشمن سلوک اور احسان سے بھی قبضہ میں نہیں آتا، اسے تو انسان کی تباہی اور بربادی ہی میں مزہ آتا ہے اور اس کی پرانی عداوت آدم علیہ السلام کے وقت سے ہے۔قرآن فرماتا ہے: اے بنی ادم دیکھو، کہیں شیطان تمہیں بہکا نہ دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو وہ بہکا کر جنت سے نکلوادیا، اور جگہ فرمایا، کہ شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن ہی سمجھو، ایک اور جگہ فرمایا، کیا تم اس شیطان سے اور اس کی ذریات سے دوستی کرتے ہو، مجھے چھوڑ کر؟ وہ تمہارا دشمن ہے، یادرکھو، ظالموں کے لئے برا بدلہ ہے، یہی وہ لعین ہے جس نے قسم کھا کر ہمارے باپ آدم علیہ السلام سے کہا تھا، کہ میں تمہارا خیرخواہ ہوں۔تو اب خیال کر لیجئے کہ ہمارے ساتھ اس کا کیا معاملہ ہوگا؟ ہمارے لئے تو وہ حلف اٹھا کر آیا ہے، کہ اللہ جل جلالہ کی عزت کی قسم، میں ان سب کو بہکاؤں گا۔ہاں ان میں سے جو مخلص بندے ہیں وہ محفوظ رہ جائیں گے۔اسی لئے اللہ تعالی کا فرمان ہے: فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٩٨﴾ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِيْنَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾ (نحل) جب قران کی تلاوت کرو، تو اللہ تعالی کے ذریعہ پناہ طلب کیا کرو۔شیطان راندھے ہوئے سے ایمان دار، اور اللہ تعالی پر توکل کرنے والوں پر اس کا کوئی زور نہیں۔اس کا زور تو انہی پر چلتا ہے جو اس سے دوستی رکھیں اور اس کو اللہ تعالی کے ساتھ شریک کریں۔

قاریوں کی ایک جماعت تو کہتی ہے، کہ قرآن پڑھنے کے بعد ''اعوذ'' پڑھنی چاہیئے، اس میں دو فائدے ہیں ایک تو قرآن کے طرز پر عمل۔دوسرے عبادت کے بعد کے غرور کا توڑ، ابوحاتم سجستانی نے اور ابن فلوفا نے حمزہ کا یہی مذھب نقل کیا ہے۔جیسے کہ ابوالقاسم یوسف بن علی بن جنادہ نے اپنی کتاب ''العبادۃ الکامل'' میں بیان کیا ہے، ابوہریرہؓ سے بھی یہی مروی ہے۔لیکن سند غریب ہے، قرطبی نے امام مالکؒ کا مذھب بھی یہی بیان کیا ہے، لیکن ابن العربی اسے غریب کہتے ہیں، ایک مذہب یہ بھی ہے کہ اول واخر دونوں مقاموں پر ''اعوذ'' پڑھے، تاکہ دونوں دلیلیں جمع ہوجائیں، اور جمھور علماء کا مشہور مذہب یہ ہے کہ تلاوت سے پہلے ''اعوذ'' پڑھنا چاہیئے، تاکہ وسوسے دور ہوجائیں، تو ان بزرگوں کے نزدیک آیت کے معنیٰ ''جب پڑھے'' تو یعنی ''جب پڑھنا چاہے تو'' ہوجائیں گے، جیسے آیت: يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ إِذَا

قُمْتُمْ إِلَى الصَّلاةِ فاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ الاية﴿۶﴾(مائدة)
یعنی جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو،تو وضوء کرلیا کرو کہ جب تم نماز کے لئے جب کھڑے ہونے کا ارادہ کرو، کے ہیں ۔احادیث کی رو سے بھی یہی معنی ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ رات کو نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرتے۔ پھر،سبحانک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالی جدک ولااله غیرک ، پڑھ کر تین مرتبہ" لا اله الا الله "پڑھتے۔پھر فرماتے"اعوذبالله السمیع العلیم من الشیطان الرجیم من ھمزہ ونفخہ ونفثہ" سنن اربعہ میں بھی یہ حدیث ہے(ابوداؤد:رقم:۷۵۸،ترمذی:۲۲۵)۔امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس باب میں سب سے زیادہ مشہور یہی ہے "ھمز" کے معنی گلا گھوٹنے کے اور"نفخ" کے معنی تکبر اور"نفثه" کے معنی شعر گوئی کے ہیں۔ابن ماجہ کی ایک حدیث میں یہی معنی بیان کئے گئے ہیں،اوراس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں داخل ہوتے ہی تین مرتبہ" الله اکبر کبیرا "تین مرتبہ" الحمدلله کثیرا "اور تین مرتبہ"سبحان الله بکرة واصیلا "پڑھتے،پھر یہ پڑھتے "اللھم انی اعوذبک من الشیطان من ھمزہ ونفخه ونفثه "ابن ماجہ میں اور سند کے ساتھ یہ روایت مختصر بھی آئی ہے،مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ آپ پہلے تین مرتبہ تکبیر کہتے پھر تین مرتبہ"سبحان الله وبحمده" کہتے پھر"اعوذبالله" اخر تک پڑھتے، مسند ابویعلی میں ہے کہ رسول پاک ﷺ کے سامنے دو شخص لڑنے جھگڑنے لگے۔غصے کے مارے ایک کے نتھنے پھول گئے آپؐ نے فرمایا اگر یہ"اعوذبالله من الشیطان الرجیم" کہہ لے تو اس کا غصہ ابھی جاتا رہے،نسائی نے اپنی کتاب (عمل الیوم واللیله) میں بھی اسے روایت کیا ہے۔مسند احمد،ابوداد،ترمذی میں بھی یہ حدیث ہے۔اس کی ایک روایت میں اتنا اضافہ اور بھی ہے، کہ معاذؓ نے اس شخص سے اس کے پڑھنے کو کہا لیکن اس نے نہ پڑھا اور اس کا غصہ بڑھتا ہی گیا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ اضافے والی روایت مرسل ہے۔اس لئے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلٰی جو معاذؓ سے اسے روایت کرتے ہیں اس کا معاذؓ سے ملاقات کرنا ثابت نہیں، بلکہ معاذؓ ان سے بیس برس پہلے فوت ہو چکے تھے،لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ شاید عبدالرحمٰن نے ابی بن کعبؓ سے سنا ہو، وہ بھی اس حدیث کے راوی ہے،اور اسے معاذؓ تک پہنچایا ہو کیونکہ اس واقعہ کے وقت تو بہت سے صحابہ موجود تھے۔صحیح بخاری،مسلم،ابوداؤد،نسائی میں بھی مختلف سندوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث مروی ہے۔استعاذہ، کے متعلق اور بھی بہت سے حدیثیں ہیں یہاں سب کو جمع کرنے سے بحث طویل ہوگا۔ان کے بیان کے لئے اذکار،ووظائف،فضائل واعمال کی کتابیں ہیں۔واللہ اعلم۔

ایک روایت میں ہے، کہ جبرئیل علیہ السلام جب سب سے پہلے وحی لیکر نبیﷺ کے پاس آئے، تو پہلے ''اعوذ'' پڑھنے کا کہا۔ تفسیر ابن جریر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ پہلے پہل جب جبرئیل علیہ السلام، محمدﷺ پر وحی لیکر آیا فرمایا کہ ''اعوذ'' پڑھے آپ نے فرمایا: استعیذ بالله السمیع العلیم من الشیطان الرجیم '' پھر جبرئیل علیہ السلام نے کہا: ''اقرأ باسم ربک الذی خلق''۔ واللہ اعلم۔

یہ ظاہر ہے کہ شیطان سے بچانے والا سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں، اسی لئے پروردگار عالم نے انسانوں کے شر سے محفوظ رہنے کی تو ترکیب سلوک واحسان وغیرہ بتائی ہے۔ اور شیطان کے شر سے بچنے کی صورت یہ بتائی، کہ ہم اس ذات پاک کے ذریعہ پناہ طلب کریں۔ اسلئے کہ نہ تو اسے رشوت دی جاتی ہے، نہ وہ بھلائی اور سلوک کے ذریعہ اپنی شرارت سے باز آتا ہے، اس کی برائی سے بچانے والا تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ گزشتہ تینوں آیتوں میں یہ مضمون گذر چکا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے'' خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾۔ اور سورۃ :مؤمنون؛؛ میں ہے ؛ ادْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ اور سورۃ حم سجدہ میں ہے: وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِیْ بَيْنَکَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾: ان تینوں آیتوں کا مفصل بیان اور ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔ لفظ ''شیطان'' شطن سے ماخوذ ہے، اس کے لفظی معنی دوری کے ہیں چونکہ یہ مردود بھی انسانی طبعیت سے دور ہے، بلکہ ہر بھلائی سے بعید ہے، اس لئے اسے شیطان کہتے ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ، شاط سے مشتق ہے اس لئے کہ وہ آگ سے پیدا شدہ ہے، اور، شاط، کے معنی یہی ہیں بعض کہتے ہیں کہ معنی کی رو سے تو دونوں ٹھیک ہیں، لیکن اول زیادہ صحیح ہے عرب شعراء کے شعر بھی اس کی تصدیق میں ملتے ہیں امیہ بن ابوصلت اور نابغہ کے شعروں میں بھی یہ لفظ، شطن، سے مشتق ہے جو دور ہونے کے معنی میں مستعمل ہے سیبویہ کا قول ہے کہ جب کوئی شیطانی کام کرے تو عرب کہتے ہیں، تشیطن فلان،۔ یہ نہیں کہتے کہ، تشیط فلان، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لفظ، شاط، سے نہیں بلکہ شطن سے ماخوذ ہے اور اس کے صحیح معنی بھی دوری کے ہے، جو جن اور انس وحیوان سرکشی کرے اسے شیطان کہہ دیتے ہیں قرآن کریم میں۔ وَكَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوّاً شَيَاطِيْنَ الإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِیْ بَعْضُهُمْ إِلَی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوراً ،وَلَوْ شَاءَ رَبُّکَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ انعام)۔ مسند احمد میں ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے انہیں فرمایا اے ابوذرؓ، جنات اور انسان

کے شیطانوں سے اللہ تعالی کی مدد کے ذریعہ پناہ طلب کرو، میں نے کہا انسان میں بھی شیطان ہوتے ہیں، آپؐ نے فرمایا ہاں، صحیح مسلم میں ان ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''نماز کو عورت، گدھا اور کالا کتا توڑ دیتا ہے، میں نے کہا جناب! سرخ۔زرد، کتوں میں سے کالے کتے کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا: کالا کتا شیطان ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ترکی گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں وہ، ناز و خرم، سے چلتا ہے، عمرؓ اسے مارتے پیٹتے بھی ہیں لیکن اس کا اکڑنا اور بھی بڑھ جاتا ہے آپ اتر پڑتے ہیں اور فرماتے ہیں تم تو میری سواری کے لئے کسی شیطان کو پکڑ لائے ہو، میرے نفس میں تکبر آنے لگا۔ چنانچہ میں نے اس سے اترنا ہی مناسب سمجھا۔

''رجیم''، فعیل کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے، یعنی وہ مرجوم ہے اور ہر بلائی سے دور ہے، جیسے اللہ تعالی نے فرمایا: وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُوماً لِّلشَّيَاطِيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ (ملک: ۵) یعنی، ہم نے دنیا کے اسمان کو ستاروں سے مزین کیا اور انہیں شیطانوں کے لئے رجم بنایا: رجیم، کے ایک معنی راجم کے بھی کئے گئے ہیں، چونکہ شیطان لوگوں کو وسوسوں سے اور گمراہیوں سے رجم کرتا ہے اس لئے اسے رجیم یعنی راجم کہتے ہیں۔

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

صحابہ کرام نے کتاب اللہ کو اسی سے شروع کیا۔ علماء کا اتفاق ہے کہ: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، سورت نمل کی ایک آیت ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ ہر سورت کے شروع میں ایک مستقل آیت ہے؟ یا ہر سورت کی ایک مستقل ایت ہے، جو اس کے شروع میں لکھی گئی ہے؟ یا ہر سورت کے ایت کا جزو ہے یا صرف سورت فاتحہ ہی کی ایت ہے ، اور دوسری سورتوں کی نہیں ، یا صرف ایک سورت کو دوسری سورت سے علیحدہ کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اور آیت نہیں؟ علماء سلف اور متاخرین کا ان امور میں اختلاف چلا آیا ہے، اور اپنی جگہ پر اس کی تفصیل موجود ہے۔ سنن ابی داؤد میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ سورتوں کی جدائی نہیں جانتے تھے، جب تک آپؐ پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نازل نہیں ہوتی تھی۔

چنانچہ صحیح ابن خزیمہ میں ام سلمہؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سورت فاتحہ کی شروع میں نماز میں پڑھا، اور اسے ایک آیت شمار کی، لیکن اس کے ایک راوی عمرو بن ھارون بلخی ضعیف ہے، اور اس طرح

کی ایک روایت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے۔ نیز علی، ابن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم، عطاء، طاوس، سعید بن جبیر، مکحول، زہری، رحمھم اللہ کا یہی مذہب ہے، کہ ''بسم اللہ'' ہر سورت کی ایک مستقل ایت ہے سوائے سورت برأت کے۔ ان صحابہ اور تابعین کے علاوہ عبداللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق بن راہویہ اور ابوعبیدہ قاسم بن سلام، رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ البتہ امام مالک اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں کہ ''بسم اللہ'' نہ تو سورت فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی اور سورت کی، امام شافعیؒ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ''بسم اللہ'' سورت فاتحہ کی تو ایک ایت ہے لیکن اور سورتوں کی نہیں۔

ان کا ایک قول یہ بھی ہے، کہ یہ ہر سورت کے شروع کی ایت کا حصہ ہے، لیکن یہ دونوں قول غریب ہیں، داؤد کہتے ہیں کہ ہر سورت کے شروع میں ''بسم اللہ'' ایک مستقل ایت ہے، سورت میں داخل نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ سے بھی یہی روایت ہے، اور ابوبکر رازی نے ابوحسن کرخی کا بھی یہی مذہب نقل کیا ہے، جو امام ابوحنیفہ کے بڑے پایہ کا ساتھی ہے۔ یہ تو تھی بحث ''بسم اللہ'' کے سورت فاتحہ کے ایت ہونے یا نہ ہونے کی۔

تفسیر ابن ابی حاتم میں ہے کہ عثمان بن عفانؓ نے رسول اللہ ﷺ سے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی نسبت سوال کیا، آپؐ نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بڑے ناموں اور اس میں اس قدر نزدیکی ہے جیسے آنکھ کی سیاہی اور سفیدی میں۔

ابن مردویہ میں بھی اس طرح کی روایت ہے۔ اور ابن مردویہ بھی یہی روایت کرتے ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ نے معلم کے پاس بٹھایا اس نے کہا لکھئے ''بسم اللہ'' عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''بسم اللہ'' کیا ہے؟ استاد نے جواب دیا میں نہیں جانتا آپ نے فرمایا ''ب'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا ''بہا'' یعنی بلندی ہے اور ''سین'' سے مراد اس کی ''سنا'' یعنی نور اور روشنی ہے اور ''م'' سے مراد اس کی ''مملکت'' یعنی بادشاہی ہے، اور اللہ کہتے ہیں معبودوں کے معبود کو، اور رحمٰن کہتے ہیں دنیا اور اخرت میں رحم کرنے والے کو، اور رحیم کہتے ہیں، اخرت میں رحم وکرم کرنے والے کو۔

ابن جریر میں بھی یہی روایت ہے لیکن سند کے رو سے یہ بے حد غریب ہے، ممکن ہے کہ کسی صحابی وغیرہ سے مروی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کی روایتوں میں سے ہو۔ مرفوع حدیث نہ ہو، واللہ اعلم۔

ابن مردویہ میں منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ مجھ پر ایک ایسی ایت اتری ہے جو کسی اور نبی

پر سوائے سلیمان علیہ السلام کے نہیں اتری۔ وہ ایت ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ہے۔

جابرؓ فرماتے ہیں جب یہ ایت ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اتری، بادل مشرق کی طرف چھٹ گئے۔ ہوائیں ساکن ہوگئی سمندر ٹھہر گیا جانوروں نے کان لگا لئے، شیاطین پر آسمان سے شعلے گرے، اور پروردگار عالم نے اپنی عزت وجلال کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس چیز پر میرا نام لیا جائے گا اس میں ضرور برکت ہوگی۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جہنم کی انیس داروغوں سے جو بچنا چاہے وہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھے، اس کے بھی انیس حروف ہیں، ہر حرف ہر فرشتے سے بچاؤ کا ذریعہ بن جائے گا۔ اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے، اس کی تائید ایک حدیث سے بھی کی ہے، جس میں ہے میں نے تیس سے اوپر فرشتوں کو دیکھا، کہ وہ جلدی کر رہے تھے، یہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت فرمایا تھا، جب ایک شخص نے: **ربنالک الحمد، حمدا کثیرا طیبامبار کافیه**، پڑھا تھا اس میں بھی تیس سے اوپر حروف ہیں۔ اتنے ہی فرشتے اترے، اسی طرح ''**بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**'' بھی انیس حروف ہیں، اور وہاں فرشتوں کی تعداد بھی انیس ہیں۔

مسند احمد میں مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کی سواری پر آپؐ کے پیچھے جو صحابی سوار تھے، ان کا بیان ہے کہ رسول پاک ﷺ کی اونٹنی ذرا پھسلی، تو میں نے کہا شیطان کا ستیاناس ہو، آپؐ نے فرمایا ایسا نہ کہو، اس سے شیطان پھولتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ گویا اس نے اپنی قوت سے گرایا۔ ہاں ''**بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**'' کہنے سے وہ مکھی کی طرح ذلیل و پست ہو جاتا ہے۔

نسائی نے اپنی کتاب ''**عمل الیوم واللیلہ**'' میں اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں بھی اسے نقل فرمایا ہے، اور صحابی کا نام اسامہ بن عمیرؓ بتایا ہے، اور اس میں ہے کہ ''بسم اللہ'' کہہ یہ ''**بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**'' کی برکت ہے۔ اسی لئے ہر کام اور ہر بات کی شروع میں ''**بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**'' کہہ لینا مستحب ہے۔ خطبہ کے شروع میں ''**بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**'' کہنی چاہئے، حدیث میں ہے کہ جس کام کو ''**بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**'' سے شروع نہ کیا جائے، وہ بے برکت ہوتا ہے، پاخانہ میں جانے کے وقت ''بسم اللہ'' پڑھ لے، حدیث میں یہ بھی ہے کہ وضوء کے وقت بھی پڑھ لے۔ مسند احمد اور سنن میں ابو ہریرہؓ سعید بن زید اور ابوسعید رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جو شخص وضوء میں اللہ کا نام نہ لے اس کا وضوء نہیں ہوتا۔ یہ حدیث حسن ہے، بعض علماء تو وضوء کے وقت اغاز میں ''**بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**'' پڑھنا واجب بتاتے ہیں، بعض مطلق وجوب کے قائل ہیں، جانور کو ذبح کرتے وقت بھی اس کا پڑھنا مستحب ہے۔ امام شافعی اور ایک جماعت کا یہی خیال ہے۔

بعض نے یاد آنے کے وقت اور بعض نے اسے مطلقا واجب کہا ہے، امام رازی نے اپنی تفسیر میں اس آیت کی فضیلت میں بہت سی احادیث نقل کی ہیں۔ایک میں ہے کہ جب تو اپنی بیوی کے پاس جائے اور ''بسم اللہ'' پڑھ لے اور اللہ کوئی اولاد بخشے، تو اس کے اور اس کی اولاد کے سانس کی گنتی کے برابر تیرے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھی جائیں گے۔لیکن یہ روایت بالکل بے اصل ہے، میں نے تو یہ کہیں کسی معتبر کتاب میں نہیں پائی۔کھاتے وقت بھی ''بسم اللہ'' پڑھنا مستحب ہے۔صحیح مسلم میں ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے عمر بن ابوسلمہؓ سے فرمایا، جو آپ ؐ کے گھر میں ام المؤمنین ام سلمہؓ کے، اگلے خاوند سے تھے، کہ ''بسم اللہ'' کہو، اور اپنے داہنے ہاتھ سے کھایا کرو اور اپنے سامنے سے نوالہ اٹھالیا کرو۔

بیوی سے ملنے کے وقت بھی ''بسم اللہ'' پڑھنی چاہیئے، صحیحین میں ابن عباسؓ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے ملنے کا ارادہ کرے تو یہ دعاء پڑھے ''**بسم الله اللهم جنبنا الشيطان وجنب الشيطان مارزقتنا**''یعنی اے اللہ، ہمیں اور جو ہمیں تو دے اسے شیطان سے بچا۔

فرماتے ہیں کہ اگر اس جماع سے حمل ٹھہرے تو اس بچہ کو شیطان کبھی نقصان نہ پہنچا سکے گا، یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ''بسم اللہ'' کی ''ب'' کا تعلق کس سے ہے؟ نحویوں کے اس میں دو قول ہیں، اور دونوں ہی تقریبا ہم خیال ہیں۔بعض ''اسم'' کہتے ہیں اور بعض ''فعل''، ہر ایک کی دلیل قران سے ملتی ہے، جو لوگ اسم کے ساتھ متعلق بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ " بسم اللہ"ابتدائی، یعنی اللہ کے نام سے میری ابتداء ہے۔قرآن میں ہے: **اركبوا فيهابسم الله مجريهاومرسٰهاان ربى لغفور الرحيم** اس میں اسم یعنی مصدر ظاہر کردیا گیا ہے، اور جو لوگ فعل مقدر بتاتے ہیں، چاہے وہ امر ہو یا خبر۔جیسے کہ، ابدأ" بسم الله" اور، ابتدأت" بسم الله" ان کی دلیل آیت ''**اقرأباسم ربك الذى خلق** '' ہے دراصل دونوں ہی صحیح ہیں، اس لئے کہ فعل کے لئے بھی مصدر کا ہونا ضروری ہے تو اختیار ہے کہ فعل کو مقدر مانا جائے اور اس کے مصدر کو بمطابق اس فعل کے جس کا نام پہلے لیا گیا۔کھڑا ہونا، بیٹھنا، کھانا، پینا، قرآن کا پڑھنا، یا وضوء اور نماز وغیرہ، ان سب کے شروع میں برکت حاصل کرنے کے لئے، امداد چاہنے کے لئے اور قبولیت کے لئے اللہ تعالیٰ کا نام لینا مشروع ہے، واللہ اعلم۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم، میں روایت ہے، ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جبرئیل علیہ السلام، محمد ﷺ پر جب وحی لے کر آئے تو فرمایا: اے محمد ﷺ کہئے ''**استعيذ باللهالسميع العليم من الشيطٰن الرجيم**'' : پھر کہا: کہئے '' **بسم الله الرحمٰن الرحيم** '' مقصود یہ تھا کہ اٹھنا، بیٹھنا، پڑھنا، سب اللہ کے نام سے شروع ہو۔

''اللہ'' وہ نام ہے جوسوائے اللہ تبارک وتعالی کے کسی اور کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک عرب کو یہ معلوم نہیں کہ اس کا اشتقاق کیا ہے؟ اس کا باب کیا ہے؟ بلکہ بہت بڑے نحوی کا خیال ہے کہ یہ اسم جامد ہے، اور اس کا کوئی اشتقاق ہے ہی نہیں۔ قرطبی نے علماء کرام کی ایک بڑی جماعت کا یہی مذہب نقل کیا ہے، جن میں امام شافعی، امام خطابی، امام الحرمین، امام غزالی شامل ہیں۔ خلیل اور سیبویہ سے روایت ہے کہ ''الف لام'' اس میں لازم ہے۔ امام خطابی نے اس کی ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ ''یااللہ'' تو کہہ سکتے ہیں مگر ''یاالرحمٰن'' کہتے ہوئے کسی کو نہیں سنا، اگر لفظ ''اللہ'' میں ''الف لام'' اصل کلمہ کا نہ ہوتا تو اس پر ندا کا لفظ ''یا'' داخل نہ ہوسکتا، کیونکہ قواعد عربی کے لحاظ سے حرف نداء کا ''الف لام'' والے اسم پر داخل ہونا جائز نہیں۔

بعض لوگوں کا یہ قول بھی ہے کہ یہ مشتق ہے اور اس پر ''روبہ بن العجاج'' کا ایک شعر بطور دلیل لاتے ہیں: جس میں مصدر ''تالہ'' کا بیان ہے جس کا ماضی ومضارع اَلِهَ يَأْلَهُ اِلَهَةً وُتالها، ہے، وہ شعر یہ ہے:

للہ در الغانیات المدة ☆ سبّحن واسترجعن من تالهی

جیسے کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ ''ویــذرک والا هَتَکَ'' پڑھتے تھے، مراد اس سے عبادت ہے یعنی اس اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اور وہ کسی کی عبادت نہیں کرتا۔ مجاہد وغیرہ کہتے ہیں، بعض نے اس پر اس آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ: ''وَهُوَ اللّٰهُ فِيْ السَّمٰوَاتِ وَفِيْ الْأَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ ﴿۳﴾ 'سورۃ انعام، اور ایت میں ہے ''وَهُوَ الَّذِيْ فِيْ السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِيْ الْأَرْضِ إِلَهٌ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۴﴾ ''سورۂ زخرف، یعنی وہی اللہ ہے اسمانوں میں اور زمین میں وہی ہے جو اسمان میں معبود ہے، اور زمین میں معبود ہے، سیبویہ خلیل سے نقل کرتے ہیں، کہ اصل میں یہ ''الہ'' تھا جیسے فعالٌ پھر ہمزہ کے بدلے ''الف ولام'' لایا گیا ہے جیسے ''الناس'' کہ اس کی اصل ''اناس'' ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ لفظ اللہ کی اصل ''الــــہ'' ہے ''الف لام'' حرف تعظیم کے طور پر لایا گیا ہے، سیبویہ کا بھی پسندیدہ قول یہی ہے، عرب شاعروں کے شعروں میں بھی یہ لفظ ملتا ہے کسائی اور فراء کہتے ہیں کہ اس کے اصل الالہ تھی ہمزہ کو حذف کیا اور پہلے لام کو دوسرے لام میں ادغام کیا جیسے کہ '' لَّكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّيْ وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّيْ أَحَداً ﴿۳۸﴾ ''(کھف:) میں، لکن، انا، کا لکنا، ہوا ہے، چنانچہ حسن کی قرأت میں، لکن انا، ہی ہے، اور اس کا اشتقاق ''ولہ'' سے ہے اور اس کے معنی تحیر ہے، ولہ، عقل کے چلے جانے کو کہتے ہیں جب وہ جنگل میں بھیج دیا جائے، چونکہ ذات باری تعالی اور اس

کی صفتوں کی تحقیق میں عقل حیران اور پریشان ہوجاتی ہے اس لئے اس پاک ذات کو اللہ کہا جاتا ہے، اس بناء پر اصل میں یہ لفظ ''ولاہ'' تھا، واو کو، ہمزے، سے بدل دیا گیا، جیسے کہ ''وشاح'' اور ''وسادۃ'' میں اشاح واسادۃ، کہتے ہیں۔ رازی کہتے ہیں کہ یہ لفظ ''الهت الی فلان'' سے مشتق ہے جو کہ معنی میں سکنت کے ہے، یعنی میں نے فلان سے سکون اور راحت حاصل کی۔ چونکہ عقل کا سکون صرف ذات باری تعالی کے ذکر کی طرف ہے اور روح کی حقیقی خوشی اسی کی معرفت میں ہے اس لئے کہ علی الاطلاق کامل وہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں، اسی وجہ سے ''اللہ'' کہا جاتا ہے قران مجید میں ہے الَّـذِيْـنَ آمَنُواْ وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللّهِ أَلاَ بِذِكْرِ اللّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿۲۸﴾ (الرعد).

یعنی ایمانداروں کے دل صرف اللہ تعالی کے ذکر سے ہی اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ''لاہ، یلوہ'' سے، ماخوذ ہے جس کے معنی چھپ جانے، اور حجاب کرنے کے ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ '' اله ا لفصیل'' سے ہے، چونکہ بندے اس کی طرف تضرع اور عاجزی سے جھکتے ہیں اسی کے دامن رحمت کا پلہ ہر حال میں تھامتے ہیں، اس لئے اسے اللہ کہا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ عرب ،الـه الـرجل یاله، اس وقت کہتے ہیں جب کسی اچانک امر سے کوئی گھبرا اٹھے، اور دوسرا اسے پناہ دے اور بچالے، چونکہ تمام مخلوق کو ہر مصیبت سے نجات دینے والا اللہ تعالی ہے اس لئے اس کو اللہ کہتے ہیں، جیسے کہ قران مجید میں ہے: قُلْ مَن بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۸۸﴾ (مومنون). یعنی وہی بچاتا ہے اور اس کے مقابل میں کوئی نہیں بچایا جاتا۔

رازیؒ کا مختار مذہب یہی ہے کہ لفظ ''اللہ'' مشتق نہیں ہے۔ خلیل، سیبویہ، اکثر اصولیوں اور فقھاء کا یہی قول ہے، اس کی بہت سی دلیلیں بھی ہیں، اگر یہ مشتق ہوتا، تو اس کے معنی میں بہت سے افراد کی شرکت ہوتی حالانکہ ایسا نہیں، پھر اس لفظ کو موصوف بنایا جاتا ہے اور اس کی بہت ساری صفتیں آتی ہے۔ جیسے رحمٰن، رحیم، ملک، قدوس وغیرہ تو معلوم ہوا کہ یہ مشتق نہیں، قرآن میں ایک جگہ، العز یـز الحمید''اللہ'' الخ جو آتا ہے وہاں یہ عطف بیان ہے۔ ایک دلیل اس کے مشتق نہ ہونے کے یہ بھی ہے، هـل تـعـلـم لـه سميا (مـريـم: ٦۵)، یعنی کیا اس کا ہم نام بھی کوئی جانتے ہو؟ لیکن یہ غور طلب ہے۔ واللہ اعلم۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے۔ لیکن رازیؒ فرماتے ہیں کہ مخلوق کی دو قسمیں ہیں: ایک تو وہ جو معرفت الٰہی کے کنارے پر پہنچ گئے دوسرے وہ جو اس سے محروم ہیں جو حیرت کی اندھیروں میں اور جہالت کی پر خار وادیوں میں پڑے ہوئے ہیں، وہ تو عقل اور روحانی کمالات کو کھو بیٹھے ہیں، لیکن جو ساحل معرفت پر پہنچ چکے ہیں،

جونورانیت کے وسیع باغوں میں جاٹھہرے ہیں، جو کبریائی اور جلال کی وسعت کا اندازہ کر چکے ہیں وہ بھی یہاں تک پہنچ کر حیران وششدر، رہ گئے ہیں، غرض ساری مخلوق اس کی پوری معرفت سے عاجز اور سرگشتہ وحیران ہیں پس یہ ان معانی کے بناء پر اس پاک ذات کا نام اللہ ہے۔ساری مخلوق اس کی محتاج، اس کے سامنے جھکنے والی، اور اس کی تلاش کرنے والی ہیں۔اس معنی میں اسے اللہ کہتے ہیں۔جیسا کہ خلیل کا قول ہے، عرب محاورے میں ہر اونچی اور بلند چیز کو ''لاہ'' کہتے ہیں ''لاهت الشمس'' چونکہ پروردگار عالم بھی سب سے بلند و بالا ہے، اس کو بھی اللہ کہتے ہیں۔اور ''الٰہ'' کے معنی عبادت کرنے اور تالہ کے معنی قربانی کرنے کے ہیں، اور رب عالم کی عبادت کی جاتی ہے۔اور اس کے نام پر قربانیاں کی جاتی ہیں، اس لئے اسے اللہ کہتے ہیں۔ابن عباسؓ کی قرأت میں ہیں ''ویذرک والهتک'' اس کی اصل '' الاله'' ہے پس ''ف'' کلمہ کی جگہ پر جو ''ہمزہ'' ہے وہ حذف کیا گیا۔پھر نفس کلمہ کا ''لام'' زائد ''لام'' سے، جو تعریف کے لئے لایا گیا ہے، اس سے ملا دیا گیا اور ایک کو دوسرے میں مدغم کر دیا گیا، تو ایک لام مشدد، رہ گیا، اور تعظیماً ''اللہ'' کہا گیا۔یہ تو تفسیر لفظ ''اللہ'' کی تھی۔

الرحمٰن الرحیم: ، یہ دونوں نام رحمت سے مشتق ہیں۔دونوں میں مبالغہ ہے، ''الرحمٰن'' میں ''الرحیم'' سے زیادہ مبالغہ ہے علامہ ابن جریر کے قول سے معلوم ہوتا ہے وہ بھی ان معنوں میں متفق ہیں گویا اس پر اتفاق ہے۔بعض سلف کی تفسیروں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے، عیسیٰ علیہ السلام کا قول بھی اس معنی میں پہلے گذر چکا ہے، کہ ''رحمٰن'' سے مراد دنیا اور اخرت میں رحم کرنے والا اور ''رحیم'' سے مراد اخرت میں رحم کرنے والا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''رحمٰن'' مشتق نہیں ہے، اگر یہ اس طرح ہوتا تو مرحوم کے ساتھ ملتا۔حالانکہ قرآن میں ''بالمؤمنین رحیما'' ایا ہے مبرد کہتے ہیں کہ ''رحمٰن'' عبرانی نام ہے عربی نہیں۔ابواسحاق زجاج معانی القرآن میں کہتے ہیں کہ احمد بن یحیٰ کا قول ہے کہ رحیم عربی لفظ ہے اور رحمٰن عبرانی ہے دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔لیکن ابواسحاق کہتے ہیں کہ اس قول کی طرف دل نہیں مانتا۔قرطبی فرماتے ہیں: اس لفظ کے مشتق ہونے کی دلیل یہ ہے، کہ ترمذی ومسند احمد، کی صحیح حدیث ہے: **عن ابراهيم بن عبدالله بن قارظ ان اباه حدثه: انه دخل على عبدا لرحمٰن بن عوفؓ وهو مريض، فقال له عبد الرحمٰن: وصلَتْکَ رَحِمٌ ان النبیﷺ قال: قال الله عزوجل انا الرحمٰن خلقت الرحم وشققت لهامن اسمي، فمن يصلها، اصله، ومن يقطعهااقطعه فابته. اوقال من يبتهاابته.** (مسنداحمد: رقم: ۱۶۸۰ ص: ۲۱۲/۳). رسول اللہﷺ فرماتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں ''رحمٰن''

ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا،اوراپنے نام میں سے ہی اس کا نام مشتق کیا۔اس کے ملانے والے کو میں ملاؤں گا،اوراس کے توڑنے والے کو میں کاٹ دوں گا۔اس صریح حدیث کے ہوتے ہوئے مخالفت اورانکارکرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔رہا کفارعرب کا اس نام سے انکار کرنا، یہ محض ان کی جہالت کا ایک کرشمہ تھا۔قرطبی کہتے ہیں کہ ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' کے ایک ہی معنی ہیں جیسے ندمان اورندیم ۔ابوعبید کا بھی یہی خیال ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ،فعلان،فعیل، کی طرح نہیں۔فعلان میں مبالغہ ضروری ہوتا ہے جیسے ''غضبان'' اسی شخص کو کہہ سکتے ہیں جو بہت ہی غصہ والا ہواور،فعیل ،صرف، فاعل،اورصرف،مفعول، کے لئے بھی آتا ہے جومبالغہ سے خالی ہوتا ہے۔

ابوعلی فارسی کہتے ہیں کہ ''رحمٰن'' عام اسم ہے جو ہر قسم کی رحمتوں کوشامل ہے اورصرف اللہ تعالی کے ساتھ مخصوص ہے۔رحیم باعتبارمومنوں کے ہے فرماتا ہے'' وکان بالمومنین رحیما''مومنون کے ساتھ،رحیم ہے،ابن عباس فرماتے ہیں یہ دونوں نام رحمت ورحم والے ہیں،ایک میں دوسرے سے زیادہ رحمت ورحم ہے۔ابن عباسؓ کی اس روایت میں لفظ''ارق'' ہےاس کے معنی خطابی وغیرہ ارفق کرتے ہیں جیسے کہ حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالی رفیق'' یعنی مہربانی اورشفقت والا ہے وہ ہرکام میں نرمی اورآسانی کو پسند کرتا ہے وہ نرمی اورآسانی پر وہ نعمتیں مرحمت فرماتا ہے جوسختی پرعطانہیں فرماتا۔ابن مبارک فرماتے ہیں''رحمٰن'' اسے کہتے ہیں کہ جب اس سے جو مانگا جائے عطافرمائے اوررحیم وہ ہے کہ جب اس سے نہ مانگا جائے وہ،غضبناک،ہو۔ترمذی کی حدیث میں ہے جوشخص اللہ تعالی سے نہ مانگے اللہ تعالی اس پرغضبناک ہوتا ہے۔بعض شاعروں کا قول ہے۔

اللہ يغضب ان تركت سواله   وبنى ادم حين يسال يغضب

یعنی اللہ سے نہ مانگوتو وہ ناراض ہوتا ہےاور بنی آدم سے مانگوتو وہ بگڑتے ہیں۔عزرمی فرماتے ہیں کہ ''رحمٰن'' کے معنی تمام مخلوق پررحم کرنے والا اوررحیم کے معنی مومنوں پررحم کرنے والا ہے۔دیکھئے قران کریم کی دوآیات'' ثم استوی علی العرش ''اور'' الرحمٰن علی العرش استوی ''،میں استوی کے ساتھ''رحمٰن'' کا لفظ ذکرکیا تا کہ تمام مخلوق کو یہ لفظ اپنے عام رحم وکرم کے معنی سے شامل ہوسکےاورمومنوں کے ذکرکے ساتھ لفظ''رحیم''فرمایا''وکان بالمومنین رحیما'' پس معلوم ہوا کہ''رحمٰن''میں مبالغہ بنسبت''رحیم'' کے بہت زیادہ ہے۔لیکن حدیث کی ایک دعا میں ''یارحمٰن الدنیاو الاخرة ورحیمهما'' بھی آیا ہے۔مسند بزار:۱/۱۳۱،مسند مروزی:۷۸،۷۹۔

''رحمٰن''، یہ نام بھی اللہ تعالی کے ساتھ مخصوص ہے،اس کے سوا دوسرے کا نام نہیں جیسے کہ فرمان ہے کہ اللہ تعالی

کو پکارو، یا ''رحمٰن'' کو جس نام سے چاہو اسے پکارو، اس کے بہت اچھے اچھے نام ہیں۔ایک اور روایت میں ہے:

'' واسئل من ارسلنا الخ '' (زخرف: ۴۵) یعنی اپنے سے پہلے کے رسولوں کو پوچھ لو، کیا ان کے لئے رحمٰن کے سوا کوئی اور معبود تھا جس کی عبادت وہ کرتے ہوں، جب مسیلمہ کذاب نے بڑے بڑے دعوے شروع کئے اور اپنا نام'' رحمان الیمامہ'' رکھا، تو پروردگار نے اسے بے انتہا رسوا اور برباد کیا اور وہ جھوٹ و کذب کی علامت مشہور ہوگیا، آج اسے مسیلمہ کذاب کہا جاتا ہے اور ہر جھوٹے دعویدار کو اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے، ہر دیہاتی اور شہری کچے پکے گھر والا اسے بخوبی جانتا ہے۔بعض کہتے ہیں کہ رحیم میں رحمٰن سے زیادہ مبالغہ ہے اس لئے اس لفظ کے ساتھ اگلے لفظ کی تاکید کی گئی ہے اور تاکید بہ نسبت اس کے کہ جس کی تاکید کی جائے زیادہ قوی ہوتی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تاکید ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو صفت ہے اور صفت میں یہ قاعدہ نہیں۔پس اللہ تعالی کا نام لیا گیا ہے جس نام میں اس کا کوئی شریک نہیں، اور اسکی صفت سب سے پہلے رحمٰن بیان کی گئی، اور یہ نام رکھنا بھی دوسروں کو ممنوع ہے، جیسے فرمادیا کہ، اللہ، کو' یارحمٰن'' کو پکارو، جس نام سے چاہو پکارو، اس کیلئے اسماء حسنی بہت سارے ہیں۔مسیلمہ نے بدترین جرأت کی، اور برباد ہوا، اور اس کے گمراہ ساتھیوں کے سوا یہ بات اوروں پر نہ چل سکی۔رحیم، کے وصف کے ساتھ اللہ تعالی نے دوسروں کو بھی موصوف کیا ہے۔

فرماتا ہے: لَقَدْ جَاءكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾(توبہ) اس ایت میں اپنی نبی کو رحیم کہا، اسی طرح اپنے بعض اس ناموں سے دوسروں کو بھی اس نے یاد کیا ہے۔جیسے ایت: إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً ﴿۲﴾(الدہر) میں انسان کو سمیع اور بصیر کہا ہے۔حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالی کے بعض نام تو ایسے ہیں کہ دوسرے معنی میں اس کا اطلاق ہوسکتا ہے، اور بعض ایسے ہیں کہ نہیں ہوسکتا، جیسے، اللہ تعالی، اور، رحمٰن، خالق، اور، رازق، وغیرہ، اسی لئے اللہ تعالی نے اپنا پہلا نام ''اللہ'' ذکر کیا پھر اس کی صفت ''رحمٰن'' سے کی۔اس لئے کہ'' رحیم'' کی نسبت یہ زیادہ خاص ہے اور زیادہ مشہور ہے۔قاعدہ ہے کہ پہلے سب سے زیادہ بزرگ نام لیا جاتا ہے۔اس لئے سب سے پہلے سب سے زیادہ خاص نام لیا، پھر اس سے کم، پھر اس سے کم، اگر کہا جائے کہ جب ''رحمٰن'' میں ''رحیم'' سے زیادہ مبالغہ موجود ہے تو پھر اسی پر اکتفا کیوں نہ کیا گیا، تو اس کے جواب میں عطاء خراسانی کا یہ قول پیش کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ کافروں نے ''رحمٰن'' نام بھی غیروں کا رکھ لیا تھا، اس لئے ''رحیم'' کا لفظ بھی ساتھ لگایا گیا، تاکہ کسی قسم کا وہم ہی نہ رہے۔''رحمٰن'' اور ''رحیم'' صرف

اللہ تعالیٰ ہی کے نام ہیں۔

ابن جریر نے اس قول کو نقل کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے کے عرب ''رحمٰن'' سے واقف ہی نہ تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی آیت: **قُلِ ادْعُواْ اللّهَ أَوِ ادْعُواْ الرَّحْمَـنَ أَيّاً مَّا تَدْعُواْ فَلَهُ الأَسْمَاء الْحُسْنَى** ،الایة ﴿۱۱۰﴾(اسراء)۔ نازل فرما کر، ان کی تردید کی، کفار قریش نے حدیبیہ والے سال بھی جب رسول اللہ ﷺ نے علیؓ سے فرمایا تھا کہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھو، تو کفار نے کہا تھا کہ ہم ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' کو نہیں جانتے۔ بخاری میں یہ روایت موجود ہے بعض روایتوں میں ہیں کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم ''رحمٰن یمامہ'' کو جانتے ہیں کسی اور ''رحمٰن'' کو نہیں جانتے۔ اسی طرح اور جگہ قرآن پاک میں ہے: **وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا** ﴿۶۰﴾ [الفرقان] یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے، کہ ''رحمٰن'' کے سامنے سجدہ کرو، تو وہ حیرت زدہ ہوکر جواب دیتے ہیں کہ ''رحمٰن'' کون ہے؟ جسے ہم تیرے قول کی وجہ سے سجدہ کریں۔ درحقیقت یہ بدکار لوگ صرف عناد، تکبر، سرکشی اور دشمنی کی بناء پر رحمٰن کا انکار کرتے تھے، نہ کہ وہ اس نام سے ناآشنا تھے۔ اس لئے کہ جاہلیت کے زمانے کے پرانے اشعار میں بھی اللہ تعالیٰ کا نام ''رحمٰن'' موجود ہے۔ جوانہی شاعروں کے شعر ہیں، سلامہ کے شعر اور دیگر اشعار ملاحظہ ہوں:

عجلتم علینا عجلتینا علیکم	ومایشاء الرحمٰن یعقد ویطلق
الاضربت تلک الفتاة هجینها	الاقضب الرحمٰن ربی یمینها

تفسیر ابن جریر میں نقل ہے عبداللہ بن عباس سے، کہ ''رحمٰن'' فعلان، کے وزن پر رحمت، سے ماخوذ ہے اور کلام عرب سے ہے۔ وہ اللہ، رفیق، اور رقیق ہے، جس پر رحم کرنا چاہے اور جس سے غصے ہو اس سے بہت دور اور اس پر بہت سخت گیر بھی ہے۔ اسی طرح ان کے سارے نام ہیں۔ حسن بصری فرماتے ہیں کہ ''رحمٰن'' کا نام دوسروں کے لئے منع ہے، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ کا نام ہے، لوگوں کو اس نام پر کوئی حق نہیں۔ اور اسی طرح ایک جماعت ''بسم اللہ'' کو آیت قرار دیکر آیت ''الحمد'' کو الگ پڑھتی ہے اور بعض ملا کر پڑھتے ہیں۔ میم، کو دوساکن جمع ہوجانے کی وجہ سے زیر دیتے ہیں۔ جمہور کا بھی یہی قول ہے۔ کوفی کہتے ہیں کہ بعض عرب میم پر زبر پڑھتے ہیں، ہمزہ، کی حرکت زبر، میم کو دیتے ہیں۔ جیسے ''الم، اللہ لا الٰہ الا هو''، ابن عطیہ کہتے ہیں کہ زبر کی قرأت کسی سے بھی میرے خیال میں مروی نہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴿۱﴾

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا[۲]

(۲) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴿۱﴾ جب کوئی شخص کوئی اچھا کام اپنے اختیار سے کرتا ہے، اور دوسرا شخص اس کی بزرگی کے ارادے سے اس کام کی ثناوصفت اپنے زباں سے بجالاتا ہے، تو اس کو حمد کہتے ہیں، یہ حمد خاص اللہ ہی کے ذات پاک کولائق ہے۔ دوسرے کوزیبا نہیں، حدیث میں آیا ہے "اللھم لک الحمد کله" ابن عباسؓ کہتے ہیں ، الحمدلله ، شکر کا کلمہ ہے۔ بندہ جب یہ کلمہ کہتا ہے تو للہ تعالی فرماتا ہے لو میرے بندے نے میرا شکر کیا۔ ابن عمرو کا لفظ مرفوع یہ ہے کہ "الحمدللہ" سر ہے شکر کا۔ جس نے اللہ کی حمد نہ کہی اس نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا، اس کو عبدالرزاق اور خطابی وحکیم ترمذی وبیہقی نے روایت کیا ہے۔ قران پاک میں نوح علیہ السلام کو بندہ شکر گذار فرمایا ہے: ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ﴿۳﴾ (اسراء)۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی بہت حمد کیا کرتے تھے۔

جابرؓ نے مرفوعاً کہا ہے، کہ، افضل ذکر، لا اله الاالله ہے۔ اور افضل دعا الحمدلله ہے اس کو ترمذی نے حسن کہا ہے، نسائی وابن ماجہ اور ابن حبان، بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ ابو مالک اشعریؓ کا لفظ یہ ہے کہ "الحمدلله" ترازو کو بھر دیتا ہے، رواہ مسلم والنسائی واحمد۔

انسؓ کا لفظ مرفوع یہ ہے کہ، حمد سے زیادہ کوئی چیز اللہ کو محبوب نہیں ہے، ابو ہریرہؓ کی حدیث میں یوں فرمایا ہے کہ ہر عمدہ کام جو اللہ کے حمد سے شروع نہیں کیا جاتا، وہ برکت سے خالی ہوتا ہے، رواہ اھل السنن وابن حبان وبیہقی، مسلم کا لفظ مرفوع انسؓ سے یوں آیا ہے کہ، خوش ہوتا ہے اللہ اس بندے سے جو ہر نوالے، ہر گھونٹ پر اللہ کی حمد کرتا ہے۔

رب: کہتے ہیں کسی چیز کے مالک، مربی، مدبر، مصلح، جابر، قائم کو، معبود کو، سو یہ سارے معنی اللہ پاک کی ذات میں موجود ہے۔ رب، کا استعمال غیر اللہ کے لئے اضافت سے ہوتا ہے، جیسے "رب الدار" وغیرہ بغیر اضافت خاص اللہ کے لئے بولا جاتا ہے، کسی نے یہی کہا ہے کہ یہ نام اسم اعظم ہے۔

العالمین: عالم کی جمع ہے، اور اسم آلہ کا صیغہ ہے، کہتے ہیں ہر موجود ماسوا اللہ کو، یعنی جو کچھ اللہ کے سوا موجود ہے وہ سب "عالم" ہے، لفظ عالم میں سارے خلق داخل ہیں کسی نے کہا عالم مشتق ہے علامت سے۔ یہ مصنوعات گویا وجود صانع =

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳﴾ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴﴾

بہت بخشش کرنے والا ، بڑا مہربان، جزاء کے دن کا مالک

=: کی علامت ہیں ابن معتز نے کیا خوب کہا ہے:

فیاعجبا کیف یعصی الاله ام کیف یجحده الجاحد وفی کل شیء له اية تدل علی انه واحد

بعض نے کہا، ہر زمانے کے لوگ ''عالم'' کہلاتے ہیں، ابن عباسؓ نے کہا مراد ''عالم'' سے جن اور انس ہے، بعض نے ملائکہ وشیاطین کا بھی اضافہ کیا ہے، قول اول صحیح تر ہے۔ اس دلیل سے کہ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ '' رب العٰلمین''کون ہے؟ توانہوں نے یہ جواب دیا تھا۔

قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ ﴿۲۴﴾ (الشعراء)۔ اس سے یہی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ عالم سے الگ تھلگ ہے، عالم میں داخل نہیں ہے، اس لئے قران میں آیا ہے کہ: ''الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ﴿۵﴾ (طہ) رحمٰن عرش پر ہے'' ''عالم'' کی گنتی میں اختلاف ہے کسی نے کہا چودہ ہزار عالم ہیں کسی نے کہا سترہ ہزار، کسی نے کہا اٹھارہ ہزار، کسی نے کہا اسی ہزار ''عالم'' ہیں ٹھیک بات یہی ہے کہ سوا ''عالم الغیب'' کے کسی کو گنتی عوالم کی معلوم نہیں ہے۔ کعب احبار نے کہا نہیں جانتا کوئی شخص، عدد عوالم، مگر اللہ عزوجل، میں کہتا ہوں قران مجید میں آیا ہے: وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾ (مدثر).

(۳) **الرحمٰن الرحیم**: بہت مہربان نہایت رحم والا لفظ ''رب العٰلمین'' میں ایک طرح کا ڈرانا تھا، اس لئے ان دونوں نام مبارک کو ذکر، کر کے تسلی، خاطر بخشی ترہیب کو ترغیب ملا دیا۔ ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' کی تحقیق بسملہ میں گذر گئی۔

(۴) **مالک یوم الدین**: لفظ ''مالک'' '' ملک'' سے مشتق ہے، جسکے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا قبضہ کہ وہ اس میں تصرف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو، (قاموس)۔

لفظ **دین** قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ بعض مقامات میں پوری شریعت کو دین کہا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہے: ومن یبتغ غیر الاسلام دینافلن یقبل منه .(ال عمران: ۸۵) یعنی جس نے اسلام کے سوا=:

إِيَّـــــاکَ نَـــعْبُـــدُ وإِيَّـــاکَ نَسْتَـــعِيْـــنُ

ہم تیری عبادت کرتے(۵) ہیں اور تجھ ہی سے مددمانگتے ہیں(۶)

=: کسی اور دین کو پسند کرلیا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اکثر جگہوں میں ''الدین'' اللہ کی توحید اس کی خالص عبادت، اور پکار، کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے قیدیوں کو وعظ کرتے ہوئے فرمایا: **ان الحکم الالله امران لاتعبدوا الا اياه ذلک الدين القيم** (یوسف: ۴۰) یعنی نہیں حکم مگر اللہ کے لئے اس نے حکم دیا ہے کہ مت عبادت کرو اس کے سوا کسی کی، یہی ہے دین محکم۔ سورت زمر:۳، میں فرمایا: **الالله الـــــديــــن الخالص** ۔یعنی خبردار اللہ ہی کے لئے ہے خالص عبادت اور پکار۔ اور سورت حم مومن میں ہے: **فادعوا الله مخلصين له الدين ولو کره الکافرون** (۱۴) یعنی سو اللہ کو پکارو، خالص کر کے اس کے لئے عبادت کو، گو کافروں کے لئے ناگوار ہی کیوں نہ ہو، مگر جہاں لفظ ''دین'' یوم کا مضاف ہو وہاں اس کے معنی جزاء کے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ **مـــالک يوم الدين** میں ہے۔

یعنی روز جزاء کا مالک، اور اس دن میں تمام تصرفات اور اختیارات کا واحد مختار اور اعمال کی جزاء وسزا مقرر کرنے والا، اور اعمال پر نیک وبد نتائج مرتب کرنے والا، اور اختیار رکھنے والا، یہ مذکورہ دعوی یعنی ''الحمدللہ'' کی تیسری دلیل ہے۔

(۵) اياک نعبد سورت فاتحہ میں یہ ایت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ ''ایـــاک نـعبـد'' میں ''ایـــاک'' مفعول کو ''نـــعبـــد'' فعل پر مقدم کیا گیا ہے، تا کہ حصر کا فائدہ دے، اور مطلب یہ ہو کہ عبادت صرف اللہ کے لئے ہونی چاہئے، اور اس کے سوا کسی پیغمبر، فرشتہ یا، ولی کی عبادت اور پکار نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ وہ سارے خود اللہ کے حکم سے اسی ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ اسی طرح '' **اياک نستعين** '' میں فائدہ حصر کے لئے مفعول بہ کو فعل پر مقدم کیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ مدد صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہئے۔ اور اس کے سوا کسی پیر یا پیغمبر سے اور کسی فرشتہ یا ولی سے مافوق الاسباب امور میں مدد نہیں مانگنی چاہئے۔ امام ابن کثیر بعض بزرگوں سے نقل فرماتے ہیں، کہ سارے قرآن کا مرکزی حصہ سورت فاتحہ ہے اور سورت فاتحہ کا مرکزی حصہ ایاک نعبد وایاک نستعین ہے، وہ لکھتے ہیں: **الفاتحة سر القران وسرها هذه الکلمة**

(ایاک نعبدو ایاک نستعین۔ابن کثیر)۔

عبادت کے مفہوم میں دو چیزیں داخل ہیں، ایک غایت تذلل، یعنی انتہائی عاجزی اور ذلت، دوم غایت تعظیم، لیکن اس اعتقاد اور شعور کے ساتھ کہ معبود کو غائبانہ تصرف اور قدرت حاصل ہے، جس سے وہ نفع ونقصان پر قادر ہے۔ کیونکہ معبود صرف وہی ہوسکتا ہے جس میں دو صفتیں موجود ہوں: ا۔ یہ کہ وہ عالم الغیب ہو، کائنات کا ذرہ ذرہ اس پر منکشف ہو، اور زمین وآسمان کی ساری مخلوق کے ظاہر وباطن سروعلانیہ کو وہ اچھی طرح جانتا ہو۔۲: یہ کہ وہ مالک ومختار، متصرف فی الاموراور اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو، قرآن مجید میں اللہ تعالی نے جہاں کہیں اپنے لئے استحقاق عبادت وپکار کا ذکر فرمایا ہے وہاں اپنی انہی دونوں صفتوں کو اس کی علت قرار دیا ہے، اور جہاں کہیں غیر اللہ سے عبادو پکار کی نفی کی ہے، وہاں غیر سے دونوں صفتوں کی نفی فرمائی ہے، کہیں دونوں صفتوں کی نفی ہے اور کہی صرف ایک کی، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے۔

وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَاء ُ وَیَخْتَارُ مَا کَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَى عَمَّا یُشْرِکُونَ ﴿۶۸﴾ وَرَبُّکَ یَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا یُعْلِنُونَ ﴿۶۹﴾ وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْأُولَى وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُکْمُ وَإِلَیْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۷۰﴾ (قصص) یعنی اور تیرا رب جو کچھ چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے، اور پسند کرتا ہے، ان لوگوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں، اللہ تعالی ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے، اور تیرا رب جانتا ہے، جو ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، اور وہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود بننے کے لائق نہیں، دنیا واخرت میں تمام صفات کارسازی کا مستحق وہی ہے، اور اسی کی حکومت ہوگی اور اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے ۔دوسری جگہ فرمایا:

لَهُ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَى ﴿۶﴾ وَإِن تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ یَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى ﴿۷﴾ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاء الْحُسْنَى ﴿۸﴾ (طه:۷) یعنی جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، اور جو کچھ ان دونوں کے بیچ میں ہے اور جو کچھ (زمین کی) مٹی کے نیچے ہے سب اُسی کا ہے۔ اور اگر تم پکار کر بات کہو تو وہ تو چھپے بھید اور نہایت پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔ (وہ برحق معبود ہے کہ) اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اُس کے (سب) نام اچھے ہیں۔اور ایک جگہ ارشاد ہے:

وَلِلّهِ غَیْبُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَإِلَیْهِ یُرْجَعُ الأَمْرُ کُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَکَّلْ عَلَیْهِ وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۲۳﴾ (هود) یعنی آسمانوں اور زمین میں جتنی بھی غیب کی باتیں ہیں، ان سب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے، اور سب امور اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں، پس تم اسی کی عبادت کرو، اور اسی پر بھروسہ کرو، اور تمہارا رب ان باتوں سے

بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو،ان کے علاوہ آیت الکرسی اوردوسری کئی ایتوں میں بھی یہ مضمون وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ان تمام ایتوں میں اللہ تعالی نے پہلے اپنی ان دونوں صفتوں کا ذکر فرمایا کہ وہ متصرف ومختار ہے، زمین واسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کے قبضہ میں ہے زمین وآسمان کی ساری مخلوق کے تمام معاملات اور سارے کارخانہ عالم کی تدبیر اور پورا نظام عالم اسی کے زیر اقتدار ہے،اورزمین وآسمان کے تمام غیوب کو جاننے والابھی وہی ہے،اورتینوں جگہوں میں دونوں صفتیں بیان کرنے کے بعد یہ اعلان فرمایا کہ جب عالم الغیب اور متصرف ومختار،اللہ ہے،تو معبود بننے اور پکارے جانے کے لائق بھی صرف اللہ ہی ہے،تمام صفات کارسازی بھی اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔لہذا تم اسی کی عبادت کرو،اسی کو پکارو،اسی کے آگے جھکو، اوراسی سے مانگو، جو کچھ بھی مانگو،ایک مقام پرتو اللہ تعالی نے مشرکین کو خطاب کرکے صاف صاف ان کے رویہ پرانکار فرمایا کہ تم ایسے بے بس اور بے چارے معبودوں کو پکارتے ہو جو تمہارے نفع اورنقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے، اورنہ تمہارے حالات کو جانتے ،اورنہ تمہاری پکارکو سنتے ہیں۔اوراس اللہ کو چھوڑتے ہو جو سب کچھ سنتااور جانتا ہے۔اورتمہارے نفع اورنقصان کا بھی پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّهِ مَا لاَ يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرّاً وَلاَ نَفْعاً وَاللّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۷۶﴾(مائدة: ۷۶) کہو کہ تم اللہ کے سواایسی چیز کی کیوں پرستش کرتے ہو جس کو تمہارے نفع اورنقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں اوراللہ ہی (سب کچھ) سنتا جانتا ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ہروہ قول وفعل، دعا،اور پکار،ثناء،اورتعظیم ،رکوع اورسجود قیام اورقعود،وغیرہ جو،اس اعتقاد اورشعور کے ساتھ ہو کہ معبود کو مافوق الاسباب ہمارے تمام معاملات پرغیبی قبضہ اورتسلط حاصل ہے۔اوروہ سب کچھ سنتااور جانتا ہےعبادت ہے،چنانچہ علامہ ابن قیمؒ نے عبادت کی تعریف کوایک جامع تعبیر سے حسب ذیل عبارت میں بیان فرمایا ہے: عبادت اس اعتقاد اورشعور کا نام ہے کہ معبود کوایک غیبی تسلط حاصل ہے ۔جس کی وجہ سے وہ نفع ونقصان پرقادر ہے۔اس لئے ہرتعریف ، ہرپکاراور ہرتعظیم جواس مذکورہ اعتقاد ، وشعور کے ساتھ ہو، وہ عبادت ہے۔ملخص ازمدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین۔

تقریربالاسے اس شبہ کا جواب بھی ہوگیا،کہ تعظیم وتکریم ،اورعزت واحترام تواللہ کے سوااوروں کا بھی کیا جاتا ہے۔اللہ کے پیغمبرﷺ کی تعظیم وتکریم تو ساری امت پرفرض ہے۔ استاداور پیرومرشد کاادب واحترام بھی لازم ہے۔ اور والدین کی تعظیم وتکریم بھی ضروری ہے، لہذا اگرتعظیم وتکریم اورعجز کا نام عبادت ہے تو پھر یہ بھی عبادت ہوگی۔حالانکہ عبادت صرف اللہ کا حق ہے۔غیراللہ کی عبادت جائز نہیں،تواس کا جواب یہ ہے کہ تعظیم صرف وہی عبادت

ہے جس میں معبود کو مافوق الاسباب غیبی طور پر متصرف اومختار اور عالم الغیب سمجھا جائے ، اور اگر معظم اور محترم ہستی کو صفات بالا سے متصف نہ مانا جائے تو یہ تعظیم عبادت میں داخل نہیں۔

اس لئے ایسی تعظیم غیراللہ کی بھی جائز ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تعظیم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو ذات باری تعالی کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوم وہ جو غیراللہ کے لئے بھی جائز ہے۔ پہلے ایات قرانیہ سے بوضاحت معلوم ہو چکا ہے، کہ معبودیت کے لئے دو شرطیں ہیں، ایک متصرف ومختار اور قدرت کاملہ کا مالک ہونا۔ دوم زمین وآسمان کی تمام ظاہر اور چھپی ہوئی چیزوں کا عالم ہونا۔ علامہ ابن قیم کی جو عبارت پہلے نقل کی جاچکی ہے۔ اس کا حاصل بھی یہی ہے، کہ معبود وہی ہوسکتا ہے جسے علم اور تصرف کے اعتبار سے تمام مخلوق پر غیبی تسلط حاصل ہو۔ جس کی وجہ سے وہ نفع ونقصان پہنچانے پر قادر ہو، لہذا تعظیم کا ہر وہ طریقہ خواہ وہ حمد وثنا ہو یا دعا و پکار، رکوع وسجود ہو، یا کچھ اور، جو اس اعتقاد اور شعور کے ساتھ بجالایا جائے کہ معظم ومحترم ہستی مافوق الاسباب اختیار وتصرف کی مالک اور عالم الغیب ہے، تو ایسی تعظیم عبادت ہوگی، اور ذات باری تعالی کے ساتھ مخصوص ہوگی۔ لہذا جب یہ عقیدہ ہو کہ فلاں کو مجھ پر ظاہری اسباب کے سوا مافوق الاسباب غیبی تسلط حاصل ہے، اور وہ غائبانہ مجھے نفع ونقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس اعتقاد کے تحت کوئی بھی تعظیم ہاتھ پاؤں سے سرزد ہو، یا زباں سے ثنا یا پکار ہو، تو وہ اس کی عبادت ہوگی۔

اگر یہ اعتقاد اللہ تعالی کے متعلق ہو تو اسکے تحت کئے گئے تمام افعال تعظیم، اللہ تعالی کی عبادت میں داخل ہونگے، اور اگر معاذ اللہ مذکورہ بالا اعتقاد غیراللہ کے لئے ہو، مثلا فرشتہ، جن، پیغمبر، ولی، زندہ یا فوت شدہ تو اس اعتقاد کے تحت سجدہ، رکوع۔ پکار، نذر و نیاز جھکنا، دوزانوں بیٹھنا، قبر پر چادر یا پھول چڑھانا، وغیرہ تعظیمی افعال ان کی عبادت ہوگی، اور شرک ہوگا۔ اللہ تعالی نے جہاں کہیں خالص عبادت کا حکم دیا ہے اور شرک سے منع فرمایا ہے وہاں یہی مراد ہے کہ مذکورہ بالا اعتقاد اور شعور کے ساتھ تمام تعظیمی افعال واقوال (سجدہ، رکوع، دعا، پکار، نذر، نیاز وغیرہ) صرف اللہ تعالی کے لئے بجالائے جائیں۔ سورت زمر میں ارشاد ہے: فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصاً لَّهُ الدِّيْنَ (۲ زمر).

سو آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کرتے رہیے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ غیبی تسلط اور مافوق الاسباب، اقتدار اعلی کے اعتقاد کے ساتھ ہر قسم کی تعظیم صرف اللہ ہی کی بجالاؤ، نہ کسی پیغمبر، یا ولی یا فرشتہ کی۔ اور سورۂ زمر میں پھر اشاد ہے: قُلْ إِنِّيْ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصاً لَّهُ الدِّيْنَ ﴿۱۱﴾ اور اس ایت کے بعد فرمایا قُلِ اللَّهَ أَعْبُدُ مُخْلِصاً لَّهُ دِيْنِيْ ﴿۱۴﴾ فَاعْبُدُوا مَا شِئْتُم مِّن دُونِهِ.

مطلب یہ ہے: کہ اے پیغمبرﷺ آپ فرما دیجئے کہ مجھے تو یہ حکم ملا ہے کہ میں غائبانہ تسلط اور مافوق الاسباب تصرف وقدرت کے تحت تمام تعظیمی افعال واعمال صرف اللہ ہی کے لئے بجالاؤں، اور اے مشرکین تم مذکورہ اعتقاد کے ساتھ تعظمی افعال اللہ کے سوا جس کے لئے چاہو بجالاؤ۔ ابراہیم واسمٰعیل اور ھابیل (ہبل) علیہم السلام کے لئے ، یا ''لات'' اور دوسرے بزرگوں کیلئے ،لیکن میں تو ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ جو لوگ مذکورہ بالا تعظیم صرف اللہ کے لئے بجالا ئیں گے اور غیر اللہ کی ایسی تعظیم سے اجتناب کریں گے جنت اور نعیم آخرت کی خوش خبری بھی ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے جو سورۃ زمر میں ذکر ہے:

وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَن يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَى فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿١٧﴾ یعنی جو لوگ طاغوت کی عبادت اور غیبی تسلط کے اعتقاد کے تحت اس کے لئے تعظیمی افعال واعمال بجالانے سے اجتناب کریں اور یہ سب کچھ صرف اللہ ہی کے لئے بجالائیں تو خوش خبری ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے۔

حاصل یہ ہے کہ غیبی تسلط اور مافوق الاسباب تصرف وقدرت کے اعتقاد کے تحت جو افعال تعظیمی بجالائے جائیں، وہ عبادت میں داخل ہیں، اور ایسی تعظیم اللہ کے ساتھ خاص ہے، اور اللہ کے سوا کسی پیغمبر، ولی پیر، ومرشد واستاد، اور ماں باپ اور حاکم وقت وغیرہ کے لئے جائز نہیں۔

تعظیم کی دوسری قسم یہ ہے، کہ غیبی تسلط اور مافوق الاسباب قدرت وتصرف کا اعتقاد رکھے بغیر، رسولﷺ، اپنی استاد، پیر مرشد اور دوسروں کی تعظیم وتکریم بجالانا، ان کی اطاعت کرنا، ان کے سامنے دوزانو بیٹھنا، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینا، ان کی خدمت میں تحفے تحائف اور ہدیے پیش کرنا، وغیرہ وغیرہ، یہ تعظیم چونکہ عبادت میں داخل نہیں اس لئے یہ اللہ کے سوا قابل احترام ہستھیوں کے لئے جائز ہے۔ کیونکہ اس میں وہ اعتقاد نہیں پایا گیا جو عبادت کی روح ہے، تو اس سے معلوم ہوا کہ عبادت اور غیر عبادت میں فارق اور مابہ الامتیاز نیت اور اعتقاد ہے، لیکن یہ بات یاد رہے کہ تعظیم کی بعض سورتیں ایسی ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، وہ کسی بھی نیت سے غیر اللہ کے لئے جائز نہیں ہیں، مثلاً سجدہ کرنا، اللہ کے گھر کا طواف کرنا، حلف اٹھانا (قسم کھانا)، اور نذر و نیاز دینا، وغیرہ یہ امور ایسے ہیں کہ ہر حال میں صرف اللہ ہی کے لئے کرنے جائز ہیں، غیر اللہ کیلئے بالکل ناجائز ہیں، اگر یہ امور غیر اللہ کے لئے مذکورہ بالا اعتقاد غیبی تسلط اور مافوق الاسباب قدرت کے ساتھ کئے جائیں۔ تو صریح شرک ہے، اور اگر اس اعتقاد کے بغیر کئے جائیں تو شرک نہیں ہوگی۔

(٦) وإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ یہاں بھی مفعول کو فعل پر اس لئے مقدم کیا، تا کہ حصر کا فائدہ حاصل ہو، مطلب یہ کہ جس طرح عبادت صرف اللہ ہی کی ہونی چاہئے، اسی طرح استعانت (مدد طلب کرنا) بھی صرف اسی ہی سے ہونی چاہئے نہ کسی اور سے۔ استعانت (یعنی حاجت اور مشکلات میں پکارنا اور مدد مانگنا) چونکہ عبادت کی سب سے بڑی اور اہم شاخ ہے۔ اس لئے عبادت کے بعد خصوصیت سے اس کا ذکر فرمایا۔ ہر آدمی جو کسی معبود کی عبادت کرتا ہے، دنیوی زندگی کے اعتبار سے اس کی عبادت کا مقصد اور لب لباب یہی ہوتا ہے۔ کہ اس کی تمام حاجتیں پوری ہوجائیں اور اس کی تمام مشکلیں آسان ہوجائیں،۔

اس لئے جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ دعا (یعنی پکار) عبادت کا مغز اور لب لباب ہے۔ "**الـدعاء مخ العبادة**" اور ایک روایت میں ہے "**الـدعـاء هـو العبادة**" (ابـوداود: ١٢٦٤، ترمذی: ٢٨٩٥) تفسیر ابن جریر۔، یعنی پکارنا ہی اصل عبادت ہے قرآن مجید میں بھی لفظ عبادت بمعنی دعا اور پکار وارد ہوا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (مـــومـــن: ٦٠). اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے: کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ (صرف) میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب (مرتے ہی) ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہونگے۔ اس آیت میں پہلے اللہ تعالی نے اپنی پکار کا حکم فرمایا ہے، پھر پکار کو لفظ عبادت سے تعبیر فرمایا، جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے: کہ "**عبـادتی**" سے مراد "**دعـائی**" ہے، یعنی اس آیت میں عبادت سے دعاء اور پکار مراد ہے تفسیر ابن جریر وابن کثیر۔

سورۂ زمر اور حوامیم کا مرکزی مقصد ہے۔ **فَادْعُوهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ** (مومن:٦٥) اور سورت فاتحہ میں اسی دعویٰ کو ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ سے بیان کیا گیا ہے اس طرح سارے قرآن کا مرکزی مضمون حوامیم میں اور حوامیم کا خلاصہ سورت فاتحہ میں اور فاتحہ کا لب لباب ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ میں ہے۔ (جیسا کہ پہلے گذر گیا)۔

اعتراض: ہم ہر وقت یہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، کہ ہر انسان دوسرے انسان سے مدد مانگتا ہے، اور اسے اپنی مدد کے لئے پکارتا، اور اس سے مدد کی درخواست کرتا ہے، یہ باہمی مدد وامداد کا سلسلہ اس قدر وسیع اور ضروری ہے کہ اس کے بغیر دنیا کا کاروبار ایک منٹ بھی نہیں چل سکتا۔ اور اس باہمی امداد کا ثبوت خود قرآن مجید میں بھی موجود ہے، عیسیٰ علیہ السلام

نے جب یہودیوں کی شرارت بھانپ لی، اور سمجھ لیا، کہ وہ کفر پر آڑ گئے ہیں تو اعلان کیا: مَـنْ أَنـصَـارِیْ إِلَـی اللّـٰهِ قَـالَ الْحَوَارِیُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللّٰهِ (ال عمران: ۵۲)

یعنی اللہ کی طرف میرے مددگار کون ہے؟ تو حواریون نے جواب دیا کہ ہم ہیں، اللہ کے دین کے مددگار، اسی طرح ذوالقرنین نے بھی ایک قوم سے مدد کی درخواست کی تھی، سورت کہف: میں ارشاد ہے'' فـاعیـنـونـی بقوة''الایة (۹۵) یعنی تم لوگ قوت بازو سے میری مدد کرو، علاوہ ازیں اللہ تعالی نے تمام انسانوں کو امداد باہمی کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: وتـعـاونـوا عـلـی البـر و التـقـوی (مـائـده: ۲) نیکی اور خوف الہیٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو، تو اس سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا جائز ہے۔ آج کل کے اہل بدعت اس قسم کی چیزیں پیش کر کے عوام کو ورغلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کہتے ہیں دیکھو جی، اللہ نے ایک دوسرے سے مدد مانگنے کا حکم دیا ہے۔ اور عیسی علیہ السلام نے بھی اپنی متبعین سے مدد مانگی تھی، لہذا اولیاء اللہ سے بھی مدد مانگنا جائز ہے۔

جواب: اہل بدعت کے قول سے معلوم ہوا، العیاذ باللہ، عوام الناس، اولیاء اللہ اور انبیاء علیہم السلام کے حاجت روا، اور مشکل کشا ہیں، کیونکہ عیسی علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے مدد مانگی اور ذوالقرنین نے اپنی قوم سے۔ یہ اہل بدعت بھی عجب کشمکش اور مخمصے میں مبتلا ہے۔

ایک طرف تو دعوی کرتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام اور اولیاء کرام حاجت روا اور مشکل کشا ہیں، اور دوسری طرف عوام الناس کو انبیاء اور اولیاء کا حاجت روا سمجھتے ہیں، معاذ اللہ ربی، یہ تو الزامی جواب تھا، اس کا تحقیقی جواب یہ ہے'' ایاک نستعین'' میں جو استعانت اور استمد اد اللہ کے ساتھ مختص کی گئی ہیں وہ اور ہے، اور جو استمد اد اور استعانت روزمرہ کی زندگی میں ہر آدمی دوسرے سے کرتا ہے، یا جو انبیاء علیہ السلام نے اپنے متبعین سے کی، وہ اور ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

استعانت (مدد مانگنے) کی دو قسمیں ہیں: ایک استعانت ماتحت الاسباب یعنی ظاہری اسباب کے تحت کسی سے مدد مانگی جائیں، یہ وہ امداد ہے جو تمام انسانوں کو روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے سے حاصل ہوتی ہے، عیسی علیہ السلام نے حواریوں سے جو مدد مانگی تھی وہ بھی ماتحت الاسباب تھی، جب انہوں نے محسوس کیا کہ یہود ان کو قتل کرنا چاہتے ہیں، تو حواریون سے فرمایا کہ کیا تم میں کوئی ہے جو اللہ کے دین کے لئے میری مدد کریں؟ حواریون نے جواب دیا ہم ہیں اللہ کے دین کے مددگار۔ یہ سارا معاملہ ماتحت الاسباب تھا، حواری عیسیٰ علیہ السلام کے پاس تھے، غائب نہیں تھے، انہوں نے بالمشافہ حواریوں سے اسباب عاویہ کے تحت امداد طلب کی، اسی طرح ذوالقرنین نے بھی یاجوج وماجوج کو روکنے کے لئے

دیوار بناتے وقت لوگوں سے جو کہا تھا"اعینونی بقوة" کہ تم لوگ قوت بازو یعنی کام سے میری مدد کرو، یہ مدد بھی ظاہری اسباب کے تحت تھی، نہ عیسیٰ علیہ السلام نے حواریون کو غائبانہ پکارا، اور نہ ان سے مافوق الاسباب مدد مانگی، اور نہ ہی ذو القرنین نے اپنی قوم سے ایسا کیا، جس طرح ظاہری اسباب کے تحت مدد، امداد جائز ہے، اسی طرح اسباب عادیہ کے تحت پکار بھی جائز ہے، یعنی جو آدمی سامنے موجود ہو، اسے پکار کر (اے فلاں کہہ کر) کوئی ایسا کام کرنے کا کہا جائے جو اسباب عادیہ کے تحت اس کی قدرت میں ہو، مثلا اسے کہا جائے کہ مجھے پانی پلادو یا بازار سے سودا سلف لادو وغیرہ، قرآن مجید میں ہے، جنگ احد میں وقتی افراتفری کی بنا پر جب کچھ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ سے علیحدہ ہو گئے، اور آپ ؐ نے ان کو واپس بلایا:"والرسول یدعوکم فی اخراکم" (ال عمران:١٠٣) اور رسول پیچھے سے تم کو بلا رہے تھے، نبی علیہ السلام کا یہ بلانا اور پکارنا اسباب ظاہری کے تحت تھا۔ اور اواز ان کو دی جا رہی تھی، جو میدان احد میں آپ ؐ کی آواز سن رہے تھے، یہ پکار ماتحت الاسباب ہے، اور اس کے بغیر دنیا کا کاروبار ہی نہیں چل سکتا۔

ایک جگہ فرمایا **لاتجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا** (النور:٦٣) یعنی جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو نام سے اور بلند آواز سے پکارتے ہو، اس طرح رسول اللہ کو نہ پکارا کرو۔ معلوم ہوا کہ جو استعانت امداد باہمی اور پکار عادی اسباب کے تحت ہو وہ نہ صرف جائز ہے بلکہ اس کے سوا دنیا کا کاروبار ہی نہیں چل سکتا، اور"ایاک نستعین"، میں اس قسم کی استعانت کا حصر مقصود نہیں اور نہ ہی اس کی قران میں ممانعت ہے۔

استعانت کی دوسری قسم ہے مافوق الاسباب: یعنی اسباب عادیہ کے بغیر کسی کو دور و نزدیک سے غائبانہ پکارا جائے اور اس سے استمداد کی جائے، یہ پکار اور استعانت اللہ تعالی کے ساتھ مخصوص ہے، اور اللہ کے سوا کسی پیغمبر، فرشتہ، یا ولی سے ہرگز جائز نہیں۔ تمام انسانوں، بلکہ جانداروں کی مافوق الاسباب مدد اللہ تعالی ہی کرتا ہے، اس کی امداد میں قرب و بعد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور یہ استمداد غیر اللہ سے شرک ہے، اور یہی وہ استمداد و استعانت ہے جس کا "إِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" میں حصر ہے۔ اس موقع پر تفسیروں میں ایک سوال و جواب مذکور ہے، کہ انسان ایک دوسرے سے کئی امور میں مدد لیتا ہے، پانی مانگتا ہے، روٹی مانگتا ہے، اور اس سے کئی ضرورت کی چیزیں طلب کرتا ہے، تو پھر"ایاک نستعین" کا حصر کس طرح صحیح ہوا؟

اس کا جواب: یہ دیا گیا ہے کہ انسان ظاہری اسباب کے تحت ایک دوسرے سے جو امداد لیتا ہے، وہ ظاہری امداد بھی دراصل اللہ تعالی ہی سے ہوتی ہے، کیونکہ مدد کرنے والے انسان کے جسم و جان کو اللہ ہی نے پیدا فرمایا ہے، ا=

إِهۡدِنَــــــا الصِّرَاطَ الۡمُستَقِيۡمَ ﴿۶﴾ صِـرَاطَ الَّـذِيۡـنَ أَنۡعَمتَ عَلَيۡهِمۡ

ہمیں سیدھاراستہ دکھا۔(۷)ان لوگوں کاراستہ جن پرتونے انعام کیاہے۔[۸]

سے ہاتھ پاؤں اسی نے دیئے ،اوران میں حرکت بھی اسی نے پیدا فرمائی ،لیکن استعانت اوراستمد اد کی مذکورہ بالا دوقسمیں (ماتحت الاسباب اور مافوق الاسباب) بیان کرنے کے بعداس قسم کے سوال وجواب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ۔

بعض اہل بدعت اس موقع پرایک اور مغالطہ پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ تو درست ہے، کہ غیراللہ کی عبادت جائزنہیں بلکہ شرک ہے خواہ کسی پیغمبر کی عبادت ہو یافرشتہ اورولی کی ،لیکن انبیاء اور اوراولیاء کوحاجات ومشکلات میں امداد کے لئے غائبانہ پکارنا شرک نہیں بلکہ جائز ہے،اورقران مجید کی جن آیتوں میں غیراللہ کی دعا سے منع کیا گیا ہے وہاں دعا سے مرادعبادت ہے نہ کہ پکار،اورثبوت یہ پیش کرتے ہیں کہ مفسرین نے ''یدعون'' کی تفسیر ''یعبدون'' سے ''یدعو'' کی ''یعبد''اور''ادع'' کی ''اعبد'' سے کی ہے۔

تواس کا جواب یہ ہے کہ: غیراللہ کوغائبانہ مافوق الاسباب پکارنا شرک ہے،اوراہل بدعت کا استدلال سراسرغلط ہے، کیونکہ پہلے بالتفصیل بیان ہوچکا ہے کہ ''دعاء''اور پکارکی دوقسمیں ہیں،ایک مافوق الاسباب،اوردوم ماتحت الاسباب ،پکارکی پہلی قسم عبادت ہے،اوراللہ کے ساتھ خاص ہے،اوردوسری قسم چونکہ عبادت نہیں،اس لئے وہ غیراللہ کے لئے بھی جائزہےاوریہی وہ پکارہےجس سے مغالطہ دیا جاتا ہے۔

باقی رہامفسرین کا ''تدعون'' کی تفسیر ''تعبدون'' سے کرنا،تواس سے ان مقصد دعا کا حاصل معنی بیان کرنا ہے، اور یہ مطلب ہے کہ غائبانہ مافوق الاسباب دعابھی عبادت ہی کا فرد ہے۔(بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ دعااور پکارعبادت کا سب سے اہم فرد ہے)۔ اورجس طرح عبادت اللہ کےسوا کسی کی جائزنہیں،اسی طرح یہ دعااور پکاربھی اللہ کےسوا کسی کی جائزنہیں۔شاہ ولی اللہ ''الفوز الکبیر''میں فرماتے ہیں''مفسرین حاصل معنی بطریق افہام بیان می کنندمردمان ناواقف گمان می کنند کہ لفظی معنی کردہ اند۔دعا بمعنی مطلق خواندن کسے رامنع نیست مراداز خواندن کسے رادرغائبانہ حاجات است، لہذا مفسرین تفسیر بہ عبادت می کنند''

شاہ صاحب کی عبارت سے معلوم ہوا کہ غیراللہ کوپکارنا دوقسم ہے،ایک غائبانہ حاجات میں یعنی مافوق الاسباب

مفسرین کرام ''یدعون'' کی ''یعبدون'' سے تفسیر کرکے اس طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ مافوق الاسباب غائبانہ حاجات میں پکارنا عبادت ہے، اس لئے اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔اور غیر اللہ کے لئے شرک ہے۔پکار کی دوسری قسم ماتحت الاسباب ہے، وہ غیر اللہ کے لئے جائز ہے، جیسا کہ ''و الرسول یدعوکم فی اخراکم'' اور ''لاتجعلوا دعاء الرسول'' میں ہے جیسا کہ تفصیل سے مذکور ہو چکا ہے، نیز تمام اہل لغت نے دعا کے معنی خواندن (پکارنا) سے کیئے ہیں، عبادت سے نہیں کیے، اور مفسرین کا کام لغوی معنی بیان کرنا نہیں، بلکہ ان کا کام تو مطلب اور تفسیر بیان کرنا ہے۔

(۷) اهْدِنَــــا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پہلی ایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سب کا پیدا کرنے والا اللہ تعالی ہے، اور پھر ہر چیز اور ہر جاندار کو رفتہ رفتہ حد کمال تک پہنچانے والا بھی وہی ہے، سارے عالم کا نظام بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، وہی متصرف و مختار ہے، اور پھر محاسبہ اعمال کے دن یعنی قیامت کے دن کا مالک بھی وہی ہے۔جب انسان ان چاروں حقیقتوں کا اعتراف کر لے، اور ان پر پختہ ایمان لے آئے، وہ بے ساختہ پکار اٹھے گا۔''ایاک نعبدو ایاک نستعین'' یہ دراصل بندوں کا اپنے رب سے عہد ہے کہ اے اللہ ہم صرف تیری ہی بندگی کریں گے، صرف تجھے ہی حاجات و مشکلات میں مدد کے لئے پکاریں گے، اس کے بعد'' اھدنا الصراط المستقیم'' میں اسی عہد پر استقامت کی دعا مانگی جا رہی ہے، مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ سیدھی راہ جو تو نے ہمیں دکھا دی ہے یعنی توحید اور صرف تیری عبادت و پکار اور صرف تجھی سے استعانت و استمداد کی راہ، اب اس پر ہمیں قائم رکھ، تادم آخر، ہمیں اس پر چلا ''الصراط المستقیم'' کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس سے ''ایاک نعبدو ایاک نستعین'' والا رستہ مراد ہے۔اس صورت میں ''الصراط'' کا الف لام عہد خارجی کے لئے ہوگا۔قرآن مجید کی دوسری کئی آیتوں میں ''صراط مستقیم'' سے توحید اور اللہ کی خالص عبادت و پکار کی طرف اشارہ ہے، ایک جگہ عیسی علیہ السلام کی زبان سے صراط مستقیم کا مفہوم یہ بیان فرمایا:

وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٣٦﴾ (مریم) اور بے شک اللہ ہی میرا پروردگار ہے اور وہی تمہارا پروردگار، اس لئے صرف اسی کی عبادت کرو، اور صرف اسے ہی پکارو، یہی ہے صراط مستقیم (سیدھی راہ) اور ایک جگہ تمام بنی آدم کو خطاب کرکے فرمایا:

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِيْ آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنْ اعْبُدُوْنِيْ هَذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾ (یس) اے اولاد آدم کیا میں نے تمہیں اس بات کی تاکید نہیں کی تھی کہ شیطان کی بندگی مت کرنا اور صرف میری ہی بندگی کرنا یہی ہے صراط مستقیم۔

الصراط المستقیم، کا دوسرا مطلب یہ ہے، کہ اس سے مطلق راہ حق مراد ہے، جو اسلام کے تمام احکام کو شامل ہے، مثلاً عبادات، معاملات، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات، احکام برزخ، احوال اخرت، وغیرہ، **و المراد به طریق الحق و هو ملة الاسلام (مدارک)** اور آیت، سورت انعام (۱۵۱) میں بھی اس طرف اشارہ ہے، وہاں پہلے اللہ تعالیٰ نے شرک سے منع فرمایا، پھر والدین سے احسان اور حسن سلوک کا حکم دیا، پھر قتل اولاد، قتل نفس محرمہ، اور دیگر تمام فواحش سے منع کیا، پھر یتیموں کے حق تلفی سے روکا۔ پھر ناپ تول پورا کرنے اور ہر حال میں عدل وانصاف کو قائم رکھنے کا حکم دیا۔ اور اخر میں جناب نبی کریم ﷺ کو اعلان کرنے کا حکم فرمایا: ''وَاَنَّ هَذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْه'' اور بے شک یہ میرا راستہ جو بالکل سیدھا ہے۔ سو اس راہ پر چلو، یہاں دین کے تمام احکام کو ''**صراط مستقیم**'' فرمایا

''**الصراط المستقیم**'' مرکب توصیفی ہے اور ''**المستقیم**'' اس چیز کو کہتے ہیں جو بالکل سیدھی ہو، اور اس میں کسی قسم کی کجی اور پیچ وخم نہ ہو، اور '' **الصراط المستقیم**'' (سیدھی راہ) توحید یا پوری ملت اسلام کو اس لئے فرمایا کہ توحید کی راہ بالکل سیدھی ہے۔ جس پر چلنے سے انسان اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اگر راہ توحید سے سرمو ہٹ گیا تو سیدھا جہنم میں پہنچے گا۔ اسی طرح ملت اسلام بھی سیدھی اور درمیانی راہ ہے، اس میں نہ افراط ہے نہ تفریط، جیسا کہ یہود نے عزیر علیہ السلام کے بارے میں افراط، اور مسیح علیہ السلام کے بارے میں تفریط سے کام لیا، اور عیسائیوں نے عیسی علیہ السلام کے حق میں افراط سے کام لیا۔ اور جناب محمد ﷺ کی شان میں تفریط کی، اسی طرح باقی احکام شرعیہ میں بھی، پہلی امتوں میں افراط وتفریط موجود تھی۔ لیکن شریعت محمدیہ **علی صاحبها الصلوات و السلام** ہر قسم کی اعتقادی اور عملی افراط وتفریط سے بالکل پاک ہے۔

لفظ ''ہدایت'' ہمیشہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے، مفعول اول کی طرف ہمیشہ بلا واسطہ حرف جر، اور مفعول ثانی کی طرف کبھی بواسطہ حرف جر مثلاً **یهدی من یشاء الی صراط مستقیم** (یونس: ۲۵) اور'' **وهدیناهم الی صراط مستقیم**''(انعام: ۸۸) اور کبھی بلا واسطہ حرف جر، مثلاً ''**وهدیناهما الصراط المستقیم**''(سورت صافات: ۱۱۸) اور ''**ویهدیک صراطا مستقیما** (فتح: ۲)''، لیکن استعمال کے ان دونوں صورتوں کے معنوں میں فرق ہے، پہلی سورت میں ہدایت کے معنی ''**اراءة الطریق**'' راہ نمودن یعنی راہ دکھانے کی ہونگے۔ اور دوسری صورت میں اس کے معنی، **ایصال الی المطلوب**، بمنزل رسانیدن، یعنی منزل مقصود تک پہنچانے کے ہوں گے۔ ''**اهدنا الصراط المستقیم**''، میں ''نا''، ضمیر منصوب متکلم مفعول اول ہے اور ''**الصراط المستقیم**''، مفعول ثانی ہے جو بلا واسطہ حرف

جراستعمال ہوا ہے۔اس لئے ہدایت کے معنی یہاں ایصال الی المطلوب (یعنی منزل مقصود تک پہنچا دینے) کے ہیں۔ یہاں چونکہ منزل مقصود صراط مستقیم ہے اس لئے معنی یہ ہونگے کہ ہم کو صراط مستقیم (سیدھی راہ) پر چلا، اور اس پر قائم رکھ۔جیسا کہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: (چلا ہم کو راہ سیدھی) اور یہاں یہ معنی موزون اور مناسب ہیں، کیونکہ جب ایک شخص" الحمدللہ" سے" ایاک نستعین" تک بیان کردہ تمام باتوں پر ایمان لے آتا ہےاور ان پر عامل ہوجاتا ہےتو"صراط مستقیم" تو اس نے دیکھ لیااور سیدھی راہ اسے مل چکی، اس لئے اب "اھدنا الصراط المستقیم "میں سیدھی راہ دیکھنے کی دعا نہیں کر رہا بلکہ وہ یہ التجا کر رہا ہے کہ: اے اللہ جو سیدھی راہ تو نے مجھے دکھادی ہے، اب اس پر مجھے قائم رکھ، ومعناہ ادم ھدایتنا (قرطبی).

ہدایت کی دو قسمیں ہیں، ایک فطری، دوسری کسبی۔فطری ہدایت تو انسان اور غیر انسان سب کے لئے عام ہے، اور اللہ کی طرف سے ہر ذی روح کو پیدائش کے ساتھ ہی عطا کیا جاتا ہےجیسا کہ سورت (طٰہٰ) میں ارشاد ہے: قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ أَعْطَی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَی ﴿۵۰﴾ اور اس نے ہر چیز کو صورت عطا کی اور پھر اس کی راہنمائی فرمائی۔

اور ایک جگہ فرمایا:"و الذی قدر فھدی" (الاعلی:٣) وہ جس نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کیا اور رہنمائی فرمائی۔ہم دیکھتے ہیں کہ مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی دانہ چگنے لگتا ہے، جانوروں کے بچے پیدا ہوتے ہی پستان مادر سے دودھ پینے لگتے ہیں۔آخر انہیں کون بتاتا ہے کہ یہ ہماری غذا ہے، اور اسے حاصل کرنے کا مقام اور طریقہ یہ ہے، یہ راہنمائی اللہ تعالی کی طرف سے ہوتی ہے، اور ہر ذی روح کی فطرت میں ودیعت ہوتی ہے۔

ہدایت کی دوسری قسم کسبی ہے جو اللہ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام اور کتب سماویہ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، پھر اس کے چار درجے ہیں: (١) انابت، یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنا، اور ضد وعناد کو چھوڑ کر راہ ہدایت کی تلاش وجستجو کرنا، یہ ہدایت صرف انہیں لوگوں کو ملتی ہے جن میں انابت الی اللہ اور تلاش حق کا جذبہ ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ویھدی الیہ من اناب (الرعد:٢٧) اور دوسری جگہ فرمایا: ویھدی الیہ من ینیب (شوری:١٣) یعنی اللہ تعالی ہدایت کی توفیق صرف ان لوگوں کو دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع اور انابت کرتے ہیں۔

(٢) ہدایت یعنی سیدھی راہ پانا، یہ انابت الی اللہ کے بعد حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔

(٣) استقامت: ہدایت کے بعد استقامت کا درجہ ہے۔جب ایک آدمی کو ہدایت حاصل ہوجاتی ہے، اور اسے صراط مستقیم مل جاتا ہے۔تو اب وہ اللہ کی ہدایت کے مطابق سیدھی راہ پر چلتا ہے، اور اس پر قائم ہوجاتا ہے ارشاد ہے:

''ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا''(حٰمٓ سجدہ: ۳۰) اس میں دوسرے اور تیسرے درجہ کا بیان ہے ''قالوا ربنااللہ ''میں ہدایت آ گئی۔اور''ثم استقاموا''میں استقامت۔

(۴)ربط القلب، راہ ہدایت اور صراط المستقیم پر استقامت کے بعد ربط القلب کا درجہ حاصل ہوتا ہے، یہ درجہ رسوخ ایمان اور یقین کی پختگی کا،سب سے اونچا اور بلند مقام ہے ،جب مومن کو ایمان ویقین کا یہ درجہ حاصل ہوجائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے راہ ہدایت سے نہیں ہٹا سکتی اور نہ اس کے ایمان ویقین کو متزلزل کرسکتی ہے۔ یہ درجہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔اصحاب کہف کو یہ درجہ حاصل تھا چنانچہ ارشاد ہے: إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَن نَّدْعُوَ مِن دُونِهِ إِلَهاً لَقَدْ قُلْنَا إِذاً شَطَطاً ﴿۱۴﴾ الکہف)۔ وہ چندنوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے۔اور ہم نے ان کی ہدایت میں ترقی کردی اور ان کے دل مضبوط کئے،اس ایت میں تین درجات کا ذکر ہے: آمنوا بربهم میں ہدایت فزدناهم هدیً میں استقامت اور و ربطنا علی قلوبهم ربط القلب کا ذکر ہے، ہدایت کا یہ درجہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی حاصل تھا،جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:﴿ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُوْلَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ﴾.(الحجرات:۷)

لیکن اللہ تعالی نے ایمان کو تمہارا محبوب بنادیا اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کردیا،اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو نفرت دے دی۔''اهد نا''میں ہدایت کی اخری دو درجے حاصل کرنے کی درخواست کی گئی ہے،یعنی استقامت اور ربط القلب کیونکہ انابت اور ہدایت تو پہلے حاصل ہوچکی ہے ،ہدایت کی طرح ضلالت کے بھی چار درجے ہیں، ان کا ذکر اگے آرہا ہے۔

(۸) ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنعَمتَ عَلَيْهِمْ ' یہ الصراط المستقیم سے بدل کل ہے اور بدل کا فائدہ یہ ہے کہ صراط مستقیم کی تفسیر اور تعین ہوجائے یعنی صراط مستقیم وہ راستہ ہے،جس پر وہ لوگ قائم رہے جو ''الذین انعمت علیهم'' کے مصداق ہیں، اور جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے انبیاء علیہم السلام،صدیقین،شہداء اور صالحین مراد ہیں۔جیسا کہ ایک دوسری ایت میں اس طرف اشارہ ہے:وَمَن يُطِعِ اللّهَ وَالرَّسُولَ فَأُوْلَـئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاء وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُولَـئِكَ رَفِيْقاً ﴿۶۹﴾ النساء)۔جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو ایسے اشخاص بھی ان لوگوں کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ تعالی نے انعام فرمایا ہے،یعنی انبیاء،=

غَيُـــرِ الــمَــغُــضُــوُبِ عَــلَيُهِــمُ وَلَا الــضَّـــآلِّيُــنَ ۝

نہ جن پرتیرا غضب نازل ہوا اورنہ گمراہ ہوئے .[۹]

=وصدیقین،اورشہداء،اورصالحین،اور یہ اشخاص بہت اچھے رفیق ہیں۔قـال الـجـمهـور من الـمـفسـريـن انـه ارادصـراط الـنبيـيـن و الصديقين و الشهداء و الصالحين ، وانتزعوا ذلک من قوله تعالى :وَمَن يُطِعِ اللّـهَ وَالـرَّسُـولَ فَـأُوْلَـئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاء وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُولَـئِكَ رَفِيْقاً۝۶۹ (قرطبی)۔

سوال: اگر ''الـصـراط الـمستقيم '' سےمندرجہ بالا چار گروہوں کی راہ مراد ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ ''اهـدنا الــصـــراط الـــمستـقيـم '' میں ان چاروں جماعتوں کے درجات حاصل کرنے کی درخواست کی گئی ہے،اوراس میں ''الـنبييـن'' کا درجہ بھی شامل ہیں،تو اس کے حاصل کرنے کی درخواست بھی اس میں شامل ہوگی۔اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب بھی درجہ نبوت حاصل کرنے کا امکان موجود ہے۔

جواب: اول تو یہی غلط ہے کہ''اہدنا الصراط المستقیم''میں چاروں جماعتوں کے درجات حاصل کرنے کی درخواست کی گئی ہے، بلکہ اس میں تو صرف ان جماعتوں کی راہ پر چلنے کی اور قائم رکھنے کی درخواست ہے نیز درخواست اودعا ہمیشہ ایسی چیز کے حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہے،جس کا حصول کسب اومحنت سے ممکن ہو،اور جس فضل وکمال کا حصول کسب اور محنت سے ناممکن ہو،اس کے لئے درخواست کرنا بالکل بے معنی اور عبث ہے،اس لئے اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ ''اهدنا الصراط الـمستيـم ''میں ان چاروں جماعتوں کے درجات حاصل کرنے کی درخواست کی گئی ہے،تو درجہ نبوت چونکہ کسب وریاضت سے حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ نبوت ایک محض وہبی چیز ہے،اوراس کے بارے میں قانون الٰہی یہ ہے''اللہ يـعـلـم حيث يجعل رسـالتـه'' (**الانعام**: ۱۲۴)، لہٰذا درخواست کا تعلق نبوت سے نہیں بلکہ درخواست صرف صدیقین شہداء اور صالحین کے کمالات کے لئے ہے۔

(۹) ﴿غَيْـرِ المَغضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّالِّيْنَ ﴾ یہ ''الذين انعمت عليهم'' سے بدل ہے، یا اس کی صفت ہےاور''ولا الـضـالـيـن''''غير المغضوب عليهم ''پرعطف ہےاور''لا''تاکید نفی کے لئے ہے، جولفظ غیر سے مفہوم

ہے: بدل من "الذين انعمت عليهم" اوصفة له، و"لا"مزيدة لتاكيدمافي "غير"من معنى النفي (مظهری) . رسول پاک ﷺ سے منقول ہے کہ "مغضوب علیھم" سے یہوداور''ضالین'' سے نصاری مراد ہیں،اسی طرح عبداللہ بن مسعودؓ وابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہیں (ابن جریر)۔

''غضب'' کے معنی شدید غصہ کے ہیں،اورایک نفسانی کیفیت ہے،لیکن اللہ تعالی کی صفات میں غضب کے معنی ارادہ عقوبت اورقصدسزا کے ہیں۔ومعنى الغضب فى صفة الله تعالى ارادته العقوبة،فهوصفة ذات، وارادة الله تعالى من صفات ذاته (قرطبی) اورسلف صالحین کے نزدیک کمایلیق بشانہ ہے۔

اور''ضلال'' کے معنی سیدھی راہ سے بھٹک جانااور ہدایت سے علیحدہ ہوکر چلنا. الضلال فى الدين الذهاب عن الحق (روح المعانی)۔ان ایتوں کا حاصل یہ ہے کہ،اے اللہ! ہم کوان لوگوں کی راہ پرقائم رکھ،جن پرتو نے انعام فرمایا۔اورجن پر نہ تیراغضب ہوا،اورنہ وہ گمراہ ہوئے ،جن لوگوں پر تیراغضب ہو،مثلاً یہود،اورجولوگ راہ حق سے گمراہ ہوئے ،مثلا نصاریٰ ان کی راہ سے ہم کو بچا،مغضوب علیہم کی تفسیر یہود سے اورضالین کی نصاری سے بطور تمثیل ہے۔یہ مطلب نہیں کہ مغضوب علیہم صرف یہود ہی ہیں اورضالین سے صرف نصاری ہی مراد ہیں،اس لئے یہودونصاری کے علاوہ مشرکین اورمنافقین بھی ان دونوں لفظوں میں داخل ہیں۔نبی کریم ﷺ کے وقت چونکہ یہودونصاری، مذہب اور خانقاہیت کے اجارہ دار تھے،اورساتھ ہی راہ حق سے گمراہ اور بھٹکے ہوئے تھے،اوراللہ تعالی کے قہروغضب کے مستحق تھے، اس لئے المغضوب عليهم اورالضالين کی تفسیر ان دونوں گروہوں سے کی گئی۔

ہدایت کی طرح گمراہی کے بھی چاردرجے ہیں:

(۱) **ریب وشک** یہ درجہ گمراہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے،پہلے آدمی کے دل میں توحیداور دین حق کے بارے میں شبہات وشکوک پیدا ہوتے ہیں،جواسے صراط مستقیم اورراہ ہدایت سے بھٹکاتے ہیں۔

(۲) ضلالت (گمراہی) توحیداوردین حق سے متعلق شکوک وشبہات کاازالہ نہ کیاجائے اوروہ کسی کے دل میں جاگزیں ہوجائیں،تو آدمی ضلالت اورگمراہی میں جاگرتاہے،اورراہ حق کوچھوڑ کر باطل کی راہ اختیارکرلیتاہے۔

(۳) جدال:ضلالت کے بعدجدال کادرجہ ہے گمراہی کے بعدگمراہ شخص اپنے باطل نظریات اورغلط عقائدکوحق اورصحیح ثابت کرنے کے لئے اہل حق سے جھگڑا اورمجادلہ ومنازعہ کرتاہےاورضدوعناد سے ہرحق بات کوردکردیتاہے۔

(۴) مہرجباریت یاطبع علی القلب یاختم علی القلب،گمراہی کے بعدجب آدمی حق کے مقابلہ میں جھگڑا اورجدال

شروع کرتا ہے اور تمام عقلی اور نقلی دلائل سے حق کے واضح اور ثابت ہو جانے پر بھی حق کو نہیں مانتا، اور اپنی ضد و عناد پر ڈٹا رہتا ہے، تو اب اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے، یعنی اس کے دل میں جو کفر و نفاق اور شرک ہے وہ دل سے باہر نہیں نکل سکتا، اور جو چیز اس کے دل سے باہر ہے یعنی ایمان و یقین اور توحید و اخلاص وہ اس کے دل میں داخل نہیں ہو سکتی، جب آدمی گمراہی کے اس درجے میں پہنچ جاتا ہے تو اس کا راہ راست پر آنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس درجہ میں اس سے ہدایت کی توفیق سلب کر لی جاتی ہے۔

شیخ حسین علی رحمۃ اللہ علیہ، اس کو مہر جباریت سے تعبیر فرماتے تھے، قران مجید میں یہ چاروں درجے کہیں جدا جدا اور کہیں دو دو یا اس سے زیادہ یکجا مذکور ہیں، سورۂ مومن، میں دو ایتوں کے اندر چاروں درجے ایک ساتھ مذکور ہیں۔

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُم بِهِ حَتَّى إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن يَبْعَثَ اللَّهُ مِن بَعْدِهِ رَسُولاً كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ (۳۴) . الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ كَبُرَ مَقْتاً عِندَ اللَّهِ وَعِندَ الَّذِينَ آمَنُوا كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾ یقیناً اس سے قبل یوسف علیہ السلام تمہارے پاس دلائل توحید و نبوت لے کر آ چکے تھے سو تم ان امور میں برابر شک میں رہے جو تمہارے پاس لائے تھے۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہوگئی تو تم کہنے لگے کہ بس اللہ اب ان کے بعد کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔ اس لئے اللہ تعالی حد سے تجاوز کرنے والوں، اور توحید میں شک کرنے والوں کو گمراہ کر دیتا ہے، جو محض ضد و عناد کی وجہ سے بلا کسی دلیل کے، جو ان کے پاس موجود ہو، اللہ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں، یہ کج بحثی اور جھگڑا اللہ تعالی کو بھی سخت ناپسند ہے، اور ایمان والوں کو بھی، اس لئے اللہ تعالی ہر مغرور اور جابر کے پورے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

اس ایت میں ''کذالک'' میں دونوں جگہ'' کاف ''تعلیلیہ ہے اور بمعنی لام ہے جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کر دیا گیا ہے، اس آیات میں چاروں درجات بالتدریج مذکور ہیں، پہلے وہ لوگ یوسف علیہ السلام کے لائے ہوئے دلائل توحید اور نبوت کے بارے میں ریب و شک میں پڑے رہے، اس وجہ سے گمراہ ہوئے، اور راہ ہدایت اور جادہ توحید سے بھٹک گئے ۔ اس کے بعد انہوں نے ضد و عناد سے جھگڑا اور مجادلہ شروع کر دیا اور توحید اور دین حق سے دور بھاگنے لگے، اس لئے اللہ تعالی نے ان کے دلوں پر مہر جباریت لگا دی۔ ضلالت کے یہ چار درجے ہدایت کے چاروں درجوں کے مقابلے میں ہیں اول: انابت کے مقابلہ میں ریب و شک دوم ہدایت کے مقابلے میں ضلالت سوم استقامت کے مقابلہ میں جدال

ومخاصمت چہارم ربط القلب کے مقابلہ میں طبع علی القلب۔

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ، میں ضلالت کے چاروں درجات مذکور ہیں پہلے تینوں درجے الضالین میں اور چوتھا درجہ مغضوب علیہم میں۔

(فــــوائد)

فائدہ اول:

اہل حدیث اور اہل رائے کے درمیان مسئلہ امین مختلف فیہ ہے، اہل حدیث کی تحقیق ہے، کہ جہری نمازوں میں امام اور مقتدی دونوں کو آمین بالجہر کہنی چاہئے۔ سری نمازوں میں آمین بالسر کہنے پر اجماع ہے۔ اہل رائے کا خیال ہے کہ جہری نمازوں میں امام اور مقتدی کو آمین خفیہ کہنی چاہئے۔ اس مسئلہ میں جانبین کے دلائل کا علمی و تحقیقی جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

حدیث اول: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **اذا امّن الامام فأمّنوا فانه من وافق تأمينه تأمين الملائكةغفر له ماتقدم من ذنبه** . یعنی جب امام آمین کہے، تو تم بھی آمین کہو، کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے موافق ہو جائے اس کے سابقہ گناہ معاف کر دئے جائیں گے ،(بخاری ر ح ۷۸۰ ومسلم ح ۴۱۰/۷۲)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امام جہر سے آمین کہے ۔امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ النیسابوری (متوفی ۳۱۱ھ) فرماتے ہیں: **فی قول النبی ﷺ ((اذا امّن الامام فأمّنوا))مابان وثبت أن الامام يجهربآمين ،اذمعلوم عند من يفهم العلم أن النبی ﷺ لا يأ مر المأموم أن يقول آمين عند تأمين الأمام الا والماموم يعلم أن الأمام يقوله ، ولوكان الأمام يسرّ بآمين، لايجهربه، لم يعلم المأموم أن امامه قال آمين اولم يقله.ومحال أن يقال للرجل اذا قال فلان كذا فقل مثل مقالته وأنت لاتسمع مقالته ،وهذاعين المحال ،ومالايتوهمه عالم أن النبی ﷺ يأمرالمأموم أن يقول آمين اذا قاله امامه وهو لايسمع تأمين امامه.**

نبی کریم ﷺ کے فرمان ''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو'' سے واضح طور پر یہ ثابت ہوا، کہ امام کو جہر سے آمین کہنی چاہیے، کیونکہ ہر صاحب علم سمجھ رکھتا ہے کہ نبی ﷺ مقتدی کو امام کی آمین کے وقت آمین کہنے کا حکم نہیں فرماتے مگر

مقتدی امام کی آمین کو جانتا ہے۔اور اگر امام آمین بالسّر کہے بالجہر نہ کہے تو مقتدی کو معلوم نہیں ہوسکتا کہ امام نے آمین کہی ہے یا نہیں کہی ہے، اور یہ محال ہے کہ آدمی سے کہا جائے کہ جب فلاں یہ کہے تو تم بھی اسی طرح کہو، حالانکہ تم اس کی بات نہیں سن رہے ہو، یہ قطعی طور پر محال ہے اور کوئی عالم بھی اس کا تصور نہیں کرسکتا کہ نبی ﷺ مقتدی کو آمین اس وقت کہنے کا حکم دیں جب امام آمین کہے اور مقتدی امام کی آمین نہ سن رہا ہو، (صحیح ابن خزیمہ ۱/۲۸۶ ح ۵۷۰)۔

کئی قرائن امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے اس بیان کی تائید کرتے ہیں۔

(۱) ابوہریرہؓ کی دوسری مرفوع حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس حدیث میں آمین بالجہر مراد ہے، مثلاً حدیث نعیم المجمر، حدیث اسحاق بن ابراھیم الزبیدی وغیرہ کا۔

(۲) منصور بن میسرہ سے روایت ہے کہ میں نے ابوہریرہؓ کے ساتھ نماز پڑھی، جب آپ نے ﴿غیر المغضوب علیھم ولاالضآلین﴾ کہا تو آمین کہی یہاں تک کہ ہمیں سنا دیا، آپ کے پیچھے جو نماز پڑھ رہے تھے انہوں نے بھی آمین کہی (مصنف عبدالرزاق ۲/۹۵،۹۶ ح:۲۶۳۴)۔

اس اثر کے سارے راوی ثقہ ہیں، سوائے منصور بن میسرہ کے (جو تابعی ہے) اگر یہ تصحیف نہیں ہے تو اس کے حالات مجھے معلوم نہیں۔

خالد بن ابی عزہ کے بارے میں ظفر احمد تھانوی لکھتے ہیں: **فلم اقف علیٰ ترجمته ولکنه ثقة علی قاعــــدة ابن حبان**: مجھے اس کے حالات نہیں ملے لیکن وہ ابن حبان کے قاعدہ پر ثقہ ہیں۔(اعلاء السنن ۱/۲۷۷) دیوبندیوں کے نزدیک قرون ثلاثہ میں کسی کا مجہول ہونا چنداں مضر نہیں۔ **والجھالة فی القرون الثلاثة لایضر عندنا**: (اعلاء السنن ۳/۱۶۱) اور قرون ثلاثہ میں مجہول ہونا ہمارے نزدیک مضر نہیں ہے۔

اور حافظ ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا: **اخبرنا یحیٰ بن محمد بن عمر و بالفسطاط قال حدثنا اسحاق ابن ابراھیم بن العلاء الزبیدی قال حدثنا عمرو بن الحارث قال حدثنا عبد اللہ بن سالم عن الزبیدی قال أخبرنی محمد بن مسلم عن سعید بن المسیب وأبی سلمة عن ابی ھریرةؓ قال کان رسول اللہ ﷺ اذا فرغ من قراء ة أم القرآن رفع صوته وقال آمین۔**

یحیٰ بن محمد بن عمرو نے ہمیں حدیث بیان کی (انہوں نے کہا) ہمیں اسحاق بن ابرہیم بن العلاء الزبیدی نے حدیث بیان کی (انہوں نے کہا) ہمیں عمرو بن حارث نے حدیث بیان کی انہوں نے عبداللہ بن سالم عن زبیدی سے

حدیث بیان کی (کہا) مجھے محمد بن مسلم (الزہری) نے عن سعید بن مسیّب عن ابی سلمۃ (کے واسطے) سے حدیث بیان کی کہ ابوہریرہؓ سے روایت ہے جب رسول اللہ ﷺ سورۃ فاتحہ کی قراءت سے فارغ ہوتے تو اپنی اواز بلند کرتے ،اورفرماتے آمین ۔(صحیح ابن حبان ۳/۱۴۷ح ۱۸۰۳،مصنف عبدالرزاق ۲/۹۷)۔

حدیث دوم: ابی ہریرۃؓ (فعلی) امام نسائی نےنقل کیاہے کہ :**اخبرنا محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم عن شعیب حدثنا اللیث حدثنا خالد عن ابی ھلال عن نعیم المجمر قال: صلیت وراء ابی ھریرۃ فقرأ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ثم قرأ بأم القران حتیٰ بلغ غیر المغضوب علیھم ولاالضآلین فقال: آمین، فقال الناس آمین ویقول کلما سجد :اللہ اکبر واذا قام من الجلوس فی الاثنتین قال: اللہ اکبر واذا سلم قال: والذی نفسی بیدہ انی لاشبھکم صلوٰۃ برسول اللہ ﷺ:**

نعیم المجمر (تابعی) سے روایت ہے کہ میں نے ابوہریرہؓ کے پیچھے نماز پڑھی۔پس آپ نے **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم** پڑھی پھرآپ نےسورۃ فاتحہ پڑھی جب آپ نے ﴿**غیر المغضوب علیھم ولاالضآلین**﴾ پڑھاتو آمین کہی اورلوگوں نے بھی آمین کہی ،جب آپ سجدہ کرتے تواللہ اکبر کہتے اور جب دورکعتوں سے اٹھتے تو اللہ اکبر کہتے پھر فرماتے :اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ،میں تم سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مشابہ ہوں ۔(سنن نسائی ۲/۱۳۴ح ۹۰۵)۔

حدیث سوم علیؓ: **حدثنا عثمان بن ابی شیبۃ ثنا حمید بن عبدالرحمٰن ثنا ابن ابی لیلیٰ عن سلمۃ بن کھیل عن حجیۃ بن عدی عن علیؓ قال سمعت رسول اللہ ﷺ اذا قال ولاالضآلین قال آمین.**

یعنی علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا،آپ ﷺ نے جب ولاالضآلین کہاتو آمین کہی ۔[رواہ ابن ماجۃ فی سننہ ۱/۲۷۸ح ۸۵۴] اوربیھقی نے بھی خلافیات میں نقل کیاہے ۔جس کی عبارت یہ ہے: **قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول امین أذاقرأ، غیر المغضوب علیھم ولا الضالین''**

حدیث چہارم: عبداللہ بن زبیرؓ: **عبدالرزاق عن ابن جریج عن عطاء قال قلت له أکان ابن الزبیر یؤمّن علی اثر ام القرآن ؟قال نعم ،ویؤمّن من وراہ حتیٰ ان للمسجد للّجۃ :** ابن جریج نے کہامیں نے (عطاء بن ابی رباح) سے پوچھا،کیاابن زبیرؓ فاتحہ کے اختتام پرآمین کہتے تھے؟ توانھوں نے کہاہاں اورجوان کے پیچھے

(نماز پڑھتے تھے)وہ بھی، یہاں تک کہ مسجد گونج اٹھتی تھی۔ (مصنف عبدالرزاق۹۶/۲،۹۷، ومصنف ابن ابی شیبۃ۴۲۶/۲)۔

حدیث پنجم :عکرمہؒ(عن الاصحاب): ابن ابی شیبۃ نے کہا:حدثنا وکیع قال ثنافطرقال سمعت عکرمةؓ یقول أدرکت الناس ولهم زجة [وفی المحلیٰ۲۶۴/۳،،ضجة]فی مساجدهم بآمین اذاقال الامام غیر المغضوب علیهم ولاالضآلین ۔یعنی وکیع نے ہمیں حدیث بیان کی (کہا) فطر نے ہمیں حدیث بیان کی (کہا) میں نے عکرمہؒ(تابعی) سے سنا، وہ کہہ رہے تھے، میں نے لوگوں کو(ان کی مساجد میں) اس حال میں پایا کہ جب امام﴿غیر المغضوب علیهم ولاالضآلین﴾ کہتا تو لوگوں کے آمین کہنے سے مساجد گونج اٹھتی تھیں۔(مصنف ابن ابی شیبۃ۴۲۵/۲):

حدیث ششم:ام الحصین رضی الله عنه : طبرانی نے فرمایاحدثناابراهیم بن هاشم البغوی ثنا هدبة بن خالدثناهارون بن موسی النحوی ثنااسمٰعیل بن مسلم عن ابی اسحاق عن ابن ام الحصین عن جدته ام الحصین انها کانت تصلی خلف النبی ﷺ فی صف من النساء فسمعته یقول:الحمدلله رب العٰلمین، الرحمٰن الرحیم، مٰلک یوم الدین، بلغ (ولا الضالین) قال:"آمین"حتی سمعته وانافی صف النساء، وکان یکبر اذاسجدواذارکع.(معجم الکبیر:۱۵۸/۲۵). یعنی میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتی تھی (عورتوں کی صف میں) تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا،الحمدلله رب العٰلمین الخ ۔یہاں تک کہ ولا الضالین پڑھا،اس کے بعد آمین بلند آواز سے پڑھا یہاں تک کہ میں نے سنی اور میں عورتوں کی صف میں تھی۔اور رسول اللہ ﷺ جب سجدہ اور رکوع کو جاتے تو اللہ اکبر پڑھتے۔

حدیث ہفتم: حدیث عطاءؒ: ابن ابی شیبہ نے کہا:حدثنا وکیع عن عطاء قال:لقدکان لنادوی فی مسجدناهذابآمین، اذاقال الامام غیر المغضوب علیهم ولا الضالین. اوراسی روایت کوامام بیہقی نے اس الفاظ سے نقل کیا ہے۔ عن خالد بن ایوب عن عطاء قال ادرکت مأتین من اصحاب النبی ﷺ فی هذا المسجداذاقال الامام غیر المغضوب علیهم و لا الضآلین سمعت لهم زجة بآمین .(۵۹/۲).یعنی عطاء بن ابی رباحؒ نے کہا: کہ ہمارے مسجد میں جب امام غیر المغضوب علیهم ولا الضالین.

کہتا تو بھنبھناہٹ ہوتی تھی۔

حدیث ہشتم: وائل بن حجرؓ: امام ترمذی نے کہا: حدثنا بندار (محمد بن بشار) حدثنا یحیٰ بن سعید وعبدالرحمٰن بن مهدی قالا: حدثنا سفیان عن سلمة بن کهیل عن حجر بن عنبس عن وائل بن حجر قال سمعت رسول اللهﷺ ﴿ قرأ غیر المغضوب علیهم ولاالضآلین ﴾ فقال (آمین) ومدبها صوته (قال) وفی الباب عن علیؓ وابی هریرةؓ قال ابوعیسیٰ ،، حدیث وائل بن حجرؓ حدیث حسن ،،

بندار نے ہمیں حدیث بیان کی (انھوں نے کہا) ہمیں یحیٰ بن سعید اور عبدالرحمٰن بن مھدی نے حدیث بیان کی (انھوں نے کہا) ہمیں سفیان نے: عن سلمة عن حجر بن عنبس سے حدیث بیان کی کہ وائل بن حجرؓ نے فرمایا میں نے نبی کریمﷺ سے سنا، آپ نے ﴿ غیر المغضوب علیهم ولاالضآلین ﴾ پڑھا پھر کہا آمین، اور اپنی آواز کو اس کے ساتھ کھینچا، امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے (جامع ترمذی ۲/۲۷، ۲۸ ح ۲۴۸)۔

اس حدیث میں ذرا تفصیل سے تحقیق کرتے ہیں، اسلئے کہ یہ حدیث جانبین کا مستدل ہے، اختلاف سفیانؒ اور شعبہؒ کی وجہ سے: سفیان سے یہ روایت ابن مھدی، یحیٰ بن سعید المحاربی، اور وکیع نے ''مدبها صوته'' اور ''یمد بها صوته'' کے الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے، محمد بن کثیر، محمد بن یوسف الفریابی، قبیصہ اور ابوداؤد الحفری نے ''رفع بهاصوته ،، اور ''یرفع بها صوته'' کے الفاظ سے بیان کی ہے، لھذا دونوں روایتیں صحیح ہیں اور ایک دوسرے کی توضیح کرتے ہیں۔ محمد ابن کثیر کی روایت سنن دارمی ۱/۲۸۴، میں اور سنن ابی داؤد: ۱/۱۴۲ ۵، ح ۹۳۲، میں موجود ہے۔ محمد ابن کثیر کی متابعت دو ثقہ راویوں نے کی ہے۔ (۱) ابوداؤد الحفری (السنن الکبریٰ: ۲/۵۷) ان کی روایت میں ''رفع بهاصوته'' کے الفاظ ہیں۔ ابوداؤد عمر بن سعد الحفری، صحیح مسلم کا راوی اور ثقہ عابد تھا۔ (التقریب: ۴۹۰۴).

(۲) الفریابی نے ''یرفع صوته'' کے الفاظ روایت کئے ہیں۔ [سنن دارقطنی: ۱/۳۳۳] محمد ابن یوسف بن واقد الفریابی صحاح ستہ کے راوی اور الامام الحافظ شیخ الاسلام تھے۔ [النبلاء: ۱۰/۱۱۴] آپ جمہور کے نزد ثقہ ہیں، ابن معین وغیرہ نے آپ کو ثقہ کہا ہے۔

(۳) قبیصہؒ نے بھی ''یرفع بها صوته'' کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ [المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۲/۴۴ ح ۱۱۱].

شعبہ کی روایت

سلمہ بن کہیل سے حجر بن عنبسہ اورعلقمہ بن وائلؒ کی سند کیساتھ امام شعبہ نے جو روایت بیان کی ہے۔ وہ سفیان ثوریؒ اورالعلاء بن صالح وغیرہ کی روایت کیخلاف ہے ، یہ روایت[مسند احمد ۳۱۶/۴،سنن دارقطنی :۳۳۴/۱،بیھقی : ۵۷/۲ ،۵۸، مسند طیالسی:۱۰۲۴،ابن حبان:۱۴۶/۳ ، ح:۱۸۰۲،اورحاکم :۲۳۲/۲ وغیرہ میں ہے]شعبہ سے محمد بن جعفر اور یزید بن زریع نے ''اخـفـیٰ بھـا صوتـہ'' (آپ نے اپنی آواز پست رکھی) کے الفاظ بیان کئے ہیں۔عبدالرحمٰن بن مہدی، ابوداؤدطیالسی،عمر بن مرزوق،اورسلیمان بن حرب،وغیرہ نے ''خـفـض بھاصوتہ ''اور''یـخفض بھاصوتہ'' (اپنی آواز پست رکھی) کے الفاظ بیان کئے ہیں۔ابوالولید الطیالسی سے اختلاف ہے ان کے شاگرد اسماعیل بن اسحاق القاضی (ثقہ بالاجماع) کی روایت میں؛؛یـخفض بھاصوتہ ، ، کے الفاظ ہیں۔حاکم اورذہبی نے اس روایت کی تصحیح کی ہے،ابرہیم بن مرزوق (متکلم فیہ) کی روایت میں'' رافـعـاًبھـا صوتـہ '' کے الفاظ ہیں۔ابن مرزوق کی روایت شاذ اور اسماعیل القاضی کی روایت محفوظ ہے۔شعبہ سے عبدالصمد اوروہب بن جریر نے یہ حدیث بیان کی ہے،اس میں خفض وغیرہ الفاظ نہیں بلکہ قال آمین(آپ نے آمین کہی) کے الفاظ ہیں۔

(صحیح ابن حبان ۱۴۶/۳) میں حافظ ابن حبان نے اس پر''بـاب أن یـجھر بآمین'' باندھا ہے۔عبدالصمد بن عبدالوارث صحاح ستہ کے راوی اورصدوق ثبت ہیں۔ (التقریب ۱۰۸۰) وہب بن جریر بھی کتب ستہ کے راوی اور ثقہ ہیں۔(التقریب ۷۴۷۲)اوران دونوں تک سند بالکل صحیح ہے ،معلوم ہوا کہ شعبہ سے روایت میں ان کے شاگردوں کا اختلاف ہے،شعبہ بن الحجاج صحاح ستہ کے راوی،ثقہ،حافظ اور متقن تھے۔(التقریب ۲۷۹۰) مگر جمھور غیر جانبدار محدثین نے متعدد علل کی وجہ سے آپ کی اس روایت کو خطا (غلط)اورسفیان کی روایت کو صواب قرار دیا ہے۔حاکم اور حافظ ذہبی نے اگرشعبہ کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے تو امام بخاری اور امام ابوزرعہ نے شعبہ کی حدیث کو خطا اورثوری کی حدیث کو اصح قرار دیا ہے. (العلل الکبریٰ للترمذی:۲۱۷/۱) امام دارقطنی نے کہا:یـقـال أنه وھم فیه لأن سفیان الثوری ومحمد بـن سـلـمةبـن کھیل وغیرھمارووا عن سلمةفقالوا:ورفع صوته بآمین وھو الصواب (سنن دارقطنی: ۳۳۴/۱ ح ۱۲۵۶)امام بیھقی نے کہا:وقـد اجـمـع الحفاظ :محمدبن اسماعیل وغیرہ علیٰ أنه أخطافی ذالک(معرفۃ السنن والا ثار ۲۱۰/۱).

☆سفیان ثوری کی روایت کوشعبہ کی روایت پر کئی لحاظ سے ترجیح حاصل ہے:

(۱) **سفیان ثوری کی العلاء بن صالح(ثقه)** نے متابعت کی ہے،اور شعبہ کا کوئی متابع نہیں۔

(۲) سفیان کی روایت کے دوشاہد ہیں،اور شعبہ کا کوئی شاہد نہیں۔

شاہدنمبر۱: کہا جاتا ہے علقمۃ بن وائل نے بھی یہ حدیث: **یجھر بآمین**: اپنے والد وائل بن حجرؓ سے بیان کی ہے(مسند احمد۴/۳۱۸،السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴/۵۸)علقمۃ بن وائل صحیح مسلم کے راوی ہیں،ابن سعد اور ابن حبان نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے۔(التہذیب:۷/۲۴۷)ناقابل تردید دلائل سے ثابت ہے کہ آپ نے اپنے والد سے احادیث سنی ہیں۔(صحیح مسلم ۱۶۹۸۰، اور ۴۳۸۷،ملاحظہ کیجئے)علقمہ سے ابواسحاق(عمرو بن عبداللہ الہمدانی)راوی ہیں،آپ کتب ستہ کے راوی اور ثقہ عابد تھے۔آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے۔(التقریب:۵۰۶۵)آپ مدلس بھی تھے۔(طبقات المدلسین: ۳/۹۱،ملاحظہ کیجئے)آپ سے شریک نے یہ حدیث بیان کی ہے،آپ سے شریک کی روایت قبل از اختلاط ہے کیونکہ وہ آپ سے **قدیم السماع** تھے۔(میزان الاعتدال: ۲/۲۷۳)سماک نے ابواسحاق کی متابعت کی ہے(کتاب التمیز لمسلم:۱۰۶،امام مسلم نے فرمایا ہے: **اخطأ شعبة فی هذه الروایة حین قال: واخفی صوته،وسنذکر انشاء الله روایة من حدث عن شعبة فیهافاصاب ثم ذکر الخ**)سماک صحیح مسلم کے راوی اور صدوق تھے،مگر عکرمہ سے ان کی روایت میں خاص کر اضطراب ہے،اور آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے اور تلقین قبول کر لیتے تھے۔(التقریب:۵۰۶۵).

شریک بن عبداللہ القاضی صحیح مسلم کے راوی ہیں،**صدوق یخطئی کثیراًتغیر حفظه منذولی القضاء بالکوفة وکان عادلاً فاضلاًعابداًشدیداًعلیٰ اهل البدع**،، (**التقریب**:۲۷۹۷)یعنی منصب قضاء پر فائز ہونے کے بعد ان کا حافظہ کمزور پڑ گیا تھا۔ایسے راوی سے روایت متابعات میں جب کہ اصل صحیح یا حسن ہو تو پیش کی جاسکتی ہے۔شریک سے اسود بن عامر(ثقہ)نے اور ان سے احمد بن حنبل وغیرہ نے یہ حدیث بیان کی ہے۔

شاہدنمبر۲: کہا جاتا ہے کہ عبدالجبار بن وائل نے بھی یہ حدیث اپنے والد سے آمین بالجھر کے مفہوم کے ساتھ بیان کی ہے۔ (سنن ابن ماجۃ :۸۵۵،مصنف ابن ابی شیبۃ:۲/۴۲۵ح۷۹۵۹ ،مسند احمد۴/۳۱۵ح۱۸۸۴۰، ۱۸۸۴۱،سنن دارقطنی :۱/۳۳۴ح:۱۲۵۹،نسائی بحوالہ نصب الرایہ:۱/۳۱۱)عبدالجبار بن وائل صحیح مسلم کے راوی اور ثقہ تھے ان کے والد سے ان کی روایت مرسل ہے۔(التقریب:۳۷۴۴)

دیوبندیوں کے نزدیک مرسل حجت ہے۔ (احسن الکلام: ۱/۲۶۲) دیگر محدثین کے نزدیک مرسل ضعیف ہوتی ہے مگر صحیح وحسن لذاتہ کی تائیداوراعتضاد کی صورت میں اسے شواہد میں پیش کیا جا سکتا ہے۔عبدالجبار سے ابواسحاق وغیرہ نے یہ حدیث بیان کی ہے، ابواسحاق سے زہیر، یونس بن ابی اسحاق، زید بن ابی انیسہ، اورابوبکر بن عیاش نے یہ حدیث بیان کی ہے۔زہیر ثقہ ثبت ہیں، مگران کا سماع ابواسحٰق سے آخری عمر کا ہے، آپ کتب صحاح ستہ کے راوی ہیں۔(التقریب : ۲۰۵۱) یونس صحیح مسلم کے راوی اور جمہور کے نزدیک ثقہ اورصدوق ہیں، آپ کو کچھ اوہام بھی ہوئے ہیں۔حافظ ذہبی نے کہا؛؛بل هو صدوق لابأس به،،(میزان الاعتدال: ۴/۴۸۳) زید کتب ستہ کے راوی اور ثقہ تھے۔(التقریب: ۲۱۱۸) ابوبکر بن عیاش قول راجح میں جمہور کے نزدیک ثقہ وصدوق ہیں لہذا حسن الحدیث ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے نور العینین مطالعہ کیجئے (طبع جدید: ۱۲۸)۔

(۳) جمہور محدثین نے شعبہ کی روایت کو خطأ اور ثوری کی روایت کو صواب قرار دیا ہے۔

(۴) شعبہ کی روایت میں اضطراب ہے، یہ بات ابوبکر الاثرم نے کہی ہے جبکہ سفیان کی روایت میں اضطراب نہیں ہے (تلخیص الحبیر :۱/۲۳۷)۔

(۵) محدثین کا قاعدہ اور ضابطہ ہے کہ سفیان اور شعبہ کی روایت میں جب بھی اختلاف ہوتو سفیان کی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔امام بیہقی نے کہا:لااعلم اختلافاًبین اهل العلم بالحديث أن سفيان وشعبةاذا اختلفافالقول قول سفيان.

علم حدیث سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جب سفیان اور شعبہ کے مابین اختلاف ہوتو سفیان کا قول راجح ہوگا۔(اعلام الموقعین: ۲/۳۹۶،عون المعبود: ۳/۲۰۷، الخلافيات للبيهقي: ۱/۵۰) یحیٰ القطان نے کہا ہے: جب شعبہ سفیان کی مخالفت کرے تو میں سفیان کے قول کو لیتا ہوں۔ (الجرح والتعديل: ۴/۲۲۳، ۲۲۴ . وسنده صحيح. تهذيب التهذيب :۴/۱۰۱) یعنی حدیث کی روایت میں، نیز ملاحظہ فرمائیں (شرح علل الترمذی لابن رجب : ۱/۱۵۶، ۱۷۷)

(۶) وائل بن حجرؓ کی روایت (جو کہ ثوری کی سند کے ساتھ ہے) کے دیگر صحابہ کرام سے کئی روایات بھی شاہد ہیں، جب کہ شعبہ کی روایت کا کوئی شاہد نہیں ہے۔دونوں روایات کی تطبیق علماء احناف کے الفاظ سے۔

(۱) ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:ولو كان الي فی هذا شئ لوفقت بأن رواية الخفض يراد بها عدم القرع

العنيف ،ورواية الجهر بمعنى قولها في زير الصوت وذيله يدل على هذا ما في ابن ماجة،كان ﷺ ﴿اذاتلا غير المغضوب عليهم ولاالضآلين﴾ قال آمين حتى يسمع من في الصف الاول فيرتج بهاالمسجد، ابن ماجه: ٢٦٢/١ ،برقم: ٨٥٢، وارتجاجه اذاقيل في اليم فانه الذى يحصل عنه دوى كما يشاهد في المساجد ،بخلاف ماذاكان بقرع ،وعلى هذافينبغي أن يقال على هذا الوجه لا بقرع كما فعله بعضهم (فتح القدير : ١/ ٣٠٢).

(٢) شاہ انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں: بقي اختلاف سفيان وشعبة في حديث وائلؓ فوجهه عندى أنه من باب حفظ كل ما لم يحفظه الآخر والحديث يسقط علىٰ مذهب الشافعية ، وكان النبى ﷺ جهر فيها بالتأمين دون جهر الفاتحةوهومذهب الامام الشافعيؒ،فكان في تأمينه جهر وخفض معاً،الجهر في نفسه والخفض بالنسبةالى الفاتحة ،فمايرويه شعبةؓ ايضاًصحيح ،ومايؤدّيه سفيانؓ ايضاًصحيح الا ان كلاهمايؤديان حصةمن المراد، فجهره ،أداه سفيانؓ ،وخفضه ،بالنسبة الى الفاتحة، ذكره شعبة ، والأمران صحيحان هٰذاهوالرأى عندى والناس حملوه على الاختلاف فا ضطر كل الى اعلال ماعندالآخر ،ولاحاجة اليه عندى :فيض البارى: ٢٩٥/٢ .

(٣) ان دونوں کی تطبیق کے بعد مولانا عبدالحئی لکھنویؒ کی توجیہ نقل کرتے ہیں:

قلت :لقد طفنا كماطفتم سيننا بهٰذاالبيت طرااجمعينـــــــــا

فوجدنابعد التأمل والامعان القول بالجهربآمين هوالاصح لكونه مطابقالماروى عن سيد بنى عدنان ،وروايةالخفض عنه ﷺ ضعيفة لاتوازى روايات الجهر،ولو صحت وجب ان تحمل على عدم القرع العنيف كمااشار اليه ابن الهمام ،واى ضرورة داعية الى حمل روايات الجهر على بعض الاحيان اوالجهر للتعليم مع عدم ورود شئى من ذالک في رواية ،والقول بأنه كان في ابتداء الأمر اضعف لان الحاكم قد صححه من روايةوائل بن حجرؓ وهوانما اسلم في اوخرالامر كماذكره ابن حجر في فتح البارى.واما اثر ابراهيم النخعى ونحوه فلاتوازى الروايات المرفوعة والله اعلم[السعاية: ١٧٦/٢].

مذکورہ عبارات سے ان علماء کا مقصد ظاہر ہے کہ حدیث وائل بن حجرؓ میں شعبہ اور سفیان کا جو اختلاف ہے یہ اخفا

اور جہر کانہیں بلکہ سفیان کا مقصد یہ ہے کہ آمین فی نفسہ جہر سے تھا جبکہ شعبہ کا مقصد یہ کہ بنسبت فاتحہ آپ ﷺ نے آمین پست اواز سے کہی، تو ان علماء نے دونوں روایتوں کا تطبیق بھی کیا، تعارض کو دفع کیا اور یہ بھی ثابت کیا کہ آمین بالجہر صحیح سنت سے ثابت ہے۔ اور ان علماء کے قول کا تائید حدیث ابومحذورہؓ میں موجود ہے جو کہ ابوداؤد نے نقل کیا ہے: قال قلت یارسول اللہ علمنی سنة الآذان قال فمسح مقدم رأسه قال تقول اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، ترفع بھا صوتک، ثم تقول اشھدان لااله الا اللہ، اشھدان لااله الا اللہ، اشھدان محمداً رسول اللہ، اشھدان محمداً رسول اللہ، تخفض بھا صوتک، الحدیث سنن ابی داؤد: ۱۳۵/۴، مع المنھل

یعنی میں نے کہا یارسول اللہ مجھے اذان سکھلاؤ کیونکر کہتے ہیں، آپؐ نے میرے سر پر آگے کی جانب ہاتھ پھیرا، اورفرمایا: اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، بلند آواز سے کہہ: پھر آہستہ سے کہہ: اور پھر بلند آواز سے کہہ: اشھدان لااله الااللہ، اشھدان لااله الااللہ، اشھدان محمدارسول اللہ، اشھدان محمدارسول اللہ، الحدیث۔

جبکہ یہی معنی حدیث ابی قتادہ میں بھی مذکور ہے کہ، عن ابی قتادہؓ ان النبی ﷺ خرج لیلة فاذاھو بابی بکرؓ یصلی یخفض من صوته، قال ومر بعمر بن الخطابؓ وھو یصلی رافعا صوته، قال فلما اجتمعا عند النبی ﷺ قال النبی ﷺ یاابابکر مررت بک وانت تصلی تخفض صوتک، قال قد اسمعتُ من ناجیت یارسول اللہ، قال وقال لعمر مررت بک وانت تصلی رافعا صوتک، قال فقال یارسول اللہ اوقظ الوسنان واطرد الشیطان. زاد الحسن فی حدیثه فقال النبی ﷺ یاابابکر ارفع من صوتک شیئا وقال لعمر اخفض من صوتک شیئا. ابوداود: باب رفع الصوت بالقرأة فی صلاة اللیل: ۱/ ۵۴۰ (مترجم).

ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک شب کو نکلے انہوں نے ابوبکرؓ کو دیکھا چپکے چپکے نماز پڑھ رہے ہیں، اور عمرؓ کو دیکھا بلند آواز سے قرأت کر رہے ہیں، جب دونوں (ابوبکرؓ وعمرؓ) رسول اللہ کے پاس آئے، آپؐ نے پوچھا اے ابوبکر میں جو تمہارے پاس گیا تو دیکھا تم چپکے چپکے نماز پڑھ رہے تھے؟ انہوں نے کہا یارسول اللہ میں اس کو سنا تا تھا جو کانا پھوسی بھی سن لیتا ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کو) پھر آپؐ نے فرمایا اے عمر میں جو تمہارے پاس گیا تو دیکھا تم بلند آواز سے پڑھ رہے تھے؟ انہوں نے کہا یارسول اللہ میں سوتے کو جگا تا تھا، اور شیطان کو بھگا تا تھا (یعنی پکار کر پڑھنے سے یہ غرض تھی

کہ جولوگ سورہے ہیں نماز کونہیں اٹھے وہ آواز سن کر چونک جاویں۔حسن کی روایت میں اتنی زیادہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:اے ابوبکرتم اپنی آواز تھوڑی بلند کرو،اے عمرتم اپنی آواز تھوڑی پست کرو۔

توان دونوں حدیثوں سے بھی معلوم ہوا کہ خفض کا معنی پست آواز یعنی معمولی جہر ہے جبکہ محققین علماء کا بھی یہ قول ہے کہ آمین زیادہ اونچی آواز سے نہیں کہنا چاہئے۔بس اتنا کہ بعد والی صف اس کو سنے جیسا کہ حدیث میں ہے:

چند غلط فہمیوں کا ازالہ:

(۱) بعض لوگوں نے کہا: آمین دعاءوذکر ہے،اوردعاء وذکر میں اصل اخفاء ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿**اُدعـــوا ربکم تضرعاوخفیة انه لایحب المعتدین**﴾اعراف:۵۵۔

ترجمہ: اپنے رب سے عاجزی اورآہستگی کے ساتھ دعا کیا کرو،بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتے۔(**اظهار التحسين في اخفاء التأمين**: ۱۵؛۵۴).

جواب(۱)اس آیت کے معنی ہماری تحقیق کے مطابق آج تک کسی مستند مفسر نے بھی خفیہ آمین کہنے کے نہیں کئے۔جیسے :**تفسیر ابن جریر ،تفسیر ابن ابی حاتم ،تفسیر ابن کثیر،تفسیر ابن جوزی ،تفسیر معالم التنزیل ،تفسیر بیضاوی ،تفسیر کبیر ،تفسیر مدارک،تفسیر جلالین ،تفسیر فتح البیان** وغیرہ ملاحظہ کیجئے،اور اس کے ساتھ کتاب(**الظفر المبین فی رد مغالطات المقلدین**)بھی ملاحظہ ہو،اسلئے یہ مفہوم ایک خودساختہ اور جدید اختراع ہے۔

(۲) آمین بالجہر کا حکم اس آیت کے عموم سے مستثنٰی اور مخصوص ہے،اسلئے کہ رسول اللہ ﷺ اورصحابہ کرام نے آمین بالجہر کہی ہے،لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی بات قرآن کی آیت کے مفہوم کے تعین میں حجت ہے۔اس آیت کے مفہوم سے اور بھی کئی دعائیں مستثنٰی ہیں۔مشت نمونہ ءخروار۔صحیح مسلم میں ہے؛**فلما قضی النبی ﷺ صلوته ثم دعا علیهم الخ**،،(**کتاب الجهاد باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین** :ح۱۰۷،۱۷۹۴) اوریہی صحیح مسلم میں ہے براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ :**فسمعته یقول :رب قنی عذابک**...الخ،،(کتاب الصلوٰۃ باب استحباب یمین الامام:ح۷۰۹،۹۲).

(۳) اگراس آیت کی رو سے اہل الرائے کے نزدیک ہر دعا کو خفیہ پڑھنا لازم ہوتو وہ خود اس آیت کے خودساختہ مفہوم

کے خلاف بلند آواز سے کیوں دعایں کرتے ہیں؟ مثلاً جہری نمازوں میں فاتحہ بالجہر پڑھتے ہیں جو دعا ہے۔فرض نماز کے بعد اونچی اواز سے دعا کرتے ہیں۔بسا اوقات امام کی دعا پر مقتدی اونچی اواز میں آمین بھی کہتے ہیں۔

(۴) ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ نے جو دعا خفیہ کی ہے وہ خفیہ کرنی چاہیئے اور جو بالجہر کی ہے وہ بالجہر کرنی چاہیئے، چونکہ آمین آپ ﷺ سے اور آپؐ کے جان نثار صحابہ کرام سے ثابت ہے،لہٰذا آمین بالجہر کہنی چاہیئے قرآن کریم کے عموم کی تخصیص خبر واحد کیساتھ ائمہ اربعہ کے نزدیک جائز ہے۔(الاحکام للآمدی:۲/۳۴۷)۔

فائدہ دوم:

امام بخاریؒ نے (جزءالقرأت:۲۵) میں لکھا ہے: کہ متواتر احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص نماز میں سورت فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی، یہ ارشاد نبوی عام ہے اس میں مرد،عورت،امام،مقتدی اور منفرد سب شامل ہیں ۔ان احادیث میں سے ایک حدیث عبادہ بن صامتؓ سے نقل ہے

پہلی حدیث: عبادۃ بن صامت سے نقل ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"**لاصلــــوۃ لمن لم یقرأبفاتحۃ الــکتـــاب**" یعنی اس کی نماز نہیں ہوتی جو سورت فاتحہ نہ پڑھے، یہ روایت متفق علیہ ہے۔(بخاری حدیث نمبر:۷۵۶، مسلم:۳۴،۳۴،۳۶) جبکہ امام بیہقی نے جزءالقرأت:۶۴ حدیث نمبر ۱۲۱، میں۔اور اسی طرح امام نسائی نے ۲/۱۴۱، میں اور ابن حبان نے ۸۶/۵،۹۵، میں ان الفاظ سے نقل کی ہے:"**لایقـرأن احـدمنکم اذاجھرت الابام القرآن**" جب میں جہر کے ساتھ قرأت کر رہا ہوں تو تم میں سے کوئی شخص بھی سورت فاتحہ کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھے۔

دوسری روایت: رفاعہ بن رافع الزرقیؓ سے ایک لمبی روایت نقل ہے: جو کہ صلوۃ کے متعلق ہے،اس میں یہ الفاظ نقل ہیں"**اذااقـمیـت الصلوٰۃ فکبّرثم اقرأبفاتحۃ الکتاب وماتیسرثم ارکع**" الحدیث،یعنی جب نماز کی اقامت ہو جائے،تو تکبیر کہہ،پھر سورت فاتحہ پڑھ اور اس کے بعد جو آسان ہو۔پھر رکوع کر:**شـرح السـنۃ لـلبـغوی** :۳/۱۰۔ اور آگے فرمایا، یہ حدیث حسن ہے۔

تیسری حدیث: انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ: **ان الـنبـیﷺ صـلـی بـاصـحـابہ فلماقضی صـلاتـہ اقبـل عـلیھـم بوجھہ فقال اتقرؤن فی صلاتکم والامام یقرأ؟فسکتوافقالھاثلاث مرات فقال قائل اوقائلون انالنفعل قال:فلاتفعلوا ولیقرأاحدکم بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ.**

یعنی انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کو ایک نماز پڑھائی، پس جب آپ نے نماز پوری کی تو ان کی طرف چہرہ مبارک کرتے ہوئے فرمایا، کیا تم اپنی نماز میں پڑھتے ہو جبکہ امام پڑھ رہا ہوتا ہے؟ تو وہ خاموش ہو گئے آپ ؐ نے یہ بات تین دفعہ دہرائی، تو ایک یا کئی اشخاص نے کہا: بے شک ہم ایسا کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا: پس ایسا نہ کرو، اور تم میں سے ہر شخص سورت فاتحہ اپنے دل میں پڑھے۔(مسند ابی یعلی الموصلی: ۱۸۷/۵، ۱۸۸، ح ۲۸۵۰)۔ صحیح ابن حبان: ۱۵۲/۵۔

چوتھی حدیث: ایک صحابی کی روایت:" **عن محمد بن ابی عائشه عمن شهد ذاک قال: صلی النبی ﷺ فلما قضی صلاته قال: اتقرؤن والامام يقرأ قالوا: انا لنفعل قال: فلا تفعلوا الا ان يقرأ أحدكم بفاتحة الكتاب في نفسه**"

محمد ابو عائشہ نے ایک صحابی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی، جب آپ ؐ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: کیا تم اس وقت پڑھتے ہو جبکہ امام پڑھ رہا ہوتا ہے، انہوں (صحابہ) نے کہا: ہم بے شک ایسا کرتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: پس ایسا نہ کرو، سوائے اس کے کہ تم میں سے ہر شخص سورت فاتحہ اپنے دل میں پڑھے۔(مصنف عبد الرزاق ۱۲۶/۲، ۱۲۷ او، ومسند احمد ۲۳۶/۴۔

پانچویں حدیث: عبداللہ عمروؓ کی ہے: **عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده قال قال رسول الله ﷺ تقرؤن خلفي؟ قالوا نعم انا لنهذّ هذاً قال فلا تفعلوا الا بام القران.**

عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم میرے پیچھے پڑھتے ہو؟ تو انہوں نے جواب میں کہا: جی ہاں، ہم جلدی جلدی پڑھتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کچھ بھی نہ پڑھو سوائے فاتحہ کے، اس روایت کو امام بخاریؒ نے جزء القرأت حدیث نمبر ۶۳، میں اور امام بیہقی نے کتاب القرأت ۹۷، میں نقل کیا ہے۔

چھٹی حدیث: حدیث ابی ہریرۃؓ: **عن ابی هريرة رضی الله تعالى عنه عن النبی ﷺ اذا اقيمت الصلوٰة فكبر ثم اقرأ ثم اركع**" الحدیث، رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی کو فرمایا جب فرض نماز کی اقامت ہو جائے تو تکبیر کہہ پھر قرأت کر پھر رکوع کر۔ یہ حدیث امام بخاریؒ نے جزء القرأت نمبر: ۱۱۳، پر نقل کیا ہے۔

ساتویں حدیث: معاویۃ بن الحکم السلمیؓ کی ہے: معاویۃ بن الحکم السلمی کی ایک طویل حدیث کا خلاصہ ہے کہ انہوں

نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور نماز میں باتیں کرتے رہے فرماتے ہیں: فلما صلی رسول اللہ ﷺ فبأبی وأمی ما رأیت معلما قبله، بعده، احسن تعلیما منه، فو الله ما كهرنی ولا ضربنی ولا شتمنی، ثم قال: ان هذا الصلوٰة لا يصلح فيها شيء من كلام الناس انما هو التسبيح و التكبير وقرأة القران"

پس جب رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تو میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، آپؐ سے بہترین استاد نہ پہلے میں نے دیکھا اور نہ بعد میں۔ آپ نے نہ تو مجھے جھڑکا نہ مارا اور نہ برا بھلا کہا پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اس نماز میں انسانوں کے کلام کی کوئی چیز جائز نہیں ہے، یہ نماز تو تسبیح و تکبیر اور قران کا پڑھنا ہے۔ (صحیح مسلم: ۱/۲۰۳، ح ۵۳۷)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتدی جس طرح تسبیح و تکبیر کہے گا، اسی طرح سورۃ فاتحہ بھی پڑھے گا، کیونکہ یہ حدیث خاص طور پر مقتدی کے بارے میں ہے۔ امام بخاریؒ وغیرہ نے بھی اس سے قرأت خلف الامام کے بارے میں استدلال کیا ہے۔ (جزء القرأت: ۶۹، ۷۰، بیہقی (۱۷۷ ح ۶۷)

آٹھویں حدیث: خلیفہ راشد امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے: قال يزيد بن شريك انه سئل عمرؓ عن القرأة خلف الامام؟ فقال اقرأ بفاتحة الكتاب قلت: وان كنت انت؟ قال فان كنت انا، قلت وان جهرت؟ قال وان جهرت"

یزید بن شریک (تابعی) سے روایت ہے کہ انہوں نے عمرؓ سے قرأت خلف الامام کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا: فاتحہ پڑھ تو میں (یزید) نے کہا: اور اگر آپ ہوں؟ تو فرمایا: اگر میں ہوں (تو بھی پڑھ) میں (یزید) نے پوچھا: اگر آپ قرأت بالجہر کر رہے ہوں؟ تو فرمایا: اور اگر میں جہر سے پڑھوں (تو بھی پڑھ۔ (المستدرک: ۱/۲۳۰۔ سنن کبریٰ: ۲/۱۶۷۔ مصنف عبدالرزاق: ۲/۱۳۱)۔

نویں حدیث ابوسعید خدری: امام بخاریؒ نے فرمایا: قال ابو نضرة سألت اباسعيد الخدريؓ عن القرأة خلف الامام؟ فقال بفاتحة الكتاب" ابونضرہ نے کہا: میں نے ابوسعید خدریؓ سے امام کے پیچھے قرأت کا پوچھا؟ تو انہوں نے فرمایا سورت فاتحہ پڑھ۔ یہ روایت امام بخاری نے جزء القرأت: ۳۰، ۳۱، میں اور امام بیہقی نے کتاب القرأت: ۱۱۰، میں نقل کیا ہے۔

دسویں حدیث: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے: عن العيزار عن ابن عباسؓ قال اقرأ خلف الامام

بفاتحة الکتاب''عیزار نے کہا: کہ عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا: امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھ۔اس روایت کوابن ابی شیبہ نے مصنف: ۱/۳۷۵، میں اور امام بیہقی نے سنن کبریٰ: ۱۶۹/۲، میں نقل کیا ہے۔**تلک عشرة کاملة۔**

ان کے علاوہ بھی بہت سی حدیثیں ہیں جن میں مقتدی کو فاتحہ کا حکم دیا گیا ہے، لیکن یہاں اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

تیسرا فائدہ

بعض لوگ اس آیت کریمہ ''**صراط الذین انعمت علیهم**' سے' مسئلہ تقلید کے لئے استدلال کرتے ہیں تو اس مسئلہ کا مذکورہ آیت سے دور کا تعلق بھی نہیں یہ ایک جاہلانہ استدلال ہے، محمد رسول اللہ ﷺ سے لیکر آج تک کسی مفسر، عالم، فقیہ نے اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط نہیں کیا ہے، لہذا یہ ان لوگوں کا کام ہے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں فرمایا ہے: **فاما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ماتشابه منه ابتغاء الفتنة و ابتغاء تاویله** (**العمران: ۷**)۔ اور اس آیت کی تفسیر بھی کسی سے مخفی نہیں، علاوہ ازیں اگر ان کا یہ تفسیر مان لیا جائے تو یہاں پر تمام ربانی انعام یافتہ لوگوں کے راستے کا ذکر ہے، بعض انعام یافتہ کا نہیں لہذا اس آیت کریمہ سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہوا، یہ بات عام لوگوں کو بھی معلوم ہے کہ ربانی انعام یافتہ (انبیاء، صدیقینؓ، شہداء اور صالحین) کا راستہ، اللہ اور رسول کی اطاعت ہے آنکھیں بند کر کے کسی غیر نبی کی بے دلیل تابع داری نہیں، لہٰذا اس آیت کریمہ سے بھی تقلید کا رد ہی ثابت ہے، اور اس مسئلہ کی مزید تحقیق انشاء اللہ سورہ بقرہ میں آئے گی۔

چوتھا فائدہ:۔

یہاں اکثر مفسرین نے ''وسیلہ'' کے متعلق بحث لکھا ہے: لیکن بعض مفسرین نے یہاں وسیلہ کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے۔

وسیلہ، استعانت اور استمداد کے مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے، امید ہے کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء و اولیاء کو وسیلہ بنانا نہ مطلقا جائز ہے اور نہ مطلقا ناجائز ہے، بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے، کہ کسی کو مختار مطلق سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے، اور محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے۔ (معارف القرآن)۔ اور اسی طرح عبارت تفسیر عثمانی میں بھی ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں اس کا تفصیلی بحث (سورت مائدہ: ۳۵) میں آئے گا۔

سورة البقرة (مدنية)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

اس سورت کا نام مشہور تو یہی ہے ''بقرۃ'' کے معنی گائے کے ہیں، چونکہ اس سورت کی آیت نمبر (٦٨) میں گائے سے متعلق ایک قصہ بیان ہوا ہے، اس لئے اسی مناسبت سے اس کا نام سورت البقرہ (یعنی وہ سورت جس میں گائے کا ذکر ہے) رکھا گیا۔

صحیح حدیثوں میں سورت بقرہ کی بہت کچھ فضیلت ثابت ہے۔ایک حدیث شریف میں رسول پاک ﷺ نے فرمایا ہے: ''ان لکل شیء سناماً وان سنام القران سورة البقرة'' مستدرک، جامع الترمذی، وانظر تفسیر ابن کثیر، یعنی ہر چیز کا ایک اعلیٰ حصہ ہوتا ہے، اور قران مجید کا اعلیٰ و برتر حصہ سورۃ بقرہ ہے۔قران مجید کی سورتیں کلام اللہ ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں، البتہ مضامین کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فوقیت ہے، سورۃ بقرہ میں چونکہ تمام بنیادی عقائد، توحید و رسالت ،کتب، اخرت وغیرہ مرکزی اعمال، جہاد، انفاق، نماز، روزہ، حج، زکواۃ وغیرہ اور بعض اہم معاملات نکاح ،طلاق، عدت، قصاص، وصیت، رہن ،قرض، سود وغیرہ تفصیل سے مذکور ہیں، بلکہ وہ تمام مضامین جو پورے قران مجید میں پھیلے ہوئے ہیں وہ تفصیلا یا اجمالا سارے کے سارے اس سورت میں آ گئے ہیں، اسی مناسبت سے بعض روایتوں میں اس سورت کا نام ''فسطاط القرآن'' بھی آیا ہے فسطاط کے معنی خیمہ کے ہیں جس طرح خیمہ نیچے بیٹھنے والوں پر حاوی ہوتا ہے، اسی طرح یہ سورت بھی قران مجید کے تمام مضامین پر حاوی ہے، اس لئے اس لحاظ سے باقی سورتوں پر فضیلت وبرتری حاصل ہے، ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے: اقرؤا سورة البقرة فان اخذها بركة وتركها حسرة ولا يستطيعها البطلة۔ (صحیح مسلم و مسند احمد)۔

یعنی سورت بقرہ پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا اور اس پر عمل کرنا باعث برکت اور اس کا ترک موجب حسرت وندامت ہے۔مگر باطل پرست لوگ اس پر عمل نہیں کرسکیں گے۔

ربط: سورت بقرہ کو سورت فاتحہ کے ساتھ کئی طرح سے ربط ہے:

(۱) **ربط اسمی**: یہودی گائے کی پرستش اور اس کی تعظیم کیا کرتے تھے، چنانچہ سامری نے جب سونے

کا بچھڑا بنا کران کے سامنے لا رکھا، تو سب اس کے سامنے جھک گئے اور اسے پوجنے لگے، یہود کے علاوہ خود مشرکین عرب بھی گاؤ پرستی میں مبتلا اور اس کے تقدس کے قائل تھے، جب کبھی بارش نہ ہوتی تو وہ گائے کی دم کے ساتھ گھاس پھونس باندھ کر اور اسے آگ لگا کر چھوڑ دیتے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب آگ سے گائے کی دم جلے گی، تو وہ چیخ و پکار کرے گی، اور اس کی چیخ و پکار اور بے چینی کی وجہ سے اللہ تعالی بارش برسائے گا۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت کا ایک سمجھدار اور سلیم الفطرت شاعر الورل الطائی ایسے ضعیف الاعتقاد مشرکوں کو ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے:

لادر درجال خاب سعیهم　　　یستمطرون لدی الازمات بالعشر

ان لوگوں کا عمل بے نتیجہ ٹھہرا جن کی کوشش ناکام ہوئی اور جو خشک سالی میں عشر (ایک پودا) کے ذریعہ بارش طلب کرتے ہیں۔ (لسان العرب)۔

اجاعل انت بیقور امسلعة　ذریعة لک بین الله و المطر

کیا تو اللہ اور بارش کے درمیان اس گائے کو وسیلہ بناتا ہے جس کی دم سے سلع (ایک پودا) کی ٹہنیاں بندھی ہوئی ہیں۔ (مشکل القران ابن قتیبہ)۔

اور اس وقت کے عیسائی تو آل عمران کے بعض بزرگوں کی الوہیت کے قائل تھے، اور انہیں مالک ومختار سمجھ کر حاجات ومشکلات میں پکارتے تھے۔ عیسی ومریم علیہما السلام کے متعلق عیسائیوں کے جو مشرکانہ عقائد تھے، وہ قران مجید میں جابجا تفصیل سے مذکور ہیں، سورت بقرہ میں زیادہ تر روئے سخن، یہود کی طرف اور سورۃ ال عمران میں نصاری کی طرف ہے، ان دونوں سورتوں میں زیادہ تر حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد کا نمبر آتا ہے۔ اس زمانہ میں جس طرح حقوق اللہ کو نہایت بیباکی سے پامال کیا جا رہا تھا اسی طرح حقوق العباد کو بھی نہایت بے دردی سے ضائع کیا جا رہا تھا، خصوصا عورتوں کے ساتھ نہایت وحشیانہ اور غیر منصفانہ سلوک کیا جا رہا تھا۔ اور ان کی فطری کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کی خوب حق تلفی کی جاتی تھی تو اللہ تعالی نے سورت البقرہ اور سورت آل عمران کے بعد سورت نساء میں عورتوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان سے حسن معاشرت کی تلقین فرمائی، تا کہ مسلمان حقوق اللہ اور حقوق العباد آدا کر کے اللہ تعالی کی رضامندی حاصل کریں، اور اللہ تعالی کے خوان نعمت سے دنیا اور عقبی میں بہرہ مند ہو سکیں۔ اب ان سورتوں میں اسی ربط بطریق ذیل ہوگا: **اللهم ایاک نعبدو ایاک نستعین (فاتحة) ولا نعبدو لا نستعین البقرة کمافعل الیهودو المشرکون (بقرة). ولا نعبدو لا نستعین ال عمران کمافعل النصاری (ال عمران) ونؤدی حقوق النساء رغبة ونؤتی**

صـدقـاتهـن نـحلة(نساء)فانزل علينامائدة انعامک وافضالک فی الدنیا والاخـرة(مائدة) اےاللہ!ہم صرف تیری بندگی کرتے ہیں اورصرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور تیرے سوا کسی کی بندگی اور پرستش نہیں کرتے ،جس طرح یہود اور مشرکین عرب گائے کی اور نصاری آل عمران کے بزرگوں کی عبادت اور پرستش کرتے تھے۔ہم عورتوں کے حقوق بہ رضا ورغبت ادا کرینگے۔پس اے اللہ! دنیاواخرت میں اپنے فضل واحسان اورانعام واکرام سے سرفراز فرما۔یہ ربط اسی سورت مائدہ تک ہےاس کے بعد کا ربط اسی سورت انعام کے شروع میں مذکور ہوگا۔

دوسرا ربط: سورت فاتحہ میں''اهـدنـا الـصـراط المستقيم ''سے ہدایت کی درخواست کی گئی ہے۔اب سورت بقرہ کی ابتداء ہیں اس کی منظوری آگئی کہ یہ پوری کتاب سرچشمہ ہدایت ہے،اورسیدھی راہ دکھاتی ہے اور پھر سورت میں ہدایت کا جامع اورمکمل پروگرام بیان فرمایا ہے۔

تیسرا ربط: سورت فاتحہ میں تین جماعتوں کا ذکرتھا(۱)منعم عليهم جن پراللہ کا انعام ہوا۔(۲)''مغضوب عليهم'' جن پراللہ کاغضب ہوا ہے۔(۳)''الـضـالـين ''گمراہ لوگ منعم علیہم سےمومنین مراد ہیں جن کے چار درجے ہیں باقی دونوں گروہ غیر مومنین کے ہیں ان کے بھی چار درجے ہیں۔جیسا کہ سورت فاتحہ کی تفسیر میں مفصل گذر چکا ہے۔''مغضوب علیہم''سے وہ لوگ مراد ہیں جوفساد باطن کے ساتھ ساتھ فساد عمل میں بھی مبتلا ہیں،یعنی نہ ان کے عقائد صحیح ہیں اور نہ اعمال درست،(یہ کافروں کا گروہ ہیں)اور''الضالین''سے مراد وہ لوگ ہیں جوفساد باطن کا شکار ہیں۔اوران کے عقائد میں کفروشرک کی گندگی موجود ہے البتہ ان کے کچھ ظاہری اعمال مسلمانوں کے سے ہیں،(یہ گروہ منافقوں کا ہے) سورت فاتحہ میں ان تینوں جماعتوں کا ذکراجمالی تھا،اب سورت بقرہ کی ابتداء میں لف ونشر مرتب کےطور پرقدرے تفصیل سے ان کا ذکر کیا گیا ہے،اورساتھ ہی ان کے کچھ اوصاف اوران کی جزاوسزا کا بیان بھی آگیا ہے۔''قـال الامـام الـرازی ويـحتـمـل ان يـقـال الـمـغـضـوب عـليهم هم الكفار،و الضالون هم المنافقون ،وذلک لانه تعالی بـدأبـذكـر الـمـؤمـنيـن و الثـنـاء عـليهـم فـی خـمس ايات من اول سورةا لبقـرة ثم اتبعه بذكر الـكـفـاروهـوقـولـه ان الـذيـن كـفـرواثـم اتبعـه بذكر المنافقين وهو قوله ومن الناس من يقول امنا فكذابدأبذكر المومنين وهوقوله انعمت عليهم ثم اتبعه بذكر الكفاروهوقوله غير المغضوب عليهم ثم اتبعه بذكر المنافقين وهوقوله ولا الضالين.(تفسر كبير).

چوتھا ربط: سورت فاتحہ میں بندوں سے''ایاک نعبد''کے ذریعے اللہ کی توحید کا اقرار لیا گیا ہے،اورعبادت واستعانت کواللہ=

الٓـــــــــــــــــــــــمّٓ ﴿۱﴾

اللہ تعالی کو اس کا علم ہے۔ (۱)

= کے ساتھ مخصوص ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔سورت بقرہ میں اسی دعویٰ توحید کومختلف مقاصد کے پیش نظر تین جگہ ذکر کر کے ہر جگہ اسے دلیل عقلی سے واضح اور ثابت کیا گیا ہے۔چنانچہ(۲۱) نمبرآیت میں،یاایھا الناس اعبدوا ربکم سے دعوی پیش کیااور پھر" الذی خلقکم " سے رزقالکم تک دلیل عقلی پیش کی،دوسری دفعہ(ایت:۱۶۳)میں:وَإِلَـٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ لَّآ إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ سے دعوی پیش کیا،اوراس کے بعد:(ایت:۱۶۴)میں"إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِيْ الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ ،الاية. میں دلیل عقلی بیان کی،

تیسری بار(ایت:۲۵۵)میں الْحَيُّ الْقَيُّومُ لاَ تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ،الاية. دعوی میں پیش کیا۔اوراس میں آیت کی آخر تک عقلی دلیل پیش کی،دعوی توحید کوتین بار ذکر کرنے کا مقصد جدا گانہ ہے۔پہلے موقع پر شرک فی الدعاء کی نفی مقصود ہے یعنی اللہ کے سوا غائبانہ دعا اور پکار سننے والا اور کوئی نہیں،دوسرے مقام پر نذر ونیاز اورمنت میں شرک کی نفی مقصود ہے۔اورتیسری جگہ شفاعت قہری کی تردید مقصود ہے۔

مختصر خلاصہ

سورت بقرہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے دو حصے ہیں۔حصہ اول ابتداءسورت سے اولـئـک هـم الـمتـقـون (۱۷۷) تک ہے،اوردوسرا حصہ وہاں سے سورت کے اخرتک ،حصہ اول میں دومضمون بیان کئے گئے ہیں توحید اوررسالت ابتداءسورت سے " وَلَا تَـنـفَـعُـهَـا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ" ﴿۱۲۳﴾توحیداور" وَإِذِ ابْتَلَى إِبْـرَاهِيْـمَ رَبُّـهُ بِـكَلِمَـاتٍ" (۱۲۴) سے حصہ اول کے اخر تک رسالت کا بیان ہے،گویا کہ پہلا حصہ"لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی تشریح ہے۔دوسرا حصہ مسلمانوں کے ظاہر و باطن کی اصلاح کے طریقے،اوراندرونی نظام کودرست کرنے کے لئے امورانتظامیہ بیان فرما کرمشرکین کے مقابلے میں انہیں جہاداورانفاق کا حکم دیا گیا ہے،گویا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی خاطر مشرکین سے جہاد کا حکم فرمایا گیا ہے۔

(۱) یہ حروف مقطعات میں سے ہیں۔جوقران مجید کی انتیس (۲۹) سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں،مفسرین کرام

نے ان حروف کے ان سورتوں کی ابتداء میں ذکر کرنے کی حکمتیں، ان کے ظاہری معانی اوران کی تمثیلات بیان فرمائی ہیں۔مفسرین کرام نے جو کچھ بیان کیا ہے اسے ان حروف مقطعات کے حقیقی معانی اورمرادات الٰہی تو نہیں کہا جاسکتا زیادہ سے زیادہ انہیں فوائد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

یہ حروف بے معنی اور مہمل نہیں ہیں، ان سے مرادالٰہی متعین ضرور ہیں، لیکن ان کا بھید اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔**هذا علم مستور وسر محجوب استأثر اللّٰہ تبارک وتعالى به** ۔تفسیر کبیر، روح المعانی، بیضاوی، خلفائے راشدین اور ابن مسعودؓ سے یہی منقول ہے،:**لکل کتاب سرٌ وسر القران اوائل السور** ۔ روح المعانی، تفسیر کبیر (یعنی ہر کتاب کا ایک بھید ہوتا ہے اور قران مجید کے بھید سورتوں کے ابتدائی حصے یعنی حروف مقطعات ہیں۔امام شعبی فرماتے ہیں: **سر اللّٰہ تعالى فلاتطلبوہ** تفسیر کبیر، روح المعانی، یعنی یہ حروف مقطعات اللہ کا بھید ہیں ان کے پیچھے مت پڑو۔

سورتوں کی ابتداء میں ان حروف کے ذکر نے میں جو حکمتیں مفسرین کرام نے بیان کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اعمال شرعیہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کی حکمت اور علت ہماری سمجھ میں آسکے، جیسے نماز، روزہ اور زکواۃ، یہ بات بہ خوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ نماز میں قیام اور رکوع اور سجود وغیرہ کے ذریعے اپنے مالک اور آقا کے سامنے انتہائی عاجزی اور بے چارہ گی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔روزہ سے شہوات نفسانیہ کو کمزور کر کے روحانی پاکیزگی حاصل کی جاتی ہے۔بھوک کے تجربہ سے غریبوں اور بھوکوں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور زکواۃ کے ذریعے حاجت سے زائد دولت سوسائٹی کے معذور اور محتاج طبقہ میں تقسیم کر کے ان کی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔

دوسری قسم ان اعمال کی ہے جن کی حکمت اور علت ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔مگر ہم ایسے اعمال بجالانے کے مکلّف ہیں، جیسا کہ افعال حج ہیں مثلاً صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا (دوڑنا) طواف میں رمل کرنا (کندھوں ہلاہلا کر چلنا) اور جمرات پر سنگریزے پھینکنا۔کمال انقیاد اور تسلیم اسی کا نام ہے، کہ احکم الحاکمین کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے خواہ اس کی علت سمجھ میں آئے یا نہ آئے بلکہ اطاعت کرنے کے لئے علت دریافت کرنا بے ادبی میں داخل ہے۔

اعمال شرعیہ کی طرح اقوال کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ ہیں جن کا مفہوم ہماری سمجھ میں آسکتا ہے۔ایسے اقوال کے پڑھنے ان کے معانی میں غور فکر کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اور کچھ اقوال ایسے ہیں، جن کا مفہوم ہماری عقل وفہم سے ماوراء ہے۔مگر ہمیں ان کے بھی ماننے اور پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے (تفسیر کبیر) سورت ال عمران کی آیت کا یہی مطلب ہے:هُوَ الَّذِیْ أَنزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ =

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

یہ وہ کتاب ہے(۲) جس میں کوئی بھی شک نہیں۔ پرہیز گاروں کے لئے ہدایت ہے۔

=الْكِتَاب (الایة:۷) یعنی وہ ایسا ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی، جس کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو محکم ہیں یعنی جن کا مطلب واضح اور ظاہر ہے، یہی ایتیں اس کتاب کا اصلی مدار ہیں۔اور اس میں کچھ آیتیں ایسی ہیں، جن کی مراد مشتبہ ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ دین میں شورش ڈھونڈنے اور اس کا مطلب تلاش کرنے کی غرض سے اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں، جس کی مراد مشتبہ ہے۔حالانکہ اس کا مطلب بجز اللہ تعالی کے اور کوئی نہیں جانتا، جو لوگ علم دین میں پختہ کار ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر اجمالا یقین رکھتے ہیں، کہ یہ سب ہمارے پروردگار کے طرف سے ہیں، اور نصیحت صرف وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔اس آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ قران مجید کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک ''محکمات'' یعنی وہ جن کا مطلب معلوم اور مراد متعین ہے ان کا حکم یہ ہے کہ ان کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔دوسری'' متشابہات'' یعنی وہ جن کی مراد مشتبہ ہے اور اللہ کے سوا ان کی صحیح مراد کسی کو معلوم نہیں، علماء ربانیین کا متشابہات کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں لیکن ان کا اصل مقصد اللہ تعالی ہی جانتا ہے۔متشابہات کی دو قسمیں ہیں: قسم اول حروف مقطعات جو بعض سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں جیسے الم ،الر ،المر ،طٰہٰ ،حٰمٓ. وغیرہ ۔(ابن کثیر، روح المعانی، خازن، معالم، قرطبی) اور قسم دوم وہ الفاظ ہیں جن کے ظاہری اور لغوی معانی تو معلوم ہوں، لیکن ان کی کیفیت کو سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہ ہو، جیسے اللہ کی طرف سے یدٌ (ہاتھ) وجہٌ (چہرہ) وغیرہ کے اضافت جیسے اینماتولوا فثم وجه الله (البقرہ:۱۱۵) یدالله فوق ایدیهم (الفتح:۱۰)۔

(۲) اس آیت کریمہ میں ترکیب نحوی کی کئی صورتیں ہیں ''ذلک الکتاب'' مبتدا اور ''لاریب فیه'' جملہ اس کی خبر ہو: یا، ذلک مبتدا ہو اور الکتاب اس کا پہلی خبر اور لاریب فیه خبر بعد خبر ہو، یا علیحدہ جملہ ہو، اس صورت ''الکتاب'' کا الف لام حقیقت کے لئے ہوگا اور ذلک الکتاب کا مطلب یہ ہوگا کہ کامل اور صحیح معنوں میں کتاب یہی قران ہے۔(روح المعانی) یا الکتاب کا الف لام عہد کے لئے ہوگا، اور اس سے اشارہ اس کتاب کی طرف ہوگا جس کے نزول کی بشارت تورات اور انجیل کے ذریعے یہود و نصاری کو مل چکی تھی۔اور وہ جانتے تھے کہ بنی اسمٰعیل میں اخری=

اَلَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ وَيُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ﴿۳﴾

جو کہ یقین کرتے ہیں غیب پر، (۳) اور نماز قائم کرتے ہیں (۴) اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے۔ اس میں سے خرچ کرتے ہیں (۵)

= نبی پیدا ہوگا، اور اس پر اللہ کی طرف سے کتاب نازل ہوگی۔ (روح المعانی)

مگر اس صورت میں "لاریب فیہ" کو علیحدہ جملہ قرار دینا زیادہ موزوں ہوگا۔ اور ترجمہ یوں ہوگا: بے شک یہ وہی کتاب ہے یعنی جس کی بشارت انبیاء سابقین دے چکے ہیں۔ ذلک الکتاب، ای الکتاب الذی اخبر الانبیاء المتقدمون بان اللہ تعالی سینزله علی النبی المبعوث من ولد اسمٰعیل (تفسیر کبیر)۔

ان دونوں ترکیبوں میں ھدی للمتقین میں دو احتمال ہونگے: یا تو یہ جملہ پہلے مبتداء کی خبر بعد خبر ہوگا، یہ علیحدہ جملہ ہوگا اور اس کا مبتدا "ھو" محذوف ہوگا، ان دونوں ترکیبوں کی صورت میں لاریب فیہ کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کتاب کے اللہ کی طرف سے ہونے میں اور اس کے مضامین کی صحت اور واقعیت میں کوئی شک اور شبہ نہیں۔ یہاں نفس قرآن میں شک کی نفی مقصود ہے، یہ مطلب نہیں کہ اس میں کسی فرد بشر کو شک نہیں کیونکہ کسی آدمی کا قرآنی مضامین کی صحت یا اس کے من عند اللہ ہونے میں شک کرنا اس کے اپنے قصور فہم کا نتیجہ ہے یہ ریب اس کے اپنے فہم میں ہے نہ کہ قرآن میں، اس لئے یہاں مقصود یہ ہے کہ یہ کتاب فی نفسہ ہر قسم کی شک وریب سے پاک ہے، اس کے دلائل واضحہ اور براہین قاہرہ نے اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ (قرطبی، مدارک،، کبیر)۔

"ذلک الکتاب" مبتدا، لاریب فیہ جملہ معترضہ برائے تاکید "ھدی للمتقین "خبر، اس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا: بے شک یہ کتاب ڈرنے والوں کے لئے سراپا ہدایت ہے۔ اس ترکیب کی صورت میں نہ ریب کے متعلق کوئی اشکال وارد ہوتا ہے اور نہ ہی کسی لفظ کو مقدر ماننے کی ضرورت ہے۔

یہاں ایک شبہ کیا جاتا ہے کہ قران مجید کی کئی دوسری آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب (قران) بلاتخصیص تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ھدی للناس وبینات من الھدی و الفرقان. (سورۃ بقرہ: ۱۸۵) مگر اس آیت میں قران مجید کے ہدایت ہونے کو متقی لوگوں کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ قران تا قیامت تمام بنی ادم کے لئے ہدایت ہے۔ مگر چونکہ اس کی ہدایت سے فائدہ صرف وہی

لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں خوف الٰہی ہو۔اس لئے یہاں صرف متقین کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔(تفسیر،روح المعانی) یا متقین سے مراد: **المنیبین الی الله الذین یتقون الضدویجتنبون العناد** ۔یعنی جولوگ اللہ کی طرف متوجہ اورراہ حق کے طالب ہیں، جب وہ ضد وعناد کو بالائے طاق رکھ کر نظر انصاف سے اس کتاب کا مطالعہ کریں گے،تو ان پر یہ کتاب یقیناً ہدایت کی راہیں کھول دیگی اوران کے دلوں کوضرور نور ہدایت سے روشن اومنور کردیگی۔ **کما قال الله تعالی:"ومایتذکر الا من ینیب"(مومن:۱۳)"ویهدی الیه من ینیب"(شوری:۱۳)"ومن خشی الرحمٰن وجاء بقلب منیب"(قٓ:۳۳)"ویهدی الیه من اناب"(رعد:۲۷).**

یعنی ہدایت کوقبول کرنے اوراس کوروکنے کے اعتبار سےلوگوں کی تین قسموں کا بیان

پہلی جماعت: یعنی وہ لوگ جوظاہر وباطن میں مسلمان ہیں ان کی پانچ صفات بیان فرمائی ہیں۔

(۳) "متقین" کی پہلی صفت "یومنون" ایمان سے ماخوذ ہےاورایمان کے معنی دل سے ماننے اورتصدیق کرنے کے ہیں[قرطبی]۔اور"غیب" ہراس چیز کو کہتے ہیں جوحس وعقل کی رسائی اوردسترس سے ماوراء ہو، **مالا یقع تحت الشعور ولا تقتضیه بداهت العقل (روح المعانی)وهوقول جمهور المفسرین، ان الغیب هو الذی یکون غائباعن الحاسة** ۔(کبیر)۔اور یہاں غیب سے مرادوہ تمام چیزیں ہیں جن کاادراک عقل وحس سے ناممکن ہے اوران کے متعلق جوکچھ بھی معلوم ہے وہ پیغمبرﷺ کی اطلاع واخبار ہی سے معلوم ہے،مثلاذات باری تعالی،فرشتے،کتب سماویہ،انبیاء متقدمین علیہم السلام،احوال برزخ،علامات قیامت،حشر ونشر،صراط،ومیزان،جنت،دوزخ،وغیرہ۔ **کل مااخبربه الرسول ﷺ ممالاتهتدی الیه العقول، من اشراط الساعةوعذاب القبرو الحشر و النشرو الصراط و المیزان والجنة و النارالخ.(قرطبی)انه مااخبربهﷺفی حدیث جبریل علیه السلام وهو اللّٰه تعالی وملائکته ورسله والیوم الاخروالقدرخیره وشره الخ(روح المعانی، ابن کثیر ،قرطبی،ابن جریر)** ۔تو آیت کا ماحصل یہ ہوا،کہ وہ لوگ ان تمام امورکو جوان کی عقل وفہم اورحس وادراک سے باہر ہیں محض پیغمبرعلیہ السلام کی اطلاع پرسچا مانتے اوران کی تصدیق کرتے ہیں۔

یہاں ایک بات ذہن نشین کرلینی چاہئے ،کہ عالم غیب کی تمام اشیاءاوران سے متعلق احوال وکوائف مثلاعالم برزخ اور مابعد الحشر کی تفصیلات وکوائف کومخبر صادقﷺ کے بیان کے مطابق ہی ماناجائے گا،ظن وتخمین اورعالم شہادت پرقیاس کے ذریعے عالم غیب کی کوئی چیز ثابت نہیں کی جاسکتی،عالم غیب کے امور جونصوص قطعیہ سے ثابت ہیں مثلاعذاب

قبر،حشر ونشر وغیرہ ،ان کا انکارکفر اور جوامور دلائل ظنیہ سے ثابت ہیں مثلا زندوں کے بعض اعمال سے مردوں کا منتفع ہونا،مثلا ایصال ثواب،امت کے صلوات وسلام کا نبی علیہ السلام کو پہنچنا،اور عالم برزخ میں ارواح کا اجساد مثالیہ میں متمثل ہوکر عبادات اور دیگرافعال بجالانا وغیرہ کا انکار بدعت ہے۔ اوروہ امورجن کی بنیاد محض ضعیف اور بالکل کمزورروایتوں پر ہو،ان کے انکار سے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ایسے امور کے رد وقبول میں قرآنی ارشادات اورصحیح روایتوں سے رہنمائی حاصل کی جائے گی۔مُردوں کا سننا،امت کے اعمال کا نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش ہونا وغیرہ ایسے ہی امور ہیں،ان امورکی پوری تحقیق اپنی جگہ آئے گی۔

(۴) متقی لوگوں کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ نماز قائم رکھتے ہیں نماز قائم رکھنے سے اس کواس کے تمام فرائض وواجبات،سنن ومستحبات اورحقوق وآداب کےساتھ ادا کرنا مراد ہے۔**یاتون بهابحقوقها(جلالين)عن ابن عباسؓ اقامت الصلوٰة اتمام الركوع و السجودو التلاوت و الخشوع و الاقبال عليهافيها،وقال قتادة اقامة الصلوٰة المحافظة على مواقيتهاووضوئهاوركوعهاوسجودها.(ابن كثير).اقامتهاعبارة عن تعديل اركانها وحفظها من ان يقع خلل فى فرائضهاوسننها وادابها(كبير)** . ان عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی ایک ظاہری صورت ہے،اورایک باطنی حقیقت،ظاہری صورت تو یہ ہے،کہ شرعی طریقہ کے مطابق نمازی کا بدن،اس کے کپڑےاورنماز پڑھنے کی جگہ پاک ہو۔اورنماز کواس کے تمام ظاہری ارکان وآداب کی شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے ادا کیا جائے ،اورنماز کی باطنی صورت یہ ہے کہ نماز کوفریضہ الٰہی سمجھ کرمحض رضائے مولیٰ کی خاطر پورے خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کیا جائے ،اورنماز کے دوران نماز ہی کواپنے دل کی توجہ کا مرکز بنایا جائے ،خیالات فاسدہ اوروساوس شیطانیہ سے دل کوخالی اور پاک رکھا جائے۔لہذا نماز کوان تمام ظاہری اور باطنی حقوق کے ساتھ ادا کرنے کا نام،اقامت صلواۃ ہے اوریہی متقین کی دوسری صفت ہے۔اس صفت میں جس قدر کمال یانقص ہوگا اسی قدر اتقاء میں فرق پڑ جائے گا۔

(۵) یہ متقین کی تیسری صفت ہےبعض مفسرین نے اس آیت سے ''زکواۃ'' مراد لی ہےمگر اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ ایت اپنی عموم پر ہی محمول ہے، اورتمام حقوق مالیہ کی ادائیگی کوشامل ہےخواہ وہ واجب ہوں یا غیرواجب،مثلا زکوٰۃ،نفلی صدقہ،قربانی،اپنی ذات اوراہل عیال پرخرچ وغیرہ۔**واولى التاويلات بالاية واحقهابصفة القوم ان يكون كانوا لجميع اللازم فى اموالهم مؤدين ،زكوة كان ذلك اونفقة من لزمته نفقته من اهل وعيال وغيرهم ممن تجب عليهم نفقته بالقرابة و الملك وغيرذلك.(ابن جرير،ابن كثير)ويدخل فيه**

انفاق الواجب کالزکوٰۃ و النذر والانفاق علی النفس وعلی من تجب نفقته علیه والانفاق فی الجهاد اذاوجب علیه والانفاق فی المندوب وهو صدقة التطوع ومواساة الاخوان وهذه کلهامما یمدح بها.(خازن).

بلکہ ایت اس سے بھی زیادہ عموم کی محتمل ہے، لفظ ''ما'' اپنے عموم اور وسعت کی وجہ سے ان تمام انعامات کو شامل ہے جو اللہ تعالی نے انسان کو عطا فرمائے ہیں۔خواہ مادی انعامات، جیسے مال واولاد، ودولت، وثروت وقوت، صحت وغیرہ، خواہ علمی، جیسے علم وہنر عقل وحکمت اور فہم وفراست وغیرہ۔لہٰذا اپنی قوت وصحت اور اولاد کے ذریعے دوسروں کی مدد کرنا علم وحکمت سکھانا، مخلصانہ مشوروں سے تعاون کرنا، یہ سب اس ایت کے تحت داخل ہیں۔**الانفاق البذل،من النعم الظاهرة و الباطنة ،وعلم لایقال به ککنز لاینفق منه.(روح المعانی). وقال بعض المتقدمین فی تاویل قوله تعالی ومما رزقناهم ینفقون ای مما علمناهم یعلّمون.قرطبی۔**

(٦) یہ متقین کی چوتھی صفت ہے، اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر ہے ایک وہ وحی جو رسول پاک ﷺ پر نازل ہوئی، دوسری وہ وحی جو پہلے پیغمبروں پر اتری، پہلے انبیاء علیہم السلام کی کتابوں پر ایمان لانے سے مراد صرف یہ ہے کہ انہیں اللہ کی طرف سے مانا جائے اور انہیں سچا سمجھا جائے، ان پر عمل کرنا واجب نہیں، رسول اللہ ﷺ کی وحی پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اسے حق اور من عنداللہ ماننے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی کیا جائے اور اپنی زندگی اس کی ہدایت کے مطابق بسر کی جائے۔آپ ؐ کی وحی صرف قران مجید ہی میں منحصر نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے تمام دینی ارشادات جو کتب احادیث میں موجود ہیں یہ سب وحی تھے، تو جس طرح قران پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح قران کے علاوہ دوسری وحی کو ماننا بھی فرض ہے۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کے بعد وحی منقطع ہو چکی ہے، اگر جاری ہوتی تو یہاں اس پر بھی ایمان لانے کا ذکر ضرور ہوتا۔اس آیت میں جس ایمان کا ذکر ہے حقیقت میں وہ ایمان بالغیب ہی کا ایک شعبہ ہے ''**یومنون بالغیب**'' کے الفاظ پورے عالم غیب پر حاوی تھے، مگر اس آیت میں عالم غیب کی صرف دو چیزوں کو خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے یعنی گزشتہ وحی اور موجودہ وحی پر ایمان لانا، تو اس **تخصیص بعد التعمیم** سے یہود ونصاری میں سے جو لوگ ایمان لا چکے تھے، ان کی عزت افزائی اور ان کی فضیلت کا اظہار مقصود ہے۔(روح المعانی، کبیر، مظہری)۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ

اورجو ایمان لاتے ہیں،اس پرجواتاراگیاہے آپ پراورجوآپ سے پہلے اتاراگیا(٦)اورآخرت پربھی وہ

يُوْقِنُوْنَ ﴿٤﴾ أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥﴾

یقین رکھتے ہیں۔(٧)وہی لوگ اپنے رب کے راستہ پرہیں اوروہی نجات پانے والے ہیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾

بے شک جولوگ انکارکرچکے ہیں برابرہے انہیں توڈرائے یانہ ڈرائے وہ ایمان نہیں لائیں گے ۔(٨)

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ط

اللہ نے ان کے دلوں اورکانوں پرمہرلگادی ہے(٩) اوران کے آنکھوں پرپردہ ہے

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٧﴾

اوران کے لئے بڑاعذاب ہے۔

---

(٧) یہ متقین کی پانچویں صفت ہے، یہاں اخرت سے مراددارِاخرت یعنی قیامت ہے نہ کہ نبوت، جیسا کہ منکرین ختم نبوت کا خیال ہے، چنانچہ دوسری ایت میں ارشاد ہے: وان الـدار الاخرة لهی الحيوان.(عنكبوة: ٦٤) قیامت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ حشر ونشر، حساب وکتاب، جنت، دوزخ، اور یوم قیامت کو جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب کچھ مانتے اور اس کے وقوع پر یقین رکھتے ہیں یہاں تک تو دعوت توحید کو قبول کرنے والوں اور کتاب ہدایت سے منتفع ہونے والوں کی صفات وعلامات کا ذکر تھا، اب آگے ان صفات کا ثمرہ اوران کے حاملین کی جزاء کا بیان ہے۔

یہاں دونوں جگہوں میں ''اولئک'' کا اشارہ مذکورہ بالا صفات کے حاملین کی طرف ہے۔ای الـمتصفون بـمـاتـقـدم مـن الايـمـان بالغيب واقام الصلوٰة و الانفاق من الذى رزقهم. الخ. تفسیر ابن کثیر.ای الـذيـن هـذه صـفـتهـم (تفسیر خازن)ای اهل هذه الصفة(معالم) ۔یعنی جولوگ مذکورہ صفات سے متصف ہیں

دنیامیں وہ سیدھی راہ پر ہیں۔اورآخرت میں بھی انہیں خاطرخواہ کامیابی ہوگی۔**فـان الهـدی فی الدنیا و الفلاح فی الاخـرة** (روح المعانی)۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ: "**مـفلحون**" کاتعلق دنیااورآخرت دونوں سے ہو،ابن کثیر،یعنی سیدھی راہ پر چلنےاور کتاب ہدایت پرعمل کرنے کی وجہ سے وہ دنیامیں بھی کامیاب ہونگے اورآخرت میں بھی۔ (**اولٰـئک هم المفلحون**) میں"**هم**" **ضمیر فصل** ہےجوحصراورتخصیص کےمعنی پیدا کرتی ہے(بیضاوی،مظہری)۔معتزلہ نے اس ایت سے استدلال کیاہے کہ مرتکب کبیرہ مخلد فی النار ہےاوراس کے لئے نجات نہیں کیونکہ اس ایت نے فلاح کو مذکورہ صفات والے مومنوں میں محصور کردیاہے۔تواس سے معلوم ہواکہ جن میں یہ صفات نہ ہوں وہ اس فلاح سے محروم رہیں گے،تواس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حصر مطلق اعتبار سےنہیں ہے بلکہ فلاح کامل اعتبار سے ہےیعنی فلاح کامل توانہیں لوگوں کے لئےمخصوص ہے جو مذکورہ صفات سے متصف ہوں گے۔البتہ مطلق فلاح کےساتھ مخصوص نہیں، بلکہ جن لوگوں میں بعض عملی خامیاں ہونگی نجات وفلاح تواخران کوبھی حاصل ہوجائے گی۔ **واولـئک هـم الـمفلحون یدل عـلـی انهـم الـکاملون فی الفلاح فیلزم ان یکون صاحب الکبیرہ غیر کامل فی الفلاح**(تفسیر کبیر) **الـمـراد الـمـفـلـحون الکاملون فی الفلاح ویلزم منه عدم کمال فلاح من لیس منهم لاعدم الفلاح مطلقا**(تفسیر مظهری،بیضاوی) ۔یہاں توان لوگوں کاذکرتھاجنہوں نے کتاب ہدایت کودل وجان سے مانااوراسے اپنی زندگی کادستورالعمل بنایا۔اب آگےدوسری جماعت کاذکرہے۔

(۸) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دعوت حق کوظاہراًوباطناًٹکرادیا،نہ دل سے مانانہ زبان سے، بلکہ اپنے پوری طاقت سےاس کی مخالفت کی ،اس ایت میں "**کــفـروا**" سے مرادمطلق کافرمرادنہیں ہیں کیونکہ نبی کریمﷺ کی تبلیغ پر ہزاروں کافرایمان لائے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے، بلکہ اس سے مرادخاص قسم کے کافر ہیں یعنی وہ لوگ جوحق کواچھی طرح سمجھ چکےاور پہچان چکے ہوں ،مگرمحض ضدوعناد کے وجہ سے اس کاانکارکرتے ہوں۔ضدوانکارکی وجہ سے ان کے ضمیر مردہ اوردل سیاہ ہوچکے ہیں،اس لئے وعظ ونصیحت وتبلیغ وانذار،کا،ان پرکوئی اثرنہیں ہوسکتا۔**ای ستــروا الــحق عـنـادا** (**مــدارک**) مشرکین مکہ میں ابوجہل،ابولہب،ولید بن مغیرہ،وغیرہ،اور یہود کےبعض علماء،اورروَس مثلاحیی بن اخطب ،کعب بن اشرف وغیرہ اس قسم کے کافر تھے۔(ابوسعود،قرطبی،نیشاپوری)۔جیسا کہ فرعون اوراس کی قوم کی متعلق اللہ تعالی نے ارشادفرمایاہے: **وَجَـحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْماً وَعُلُوّاً** (نمل:۱۴) ۔انہوں نے انکارکردیاحالانکہ ان کےدل یقین کرچکے تھےصرف ظلم اورتکبرکی بناپر۔

یہی حال مشرکین مکہ کا تھا، اوراحبار یہود کے متعلق ارشاد ہے:''فـلـمــا جـــائهـم مــا عــرفـوا كفـروا بـه(البقره: ۸۹) اور أأنذرتهم'' میں ہمزہ استفہام کے لئے نہیں ہے بلکہ تسویہ کے لئے ہے، کیونکہ جو ہمزہ: سواء ،ماادری ،ماابالی، لیت شعری ،وغیرہ، کے بعد آئے وہ تسویہ کے لئے ہوتا ہے، اور علامت اس کی یہ ہے کہ مصدر اس کے مدخول کے قائم مقام ہو سکے۔(مغنی ابن ہشام)۔اور رضی شرح کافیہ میں ہے'' ان الهـمـــــزة تستعمل مطردامع ''اَمّ'' التســــــوية ''اور''ام'' اس ایت میں احدالامرین کے لئے نہیں بلکہ یہ''ام'' متصلہ ہے اور تسویہ کے لئے (رضی شرح کافیہ، مغنی) ترکیب نحوی: الـذيـن كفروا ،موصول مع صلہ اسم انّ ، سـواء عـليهـم ائنذرتهم ، بتاویل مصدر مبتداء موخراور یہ جملہ خبر ان۔(مظہری، رضی)''لايؤمنون''، جملہ مفسرة ہے جو ماقبل کی تفصیل کرتا ہے، جمله مفسره ،لاجمال مـاقبـلهـافيـمـافيه الاستواء. ، (مظهري،روح المعاني) یعنی ان کافروں کے حق میں آپ ﷺ کے انذار اور عدم انذار کے یکساں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا اور ایمان نہیں لائیں گے۔یا'' لايـؤمـنـون'' جملہ''ان'' کی خبر ہے اور سـواء عـليهم الخ .درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔اور خبر''ان'' و الـجـمـلـة قبـلهااعتراض (روح المعانی. مظهری ،مدارک) ایت کا مفہوم دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔

(۹) یہ جملہ معللہ ہے اور ماقبل کی علت اوراس کا سبب بیان کر رہا ہے۔اعـلـم انه تعالى لمابين فى الاية انهم لايـومـنـون اخبـرفـى هـذالاية سبـب الـذى لاجلـه لـم يومنواوهو الختم.(تفسیر کبیر)ختم الله على قـلـوبهـم.استيـنـاف تـعـليـلـى لـمـاسبـق مـن الـحـكـم (ابـوالسعود)اشاره الى برهان لمى للحكم السـابـق(روح المعانى) یعنی پیغمبر علیہ السلام کے انذار کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے۔کیونکہ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگ چکی ہے اوران کی انکھوں پر پردہ پڑ چکا ہے، قبول حق کی تمام راہیں ان پر بند ہو چکی ہیں، اس لئے اب وہ ایمان نہیں لائیں گے۔اوراس دولت سے ہمیشہ کے لئے محروم رہیں گے۔اب یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالی ہی نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی، اوران کی انکھوں پر پردہ ڈال دیا، اوراس طرح ان پر قبول ہدایت کی تمام راہیں روک دیں، تو پھر اگر وہ ایمان نہیں لائے اور کفر پر مر گئے تو انہیں سزا کس قصور پر دی جائی گی؟ کیونکہ مہر الٰہی کی وجہ سے وہ کفر پر مرنے پر مجبور تھے، لہٰذا یہ بات عدل وانصاف کے منافی ہے کہ ایسے لوگوں کو سزا دی جائے، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالی ظالم نہیں ہے، وہ کسی کو بلاقصور سزا نہیں دیتا، اس آیت میں ان کافروں کا جو انجام بیان کیا گیا ہے، وہ خود ان کے اپنے اعمال کی نتیجہ ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو پیدا کیا، دیکھنے، سننے کے لئے اسے انکھ اور کان دیئے

غور وفکر وسوچ بچار کے لئے اسے دل ودماغ اور عقل شعور کی دولت سے مالا مال فرمایا: ارشاد ہے:

وَاللّٰهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لاَ تَعْلَمُونَ شَيْئاً وَجَعَلَ لَكُمُ الْسَّمْعَ وَالأَبْصَارَ وَالأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۷۸﴾(نحل) آفاق وانفس کے واضح اور روشن دلائل کے دفتر اس کے سامنے کھول دیئے تاکہ وہ اپنے حواس کے ذریعے ان میں غور وفکر کر کے حق وباطل میں امتیاز کر سکے۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (حٰم سجده: ۵۳)

اور پھر اسی پر ہی بس نہیں کی بلکہ سیدھی راہ دکھانے اور عقلی ونقلی دلائل کے ساتھ حق سمجھانے کے لئے پیغمبر بھی بھیجے جنہوں نے دن رات اللہ کا پیغام سنایا اور ان کے تمام شبہات دور کر کے اللہ کی حجت ان پر قائم کی۔ رُّسُلاً مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلاَّ يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّهُ عَزِيزاً حَكِيماً ﴿۱۶۵﴾(النساء)

لیکن اس کے باوجود کہ ان پر حق واضح ہو گیا اور انہوں نے حق کو اچھی طرح پہچان لیا۔ انہوں نے حق کو نہ مانا بلکہ ضد وعناد کی وجہ سے کفر وانکار پر ڈٹے رہے، نہ آنکھوں سے کام لیا، نہ کانوں سے، نہ عقل شعور ہی کو استعمال کیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ کفر و انکار ان کے رگ وریشہ میں سرایت کر کے ان کی طبعیت ثانیہ بن گیا۔ ان کے حواس بے کار ہو گئے اور حق کا احساس وشعور ہمیشہ کے لئے ان سے رخصت ہو گیا، اور ان پر گمراہی کی ایک ایسی تاریکی اور ظلمت چھا گئی، کہ اب وہ اس سے باہر نہیں آسکتے، گمراہی کی اس کیفیت کو مہر سے تعبیر کیا گیا ہے تو یہ مہر جو لگی ہے تو وہ قانون تکوینی کے تحت اپنے اسباب وعلل کی بنا پر لگی ہے، جب کوئی شخص حق کو پہچاننے کے بعد محض ضد وعناد کی وجہ سے اپنے ارادے اور اختیار سے کفر کو ایمان پر ترجیح دیتا ہے تو اس سے ایمان کی توفیق چھین لی جاتی ہے اور اس کے حواس بے کار ہو جاتے ہیں، اور وہ جدھر جانا چاہے اسے ادھر ہی کو دھکیل دیا جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: فَمَا أَغْنَى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُم مِّن شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُون (الاحقاف: ۲۶) اور دوسری جگہ ارشاد ہے: وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءتْ مَصِيراً ﴿۱۱۵﴾(النساء)

اس سے معلوم ہوا کہ ان کے حواس پر مہر کا لگنا، اور سعادت ایمان سے ان کی ابدی محرومی، یہ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہیں، ان کے جحود وانکار اور ضد وعناد کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس مہر کی وجہ سے انہیں کفر پر مجبور کیا گیا ہے۔=

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ
اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اورقیامت کے دن پرایمان لائے۔(۱۰)
وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَمَا
حالانکہ وہ ایمان دارنہیں ہے ۔اللہ اورایمان داروں کودھوکا دیتے ہیں حالانکہ
يَخْدَعُوْنَ إِلَّآ أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾
وہ اپنی آپ ہی کودھوکا دے رہے ہیں۔اورنہیں سمجھتے۔

= اب یہاں ایک اورسوال باقی رہ جاتا ہے کہ:''ختم اللہ علی قلوبھم ''میں مہرلگانے کواللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے،اس سے معلوم ہوا کہ مہرلگناان کے اعمال کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالی کا فعل ہے،تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک تمام افعال عباد کا خالق اللہ تعالی ہے،اور ہر کام کے لئے فاعل مباشر اور سبب کا ہونا ضروری ہے۔اور کام کو چونکہ تینوں سے نسبت ہوتی ہے،اللہ تعالی سے مخلوق ہونے کی نسبت،فاعل سے صدور کی،اور سبب سے ترتب کی،اس لئے فعل کو تینوں کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔مثلا ایک شخص کو قتل اور غارت گری کے جرم میں پھانسی دے دی جاتی ہے،تو اس پر لوگ مختلف عبارتوں سے رائے زنی کریں گے۔کوئی کہے گا اللہ تعالی نے اس کا بیڑہ غرق کردیا،کوئی کہے گا اس نے خود ہی اپنا خانہ خراب کردیا،اور کوئی یوں گویا ہوگا کہ بداعمالیاں اسے لے ڈوبیں،اپنی اپنی جگہ تینوں فقرے صحیح ہیں۔جس نے اس مجرم کی تباہی کو اللہ کی طرف منسوب کیا ہے۔اس کی ہرگز یہ غرض نہیں اور نہ ہی سامعین نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس کی تباہی کا ذمہ دار اللہ تعالی ہے،اور وہ مجرم بری الذمہ اور بےقصور ہے۔بلکہ اس کی تباہی کو اللہ کی طرف اس لئے منسوب کیا گیا ہے کہ وہ خالق الافعال ہے۔

باقی رہی اس کی تباہی تو وہ اس کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔اسی طرح مہرلگانے کو مختلف نسبتوں کی وجہ سے مختلف ذوات کی طرف منسوب کیا گیا ہے،مہر لگنے کا اصل سبب چونکہ ان کے اپنے اعمال تھے اس لئے کبھی اس کیفیت کو ان کے اعمال سے وابستہ کیا گیا۔کلا بل ران علی قلوبھم ما کانو یکسبون (تطفیف: ۱۴) اور کبھی ان معاندین نے

اس مہر کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے سب کچھ اپنی ہی طرف منسوب کرلیا۔ وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِيْ أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِيْ آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِن بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ (حٰمٓ السجدہ: ۴) اوراللہ تعالی چونکہ خالق الافعال علة العلل اور مسبب الاسباب ہے، اس لئے اس لحاظ سے مہر لگانے کی نسبت اللہ تعالی کی طرف بھی کی گئی ہے ،جیسا کہ زیر بحث آیت میں ہے اس لئے مہرلگانے کو اللہ کی طرف منسوب کرنے سے ایمان سے ان کی محرومی، کفر پر موت، اورابدی عذاب کی ذمہ داری، اللہ پر عائد نہیں ہوتی ، یہ سب کچھ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے اوران کا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔

(۱۰) تیسری فرقہ منافقین: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ظاہری طور پر اسلام تو قبول کرلیا مگر باطن میں کافر ہی رہے، ان لوگوں نے زبان سے تو اسلام کا اقرار کیا مگر دل سے انکار کیا، اس آیت میں منافقین کے ایمان کی حقیقت بیان فرمائی کہ یہ زبان سے تو اللہ کے توحید، اور اخرت کا اقرار کرتے ہیں لیکن ان کے دل یقین وایمان اور تصدیق واذعان سے یکسر خالی ہیں۔ اس کے بعد منافقت اوردو رخی چال سے ان منافقین کی غرض وغایت بیان کئی گئی ہے، اس دورخی چال سے وہ مسلمانوں کو فریب دیکران سے دنیوی اور مادی فائدے حاصل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ظاہری طور پر اسلام قبول کر لینے سے دنیوی احکام میں وہ مسلمان ہی شمار ہونگے ، ان کا جان ومال محفوظ ہوجائے گا اور مسلمانوں کو وقتا فوقتا حاصل ہونے والے اموال غنیمت اور دیگر مادی فوائد میں وہ ان کے ساتھ برابر کے شریک ہونگے: "یخادعون اللہ" پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ دھوکہ اور فریب تو اسے دیا جاسکتا ہے۔ جو لاعلم ہو اور حقیقت سے ناواقف ہو، لیکن اللہ تعالی تو عالم الغیب و الشھادة ہے، اور ہر ظاہر اور ہر چھپی چیز کو جانتا ہے، اسے کیونکر دھوکہ دیا جاسکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے: ای یخٰدعون رسول اللہ. (مدارک، قرطبی، مظھری، خازن ومعالم، کبیر، روح المعانی، نشاپوری، بحر المحیط) یعنی وہ اللہ کی رسول کو دھوکہ دیتے ہیں، (اس سے یہ بھی بخوبی ظاہر اور معلوم ہوگیا کہ ان تمام مفسرین اہل السنّت والجماعت کا یہ متفقہ اور مسلمہ عقیدہ تھا کہ رسول پاک ﷺ عالم الغیب نہ تھے نہ ذاتی طور پر اور نہ عطائی طور پر)۔

یا، اللہ کو دھوکہ دینے سے ایمان والوں کو دھوکہ دینا مراد ہے کیونکہ اللہ والوں کو دھوکہ دینا اور وہ بھی صرف اس لئے کہ وہ مومن، توحید کے پابند ہیں، ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ کو دھوکہ دینا۔ وقیل المرادبه المومنون، واذاخادعوا المومنين فكانهم خادعوا الله تعالى .(خازن) وقيل ذكرالله ههناتحسين و المقصودبالمخادعة

مخادعة الذين امنوا. (معالم) اس سورت میں ''واؤ'' تفسیر یہ ہوگی ،اور ''و الذين امنوا'': کا عطف ماقبل پر تفسیری ہوگا منافق یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ وہ اپنی اس دورنگی پالیسی سے مسلمانوں کو دھوکہ دیکر مزے کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ نہیں دے رہے، بلکہ اپنی جانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں، اوراس منافقانہ روش سے غیر شعوری طور پر اپنی ہی عاقبت خراب کررہے ہیں۔ مگر انہیں اس بات کا شعور واحساس تک نہیں ہے کہ ان کی یہ غلط روش خود انہی کی تباہی کا باعث ہوگی اوراس کا وبال خود انہی پر پڑھے گا۔ (قرطبی، معالم) اگلی ایت میں منافقین کے حال پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔

ان کے باطن کے خرابی اورفساد عقائد کو بیماری سے تعبیر فرمایا: و المرض عبارة مستعارة عن الفساد الذى فى عقائدهم. (قرطبی) اور یہ لفظ نفاق شک وریب، جو دواانکار پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں سے عداوت اور بغض وحسد وغیرہ سب کو شامل ہے۔ في قلوبهم مرض شک ونفاق. (معالم، ابن جرير) استعيرههنالمافي قلوبهم من الجهل وسوء العقيدة وعداوة النبي ﷺ وغيرذلک من فنون الكفر (ابوسعود) ومجازبان يستعارلبعض امراض القلب كسوء الاعتقادوالغل و الحسدوالميل الى المعاصى فان صدورهم كانت تغلي على رسول الله ﷺ غلاوحنقا (نشاپوری) اور بیماری عضو کی اس غیر طبعی حالت کا نام ہے جس کی وجہ سے عضو کے طبعی افعال میں خلل وفتور واقع ہوجائے، یہ تمام امور چونکہ دل کو اللہ کی معرفت اوراس کی سچی اطاعت اور مخلصانہ عبادت سے روکتے ہیں اس لئے یہ سب روحانی اور قلبی امراض ہیں۔ (کبیر)۔

شک ونفاق اور بغض وحسد کی یہ بیماری جو ان کے دلوں کو لگی ہوئی تھی کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتی گئی۔ جوں جوں قران نازل ہوتا ان کا کفر ونفاق بڑھتا جاتا، کیونکہ ہرایت کے ساتھ یہ وہ منافقانہ سلوک کرتے، بہ ظاہر اسے مانتے لیکن دل میں اس کا انکار کرتے یا جوں جوں پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں کو دشمنوں پر غلبہ اوراقتدار حاصل ہوتا گیا اوردین اسلام کی شان وشوکت میں ترقی ہوتی گئی تو ان کی دلوں کی جلن اور تکلیف اوران کے سینوں میں بغض وحسد کی آگ بڑھتی گئی۔ وزيادة الله مرضهم امابتضعيف حسدهم بنعم الله تعالى على رسوله و المؤمنين اوظلمة قلوبهم يتجددكفرهم بماينزله سبحانه شيئافشيئامن الآيات و الذكر الحكيم. (روح المعانى) ''فزادهم الله'' میں فاء تعقیب کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ''فاء'' کا مابعد ماقبل پر مرتب ہے۔ و الفاء للدلالة على ترتب مضمونهاعليه (ابوسعود) یعنی ان کی بیماری انہیں کی بداعمالیوں اور بد پرہیزیوں کا نتیجہ ہے، باقی رہا اضافہ مرض کو اللہ کی طرف منسوب کرنا تو محض اس لئے ہے کہ وہ مسبب الاسباب ہے، اور فاعل حقیقی ہے ایت =

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضاً وَّلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا
ان کے دلوں میں بیماری ہے، پھراللہ نے ان کی بیماری بڑھادی اوران کے لئے دردناک عذاب ہے اس لئے کہ وہ
يَكْذِبُوْنَ ﴿١٠﴾ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ قَالُوْآ إِنَّمَا نَحْنُ
جھوٹ بولتے تھے۔ اورجب انہیں کہاجاتاہے کہ ملک میں فسادنہ ڈالوتو کہتے ہیں
مُصْلِحُوْنَ ﴿١١﴾ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٢﴾
کہ ہم ہی تواصلاح کرنے والے ہیں۔خبرداربیشک وہی لوگ فسادی ہیں۔(۱۱) لیکن نہیں سمجھتے۔
وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ آمِنُوْا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوْا أَنُؤْمِنُ كَمَا
اورجب انہیں کہاجاتاہے ایمان لاؤجس طرح اورلوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائیں جس طرح
آمَنَ السُّفَهَآءُ أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾
بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں خبرداروہی بیوقوف ہیں لیکن نہیں جانتے
وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَالُوْا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْآ إِلٰى شَيَاطِيْنِهِمْ قَالُوْا
اورجب ایمان داروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے (۱۲)اورجب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے
إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ
ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم توصرف ہنسی کرنے والے ہیں اللہ ان سے ہنسی کرتاہے
وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾
اورانہی مہلت دیتاہے کہ اپنی گمراہی میں حیران رہیں۔

= کے ان دونوں حصوں میں منافقین کے انجام کی علت اورسبب کا بیان تھا۔آگے ان کے انجام کاذکرہے۔منافقین خبث

باطن اورفساد عقیدہ کی خطرناک بیماری میں مبتلا تھے اللہ کی طرف سے آیات شفاء لگا تار نازل ہوتی رہیں، مگر انہوں نے ان سے اعراض کیا اوران سے فائدہ اٹھانے کی ادنیٰ سی کوشش بھی نہ کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا مرض بڑھتا گیا اور بالاخران کی ہلاکت کا باعث ہوا اور وہ دائمی عذاب اور دردناک سزا کے مستحق قرار پائے۔ "بما کانوا یکذبون" یہاں "باء" سببیت کے لئے اور "ما" مصدریہ ہے (روح، ابوسعود) اور فعل ناقص دوام واستمرار کے لئے ہے۔ابوسعود، روح۔یعنی مسلسل کذب بیانی اورنفاق پر لگا تار اصرار کی وجہ سے انہیں مذکورہ سزا کا حکم سنایا گیا ہے، اور یہاں جھوٹ بولنے سے وہی نفاق مراد ہے یعنی دل میں اسلام کا انکار چھپائے ہوئے ہیں مگر زبان سے "امنـا بالله وبالیوم الاخر" کا اقرار کرتے ہیں و معناه بکذبهم وقولهم امنـا ولیسوا بمؤمنین.(قرطبی)ای بکذبهم فی قولهم امنا بالله وبالیوم الاخر.(مدارک) اگے منافقین کی مزید خباثتیں ذکر کرکےان کے حال کواور واضح کیا گیا ہے۔

منافقین بہ ظاہر مسلمان تھے لیکن در پردہ کافروں سے ربط قائم کر رکھا تھا مسلمانوں کے پوشیدہ راز ان تک پہنچاتے، اورانہیں مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہے، اوراس طرح فتنہ وفساد کے لئے زمین ہموار کر رہے تھے:وکان فساد المنافقین فی الارض انهم کانوا یمایلون الکفار ویمالؤنهم علی المسلمین بافشاء اسرارهم الیهم واغرائهم علیهم ،وذلک ممایؤدی الی هیج الفتن بینهم.(مدارک)والفساد،منهاالنفاق الذی صافوابه الکفارفاطلعوهم علی اسرار المؤمنین فان کل ذلک یودی الی خراب الارض وقلة الخیرونزع البرکة وتعطل المنافع .

یعنی ہم نے جو مسلمانوں اور کافروں دونوں فریقوں سے میل جول قائم کر رکھا ہے اس سے ہمارا مقصود صرف دونوں فریقوں میں صلح اور آشتی کی فضا پیدا کرنا ہے اور کچھ نہیں۔ان هذا المدارات سعی فی الاصلاح بین المسلمین و الکفار.(کبیر) قالواانمانریدالاصلاح بین المومنین واهل الکتاب.(ابن جریر).

(۱۱) یہ منافقوں کے دعوے کا نہایت ہی بلیغ طریقے سے رد ہے، جملہ مستانفہ لاکر اور حرف تنبیہ سے متنبہ کر کے سامعین کو متوجہ کر کے حرف تاکید اور کلمہ حصر سے اس حقیقت کو واضح فرمایا، کہ یہ لوگ مصلح ہونے کا دعوی کر رہے ہیں حالانکہ فتنہ وفساد کا سرچشمہ یہی لوگ ہیں، اورزیادہ تر فساد انہیں کے ذریعے پھیل رہا ہے۔ان کے دل مرض نفاق کی وجہ سے اس حد تک مردہ اور بےحس ہو چکے ہیں کہ اصلاح وفساد میں امتیاز نہیں کر پاتے، اور شر وفساد کو امن واصلاح قرار دے رہے ہیں۔وهذاانماناشئ من جهل مرکب فاعتقدواالفسادصلاحا

واصرواواستکبروااستکبارا.(روح المعانی).

"واذاقیل لھم" سے منافقین کی دوسری خباثت ذکر کیا، زبان سے "امنـا" کہہ کر مومن ہونے کا دعوی تو وہ پہلے ہی کر چکے تھے یہاں دوبارہ انہیں ایمان لانے کا حکم دیا جارہا ہے۔وہ منافقانہ طور پر ایمان لائے ہوئے تھے۔اب انہیں مخلصانہ طور پر ایمان لانے کا حکم دیا جارہا ہے۔ای ایمـانـامقـرونـابـالاخـلاص بعیـداعن النفاق.(کبیر) مقرونابالاخلاص ،خالصاعن شوائب النفاق.(روح المعانی) اور"الناس" میں الف لام عہد کا ہے اوراس سے مراد مہاجرین اورانصار ہے یاوہ مومنین مراد ہیں جواہل کتاب میں سے ایمان لا چکے تھے۔عبداللہ بن سلام وغیرہ من مومنی اھل الکتاب ،وقیل کماامن المھاجرون و الانصار.(معالم).

"قالوا انؤمن کماامن السفھاء" یہ منافقین کا قول ہے اور لفظ" سفھاء "سے انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم پر طنز کیا ہے یعنی ہم ان بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں، جواپنے نفع ونقصان کوبھی نہیں سمجھتے۔وانماسفھّوھم جھلامنھم حیث اشتغلوابمالایجدی فی زعمھم.(روح المعانی) امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ منافقین صاحب اقتدار لوگ تھے وہ دولت واقتدار کے نشے میں مخمور،طبقہ دین اسلام کو باطل سمجھتے تھے اور جوشخص باطل دین کوقبول کرے وہ بیوقوف ہوتا ہے۔(کبیر) جیسا کہ آج کل روشن خیالی کے مرض میں مبتلا اورنشہ اقتدار میں بدمست طبقہ، دین کا درد رکھنے والوں اوران کی اللہ ورسول کے احکام سے بغاوت پرحرف گیری کرنے والوں کوکم فہم ،دقیانوسی اورموجودہ دور کے تقاضوں سے بےخبر ،وغیرہ القاب سے سرفراز فرماتے ہیں ،یہ بعینہ ان منافقین کی تقلید ہے،۔

"الا انھم ھم السفھاء" سے زوراورتاکید کےساتھ منافقین کا رد کیا ہے۔یعنی اصل میں بیوقوف تو وہ خود ہیں جوتمام انبیاءعلیہم السلام کے متفقہ دین کوقبول کرنے والوں پرسفاہت اورکم عقلی کا الزام لگارہے ہیں۔ الاانھـــم ھـــم السفھاء دون المومنین و المصدقین باللہ وبرسولہ وثوابہ وعقابہ .(ابن جریر)

"ولکن لایعلمون" ان کی جہالت ونادانی کا یہ عالم کہ وہ اپنی اس کھلی ہوئی حماقت اورسفاہت کوبھی نہیں سمجھ سکتے۔

(**فائدہ**) ان ایتوں سے صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی فضیلت ثابت ہوئی ہے، یہ ایتیں ان کے مومنین مخلصین ہونے کا بین اورلافانی ثبوت ہیں، ان کا ایمان اس قدر کامل ،شوائب نفاق سے اس قدر پاک،اللہ کے نزدیک اس قدر پسندیدہ اورمقبول ہے،کہ اسے منافقین کے سامنے بطورنمونہ پیش کیا گیا ہے۔نیز اس مبارک جماعت کو بیوقوف کہنے والوں کو پر=

أُولَـٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى
یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی
فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿١٦﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى
سوان کی تجارت نے نفع نہ دیااور ہدایت پانے والے نہ ہوئے ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے
اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَآءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ
آگ جلائی پھر جب آگ نے اس کے آس پاس کوروشن کردیا تواللہ نے ان کی روشنی بجھادی اورانہیں
ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿١٨﴾
اندھیروں میں چھوڑا کہ کچھ نہیں دیکھتے ۔ بہرے گونگے اندھے ہیں سووہ نہیں لوٹیں گے ۔(۱۳)

=لے درجہ کے بیوقوف قرار دیا ہے۔

(۱۲) یہ منافقوں کی تیسری خباثت ہے، کہ جب وہ بااثر اورمخلص مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم خالص ایمان لا چکے ہیں ''امنّا'' سے منافقین مسلمانوں کواس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے کہ اب انہوں نے نفاق چھوڑ دیا ہے، اوردل سے خالص ایمان قبول کرلیا ہے، کیونکہ ان کا زبانی ایمان تو مسلمانوں کو پہلے بھی معلوم تھا۔ **فالمراد اخلصنا بالقلب، و الدليل عليه ان الاقرار باللسان كان معلومامنهم.** (کبیر) مگر یہی لفظ ان کے نفاق کی غمازی کرتا ہے کیونکہ مسلمانوں کو پہلے سے اس نفاق کا علم تھا اب اس کی تردید کیلئے اوران کے دلوں میں اپنے اخلاص کا سکہ بٹھانے کے لئے انہیں کوئی تاکیدی جملہ استعمال کرنا چاہیئے تھا مگراس کے باوجودوہ سرسری طور پرصرف ''امنّا'' کالفظ استعمال کرتے ہیں اس لئے کہ نفاق قلبی کی وجہ سے وہ تاکیدی جملے گوارہ نہیں کرسکتے۔

''خلا'' کا صلہ عام طور پر''باء'' اتا ہے مگر یہاں''الی'' آیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں'' **خلا**'' **ذهاب** کے معنی کو متضمن ہے اورمطلب یہ ہے کہ منافقین مسلمانوں سے ملنے کے بعد جب اپنے لیڈروں کے پاس جاتے ہیں تو وہاں مسلمانوں کے سامنے کئے ہوئے اقرار کے خلاف باتیں کرتے ہیں، اس تضمین کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے منافقین کی

منافقت خوب عیاں ہوجاتی ہے۔لہٰذا ''الیٰ '''' ذاھبین'' محذوف سے متعلق ہے جو''خلوا'' کے فاعل سے حال ہے ای **خلوا ذاھبین الی شیاطینھم**،اورشیاطین سے علماء یہوداورشرک وکفر کے لیڈر مراد ہیں۔**شیاطینھم ،سادتھم وکبرائھم ورؤسائھم من احبار الیھودورؤس المشرکین والمنافقین .(ابن کثیر).**

''**انامعکم**'' یعنی دین اورایمان اورعقیدہ میں ہم تمہارے ساتھ ہیں **انامصاحبوکم وموافقوکم علی دینکم.(مدارک).**

(۱۳) مثال کوعربی میں مثل بھی کہتے ہیں،اس کی جمع امثال آتی ہے جیسے قرآن میں ہے ''**وتلک الامثال**''(**حشر : ۲۱**) یعنی یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں،جنہیں صرف عالم ہی سمجھتے ہیں۔ایت کا مطلب یہ ہے کہ منافق جوگمراہی کوہدایت کے بدلے اوراندھے پن کوبینائی کے بدلے مول لیتے ہیں۔ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جواندھیرے میں آگ جلائیں اس سے دائیں بائیں کی چیزیں اسے نظرآنے لگیں۔

پریشانی دورہواورفائدے کی امید بندھے،کہ دفعتہً آگ بجھ جائے،اور یک لخت اندھیرا چھاجائے،تونہ نگاہ کام کرے اورنہ راستہ معلوم ہوسکے،اور باوجوداس کے وہ شخص خودبہرا ہو۔کسی کی بات کونہ سن سکتا ہو،گونگا ہو،کسی سے دریافت نہ کرسکتا ہو،اندھا ہو،جوروشنی سے کام نہ چلاسکتا ہو،اب بھلا یہ کیسے راہ پاسکے گا؟ ٹھیک اسی طرح یہ منافق بھی ہیں کہ ہدایت کوچھوڑکر یہ راہ گم کربیٹھے اوربھلائی کوچھوڑکر برائی کوچاہنے لگے۔اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے ایمان قبول کرکے کفرکیا تھا،جیسے قرآن کریم میں کئی جگہ بصراحت موجود ہے واللہ اعلم۔

امام رازی نے اپنی تفسیر میں سدیؒ سے یہی نقل کیا ہے پھرکہا ہے کہ یہ تشبیہ بہت ہی درست اورصحیح ہے،اس لئے کہ پہلے توان منافقوں کونورایمان حاصل ہوا،پھران کے نفاق کی وجہ سے وہ بجھ گیااوریہ حیرت میں پڑ گئے اوردین کی حیرت سے بڑی حیرت اورکیا ہوگی؟

ابن جریرؒفرماتے ہیں کہ جن کی یہ مثال بیان کی گئی ہے انہیں کسی وقت بھی ایمان نصیب ہی نہ ہوا تھا،کیونکہ پہلے فرمان باری تعالیٰ گذرچکا ہے:''**وماھم بمؤمنین**'' یعنی گویہ زبان سے اللہ تعالیٰ پراورقیامت پرایمان لانے کی کہتے ہیں،مگر حقیقتاً یہ ایمان دارنہیں،لیکن ٹھیک بات یہ ہے کہ اس آیہ مبارکہ میں ان کے کفرونفاق کے وقت کی خبردی گئی ہے،اس سے اس کاانکارنہیں ہوتا کہ اس حالت کفرونفاق سے پہلے کبھی انہیں ایمان حاصل ہی نہیں ہوا،ممکن ہے ایمان لائے ہوں پھراس سے ہٹ گئے اوردلوں پرمہریں لگ گئی ہوں،دیکھئے اورجگہ قرآن کریم میں ہے:''**ذٰلک بانھم آمنوا=**

أَوۡ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعۡدٌ وَّبَرۡقٌ يَجۡعَلُوۡنَ أَصَابِعَهُمۡ فِيۡ

یاجیسا کہ آسمان سے بارش ہو۔جس میں اندھیرے اورگرج اورچمک ہو۔ اپنی انگلیاں

آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ واللّٰهُ مُحِيۡطٌ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ

اپنے کانوں میں کڑک کے سبب اور موت کے ڈر سے رکھتے ہوں۔ اوراللہ پاک کافروں کوگھیرے ہوئے ہے۔قریب ہے

الۡبَرۡقُ يَخۡطَفُ أَبۡصَارَهُمۡ كُلَّمَا أَضَآءَ لَهُم مَّشَوۡا فِيۡهِ وَإِذَا أَظۡلَمَ عَلَيۡهِمۡ

کہ بجلی ان کی انکھیں اچک لے۔جب ان پرچمکتی ہے تواس کی روشنی میں چلتے ہیں اورجب ان پراندھیرا ہوتا ہے

قَامُوۡا وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمۡعِهِمۡ وَأَبۡصَارِهِمۡ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ

توٹھہر جاتے ہیں۔اوراگر اللہ چاہے توانکے کان اورانکھیں لے جائے بیشک اللہ ہرچیز پر

قَدِيۡرٌ ﴿۲۰﴾

قادر ہے۔(۱۴)

=ثم کفروا‘‘(منافقون:۳) یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے ایمان کے بعد کفر کیا پھران کے دلوں پرمہر لگ گئی،اب وہ کچھ نہیں سمجھتے،یہی وجہ ہے کہ اس مثال میں روشنی اوراندھیرے کا ذکر ہے یعنی کلمہ ایمان کے ظاہر کرنے کی وجہ سے دنیا میں کچھ نور رہو گیا،لیکن کفر کے چھپانے کی وجہ سے پھرآخرت کے اندھیروں نے گھیرلیا۔

(۱۴)یہ دوسری مثال ہے جودوسری قسم کے منافقوں کے لئے بیان کی گئی ہے یہ وہ قوم ہے جن پرکبھی حق ظاہر ہوجاتا ہےاورکبھی شک میں پڑ جاتے ہیں،توشک کے وقت ان کی مثال برسات کی سی ہے۔’’صیب‘‘ کے معنی مینہ اور بارش کے ہیں،بعض نے بادل کے معنی بیان کئے لیکن زیادہ مشہور معنی بارش کے ہی ہیں جواندھیرے میں برسے۔’’ظلمات‘‘ سے مرادشک اورکفر ونفاق ہے،اور’’رعد‘‘یعنی گرج جواپنی خوفناک آواز سے دل ہلا دیتی ہے۔یہی حال منافق کا ہے کہ اسے ہروقت خوف وڈر،گھبراہٹ اور پریشانی ہی رہتی ہے،جیسےاورجگہ ہے:’’یحسبون کل صیحة علیهم

"(منافقون: ۴) یعنی ہر آواز کو اپنے اوپر ہی سمجھتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ وَمَا هُم مِّنكُمْ وَلَكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ﴿٥٦﴾ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلاً لَّوَلَّوْاْ إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ﴿٥٧﴾ (التوبة) کہ یہ منافقین اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں، لیکن دراصل وہ ڈرپوک لوگ ہیں اگر وہ کوئی جائے پناہ یا راستہ پالیں تو یقیناً وہ اس میں سمٹ کر گھس جائیں۔ بجلی سے مثال دی ہے اس نور ایمان کی، جو ان کے دلوں میں کسی وقت چمک اٹھتا ہے۔ تو وہ اس وقت اپنی انگلیاں موت کے ڈر سے کانوں میں ڈال لیتے ہیں، لیکن یہ انہیں کوئی نفع نہ دے گا۔

یہ اللہ تعالی کی قدرتوں اور اس کے ارادہ کے ماتحت ہیں یہ بچ نہیں سکتے۔ جیسے اور جگہ ارشاد فرمایا: "هل اتاک حديث الجنود" (بروج: ۱۷) یعنی کیا تمہیں لشکر کی، فرعون اور ثمود کی روایات نہیں پہنچیں۔ پہنچی تو ہیں لیکن یہ کافر جھٹلانے میں ہی ہیں، اور اللہ تعالی بھی انہیں ان کے پیچھے سے گھیر رہا ہے۔ بجلی کا آنکھوں کو اچک لینا اس کی قوت اور سختی اور ان منافقین کی بینائی کی کمزوری اور ان کا ضعف ایمان ہے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ قرآن کی مضبوط آیات ان منافقوں کی قلعی کھول دیں گی اور ان کے چھپے ہوئے عیوب ظاہر کر دیں گی اور اپنی نورانیت سے انہیں مبہوت کر دیں گی جب ان پر اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی ایمان جب ان پر ظاہر ہو جاتا ہے تو ذرا روشن دل ہو کر پیروی بھی کرنے لگتے ہیں لیکن پھر جہاں شک وشبہ آیا ان کے دل میں کدورت اور ظلمت بھر گیا اور بھونچکے ہو کر کھڑے رہ گئے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ اسلام کو ذرا عروج ملا تو ان کے دل میں قدرے اطمینان پیدا ہوا، لیکن جہاں اسکے خلاف نظر آیا کہ یہ الٹے پیروں کفر کی طرف لوٹنے لگے۔ جیسے ارشاد الٰہی ہے: "ومن الناس من يعبدالله على حرف" (:حج: ۱۱).

یعنی بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کنارے پر ٹھہر کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اگر بھلائی ملی تو مطمئن ہوئے اور اگر برائی پہنچی تو اسی وقت پھر گئے الخ۔ ابن عباسؓ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان کا روشنی میں چلنا حق کو جان کر کلمہ اسلام پڑھنا ہے اور اندھیرے میں ٹھیر جانا کفر کی طرف لوٹ جانا ہے۔ اور بھی بہت سے مفسرین کا یہی قول ہے اور زیادہ صحیح اور ظاہر بھی یہی قول ہے۔ واللہ اعلم۔

يَـٰٓأَيُّهَـا النَّـاسُ اعْبُـدُوْا رَبَّـكُـمُ الَّـذِىْ خَـلَـقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیااور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّـذِىْ جَعَـلَ لَـكُـمُ الْاَرْضَ فِرَاشًاوَالسَّمَآءَ بِنَاءً

تاکہ تم (اس کے عذاب سے) بچو ۔ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا

فَأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اورآسمان سے بارش برسا کرتمہارے کھانے کے لئے انواع واقسام کے میوے پیدا کئے پس کسی کواللہ کا ہمسر نہ بناؤاورتم جانتے تو ہو۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا

اوراگرتم کواس (کتاب) میں جوہم نے اپنے بندے (محمدﷺ) پرنازل فرمائی ہے کچھ شک ہوتواسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنالاؤ

شُهَـدَآءَ كُـمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَإِنْ لَّـمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ

اور اللہ کے سوا جوتمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو اگرتم سچے ہو ۔لیکن اگر (ایسا) نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے

تَـفْعَلُوْا فَاتَّقُواالنَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے (اور جو) کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے ۔[۱۵]

[**۱۵**]ان دونوں ایتوں میں قران کریم کورسول اللہﷺ کا اعلی معجزہ بتلا کرآپ کی رسالت اورسچھائی کا ثبوت پیش کیا گیاہے۔رسول اللہﷺ کے معجزات توہزاروں ہیں اور بڑے بڑے حیرت انگیز ہیں لیکن ان میں سے اس جگہ آپؐ کے علمی معجزے یعنی قرآن کے ذکر پر اکتفاء کرکے یہ بتلا دیا گیا کہ آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ قران ہے۔اوراس معجزہ کوانبیاء علیہم السلام کے عام معجزات میں بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے کہ عام دستور یہ ہے کہ ہرنبی ورسول کے ساتھ اللہ تعالی اپنی قدرت کاملہ سے کچھ معجزات ظاہرفرماتے ہیں،مگر یہ معجزات ان رسولوں کے ہاتھوں ظاہر ہوتے ہیں،انہیں کے ساتھ ختم ہوجاتے ہیں،مگرقرآن حکیم ایک ایسا معجزہ ہے جوقیامت تک باقی رہنے والا ہے۔

وان کنتم فی ریب:. لفظ "ریب" کا ترجمہ اردو میں شک کا کیا جاتا ہے، مگر امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ درحقیقت ریب ایسے تردد اور وہم کو کہا جاتا ہے جس کی بنیاد کوئی نہ ہو، ذرا غور و تامل کرنے سے رفع ہو جائے، اسی لئے قرآن کریم میں اہل علم سے ریب کی نفی کی گئی ہے۔ اگرچہ وہ مسلمان نہ ہوں، جیسے ارشاد ہے۔ "**ولا یرتاب الذین اوتوا الکتاب والمؤمنون**" (**المدثر** : ۳۱)، یہی وجہ ہے کہ شروع سورۃ بقرہ میں قرآن کریم کے متعلق فرمایا "**لاریب فیه**" کہ اس میں کسی ریب کی گنجائش نہیں، اور اس آیت میں فرمایا: "**وان کنتم فی ریب**" یعنی اگر ہو تم کسی تردد میں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم اپنے واضح اور معجزانہ دلائل کی بناء پر کسی شک و تردد کا محل نہیں ہے، لیکن اپنی ناواقفیت سے پھر بھی تمہیں کوئی تردد ہے تو سن لو: **فأتوا بسورة من مثله**۔ لفظ سورۃ کے معنی محدود و قطعہ کے ہیں اور سورت قرآن مجید اس خاص حصہ قرآن کو کہا جاتا ہے جو بذریعہ وحی ممتاز اور علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

پورے قران میں اس طرح ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتیں چھوٹی بڑی ہیں۔ اور اس جگہ لفظ سورت بغیر الف لام کے لانے سے اس طرف اشارہ پایا گیا کہ چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی اس حکم میں شامل ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اگر تمہیں اس قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی تردد ہے اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ نبی کریم ﷺ یا کسی دوسرے انسان نے خود بنالیا ہے تو اس کا فیصلہ بڑی اسانی سے اس طرح ہوسکتا ہے کہ تم بھی اس قران کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال بنالاؤ، اگر تم اس کی مثال بنانے میں کامیاب ہو گئے تو بے شک تمہیں حق ہوگا کہ اس کو بھی کسی انسان کا کلام قرار دو، اور اگر تم عاجز ہو گئے تو سمجھ لو کہ یہ انسان کی طاقت سے بالاتر، خالص اللہ جلا جلالہ کا کلام ہے۔

یہاں کوئی کہہ سکتا تھا کہ ہمارا عاجز ہو جانا تو اس کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ سبھی انسان عاجز ہیں، ہوسکتا ہے کہ کوئی دوسرا آدمی یا جماعت یہ کام کر لے، اس لئے ارشاد فرمایا: "**وادعوا شهداء کم من دون الله**"، شہداء شاہد کی جمع ہے جس کے معنی حاضر کے آتے ہیں، گواہ کو بھی شاہد اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا حاضرِ عدالت ہونا ضروری ہے۔ اس جگہ شہداء سے مراد یا تو عام حاضرین ہیں، کہ سارے جہاں میں جس جس سے تم اس کام میں مدد لینا چاہو، لے سکتے ہو، اور یا اس سے مراد اُن کے بت ہیں، جن کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ قیامت کے روز یہ ہمارے لئے گواہی دیں گے۔

دوسری ایت میں ان کو ڈرایا گیا کہ اگر تم یہ کام نہ کر سکو تو پھر جہنم کی ایسی سخت آگ سے بچنے کا سامان کرلو، جس کے انگارے آدمی اور پتھر ہوں گے، اور وہ تم ہی جیسے انکار کرنے والوں کیلئے تیار کی گئی ہے۔ اور اسی جملہ کے بیچ میں جو واقعہ ہونے والا تھا اس کی خبر بھی دیدی۔ "**ولن تفعلوا**" یعنی خواہ تم کتنا ہی انفرادی اور اجتماعی زور لگاؤ تمہاری مجال نہیں کہ اس کی

مثال بنا سکو۔اس پر غور کیا جائے کہ جو قوم اسلام اور قرآن کی مخالفت اور اس کو گرانے مٹانے کے لئے اپنی جان، مال، آبرو ،اولاد سب کچھ قربان کرنے پر تلی ہوئی تھی،اس کو یہ آسان سا موقع دیا جاتا ہے، کہ قران کی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کی مثال بنالاؤ تو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہو،اور یہ کہکر ان کی غیرت کو جوش میں لایا جاتا ہے، کہ تم ہرگز یہ کام نہ کرسکو گے ،مگر پوری قوم میں کوئی بھی اس کام کے لئے آگے نہ بڑھا،اس سے بڑھ کر کونسا اعتراف اپنے عجز کا اور قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کا ہوسکتا ہے؟۔جس سے معلوم ہوا کہ قران کریم نبی کریم ﷺ کا ایسا کھلا معجزہ ہے جس نے تمام سرکشوں کی گردنیں جھکا دیں۔

تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات صرف ان کی حیات تک معجزہ ہوتے ،لیکن قران کا معجزہ بعد وفات رسول کریم ﷺ بھی اسی طرح معجزہ کی حیثیت سے باقی ہے،آج بھی ایک ادنیٰ مسلمان ساری دنیا کے اہل علم و دانش کو للکار کر دعوی کرسکتا ہے کہ اس کی مثال نہ کوئی پہلے لا سکا، نہ آج لاسکتا ہے۔اور جس کو ہمت ہو، پیش کر کے دکھلائے۔

شیخ جلال الدین سیوطی، نے اپنی کتاب، خصائص کبری:١/٢٧٩، میں رسول اللہ ﷺ کے دو معجزوں کے متعلق بحوالہ حدیث لکھا ہے کہ قیامت تک باقی ہے ایک قران کا معجزہ ہے،**ومعجزات القرا ن مستمرة الى يوم القيامة** الخ، اور امام بیہقی نے: دلائل النبوۃ:١/١٠، میں اسی طرح لکھا ہے کہ:**فاما (العَلَم) الذى اقترن بدعوته ولم يزل يتزايدايام حياته،ودام فى امته بعدوفاته،فهو (القران) العظيم ،المعجز المبين ،وحبل الله المتين، الذى هوكماوصفه به من انزله فقال:فى سورة فصلت: ٤١،٤٢،و الواقعة:٧٧،٨٠،و البروج: ٢١،٢٢،وال عمران: ٦٢ .وغيرها.**

،دوسرے یہ کہ رسول اللہ ﷺ سے ابوسعید خدریؓ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ ایام حج میں تینوں جمرات پر لاکھوں آدمی تین روز تک مسلسل کنکریاں پھینکتے ہیں پھر کوئی ان کنکریوں کے ڈھیر کو یہاں سے اٹھاتا بھی نظر نہیں آتا۔اور ایک مرتبہ پھینکی ہوئی کنکر کو دوبارہ استعمال کرنا بھی ممنوع ہے،اس لئے ہر حاجی اپنے لئے مزدلفہ سے کنکریاں نئی لیکر آتا ہے۔اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ جمرات کے گرد ایک ہی سال میں ٹیلہ لگ جاتا،جس میں جمرات چھپ جاتے اور چند سال میں تو پہاڑ ہو جاتا،رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ ہاں،مگر اللہ تعالی نے اپنے فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے کہ جس جس شخص کا حج قبول ہو،اس کی کنکریاں اٹھالی جائیں،تو اب اس جگہ صرف ان کم نصیبوں کی کنکریاں باقی رہ جاتی ہیں جن کا حج قبول نہیں ہوا،اس لئے اس جگہ پڑی ہوئی کنکریاں بہت کم نظر آتی

ہیں،اوراگرایسانہ ہوتا تو یہاں پہاڑ کھڑا ہوگیا ہوتا۔ یہ روایت سنن بیہقی:۱۲۸/۵، میں موجود ہے ۔اورفاکہی نے ''اخبار مکہ'':۱۹۲/۴، پر بہت روایات نقل کی ہیں:

یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے ذریعہ رسول کریم ﷺ کی سچائی کی تصدیق ہر سال اور ہر زمانے میں ہوسکتی ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ حج میں لاکھوں آدمی ہر سال جمع ہوتے ہیں اور ہر شخص ہر جمرہ پر ہر روز ساتھ ساتھ کنکریاں پھینکتا ہے اور بعض جاہل تو بڑے بڑے پتھر پھینکتے ہیں، اور یہ بھی یقینی طور پر معلوم ہے کہ ان کنکریوں کو یہاں سے اٹھانے اور صاف کرنے کا حکومت یا کوئی جماعت بھی روزانہ انتظام نہیں کرتی ، نہ اٹھائی جاتی ہیں،اورجیسا زمانہ قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ اس جگہ سے کنکریاں اٹھائی ہی نہیں جاتیں۔تو اگلے سال اس کا دوگنا اور تیسرے سال تگنا ہوجائے گا۔پھر کیا شبہ ہے، کہ چندسال میں یہ حصہ زمین مع جمرات کے ان کنکریوں میں چھپ جائے گا۔اور بجائے جمرات کے ایک پہاڑ کھڑا نظر آئے، مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے اور یہ مشاہدہ ہر زمانے میں رسول کریم ﷺ کی تصدیق اور آپ ؐ پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے،سنا ہے کہ اب یہاں سے کنکریاں اٹھانے کا کچھ انتظام ہونے لگا ہے مگر تیرہ سو برس تک کا عمل بھی اس مضمون کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔اسی طرح معجزہ قران ایک زندہ اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے، جیسے رسول ﷺ کے عہد مبارک میں اس کی نظیر یا مثال پیش نہیں کی جاسکی۔آج بھی نہیں کی جاسکتی۔

اس اجمالی بیان کے بعد آپ کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ قران کریم کو کس بناء پر رسول اللہ ﷺ کا معجزہ قرار دیا گیا؟ اوراس کا اعجاز کن کن وجوہ سے ہے؟ اور کیوں ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہوگئی؟۔دوسرا یہ کہ مسلمانوں کا یہ دعوا کہ چودہ سو برس کے عرصہ میں قرآن کی زبردست تحدی چیلنج کے باوجود کوئی اس کی یا اس کے کسی ٹکڑے کی مثال نہ پیش کرسکا یہ تاریخی حیثیت سے کیا وزن رکھتا ہے؟ یہ دونوں باتیں طویل الذکر اور تفصیل کی طالب ہیں۔

پہلی بات کہ قران کو معجزہ کیوں کہا گیا؟ اوروہ کیا وجوہ ہیں جن کے سبب ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے، اس پر قدیم وجدید علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور ہر مفسر نے اپنے اپنے طرز میں اس مضمون کو بیان کیا ہے، میں اختصار کے ساتھ چند ضروری چیزیں عرض کرتا ہوں،اس جگہ سب سے پہلے غور کرنے کی چیز یہ ہے، کہ یہ عجیب وغریب کل علوم کی جامع کتاب، کس جگہ،کس ماحول میں،اورکس پر نازل ہوئی؟اور کیا وہاں کچھ ایسا علمی سامان موجود تھا جن کے ذریعہ دائرۂ اسباب میں ایسی جامع بینظیر کتاب تیار ہوسکے، جوعلوم اولین اورآخرین کی جامع ،اورانسان کی انفرادی اوراجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق بہترین ہدایت پیش کرسکے،جس میں انسان کی جسمانی اور روحانی تربیت

کا مکمل نظام ہو، اور تدبیر منزل سے لیکر سیاست ممالک تک ہر نظام کے بہترین اصول ہوں۔

جس سرزمین اور جس ذات پر یہ کتاب مقدس نازل ہوئی، اس کی جغرافیائی کیفیت اور تاریخی حالت معلوم کرنے کے لئے آپ کو ایک ریگستانی، خشک اور گرم علاقہ سے سابقہ کرنا پڑھے گا۔ جس کو بطحاء مکہ کہتے ہیں، اور جو نہ زرعی ملک ہے نہ صنعتی، نہ اس ملک کی آب و ہوا ہی کچھ ایسی خوش گوار ہے جس کے لئے باہر کے آدمی وہاں پہنچنے کی رغبت کریں، نہ راستے ہی کچھ ہموار ہیں، جن سے وہاں تک پہنچنا آسان ہو، اکثر دنیا سے کٹا ہوا ایک جزیرہ نما ہے، جہاں خشک پہاڑوں اور گرم ریگ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور دور تک نہ کوئی بستی نظر آتی ہے، اور نہ کوئی کھیت نہ درخت۔

اس پورے خطۂ ملک میں کچھ بڑے شہر بھی نہیں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ان میں اونٹ بکریاں پال کر اپنی زندگی گذارنے والے انسان بستے ہیں، اس کے چھوٹے دیہات کا تو دیکھنا کیا، جو برائے نام چند شہر کہلاتے ہیں، ان میں بھی کسی قسم کے علم و تعلیم کا کوئی چرچا نہیں، نہ وہاں کوئی اسکول اور کالج ہے اور نہ کوئی بڑی یونیورسٹی یا دار العلوم، وہاں کے باشندوں کو اللہ تعالی نے محض قدرتی اور پیدائشی طور پر فصاحت و بلاغت کا ایک فن ضرور دیا ہے، جس میں وہ ساری دنیا سے فائق اور ممتاز ہیں، وہ نثر اور نظم میں ایسے قادر الکلام ہیں کہ جب بولتے ہیں تو رعد کی طرح کڑکتے اور بادل کی طرح برستے ہیں، ان کی ادنی ادنی چھوکریاں ایسی فصیح و بلیغ شعر کہتی ہیں، کہ دنیا کے ادیب حیران رہ جائیں۔ لیکن یہ سب کچھ ان کا فطری فن ہے، جو کسی مکتب یا مدرسہ میں حاصل نہیں کیا جا سکتا، غرض نہ وہاں تعلیم و تعلّم کا کوئی سامان ہے، نہ وہاں کے رہنے والوں کو ان چیزوں سے کوئی لگاؤ یا دلبستگی ہے، ان میں کچھ لوگ شہری زندگی بسر کرنے والے ہیں، تو وہ تجارت پیشہ ہیں، مختلف اجناس مال کی درآمد، برآمد، ان کا مشغلہ ہے۔

اس ملک کے قدیم شہر ''مکہ'' کے ایک شریف گھرانہ میں وہ ذات مقدس پیدا ہوتی ہے، جو مہبط وحی ہے، جس پر قران اترا ہے، اب اس ذات مقدس کا حال سنئے: ولادت سے پہلے ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہو گئے، ابھی سات سال کی عمر بھی نہ تھی کہ والدہ کی بھی وفات ہوگئی، اغوش مادر کا گہوارہ بھی نصیب نہ رہا شریف آباء واجداد کی فیاضی اور بے مثل سخاوت نے اپنے گھر میں کوئی اندوختہ نہ چھوڑا تھا، جس سے یتیم کی پرورش اور ائندہ زندگی کا سامان ہو سکے، نہایت عسرت کی زندگی، پھر ماں باپ کا سایہ سر پر نہیں، ان حالات میں آپ ؐ نے پرورش پائی، اور عمر کا ابتدائی حصہ اسی طرح گذارا جو تعلیم و تعلّم کا اصل وقت تھا ہے، اس وقت اگر مکہ میں کوئی دار العلوم یا اسکول و کالج بھی ہوتا تو بھی آپ ؐ کے لئے اس سے استفادہ مشکل تھا، مگر معلوم ہو چکا کہ وہاں سرے سے یہ علمی مشغلہ اور اس سے دلچسپی ہی

کسی کو نہ تھی، اسی لئے یہ پوری قوم عرب امیین کہلاتے تھے۔قران کریم نے بھی ان کے متعلق یہ لفظ استعمال کیا ہے اس کالازمی نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ آپ ﷺ ہر قسم کی تعلیم وتعلّم سے بے خبر رہے وہاں کوئی بڑا عالم بھی ایسا نہ تھا جس کی صحبت میں رہ کر یہ علوم حاصل کئے جاسکتے جن کا قران حامل ہے، پھر قدرت کو تو ایک فوق العادۃ معجزہ دکھلانا تھا، آپ ؐ کے لئے خصوصی طور پر ایسے سامان ہوئے معمولی نوشت وخواند ہر جگہ کے لوگ کسی نہ کسی طریقے سے سیکھ ہی لیتے ہیں، آپ ؐ نے وہ بھی نہ سیکھا بالکل امی محض رہے کہ اپنا نام تک بھی نہ لکھ سکتے تھے۔

عرب کا مخصوص فن شعر وسخن تھا جس کے لئے خاص خاص اجتماعات کئے جاتے اور مشاعرے منعقد ہوتے اور اس میں ہر شخص مسابقت کی کوشش کرتا تھا، آپ ؐ کو حق تعالی نے ایسی فطرت عطا فرمائی تھی کہ ان چیزوں سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ نہ کبھی کوئی شعر یا قصیدہ لکھا، نہ کسی ایسی مجلس میں شریک ہوئے۔ ہاں امی محض ہونے کے ساتھ بچپن سے ہی آپ ؐ کی شرافت نفس، اخلاق فاضلہ، فہم وفراست کی غیر معمولی آثار، دیانت وامانت کا اعلی ترین شہکار آپ ؐ کے ذات مقدس میں ہر وقت مشاہدہ کئے جاتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب کے بڑے بڑے مغرور ومتکبر سردار آپ ؐ کی تعظیم کرتے تھے اور سارے مکہ میں آپ ؐ کو امین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اب ایک طرف قرآن کی یہ تحدی اور چیلنج اور دوسری طرف ساری دنیا کی مخالف طاقتیں جو اسلام اور نبی ﷺ کو شکست دینے کے لئے اپنی مال، جان، اولاد، ابرو، سب گنوانے کو تیار ہیں۔

اور عرب کے سرداروں نے قران اور اسلام کے مٹانے اور پیغمبر اسلام ﷺ کو مغلوب کرنے میں جس طرح اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگایا، وہ کسی لکھے پڑھے آدمی سے مخفی نہیں۔ شروع میں رسول پاک ﷺ اور آپ ؐ کے گنے چنے رفقاء کو کس کس طرح کی ایذائیں دیکر چاہا کہ وہ کلمہ اسلام کو چھوڑ دیں، مگر جب دیکھا کہ، یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے، تو خوش امد کا پہلو اختیار کیا۔

عرب کا سردار ''عتبہ بن ربیعہ'' قوم کا نمائیدہ بن کر آپ ؐ کے پاس حاضر ہوا، اور عرب کی پوری دولت وحکومت اور بہترین حسن وجمال کی لڑکیوں کی پیشکش اس کام کے لئے کی کہ آپ ؐ اسلام کی تبلیغ چھوڑ دیں۔ آپ ﷺ نے اس کی جواب میں قران کی چند آیتیں سنا دینے پر اکتفاء فرمایا، جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو جنگ ومقابلہ کے لئے تیار ہوکر جو قریش عرب نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے مقابلہ میں سر دھڑ کی بازی لگائی، جان، مال، اولاد، ابرو سب کچھ اس مقابلہ میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہوئے۔ یہ سب کچھ کیا مگر یہ کسی سے نہ ہوسکا کہ قران کی چیلنج کو قبول کرتا، اور چند سطرے مقابلہ پر پیش کر دیتا، کیا ان حالات میں سارے عرب کا اس کے مقابلہ سے سکوت اور عجز اس کی کھلی ہوئی شہادت نہیں؟ کہ

یہ انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالی کا کلام ہے،جس کے کام یا کلام کی نظیر انسان کیا ساری مخلوق کی قدرت سے باہر ہے۔

پھر صرف اتنا ہی نہیں کہ عرب نے اس کے مقابلہ سے سکوت کیا، بلکہ اپنے خاص مجلسوں میں سب نے اس کے بیمثل ہونے کا اعتراف کیا،اور جوان میں سے منصف مزاج تھے انہوں نے اس اعتراف کا اظہار بھی کیا، پھران میں سے کچھ لوگ مسلمان ہوگئے ،اور کچھ اپنی ابائی رسوم کی پابندی یا بنی عبدمناف کی ضد کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے محروم رہے،قریش عرب کی تاریخ ان واقعات پر شاہد ہے، میں اس میں سے چند واقعات اس جگہ بیان کرتا ہوں،جس سے اندازہ ہوسکے کہ پورے عرب نے اس کلام کے، بے مثل، بینظیر ہونے کو تسلیم کیا،اوراس کی مثال پیش کرنے کو اپنی رسوائی کے خیال سے چھوڑ دیا۔

جب رسول اللہﷺ اورقران کا چرچا مکہ سے باہرحجاز کے دوسرے مقامات میں ہونے لگا،اورحج کا موسم آیا تو قریش مکہ کواس کی فکر ہوئی کہ اب اطراف عرب سے حجاج ائیں گے،اوررسول کریمﷺ کا یہ کلام سنیں گے،تو فریفتہ ہوجائیں گے اورغالب خیال یہ ہے کہ مسلمان ہوجائیں گے، اس کے انسداد کی تدبیر سوچنے کے لئے قریش نے ایک اجلاس منعقد کیا،اس اجلاس میں عرب کے بڑے بڑے سردار موجود تھے، ان میں ولید بن مغیرہ،عمر میں سب سے بڑے اور عقل میں ممتاز سمجھے جاتے تھے،سب نے ،ولید بن مغیرہ ،کو یہ مشکل پیش کی کہ اب اطراف ملک سے لوگ آئیں گے اور ہم سے محمدﷺ کے متعلق پوچھیں گے تو ہم کیا کہیں ؟ ہمیں آپ کوئی ایسی بات بتلایئے کہ ہم سب وہی بات کہہ دیں، ایسا نہ ہو کہ خود ہمارے بیانات میں اختلاف ہوجائے۔ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ہی کہو کیا کہنا چاہئے؟

لوگوں نے کہا ہمارے خیال میں ہم سب یہ کہیں ،کہ محمدﷺ (معاذ اللہ) مجنون ہیں،ان کا کلام مجنونانہ بڑ ہے۔ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ایسا ہرگز نہ کہنا، کیونکہ یہ لوگ جب ان کے پاس جائیں گے، اوران سے ملاقات وگفتگو کریں گے، اوران کو ایک فصیح وبلیغ، عاقل انسان پائیں گے،تو انہیں یقین ہوجائیگا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ اچھا ہم ان کو یہ کہیں کہ وہ ایک شاعر ہیں، ولید نے اس سے بھی منع کیا،اورکہا کہ جب لوگ ان کا کلام سنیں گے،وہ تو شعروشاعری کے ماہر ہیں،انہیں یقین ہوجائے گا کہ یہ شعر نہیں،اور نہ آپﷺ شاعر ہیں،نتیجہ یہ ہوگا یہ سب لوگ تمہیں جھوٹا سمجھیں گے، پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ تو پھر ہم ان کو کاہن قرار دیں، جو شیاطین وجنات سے سنکر غیب کی خبریں بیان دیا کرتے ہیں۔ولید نے کہا یہ بھی غلط ہے، کیونکہ جب لوگ ان کا کلام سنیں گے،تو پتہ چل جائے گا یہ کلام کسی کاہن کا نہیں ہے، وہ پھر بھی تمہیں ہی جھوٹا سمجھیں گے،اس کے بعد قران کے بارے میں جو ولید بن مغیرہ کے تاثرات تھے ان

کوان الفاظ میں بیان کیا: اللہ کی قسم، تم میں کوئی ادمی، شعر وشاعری اور اشعار عرب سے میرے برابر واقف نہیں۔ اللہ کی قسم اس کلام میں خاص حلاوت ہے، اور ایک خاص رونق ہے جو میں کسی شاعر یا فصیح و بلیغ کے کلام میں نہیں پاتا۔ پھر ان کی قوم نے دریافت کیا، کہ آپ ہی بتلائیے، پھر ہم کیا کریں؟۔ اور ان کے بارے میں لوگوں سے کیا کہیں؟ ولید نے کہا میں غور کرنے کے بعد کچھ جواب دوں گا، پھر بہت سوچنے کے بعد کہا کہ اگر کچھ کہنا ہی ہے تو تم ان کو ساحر کہو، کہ اپنے جادو سے باپ بیٹے اور میاں بیوی میں تفرقہ ڈال دیتے ہیں۔ قوم اس پر مطمئن اور متفق ہوگئی اور سب سے یہی کہنا شروع کیا، مگر اللہ کا چراغ کہیں پھونکوں سے بجھنے والا تھا؟ اطراف عرب کے لوگ آئے، قرآن سنا، اور بہت سے مسلمان ہوگئے، اور اطراف عرب میں اسلام پھیل گیا (خصائص کبری: ۱/۳۸۱)۔

اسی طرح ایک قریشی سردار نضر بن حارث نے ایک مرتبہ اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا: اے قوم قریش! آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو کہ اس سے پہلے کبھی ایسی مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا تھا کہ محمد ﷺ تمہاری قوم کے ایک نوجوان تھے، اور تم سب ان کے اخلاق وعادات کے گرویدہ اور اپنی قوم میں ان کو سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے، اب جبکہ ان کے سر میں سفید بال آنے لگے، اور انہوں نے ایک بے مثل کلام، اللہ کی طرف سے پیش کیا، تو تم ان کو جادوگر کہنے لگے، اللہ کی قسم وہ جادوگر نہیں، ہم نے جادوگروں کو دیکھا اور برتا ہے، ان کے کلام سنے ہیں، اور طریقوں کو سمجھا ہے، وہ بالکل اس سے مختلف ہیں۔

اور کبھی تم ان کو کاہن کہنے لگے، اللہ کی قسم، وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے بہت کاہنوں کو دیکھا، اور ان کے کلام سنے ہیں، ان کو ان کے کلام سے کوئی مناسبت نہیں۔ اور کبھی تم ان کو شاعر کہنے لگے، اللہ کی قسم، وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے خود شعر، شاعری کے تمام فنون کو سیکھا سمجھا ہے، اور بڑے بڑے شعراء کے کلام ہمیں یاد ہیں، ان کے کلام سے اس کو کوئی مناسبت نہیں، پھر کبھی تم ان کو مجنون بتاتے ہو، اللہ کی قسم، وہ مجنون بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنونوں کو دیکھا بھالا، ان کی بکواس سنی ہے، ان کے مختلف اور مختلط کلام سنے ہیں، یہاں یہ کچھ نہیں، اے میری قوم، تم انصاف کے ساتھ ان کے معاملہ میں غور کرو، یہ سرسری ٹلا دینے کی چیز نہیں (خصائص کبری: ۱/۲۸۳)۔

ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میرا بھائی ''انیس'' ایک مرتبہ مکہ معظّمہ گیا اس نے واپس آ کر مجھے بتلایا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو یہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے، میں نے پوچھا کہ وہاں کے لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ بھائی نے کہا کہ کوئی ان کو شاعر کہتا ہے، کوئی کاہن بتلاتا ہے، کوئی جادوگر کہتا ہے، میرا بھائی انیس خود بڑا شاعر اور کہانت وغیرہ سے

واقف آدمی تھا، اس نے مجھ سے کہا کہ جہاں تک میں نے غور کیا، لوگوں کی یہ سب باتیں غلط ہیں۔ ان کا کلام نہ شعر ہے، نہ کہانت ہے، نہ مجنونانہ کلمات ہیں، بلکہ مجھے وہ کلام صادق نظر آتا ہے۔

ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ بھائی سے یہ کلمات سنکر میں نے مکہ کا سفر کیا، اور مسجد حرام میں آکر رہنے لگا تیس روز میں نے اس طرح گذارے کہ سوائے زمزم کے پانی کے میرے پیٹ میں نہیں گیا، اس تمام عرصہ میں نہ مجھے بھوک کی تکلیف معلوم ہوئی، نہ کوئی ضعف محسوس کیا (خصائص: ۱/۲۸۷)۔

اسلام اور پیغمبر پاک ﷺ کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل اور ''اخنس بن شریق'' وغیرہ بھی لوگوں سے چھپ کر قرآن سنا کرتے، اور اس کی عجیب وغریب بے مثل وبے نظیر اثرات سے متاثر ہوتے تھے، مگر جب قوم کی کچھ لوگوں نے ان کو کہا کہ جب تم اس کلام کو ایسا بے نظیر پاتے ہو، تو اس کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ تو ابوجہل کا جواب یہ تھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ بنی عبد مناف میں اور ہماری قبیلہ میں ہمیشہ سے رقابت اور معاصرانہ مقابلہ چلتا رہتا ہے۔ وہ جس کام میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم بھی اس کا جواب دیتے ہیں، اب جبکہ ہم اور وہ دونوں برابر حیثیت کے مالک ہیں تو اب وہ کہنے لگے کہ ہم میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے، اب ہم اس میں کیسے ان کا مقابلہ کریں؟ میں تو کبھی اس کا اقرار نہ کروں گا۔ (خصائص ۱/۲۸۵)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہ پورے عرب نے ہار مان لی، اور سکوت اختیار کیا، بلکہ اس کے بے مثل اور بے نظیر ہونے اور اپنے عجز کا کھلے عام طور پر اعتراف بھی کیا ہے۔ اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عرب بلکہ ساری دنیا اس کا مثل لانے سے عاجز ہو جاتی۔

قران اور پیغمبر کے مقابلہ میں جان، مال، اولاد، آبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تو وہ تیار ہو گئے، مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کر کے دو سطریں اس کے مقابلہ میں پیش کر دیتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے جاہلانہ اعمال وافعال کے باوجود منصف مزاج تھے، جھوٹ کے پاس نہ جاتے تھے، جب انہوں نے قرآن کو سنکر یہ سمجھ لیا کہ جب درحقیقت اس کلام کی مثل ہم نہیں لا سکتے تو محض دھاندلی اور کٹھ حجتی کے طور پر کوئی کلام پیش کرنا، اپنے لئے عار سمجھا، کیونکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم نے کوئی چیز پیش بھی کر دی تو پورے عرب کے فصحاء وبلغاء اس امتحانی مقابلہ میں ہمیں فیل کر دیں گے، اور خوامخواہ رسوائی ہوگی، اس لئے پوری قوم نے سکوت اختیار کیا، اور جو زیادہ منصف مزاج تھے انہوں نے صاف طور پر اقرار وتسلیم بھی کیا، جسکے کچھ وقائع پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ عرب کا سردار سعد بن زرارہ نے رسول پاک ﷺ کے چچا عباسؓ کے سامنے اقرار کیا کہ ہم نے خوامخواہ محمد ﷺ کی مخالفت کر کے اپنے رشتے ناطے توڑے اور تعلقات خراب کئے، میں یقین کیساتھ کہتا ہوں کہ وہ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں، ہرگز جھوٹے نہیں۔اور جو کلام وہ لائے ہیں بشر کا کلام نہیں ہوسکتا۔(خصائص:۱/۲۸۷)۔

قبیلہ بنی سلیم میں قیس بن نسیبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ سے قرآن سنا،اور چند سوالات کئے جن کا جواب رسول ﷺ نے بیان فرمایا،تو یہ اسی وقت مسلمان ہوگئے اور پھر اپنی قوم میں واپس گئے تو لوگوں سے کہا: میں نے روم وفارس کے فصحاء وبلغاء کے کلام سنے ہیں،بہت سے کاہنوں کے کلمات سننے کا تجربہ ہوا ہے،حمیر کے مقالات سنتا رہا ہوں،مگر محمد ﷺ کے کلام کی مثل میں نے آج تک کہیں نہیں سنا،تم سب میری بات مانو،اوران کا اتباع کرو،انہیں کی تحریک وتلقین پر ان کی قوم کے ایک ہزار آدمی فتح مکہ کے موقع پر رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف باسلام ہوگئے۔(خصائص:۱/۲۸۸)۔

یہ اقرار وتسلیم صرف ایسے لوگوں سے منقول نہیں جو آپ ﷺ کے معاملات سے یکسو اور غیر جانب دار تھے، بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہر طرح رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں لگے ہوئے تھے،قرآن کے متعلق ان کا بھی یہی خیال تھا،مگر اپنی ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا اظہار لوگوں پر نہ کرتے تھے۔

علامہ سیوطی نے خصائص کبری:۱/۲۸۵، میں بحوالہ بیہقی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل اور ابوسفیان اور اخنس بن شریق رات کو اپنے اپنے گھروں سے اس لئے نکلے کہ چھپ کر رسول اللہ سے قران سنیں،ان میں ہر ایک علیحدہ علیحدہ نکلا، ایک کی دوسرے کو خبر نہ تھی،اور علیحدہ علیحدہ گوشوں میں چھپکر قرآن سننے لگے ،تو اس میں ایسے محو ہوئے کہ ساری رات گذر گئی،جب صبح ہوگئی تو سب واپس ہوئے،اتفاقاً راستہ میں مل گئے،اور ہر ایک نے دوسرے کا قصہ سنا،تو سب آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے،کہ تم نے یہ بری حرکت کی،اور کسی نے یہ بھی کہا کہ آئندہ کوئی ایسا نہ کرے،کیونکہ اگر عرب کے عوام کو اس کی خبر ہوگئی تو وہ سب مسلمان ہوجائیں گے۔

یہ کہہ سنکر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے،اگلی رات آئی تو پھر ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہی ٹیس اُٹھی،کہ قرآن سنیں،اور پھر اسی طرح چھپ چھپ کر ہر ایک نے قرآن سنا،یہاں تک کہ رات گذر گئی اور صبح ہوتے ہی یہ لوگ واپس ہوئے،تو پھر آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اوراس کے ترک پر سب نے اتفاق کیا،مگر تیسری رات

آئی تو پھر قرآن کی لذت وحلاوت نے انہیں چلنے اور سننے پر مجبور کر دیا، پھر پھو نچے اور رات بھر قرآن کریم سنکر لوٹنے لگے، تو پھر راستہ میں اجتماع ہو گیا، تو اب سب نے کہا کہ آؤ آپس میں معاہدہ کر لیں، کہ آئندہ ہم ہرگز ایسا نہ کریں گے، چنانچہ اس معاہدہ کی تکمیل کی گئی، اور سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، صبح کو اخنس بن شریق نے اپنی لاٹھی اٹھائی، اور پہلے ابوسفیان کے پاس پہنچا کہ بتلاؤ اس کلام کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے دبے دبے لفظوں میں قرآن کی حقانیت کا اعتراف کیا، تو اخنس نے کہا کہ اللہ کی قسم، میری بھی یہی رائے ہے، اس کے بعد وہ ابوجہل کے پاس پہنچا، اور اس سے بھی یہی سوال کیا، کہ تم نے محمد ﷺ کے کلام کو کیسا پایا؟

ابوجہل نے کہا کہ صاف بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان اور بنوعبد مناف کے خاندان میں ہمیشہ سے چشمک چلی آئی ہے، قوم کی سیادت وقیادت میں وہ جس محاذ پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم ان کا مقابلہ کرتے ہیں، انھوں نے سخاوت وبخشش کے ذریعے قوم پر اپنا اثر جمانا چاہا، تو ہم نے اُن سے بڑھ کر یہ کام کر دکھایا، اُنھوں نے لوگوں کی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں، تو ہم اس میدان میں بھی ان سے پیچھے نہیں رہے، یہاں تک کہ پورا عرب جانتا ہے کہ ہم دونوں خاندان برابر حیثیت کے مالک ہیں۔ ان حالات میں اُن کے خاندان سے یہ اواز اُٹھی کہ ہمارے خاندان میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے، اب ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ ہم کیسے کریں؟، اس لئے ہم نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم زور اور طاقت سے اُن کا مقابلہ کریں گے اور ہرگز ان پر ایمان نہ لائیں گے۔ یہ ہے قرآن کا وہ کھلا ہوا معجزہ جس کا دشمنوں کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے۔

تیسری وجہ اعجاز قرآنی کی یہ ہے، کہ اس میں غیب کی اور ائندہ پیش آنے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں، جو قرآن نے دیں، اور بعینہ اسی طرح واقعات پیش آئے جسطرح قرآن نے خبر دی تھی، مثلاً قران نے خبر دی کہ روم وفارس کے مقابلہ میں ابتداء اہل فارس غالب آئیں گے، اور رومی مغلوب ہوں گے، لیکن ساتھ ہی یہ خبر دی کہ دس سال گذرنے نہ پائیں گے کہ پھر رومی اہل فارس پر غالب آجائیں گے، مکہ کے سرداروں نے قرآن کی اس خبر پر ابوبکر صدیقؓ سے ہار جیت کی شرط لگالی، اور پھر ٹھیک قرآن کی خبر کے مطابق رومی غالب آگئے تو سب کو اپنی ہار ماننا پڑی۔ اسی طرح اور بہت سے واقعات اور خبریں ہیں جو امور غیبیہ کے متعلق قرآن میں دی گئیں اور ان کی سچائی بالکل روز روشن جیسی واضح ہوگئی۔

چوتھی وجہ اعجاز قرآن کی یہ ہے کہ اس میں پچھلی اُمتوں اور اُن کی شرائع اور تاریخی حالات کا ایسا صاف

تذکرہ ہے کہ اس زمانے کے بڑے بڑے علماء یہود و نصاریٰ جو پچھلی کتابوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے ان کو بھی اتنی معلومات نہ تھیں، اور رسول اللہ ﷺ نے تو کبھی نہ کسی مکتب میں قدم رکھا، نہ کسی عالم کی صحبت اٹھائی، نہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا، پھر یہ ابتداء دنیا سے آپ ﷺ کے زمانے تک تمام اقوام عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور سچے سوانح اور ان کی شریعتوں کی تفصیلات کا بیان ظاہر ہے، کہ بجز اس کے نہیں ہوسکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو یہ خبریں دی ہوں۔

پانچویں وجه یه هے کہ اس کی متعدد ایات میں لوگوں کے دل کی چھپی ہوئی باتوں کی اطلاع دی گئی اور وہ پھر ان کے اقرار سے ثابت ہو گیا کہ وہ بات صحیح اور سچی تھی، یہ کام بھی عالم الغیب والشھادۃ ہی کرسکتا ہے، کسی بشر سے عادۃً ممکن نہیں، جیسا کہ ارشاد قرآنی ہے ﴿**اذھمت طآئفتان منکم ان تفشلا**﴾ (**ال عمران: ۱۲۲**) جب تمھاری دو جماعتوں نے دل میں ارادہ کیا، کہ پسپا ہو جائیں۔ اور یہ ارشاد کہ ﴿**یقولون فی انفسھم لو لایعذبنااللہ بمانقول**﴾ (**مجادله: ۸**) یعنی وہ لوگ اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہمارے انکار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کو انہوں نے کسی سے ظاہر نہیں کیا، قرآن کریم نے ہی ان کا انکشاف کیا ہے۔

چھٹی وجه اعجاز قرآنی کی وہ ایات ہیں، جن میں قرآن نے کسی قوم یا فرد کے متعلق یہ پیشگوئی کی کہ وہ فلاں کام نہ کرسکیں گے، اور پھر بھی وہ لوگ باوجود ظاہری قدرت کے اس کام کو نہ کرسکے، جیسے یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا کہ اگر وہ درحقیقت اپنے آپ کو اللہ کے دوست اور ولی سمجھتے ہیں تو انہیں اللہ تعالیٰ کے پاس جانے سے محبت ہونا چاہیئے، وہ ذرا موت کی تمنا کر کے دکھائیں اور پھر ارشاد فرمایا: ﴿**ولن یتمنوہ ابداً**﴾ (**۹۵: بقرہ**) وہ ہرگز موت کی تمنا نہ کرسکیں گے: موت کی تمنا کرنا کسی کیلیے مشکل نہ تھا خصوصاً اُن لوگوں کیلیئے جو قرآن کو جھٹلاتے تھے، قرآن کے ارشاد کی وجہ سے اُن کو تمنائے موت میں خوف و ہراس کی کوئی وجہ نہ تھی، یہود کیلیئے تو مسلمانوں کو شکست دینے کا یہ موقع بڑا غنیمت تھا کہ فوراً تمنائے موت کا ہر مجلس و محفل میں اعلان کرتے۔ مگر یہود ہوں یا مشرکین زبان سے کتنا ہی قرآن کو جھٹلائیں ان کے دل جانتے تھے کہ قرآن سچا ہے، اس کی کوئی بات غلط نہیں ہوسکتی، اگر موت کی تمنا ہم اس وقت کریں گے تو فوراً مر جائیں گے اس لئے قرآن کے اس کھلے ہوئے چیلنج کے باوجود کسی یہودی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک مرتبہ زبان سے تمنائے موت کا اظھار کر دے۔

ساتویں وجه اعجاز قرآن کی وہ خاص کیفیت ہے جو قران کے سننے سے ہر خاص و عام اور مومن و کافر

پر طاری ہوتی ہے جیسے جبیر بن مطعمؓ کو اسلام لانے سے پہلے پیش آیا کہ اتفاقاً انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز مغرب میں سورۂ طور، پڑھتے ہوئے سنا، جب آپؐ آخری آیات پر پہونچے تو جبیرؓ کہتے ہیں، کہ میرا دل گویا اڑنے لگا، اور یہ سب سے پہلا دن تھا کہ میرے دل میں اسلام نے اثر کیا، وہ آیات یہ ہیں:

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ﴿٣٥﴾ أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بَل لَّا يُوقِنُونَ ﴿٣٦﴾ أَمْ عِندَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُونَ ﴿٣٧﴾ (الطور)

کیا یہ کسی کے پیدا کئے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود (اپنے تئیں) پیدا کرنے والے ہیں۔ یا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ یقین ہی نہیں رکھتے۔ کیا ان کے پاس تمہارے پروردگار کے خزانے ہیں یا یہ (کہیں کے) داروغہ ہیں؟

آٹھویں وجہ یہ ہے : کہ اس کو بار بار پڑھنے اور سننے سے کوئی اُکتاتا نہیں، بلکہ جتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے اس کا شوق اور بڑھتا ہے دنیا کی کوئی بہتر سے بہتر اور مرغوب کتاب لے لیجئے اس کو دو چار مرتبہ پڑھا جائے تو انسان کی طبیعت اکتا جاتی ہے، پھر نہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے نہ سننے کو، یہ صرف قرآن کا خاصہ ہے، کہ جتنا کوئی اس کو زیادہ پڑھتا ہے اتنا ہی اس کو شوق و رغبت بڑھتا جاتا ہے، یہ بھی قرآن کے کلام الٰہی ہونے ہی کا اثر ہے۔

نویں وجہ: یہ ہے کہ قرآن نے اعلان کیا ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالی نے لیا ہے، وہ قیامت تک بغیر کسی ادنی تغیر و ترمیم کی باقی رہے گا، اللہ تعالی نے اپنے اس وعدے کو اس طرح پورا فرمایا: کہ جب سے قرآن نازل ہوا ہے آج چودہ سو برس گذریں، ہر قرن ہر زمانے میں لاکھوں انسان ایسے رہے ہیں اور رہیں گے جن کے سینوں میں پورا قرآن اس طرح محفوظ رہا کہ ایک زیر و زبر کی غلطی کا امکان نہیں۔

ہر زمانے میں مرد، عورت، بچے بوڑھے، اس کے حافظ ملتے ہیں، بڑے سے بڑے عالم اگر کہیں ایک زیر زبر کی غلطی کر جائے تو ذرا ذرا سے بچے وہی غلطی پکڑ لیں گے۔ دنیا کا کوئی مذہب اپنی مذہبی کتاب کے متعلق اس کے مثال تو کیا اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں کر سکتا۔ بہت سے مذاہب کی کتابوں میں تو آج یہ پتہ چلانا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ اس کی اصل کس زبان میں آئی تھی؟ اور اس کے کتنے اجزاء تھے۔ کتاب کی صورت میں بھی ہر قرن ہر زمانے میں جتنی اشاعت قرآن کی ہوئی، شاید دنیا کی کسی کتاب کو یہ بات نصیب ہوں، حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کی تعداد دنیا میں بہ نسبت منکرین اور کافروں کے بہت کم رہی، اور ذرائع نشر و اشاعت بھی جتنے غیر مسلموں کو حاصل رہے ہیں مسلمانوں

کو اس کا کوئی معتد بہ حصہ نصیب نہ ہوا، مگر ان باتوں کے باوجود کسی قوم کسی مذہب کی کوئی کتاب دنیا میں اتنی شائع نہیں ہوئی جتنا قرآن شائع ہوا، پھر قرآن کی حفاظت کو اللہ تعالی نے صرف کتابوں اور صحیفوں پر موقوف نہیں رکھا، جن کے جل جانے اور محو ہو جانے کا امکان ہو، بلکہ اپنے بندوں کے سینوں میں بھی محفوظ کر دیا، اگر آج ساری دنیا کے قرآن (العیاذ باللہ) نابود کر دیا جائیں تو اللہ کی یہ کتاب پھر بھی اسی طرح محفوظ رہیگی۔

چند حافظ مل کر بیٹھ جائیں تو چند گھنٹوں میں پھر ساری کی ساری لکھی جاسکتی ہے۔ یہ بے نظیر حفاظت بھی صرف قرآن ہی کا خاصہ اور اس کے کلام الٰہی ہونے کا نمایاں ثبوت ہے، کہ جس طرح اللہ کی ذات ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اس پر کسی مخلوق کا تصرف نہیں چل سکتا، اسی طرح اس کا کلام بھی ہمیشہ تمام مخلوقات کی دستبرد اور تصرفات سے بالاتر ہو کر ہمیشہ ہمیشہ باقی رہیگا قرآن کی یہ پیشنگوئی چودہ سو برس تک مشاہدہ میں آچکی ہیں، اور تا قیامت انشاء اللہ تعالیٰ آتی رہے گی اس کھلے معجزے کے بعد قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کیا کسی کو شک وشبہ کی گنجائش رہ سکتی ہے؟۔

دسویں وجہ : وہ علوم ومعارف ہیں جن کا احاطہ آج تک کسی کتاب نے کیا ہے نہ آئندہ امکان ہے، کہ اتنے مختصر حجم اور محدود کلمات میں اتنے علوم وفنون جمع کئے جاسکیں جو تمام کائنات کی دائمی ضروریات کو حاوی اور انسان کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حال سے متعلق پورا مرتب اور بہترین نظام پیش کر سکے، شخصی پھر عائلی زندگی سے لے کر قبائلی اور شہری زندگی تک اور پھر عمرانیات واجتماعیات اور سیاستِ مما لک کے ہر پہلو پر حاوی نظام پیش کر دے۔ پھر صرف نظری اور علمی طور پر نظام پیش کرنا ہی نہیں عملی طور پر اس کا رواج پانا اور تمام نظامہائے دنیا پر غالب آکر قوموں کے مزاج، اخلاق، اعمال، معاشرت اور تمدن میں وہ انقلاب عظیم پیدا کرنا جس کی نظیر نہ قرون اولی میں مل سکتی ہے۔ نہ قرون مابعد میں یہ حیرت انگیز انقلاب کیا کسی انسان کی قدرت اور اس کی حکمت عملی کا نتیجہ ہوسکتا ہے؟ خصوصا جبکہ وہ انسان امی اور اس کی قوم بھی امی ہو

یہی وہ محیر العقول تاثیرات ہیں کہ جن کی وجہ سے قران کو کلام الٰہی ماننے پر ہر وہ شخص مجبور ہے جس کی عقل وبصیرت کو تعصب عناد نے بالکل ہی برباد نہ کر دیا ہو۔ یہاں تک کہ اس دورِ مادہ پرستی کے، مسیحی مصنفین جنہوں نے کچھ بھی قرآن میں غور فکر سے کام لیا اس اقرار پر مجبور ہو گئے کہ یہ ایک بے مثل وبے نظیر کتاب ہے۔ فرانس کا مشہور مستشرق ڈاکٹر مارڈریس کو حکومت فرانس کی وزارت معارف نے قرآن حکیم کی باسٹھ سورتوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرنے پر مامور کر لیا تھا، اس نے اعتراف کیا ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے ۔ بے شک قران کا طرز بیان خالق جل وعلا شانہ

کا طرز بیان ہے، بلاشبہ جن حقائق ومعارف پر یہ کلام حاوی ہے وہ ایک کلام الٰہی ہی ہوسکتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں شک وشبہ کرنے والے بھی جب اس کی تاثیر عظیم کو دیکھتے ہیں تو تسلیم واعتراف پر مجبور ہوتے ہیں، پچاس کروڑ مسلمان جو سطح زمین کے ہر حصے پر پھیلے ہوئے ہیں ان میں قران کی خاص تاثیر کو دیکھ کر مسیحی مشن میں کام کرنے والے بالا جماع اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا کہ جس مسلمان نے اسلام اور قران کو سمجھ لیا وہ کبھی مرتد ہوا ، یا قران کا منکر ہوگیا ہو۔

مسلمانوں میں تاثیر قرآنی کا یہ اعتراف اس مسیحی مستشرق سے ایک ایسے دور میں ہورہا ہے جبکہ خود مسلمان قران اور اسلام سے بیگانہ، اس کی تعلیمات سے دور، اس کی تلاوت سے غافل ہوچکے ہیں کاش! یہ مصنف اسلام اور قرآن کے اس دور کو دیکھتا جبکہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن کا عمل تھا اور انکی زبانوں پر قرآن کی آیات تھیں۔

اس طرح دوسرے مسیحی مصنفین نے بھی جو منصف مزاج ہیں اسی قسم کے اعتراف کئے ہیں مسٹر ولیم میور نے اپنی کتاب ''حیات محمدؐ'' میں واضح طور پر اس کا اعتراف کیا ہے، اور ڈاکٹر شبلی شمیل نے اس پر ایک مستقل مقالہ لکھا ہے۔

قران کے کلام الٰہی اور معجزہ نبوی ہونے پر دس وجوہ آپ سن چکے ہیں، آخر میں ایک اجمالی نظر اس پر ڈالئے، کہ محمد ﷺ پیدائشی یتیم ہوکر دنیا میں تشریف لائے ہیں عمر بھر کسی مکتب میں قدم نہیں رکھے، قلم اور کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا، اپنا نام بھی خود نہیں لکھ سکتے، اسی میں جوان ہوتے ہیں، آپؐ کی طبیعت عزلت پسند ہے، کسی کھیل، تماشا، جلسوں، ہنگاموں، میں جانے کے بھی عادی نہیں۔ شعر وسخن سے بھی مناسبت نہیں، کسی قومی اجتماع میں کبھی کوئی خطبہ دینے یا تقریر کرنے کا بھی عمر بھر اتفاق نہیں ہوتا، چالیس سال ہونے کے بعد جبکہ ادھیڑ عمر میں پہونچ جاتے ہیں، اور عادۃً کسی علم کے سیکھنے سکھانے کا وقت ختم ہوجاتا ہے، اس وقت آپؐ کی زبان مبارک پر ایک ایسا محیر العقول، جامع حقائق، فصاحت وبلاغت میں اعجاز نما کلام، آنے لگتا ہے، جو کسی بڑے سے بڑے عالم، ماہر اور فصیح وبلیغ سے بھی ممکن نہیں، جس کے ذریعہ آپؐ عرب کے بڑے بڑے فصحاء وبلغاء کو خطاب فرماتے ہیں، ان کے جلسوں میں پہونچ کر خطبے دیتے ہیں، اور پوری دنیا کے لئے عموماً، اور عرب کے لئے خصوصاً، یہ چیلنج سناتے ہیں، کہ کوئی اس کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ کرے، تو اس کے کسی چھوٹے سے حصہ کی مثال بنا کر دکھلا دے، اس پر پوری قوم مثال پیش کرنے سے عاجز ہوجاتی ہے۔

پوری قوم جو آپؐ کو پہلے ''امین'' کے لقب سے پکارتی ، اور تعظیم کرتی تھی، آپؐ کی مخالف ہوجاتی ہے، اس کلام کی تبلیغ سے باز رکھنے کے لئے دولت، حکومت اور ہر انسانی خواہش کی چیزیں پیش کرتی ہے، آپؐ ان میں سے کسی چیز کو قبول

نہیں کرتے، پوری قوم آپ ؐ کو اور آپ ؐ کے رفقاء کو ستانے، اور ان پر ظلم کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپ ؐ یہ سب کچھ برداشت کرتے ہیں مگر اس کلام کی تبلیغ نہیں چھوڑتے، قوم آپ ؐ کے قتل کی سازشیں کرتی ہے، جنگ وجدل پر امادہ ہو جاتی ہے، آپ ؐ کو اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ جانا پڑتا ہے، آپ ؐ کی قوم آپ ؐ کو وہاں بھی سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی۔

سارا عرب اور اہل کتاب آپ ؐ کی مخالفت پر جمع ہو جاتا ہے، آئے دن مدینہ پر حملے ہوتے ہیں، آپ ؐ کے مخالفین یہ سب کچھ کرتے ہیں، مگر قران کے چیلنج کو قبول کر کے ایک چھوٹی سی سورت قرآن کی مثل بنا کر پیش نہیں کرتے، قران ان کو غیرت دلاتا ہے اس پر بھی ان کی رگ حمیت میں حرکت نہیں ہوتی، صرف یہی نہیں کہ پورا عرب قران کی مثال پیش کرنے سے عاجز رہا۔ بلکہ خود وہ ذات اقدس جس پر یہ قرآن نازل ہوا، وہ بھی اس کی مثال اپنی طرف سے پیش نہیں کر سکتے، ان کا سارا کلام یعنی حدیث جس طرح کا ہے، قران کا کلام یقیناً اس سے ممتاز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے: قَالَ الَّذِيْنَ لاَ يَرْجُونَ لِقَاءَ نَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَـذَا أَوْ بَدِّلْهُ ،الایة ﴿۱۵﴾ (یونس)

جو لوگ آخرت میں ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسی جیسا ایک اور قرآن بنا دیجئے یا اسی کو بدل دیجئے، تو آپ فرما دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس کو بدل ڈالوں۔

ایک طرف تو قرآن کے یہ کھلے کھلے معجزات ہیں، جو اس کے کلام الٰہی ہونے پر شاہد ہیں، دوسری طرف اس کے مضامین ومضمرات اور حقائق ومعارف پر نظر ڈالئے تو وہ اس سے زیادہ محو حیرت کر دینے والی چیز ہے۔ نزول قرآن کے بتدائی دور کے چند سال تو اس حالت میں گذرے کہ قرآنی تعلیمات کو کھلے طور پر پیش کرنا بھی ممکن نہ تھا، رسول ﷺ خفیہ طور پر لوگوں کو اصول قرآنی کی طرف دعوت دیتے تھے، پھر بے شمار مزاحمتوں اور مخالفتوں کے نرغہ میں کچھ علانیہ دعوت بھی شروع کی جانے لگی، مگر قرآن کریم کے مجوزہ قانون کی تنفیذ کا کوئی امکان نہ تھا۔ ہجرت مدینہ کے بعد صرف دس سال ایسے ملے جن کو مسلمانوں کے لئے ازادی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، جس میں قرآنی نظام کا مکمل تعلیم اور تنفیذ کی کوشش اور کوئی تعمیری کام کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ان دس سال میں بھی آپ تاریخ اسلام پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی چھ سال دشمنوں کے نرغہ اور منافقین اور یہود مدینہ کی سازشوں سے کس کو فرصت تھی کہ کوئی تعمیری کام اور ایسا نظام جو ساری دنیا کے نظاموں سے مختلف ہوں، عملی طور پر نافذ کر سکے، مسلمانوں کے خلاف سب سے بڑے بڑے معرکے انہیں چھ سال کے اندر پیش آئے، غزوہ بدر، احد، احزاب وغیرہ، سب اسی مدت کے اندر ہوئے، ہجرت کے چھٹے سال، دس سال کے لئے حدیبیہ کا صلح نامہ لکھا گیا، اور صرف ایک سال اس معاہدہ پر قریش عرب قائم رہے، اس کے بعد انہوں نے اس کو بھی توڑ ڈالا۔ اور پھر جنگ

وجہاد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ظاہراسباب میں یہ صرف ایک دو سال ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کو اس کام کے لئے ملے، کہ قران کی دعوت کو عام کر سکیں، اور اس کے نظام کو نافذ کرنے کی کوشش کر سکیں، اسی عرصہ مین آپ ؐ نے بڑے بڑے سلاطین دنیا کو خطوط لکھے، قرآن کی دعوت ان کو پہونچائی، قرانی نظام کو قائم کرنے، پھیلانے کی سعی فرمائی، اور نبی کریم ﷺ کی آخری عمر تک اس آزادی کے صرف چار سال ہوتے ہیں، جن میں فتح مکہ کا جہاد بھی پیش آیا، اور مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ اب اس چار سال کی قلیل مدت کو دیکھئے، اور قران کے اس نفوذ واثر پر نظر ڈالئے، کہ رسول ﷺ کی وفات کے وقت تقریباً پورے جزیرۃ العرب پر قران کی حکومت تھی، ایک طرف سرحد روم تک، اور دوسری طرف عراق تک، تیسری طرف عدن تک، پہونچ چکی تھی۔

اگر اس سے بھی قطع نظر کر لی جائے کہ رسول اللہ ﷺ امی تھے، اس کو بھی نظر انداز کیا جائے کہ آپ ﷺ کی قوم ایک ایسی قوم تھی کہ جس نے کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کی تھی، اس کو بھی بھول جایئے کہ ساری دنیا آپ ﷺ کے خلاف تھی، اور مشرکین عرب، یہود ونصاریٰ، سب کے سب مل کر آپ ﷺ کو اور قرآن کو دنیا سے مٹانے پر تلے ہوئے تھے، بالکل ساز گار فضا مان لیجئے تو بھی ایک نئے نظام، نئے قانون اور نئے اصول کی پہلے تو تدوین وترتیب، پھر اس کی تعلیم وتفہیم پھر اسکی عملی تنفیذ اور اس کے ذریعہ ایک پاکباز معاشرہ، اور ملک بھر میں امن وسکون پیدا کرنے کے لئے کتنی مدت، کتنا سرمایہ، کتنے آدمی درکار ہیں، اور کیا وہ آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کو حاصل تھا؟ آج کے نظاموں کو سامنے رکھ کر حساب لگایئے تو ایک اندھے کی بھی آنکھیں کھل جائیں گی، کہ یہ نفوذ واثر یہ روحانی تاثیر بجز خاص قدرت الٰہیہ کسی طرح ظاہر نہیں ہو سکتی۔

اعجاز قرآنی کے پورے وجوہ اوران کی تفصیلات کا بیان ایک نہایت طویل بحث ہے، علماء امت نے اس پر بیسیوں مستقل کتابیں ہر زمانہ میں مختلف زبانوں میں تصنیف فرمائی ہیں، سب سے پہلے تیسری صدی ہجری میں جاحظ نے نظم القرآن، کے نام سے مستقل کتاب لکھی، پھر چوتھی صدی کے اوائل میں ابوعبداللہ واسطی نے بنام ''اعجاز القران'' ایک کتاب تصنیف کی، پھر اسی صدی میں ابن عیسی ربانی نے ایک مختصر رسالہ بنام ''اعجاز القرآن'' لکھا، قاضی ابوبکر باقلانی نے پانچویں صدی کے اوائل میں ''اعجاز القرآن'' کے نام سے ایک مفصل ومبسوط کتاب لکھی، علامہ جلال الدین سیوطی نے اتقان اور خصائص کبری میں، امام رازی نے تفسیر کبیر میں، قاضی عیاض نے شفاء میں، بڑی شرح وبسط کے ساتھ اس مضمون کی تفصیل لکھی، اخری دور میں مصطفیٰ صادق رافعی مرحوم نے ''اعجاز القران'' کے نام سے، اور جناب سید رشید رضا مصری نے ''الوحی المحمدی'' کے نام سے مستقل، جامع اور مبسوط کتابیں لکھیں، اردو زبان میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ایک رسالہ بنام

''اعجاز القران'' تصنیف فرمایا۔ یہ بھی قران مجید کی خصوصیات میں سے ہے، کہ اس کے ایک ایک مسئلہ پر مکمل تفسیروں کے علاوہ مستقل رسائل و کتابیں اتنی لکھی گئی ہیں کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ یہ مضمون اپنی پوری تفصیل کے ساتھ تو اس جگہ بیان نہیں ہوسکتا لیکن، جتنا بیان ہو چکا ہے وہ بھی ایک منصف مزاج انسان کو اس پر مجبور کر دینے کے لئے کافی ہے کہ قران مجید کو اللہ تعالی کا کلام اور رسول اللہ ﷺ کا عظیم الشان معجزہ تسلیم کرلے۔

بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ قران کے مقابلہ میں کتابیں اور مقالات لکھے گئے، مگر وہ محفوظ نہ رہے ہوں۔لیکن اگر ذرا بھی انصاف سے کام لیا جائے تو اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ جب سے قرآن نازل ہوا، پوری دنیا میں قرآن کے ماننے والے کم اور منکرین زیادہ رھے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہے کہ ذرائع نشر واشاعت جتنے منکرین قران کو حاصل رہے ہیں قرآن کے ماننے والوں کو اکثر قرون میں اس کا کوئی قابل ذکر حصہ حاصل نہیں رہا، قران اتنا بلند بانگ دعوی اپنے مخالفین کے سامنے کرتا ہے، ان کو چیلنج دیتا ہے، غیرتیں دلاتا ہے، اور مخالفین اسلام اسکے مقابلہ میں جان، مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں، اگر انہوں نے قرآن کا چیلنج قبول کر کے کوئی چیز مقابلہ کے لئے پیش کی ہوتی، تو کیسے ممکن تھا کہ وہ ساری دنیا میں شائع نہ ہوتی، اور ہر زمانہ میں منکرین قران مسلمانوں کے مقابلہ میں اسکو پیش نہ کرتے، اور مسلمانوں کی طرف سے اس پر جرح وقدح میں سینکڑوں کتابیں نہ لکھی گئی ہوتیں۔

اسلام کے قرن اول میں صرف ایک واقعہ مسلیمہ کذاب کا پیش آیا، کہ اس نے کچھ چند بے حیائی کے الٹے سیدھے کلمات لکھ کر یہ کہا تھا کہ یہ وحی آسمانی قرآن کی مثل ہے، مگر دنیا جانتی ہے کہ ان کلمات کا کیا حشر ہوا، خود اس کی قوم نے ان کے منہ پر ماردیئے، وہ کلمات ایسے شرمناک، غیر مہذب تھے کہ کسی مہذب سوسائٹی میں ان کو بیان بھی نہیں کیا جاسکتا، اور بہر حال جیسے بھی تھے وہ آج تک کتابوں میں نقل ہوتے چلے آئے ہیں، اگر کسی اور شخص نے کوئی اچھا کلام قرآن کے مقابلہ میں پیش کیا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا کی تاریخ اس کو یکسر بھلا دیتی، اور منکرین قران اس کو ہر قیمت پر باقی رکھنے کی کوشش نہ کرتے۔

وہ لوگ جو قرآن کے مقابلہ میں ہر وقت سینہ سپر تھے قرآن کے اس چیلنج کے جواب میں انہوں نے طرح طرح کی باتیں کیں، جن کو قرآن میں نقل کر کے جواب دیا گیا، مگر اس کا ایک واقعہ نہیں کہ کوئی کلام مقابلہ پر پیش کر کے اس کے

قران کا مثل ہونے کا دعوی کیا گیا ہو۔

ایک رومی غلام جو لوہاری کا کام کیا کرتا تھا، اور کچھ تورات اور انجیل پڑھا ہوا تھا، کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ سے ملتا تھا، عرب کے کچھ جاہلوں نے تعصب اور عناد سے یہ مشہور کیا، کہ رسول پاک ﷺ کو یہ قرآنی مضامین اس نے سکھائے ہیں، قرآن نے ان کا یہ اعتراض نقل کر کے خود جواب دیا، کہ جس شخص کی طرف سکھانے کی نسبت کرتے ہیں وہ تو خود عجمی ہے، عربی زبان کی بلاغت کو کیا جانے، اور یہ قرآن عربی کی انتہائی بلیغ کتاب ہے، سورۃ نحل کی ایت (۱۰۳) میں دیکھئے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَـٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۰۳﴾	اور ہمیں معلوم ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) کو ایک شخص سکھا تا ہے مگر جس کی طرف (تعلیم کی) نسبت کرتے ہیں اُس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے

کچھ لوگوں نے قران کی تحدّی کے جواب میں یہ کہا کہ: ''لو نشاء لقلنا مثل هذا'' (انفال: ۳۱) اگر ہم چاہتے تو ہم بھی قرآن کے مثل کلام کہہ دیتے''۔ لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ پھر چاہا کیوں نہیں؟ قرآن کے مقابلہ کے لئے سارا ایڑی چوٹی کا زور تو خرچ کیا، جان و مال کی قربانی دی، اگر تمہیں اس کا مثل کلام لکھنے یا کہنے کی قدرت تھی، تو قرآن کی اس تحدّی کے بعد تم نے اس کی مثل کلام بنا کر فتح کا سہرا اپنے سر کیوں نہیں لیا؟

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے کے بعد مخالفین نے کچھ شریفانہ سکوت نہیں کر لیا بلکہ جو کچھ ان کے منہ پر آیا، اس کے مقابلہ پر کہتے رہے، لیکن یہ پھر بھی کسی نے نہیں کہا کہ ہم میں سے فلاں آدمی نے قرآن جیسا فلاں کلام لکھا ہے، اس لئے قران کا یہ دعوی یکتائی (معاذ اللہ) غلط ہے۔ بعض معاندین کو یہ سوجھی کہ رسول پاک ﷺ جو قبل از نبوت چند روز کے لئے ملک شام تشریف لے گئے، اور راستہ میں، بحیرا، راہب سے ملاقات ہوئی وہ تورات کا ماہر تھا، اس سے آپؐ نے علوم سیکھے، مگر کوئی ان سے پوچھے کہ ایک دن کی ایک ملاقات میں اس سے یہ ساری علوم و معارف فصاحت و بلاغت کا اعجاز، اخلاقی تربیت، نظام خانگی، نظام مملکت کیسے سیکھ لئے۔ آج کل کے بعض معترضین نے کہا کہ کسی کلام کی مثل نہ بنایا جانا اس کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ وہ اللہ کا کلام یا معجزہ ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک اعلی درجہ کا ماہر بلاغت کوئی نثر یا نظم لکھے کہ دوسرا آدمی اس کی نظیر نہ لا سکیں۔

سعدی شیرازی کی گلستان، فیضی کی ''تفسیر بے نقط'' کو عام طور پر بے مثل و بے نظیر کتابیں کہا جاتا ہے، تو کیا وہ بھی معجزہ ہیں؟ لیکن اگر ذرا غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ سعدی اور فیضی کے پاس سامان تعلیم و تالیف کس قدر موجود تھا کتنے،

عرصہ تک انہوں نے تعلیم حاصل کی، برسوں مدرسہ میں پڑے رہے، راتوں جاگے، مدتوں محنتیں کیں، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ادب طے کئے، سالہا سال کی محنتوں اور دماغ سوزیوں کے نتیجہ میں اگر بالفرض فیضی یا حریری یا متنبّی یا کوئی اورعربی زبان میں اور سعدی فارسی میں اور ملٹن انگریزی میں یا ہومر یونانی میں، یا کالی داس سنسکرت میں ایسے ہوئے ہیں کہ، ان کا کلام دوسروں کے کلام سے فائق ہوگیا، تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

معجزہ کی تعریف تو یہ ہے کہ وہ اسباب متعارفہ کے توسط کے بغیر وجود میں آئے، کیا ان لوگوں کے لئے باقاعدہ تحصیل علوم، استادوں کے ساتھ طویل ملازمت وصحبت، وسیع مطالعہ، مدتوں کی مشاقی، ان کی علمی مہارت کے کھلے ہوئے اسباب نہیں ہیں؟ اگر ان کے کلام دوسروں سے ممتاز ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس نے کبھی کتاب وقلم کو ہاتھ نہ لگایا ہو، کسی مدرسہ ومکتب میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کرے کہ ہزاروں سعدی اور لاکھوں فیضی اس پر قربان ہوجانے کو اپنا سرمایہ فخر سمجھیں، اور ان کو جو کچھ علم وحکمت حاصل ہوئی اس کو بھی آپؐ ہی کے فیض تعلیم کا اثر قرار دیں۔اس کے علاوہ فیضی اور سعدی کے کلام کا مثل پیش کرنے کی کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا انہوں نے نبوت کا دعوی کیا تھا، اور اپنے کلام کے بے مثل وبینظیر ہونے کو اپنا معجزہ کہا تھا، اور دنیا کو اس کا چیلنج دیا تھا کہ ہمارے کلام کی کوئی مثال نہیں پیش کی جاسکتی؟ جس کے نتیجہ میں لوگ اس کا مقابلہ کرنے، اور مثال پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

پھر قران کی صرف فصاحت وبلاغت اور نظم وترتیب ہی بے مثال نہیں، لوگوں کے دل ودماغ پر اس کی تاثیرات عجیبہ اس سے زیادہ بے مثال اور حیرت انگیز ہیں، جن کی وجہ سے قوموں کے مزاج بدل گئے، انسانی اخلاق میں ایک کایاپلٹ ہوگئی، عرب کے تندخو، گنوار، حلم واخلاق اور علم وحکمت کے استاد مانے گئے، ان حیرت انگیز انقلابی تاثیرات کا اقرار صرف مسلمان ہی نہیں موجودہ زمانے کے سینکڑوں غیر مسلموں نے بھی کیا ہے، یورپ کے مستشرقین کے مقالات اس بارے میں جمع کئے جائیں، تو ایک مستقل کتاب بن سکتا ہے۔اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام شہادت الاقوام علی صدق الاسلام تحریر فرمائی ہے اس جگہ چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی کتاب ''تمدن عرب'' میں صفائی سے اس حیرت انگیزی کا اعتراف کیا، ان کے الفاظ کا ترجمہ اردو میں یہ ہے: اس پیغمبر اسلام، اس نبی امی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہ آئی تھی، رام کیا، اور اس درجہ پر پہنچادیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی

سلطنتوں کو زیروزبر کرڈالا، اوراس وقت بھی وہی نبی امی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگان اللہ کوکلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہیں۔

مسٹر''وڈول'' جس نے قرآن کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے لکھتا ہے کہ: جتنا بھی ہم اس کتاب (یعنی قران مجید) کوالٹ پلٹ کردیکھیں اسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی نامرغوبی، نئے نئے پہلوؤں سے اپنارنگ جماتی ہے، فوراً ہمیں مسخر کرلیتی ہے، متحیر بنادیتی ہے، اورآخر میں ہم سے تعظیم کراکر چھوڑتی ہے، اس کا طرز بیان باعتبار اس کے مضامین واغراض کے عفیف، عالیشان، اورتہدیدامیز ہے، اورجابجااس کے مضامین سخن کی غایت رفعت تک پہنچ جاتے ہیں۔غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپناپُر زوراثر دکھاتی رہے گی (شہادت الاقوام:۱۳)۔

مصر کے مشہور مصنف احمد فتحی بک ذاغلول نے ۱۸۹۸ء میں مسٹر کونٹ ہنردی کی کتاب ''الاسلام'' کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا، اصل کتاب فرنچ زبان میں تھی، اس میں مسٹر کونٹ نے قرآن کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں۔عقل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کے زبان سے کیونکرادا ہوا، جو بالکل امی تھا، تمام مشرق نے اقرار کرلیا ہے، کہ نوع انسانی لفظاومعنی ہرلحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہی کلام ہے جس کی بلندانشاء پردازی نے عمر بن خطابؓ کو مطمئن کردیا۔ان کو اللہ کا معترف ہونا پڑا، یہ وہی کلام ہے، کہ جب یحیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے جملے جعفر بن ابی طالبؓ نے حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں پڑھے، تواس کی انکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہوگئے۔اور بشپ چلااٹھا، کہ یہ کلام اسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسٰی علیہ السلام کا کلام نکلا تھا''(شہادت الاقوام:۱۴)۔

انسائکلو پیڈیابرٹانیکا، (جلد۱۶ص۵۹۹) میں ہے: قرآن کے مختلف حصص کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں: بہت سی آیات دینی واخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں، مظاہر قدرت، تاریخ، الہامات انبیاء کے ذریعہ اس میں اللہ کی عظمت ،مہربانی اورصداقت کی یاددلائی گئی ہے۔بالخصوص محمد ﷺ کے واسطہ سے اللہ کوواحداورقادر مطلق ظاہر کیا گیا ہے۔بت پرستی اورمخلوق پرستی کو بلالحاظ ناجائز قرار دیا گیا ہے۔قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔

انگلستان کے نامور مؤرخ ڈاکٹر گبن اپنی مشہور تصنیف (سلطنت روما کاانحطاط وزوال:۵/باب:۵۰) میں لکھتے ہیں: قرآن کی نسبت بحراٹلانٹک سے لے کر دریائے گنگا تک نے مان لیا ہے، کہ یہ پارلیمنٹ کی روح ہے،=

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

اور جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کوخوشخبری سنادو کہ ان کے لئے (نعمت کے) باغ ہیں جن کے نیچے سے

تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا

نہریں بہہ رہی ہیں جب اُنہیں ان میں سے کسی قسم کا میوہ کھانے کو دیا جائے گا تو کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا

مِنْ قَبْلُ وَأُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا وَّلَهُمْ فِيْهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

اوران کوایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے اور وہاں ان کے لئے پاک بیویاں ہوں گی اور وہ بہشتوں میں ہمیشہ رہیں گے

﴿٢٥﴾ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات سے عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی مکڑی وغیرہ) کی مثال بیان فرمائے۔

الَّذِيْنَ آمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ

جولوگ مومن ہیں وہ یقین کرتے ہیں کہ وہ ان کے رب کی طرف سے سچ ہے اور جولوگ کافر ہیں وہ کہتے ہیں

مَاذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖ

کہ اس مثال سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہی کیا ہے؟ اس سے (اللہ تعالیٰ) بہت لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت بخشتا ہے اور گمراہ بھی کرتا ہے

إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَا

تو صرف نافرمانوں ہی کو جو اللہ کے اقرار کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت)

أَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ أَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ

کے جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کو قطع کئے ڈالتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں

﴿٢٧﴾ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ

(کافرو!) تم اللہ تعالیٰ سے کیونکر منکر ہو سکتے ہیں جس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں جان بخشی پھر وہ تمہیں مارے گا

ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۸﴾

پھروہی تمہیں زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔ [۱۶]

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ

وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا کیں[۱۷] پھر۔

= قانون اساسی ہے، اورصرف اصول مذہب ہی کے لئے نہیں، بلکہ احکام تعزیرات، کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے ،جن پر نظام کا دارومدار ہے، جن سے نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے، جن کو حیات انسانی کی ترتیب وتنسیق سے گہرا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ محمد ﷺ کی شریعت سب پر حاوی ہے۔ یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے، کہ سارے جہاں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس جگہ مستشرقین یورپ کے اقوال واعترافات کا استیعاب نہیں کرسکتا کہ اس کی گنجائش نہیں۔ نمونہ کے طور پر چند اقوال نقل کئے گئے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ باعتبار فصاحت وبلاغت کے اور باعتبار اغراض ومقاصد کے اور باعتبار علوم ومعارف کے قران کے بینظیر و بے مثل ہونے کا اقرار صرف مسلمانوں نے نہیں، بلکہ ہر زمانے کے منصف مزاج غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔

قرآن نے ساری دنیا کو اپنی مثال لانے کا چیلنج دیا تھا، اور کوئی نہ لا سکا، آج بھی ہر مسلمان دنیا کے ماہرین علوم وسیاست کو چیلنج کر کے کہہ سکتا ہے، کہ پوری دنیا کی تاریخ میں ایک واقعہ ایسا دکھلا دو، کہ ایک بڑے سے بڑا ماہر حکیم فیلسوف کھڑا ہو کر اور ساری دنیا کے عقائد ونظریات اور رسوم وعادات کے خلاف ایک نیا نظام پیش کرے، اور اس کی قوم بھی اتنی جاہل اور گنوار ہو، پھر وہ اتنے قلیل عرصہ میں اس کی تعلیم کو بھی عام کر دے، اور عقلی تنفیذ کو بھی اس حد پر پہنچا دے کہ اس کی نظیر آج کے مضبوط ومستحکم نظاموں میں ملنا ناممکن ہوں۔ دنیا کی پہلی تاریخ میں اگر اس کی کوئی نظیر نہیں تو آج تو بڑی روشنی، روشن خیالی، بڑی تیز رفتاری کا زمانہ ہے، آج کوئی کر کے دکھلا دے، اکیلا کوئی نہ کر سکے، تو اپنی قوم کو بلکہ دنیا کی ساری اقوام کو جمع کر کے اس کی مثال پیش کرے۔

[۱۶] اس آیت میں دنیا کی زندگی اور موت کے بعد صرف ایک حیات کا ذکر ہے، جو قیامت کے روز ہونے والی ہے، قبر کی زندگی، جس کے ذریعہ قبر کا سوال وجواب، اور قبر میں ثواب وعذاب ہونا، قران کریم کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے ثابت ہے، یہاں اس کا ذکر نہیں، وجہ یہ ہے کہ یہ برزخی زندگی اس طرح زندگی نہیں ہے جو انسان

کو دنیا میں حاصل ہے، یا اخرت میں پھر ہوگی، بلکہ ایک درمیانی صورت مثل خواب کی زندگی کے ہے، اس کو دنیا کی زندگی کا تکملہ بھی کہا جا سکتا ہے اور آخرت کی زندگی کا مقدمہ بھی۔ اس لئے کوئی مستقل زندگی نہیں جس کا جداگانہ ذکر کیا جائے۔

[١٧] اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے انسان کو کسی نہ کسی حیثیت سے بلاواسطہ یا بالواسطہ فائدہ پہونچتا ہو، خواہ یہ فائدہ دنیا میں استعمال کرنے کا ہو، یا اخرت کے لئے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا، بہت سی چیزوں کا فائدہ تو انسان محسوس کرتا ہے، اس کی دوا، یا، غذا یا استعمال میں براہ راست آتی ہیں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ انسان کو ان سے فائدہ پہونچتا ہے، مگر اس کو خبر بھی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ جو چیزیں انسان کے لئے مضر سمجھی جاتی ہیں جیسے زہریلی اشیاء، زہریلے جانور وغیرہ۔ غور کریں تو وہ کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کے لئے نفع بخش بھی ہوتی ہیں، جو چیزیں انسان کے لئے ایک طرح سے حرام ہیں دوسری کسی طرح اور حیثیت سے ان کا نفع بھی انسان کو پہونچتا ہے۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ابن عطاء نے اس آیت کے تحت فرمایا، کہ اللہ تعالی نے ساری کائنات کو تمہارے واسطے اس لئے پیدا فرمایا کہ ساری کائنات تمہاری ہو، اور تم اللہ تعالی کے لئے ہو، اس لئے عقل مند کا کام یہ ہے کہ جو چیز اسی کے لئے پیدا ہوتی ہے، وہ تو اس کو ملے گی، اس کی فکر میں لگ کر اس ذات سے غافل نہ ہو جس کے لئے یہ پیدا ہوا ہے۔ (بحر محیط)۔

اس ایت سے بعض علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں میں اصل یہ ہے کہ وہ انسان کے لئے حلال و مباح ہوں، کیونکہ وہ اسی کے لئے پیدا کی گئی ہیں، بجز ان چیزوں کے کہ شریعت نے حرام قرار دیدیا، اس لئے جب تک کسی چیز کی حرمت قرآن وسنت سے ثابت نہ ہو، اس کو حلال سمجھا جائے گا۔

اس کے بالمقابل بعض علماء نے یہ قرار دے دیا، کہ انسان کے فائدے کے لئے کسی چیز کے پیدا ہونے سے اس کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لئے اصل اشیاء میں حرمت ہے، جب تک قرآن وسنت کی کسی دلیل سے جواز ثابت نہ ہو، ہر چیز حرام سمجھی جائے گی، بعض علماء نے توقف فرمایا۔

تفسیر بحر محیط میں ابن حیان نے فرمایا، کہ صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں اقوال مذکورہ میں سے کسی کے لئے حجت نہیں، کیونکہ ﴿خلق لکم﴾ میں حرف لام سببیت بتلانے کے لئے آیا ہے، کہ تمھارے سبب سے یہ چیزیں پیدا کی گئی ہیں، اس سے نہ انسان کے لئے اُن چیزوں کے حلال ہونے پر کوئی دلیل قائم ہو سکتی ہے، نہ حرام ہونے پر، بلکہ حلال وحرام کے احکام جداگانہ قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں، انھیں کا اتباع لازم ہے، اس آیت میں زمین کی پیدائش پہلے =

إِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۹﴾

آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر چیز سے خبردار ہے ۔[۱۸]

=اوراسمانوں کی پیدائش بعد میں ہونا بلفظ''ثم'' بیان کیا گیا ہے،اوریہی صحیح ہے،اور(سورۃ والنازعات:۳۰)میں جو یہ ارشاد ہے''والارض بعد ذالک دحاها''،یعنی زمین کواسمانوں کے پیدا کرنے کے بعد بچھایا،اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین کی پیدائش اسمانوں کے بعد ہوئی ہو، بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ زمین کی درستی اوراس میں سے پیداوارنکالنے وغیرہ کے تفصیلی کام اسمانوں کی پیدائش کے بعد ہوئے ،اگر چہ اصل زمین کی تخلیق اسمانوں سے پہلے ہوچکی تھی ۔(بحرمحیط وغیرہ)۔یا''بعد'' بمعنی مع ہے،اس آیت سےاسمانوں کی تعداد سات ہونا ثابت ہے،اس سےمعلوم ہوا کہ علم ھیئت والوں کااسمانوں کی تعدادنو(۹)بتلانا غلط،بےدلیل اورمحض خیالات پرمبنی ہے۔

[۱۸] اس ایت کریمہ کی تفسیر میں اہل السنۃ کےدوقول منقول ہیں:ایک یہ کہ یہاں''استوی الی السماء''بمعنی ''ارتفع الی السماء'' ہے(مرادآسمان کی طرف چڑھنااور بلند ہونا)۔معروف مفسرابن جریرنے اسی معنی کوراجح قرار دیاہے۔ چنانچہ اپنی تفسیر میں''استواء الی السماء'' کےمعنی کے بارے میں علماءکااختلاف نقل کرکےفرماتے ہیں:﴿ثم استوی الی السماء فسواھن سبع سمٰوات ﴾ کامعنی یہ ہے کہ،پھر وہ اسمان پر چڑھا اور بلند ہوااوراپنی قدرت سےتدبیر فرمائی،اورانہیں سات کی تعداد میں پیدافرمایا۔اب یہاں''استوی الی السماء'' کامعنی ظاہر یعنی ''ارتفاع الی السماء'' مرادلیا گیااور''ارتفاع الی السماء'' کی کیفیت کواللہ تعالی کے سپرد کردیا گیا(یعنی بفحوائے ایت کریمہ'' ثم استوی الی السماء''اس کااسمان کی طرف چڑھنا ثابت اور برحق ہے، لیکن چڑھنے کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں،جسےاللہ تعالی کے سپردکرناضروری ہے۔'' استوی الی السماء'' کادوسرامعنی قصدتام ہےیعنی پھراللہ تعالی نےآسمانوں کی طرف قصدفرمایا۔

امام ابن کثیرؒ نے سورۂ بقرہ اورامام بغویؒ نے سورۂ فصلت کی تفسیر میں اسی معنی کوترجیح دی ہے۔چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں ''ثم استوی الی السماء ''کامعنی یہ ہے کہ پھراس نےاسمانوں کی طرف قصدفرمایا،یہاں=

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَآئِكَةِ إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ
اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا
خَلِيْفَةً قَالُوْا أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ
ہوں تو انہوں نے کہا کہ کیا تو اس میں ایسے شخص کو خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کُشت وخون کرتا پھرے؟ اور ہم
نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّيْ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾
تیری تعریف کے ساتھ تسبیح وتقدیس کرتے رہتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے [۱۹]

= ''استویٰ'' قصد کرنے اور متوجہ ہونے کے معنی میں ہے کیونکہ یہ ''الیٰ'' کے ساتھ متعدی ہے۔ امام بغویؒ نے بھی '' ثــم استوی الی السماء ''کامعنی ''عمدالی خلق السماء'' کیا ہے، یعنی اس نے آسمانوں کوخلق فرمانے کا قصد فرمایا۔ واضح ہو کہ یہاں ''استوا'' بمعنی ''قصد'' کی تفسیر کلام کو معنی ظاہر سے پھیرنا قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ فعل ''استویٰ'' حرف ''الیٰ'' سے ملا ہوا ہے، اور حرف ''الیٰ'' غایت اور انتہا پر دلالت کرتا ہے، جس کی وجہ سے یہ فعل ''استویٰ'' ایک ایسے معنی کی طرف منتقل ہوگیا جو حرف مقترن یعنی ''الیٰ'' کے بالکل مناسب ہے۔ اس کی ایک اور مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: عیـنـا یشـرب بهاعبادالله ۔ الدہر:٦۔ یعنی چشمہ، جس سے اللہ کے بندے سیراب ہونگے۔ اب ''یشرب'' کا اصل معنی پینا ہے لیکن یہاں سیراب ہونا مراد ہے یعنی ''یشرب'' بمعنی ''یروی'' کیونکہ فعل ''یشرب'' حرف ''باء'' کے ساتھ ملکر آیا ہے، لہٰذا بمعنی ''یروی'' کی طرف منتقل ہوگیا، جو ''باء'' کے مناسب ہے۔ ثابت ہوا کہ بعض اوقات فعل اپنے متعلقہ حرف کی وجہ سے اپنے اصل معنی سے معنی دیگر کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، تاکہ کلام میں حرف کے معنی کی مناسبت پیدا ہوجائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ''استواء'' کا مذکورہ معنی متعلقہ حرف ''الیٰ'' کی مناسبت سے ہے لہٰذا یہ معنی ظاہر سے عدول قرار نہیں پائے گا۔

[۱۹] پچھلی آیتوں میں اللہ جل شانہ کی خاص وعام نعمتوں کا ذکر کرکے انسان کو ناشکری اور نافرمانی سے بچنے کی ہدایت کی گئی، اب ان دس آیتوں میں آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اسی سلسلہ میں ذکر فرمایا ہے کیونکہ نعمت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک

صوری یعنی محسوس، جیسے کھانا، پینا، روپیہ پیسہ، مکان جائداد، دوسری معنوی، جیسے عزت، آبرو، مسرت، علم، پچھلی آیات میں صوری اور ظاہری نعمتوں کا ذکر تھا، اوران آیتوں میں معنوی نعمتوں کا ذکر ہے، کہ ہم نے تمھارے باپ آدم علیہ السلام کو دولت علم دی، اور مسجود ملائک بنانے کی عزت دی اور تم کوان کی اولاد میں ہونے کا فخر عطاء کیا۔خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے جب تخلیق آدم اور دنیا میں اس کی خلافت قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو فرشتوں سے بظاہران کا امتحان لینے کی لئے اس ارادے کا ذکر فرمایا، جس میں اشارہ یہ تھا کہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، فرشتوں نے رائے یہ پیش کی کہ انسانوں میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جوفساداورخون ریزی کریں گے، اُن کوزمین کی خلافت اور انتظام سپرد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس کام کے لئے تو فرشتے زیادہ انسب معلوم ہوتے ہیں، کہ نیکی ان کی فطرت ہے، برائی کا صدور ہی اُن سے ممکن نہیں، وہ مکمل اطاعت گذار ہیں، دنیا کے انتظامات بھی وہ درست کرسکیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے غلط ہونے کا اظہار اول ایک حاکمانہ طرز سے کیا، کہ خلافت ارضی کی حقیقت اور اس کی ضروریات سے تم واقف نہیں، اس کو میں ہی مکمل طور پر جانتا ہوں۔

پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقام علم میں آدمؑ کے تفوق کا ذکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا، کہ خلافت ارض کے لئے زمینی مخلوقات کے نام اور اُنکے خواص وآثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متحمل نہیں۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے، کہ اللہ جل شانہ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا ان سے مشورہ لینا مقصود تھا، یا محض ان کو اطلاع دینا پیش نظر تھا، یا فرشتوں کی زبان سے ان کی رائے کا اظہار کرانا اس کا منشأ تھا۔

سو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو یہاں پیش آتی ہے، جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں، اور اپنے علم وبصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دوسرے عقلاء اور اہل دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے، یا ایسی صورت میں جہاں حقوق دوسروں کے بھی مساوی ہوں۔تو ان کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے، جیسے دنیا کی عام کونسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں صورتیں نہیں ہوسکتیں، اللہ تعالی خالق کائنات ہیں ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں، اور ظاہر وباطن ہر چیز ان کے علم وبصر کے سامنے برابر ہے، ان کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں۔

اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہے، جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں، اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالی ہی سب کے خالق اور مالک ہیں، فرشتے ہوں یا جن وانس سب ان کی مخلوق

ومملوک ہیں، کسی کو حق نہیں کہ ان کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کر سکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا؟ اور فلاں کام کیوں نہیں کیا؟'' لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ ﴿۲۳﴾(انبیاء:)اللہ تعالی سے اس کے کسی فعل کے متعلق سوال نہیں کیا جا سکتا، اور سب سے ان کے اعمال کا سوال کیا جائے گا۔

بات یہی ہے کہ درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں، اور نہ اس کی ضرورت ہے، مگر صورت مشورہ کی بنائی گئی، جس میں مخلوق کو سنت مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہو سکتا ہے، جیسے رسول کریم ﷺ کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کی ہدایت قرآن کریم میں فرمائی گئی جیسا کہ (ال عمران:۱۵۹) میں ہے، حالانکہ آپ تو صاحب وحی ہیں، تمام معاملات اوران کے تمام پہلو آپ کو بذریعہ وحی بتلائے جا سکتے تھے۔ مگر آپ کے ذریعہ مشورہ کی سنت جاری کرنے اور امت کو سکھانے کے لئے آپ کو بھی مشورہ کی تاکید فرمائی گئی۔ غرض فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کے اظہار سے ایک فائدہ تو تعلیم مشورہ کا حاصل ہوا، (کمافی روح البیان)۔

دوسرا فائدہ خود الفاظ قرآنی کے اشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل واعلم کوئی مخلوق اللہ تعالی پیدا نہیں کریں گے۔ اور تفسیر ابن جریر میں عبداللہ بن عباس سے ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے، کہ خلقت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ :''**لن یخلق اللہ خلقا اکرم علیـــہ منـــا و لا اعلم**''۔ یعنی اللہ تعالی کوئی مخلوق ہم سے افضل واعلم پیدا نہ فرماویں گے۔ اللہ تعالی جل شانہ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام مخلوق سے زیادہ افضل اور اعلم ہوگی، اس لئے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے خلیفہ بنانے کا ذکر کیا گیا، کہ وہ اپنے خیال کا اظہار کریں۔

چنانچہ فرشتوں نے اپنے علم وبصیرت کے مطابق نیازمندی کے ساتھ رائے کا اظہار کیا کہ جس مخلوق کو آپ خلیفہ زمین بنا رہے ہیں، اس میں تو شر وفساد کا مادہ بھی ہے، وہ دوسروں کی اصلاح اور زمین میں امن امان کا انتظام کیسے کر سکتا ہے، جبکہ وہ خود خونریزی کا بھی مرتکب ہوگا...... اس کے بجائے آپ کے فرشتوں میں شر وفساد کا کوئی مادہ نہیں، وہ خطاؤں سے معصوم ہیں، اور ہر وقت آپ کی تسبیح وتقدیس اور عبادت واطاعت میں لگے ہوتے ہیں، وہ بظاہر اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

غرض اس سے (معاذ اللہ) اللہ کے فعل پر اعتراض نہیں، کیونکہ فرشتے ایسے خیالات وحالات سے معصوم ہیں، بلکہ مقصد محض دریافت کرنا تھا، کہ ایک ایسی معصوم جماعت کے موجود ہوتے ہوئے دوسری غیر معصوم مخلوق پیدا کر کے یہ

کام اس کے حوالے کرنا، اوراس کوترجیح دینا کس حکمت پرمبنی ہے؟۔ چنانچہ اس کے جواب میں پہلے توحق تعالی نے اجمالی طور پر یہ فرمایا کہ: ''**انی اعلم مالا تعلمون**''یعنی تم خلافت الٰہیہ کی حقیقت اوراس کے لوازم سے واقف نہیں،اس لئے یہ سمجھ رہے ہو کہ ایک معصوم مخلوق ہی اس کوانجام دے سکتی ہے،اسکی پوری حقیقت کوہم ہی جانتے ہیں۔

اس کے بعد فرشتوں کواس کا کچھ تفصیلی علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائنات عالم کے نام اوران کے خواص وآثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی،فرشتوں کی فطرت وجبلت اس کے مناسب نہ تھی،وہ سب آدم علیہ السلام کوسکھائے اور بتلائے گئے تھے،مثلا دنیا کی نافع ومضر چیزیں،اوران کے خواص وآثار،ہر جانداراور ہرقوم کے مزاج وطبائع اوران کے اثار،ان چیزوں کے معلوم کرنے کے لئے طبیعت ملکی متحمل نہیں،فرشتہ کیا جانے کہ بھوک کیا ہوتی ہے؟ پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے؟ نفسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے؟ کسی چیز سے نشہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ سانپ اوربچھوکا زہر بدن پرکیا اثر کرتا ہے؟۔غرض زمینی مخلوقات کے نام اورخواص وآثار کی دریافت فرشتوں کے مزاج اورمخصوص طبعیت سے بالکل علیحدہ چیزتھی، یہ علم صرف آدمؑ ہی کوسکھلایا جاسکتا تھا،انہیں کوسکھلایا گیا،پھرقرآن کی کسی تصریح یا اشارہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم کسی تنہائی میں فرشتوں سے علیٰحدہ دی گئی،اس لئے ہوسکتا ہے کہ تعلیم سب کے لئے عام ہی ہو،مگراس تعلیم سے فائدہ اٹھانا آدم علیہ السلام کی طبعیت میں تھا،وہ سیکھ گئے،فرشتوں کی فطرت میں نہ تھا،وہ نہ سیکھ سکے،اسی لئے یہاں تعلیم کوآدمؑ کی طرف منسوب کیا گیا،اگر چہ یہ تعلیم فی نفسہ عام تھی،آدمؑ اورملائکہ دونوں کوشامل تھی،اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ظاہری تعلیم کی صورت ہی عمل میں نہ آئی ہو، بلکہ ادم علیہ السلام کی فطرت میں ان چیزوں کا علم ابتدائے افرینش سے ودیعت کردیا گیا ہو،جیسے بچہ ابتداء ولادت میں ماں کا دودھ پینا جانتا ہے،بطخ کا بچہ تیرنا جانتا ہے،اس میں کسی ظاہری تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالی کی قدرت میں توسب کچھ ہے، وہ فرشتون کا مزاج اورطبیعت بدل کران کوبھی یہ چیزیں سکھاسکتے تھے،توان کوکیوں نہ سکھایا گیا؟ مگراس کا حاصل تو یہ ہوا،کہ فرشتوں کوہی انسان کیوں نہ بنادیا، کیونکہ اگرفرشتوں کی جبلت وفطرت کوبدلا جاتا تو پھروہ فرشتے نہ رہتے، بلکہ انسان ہی ہوجاتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ زمینی مخلوقات کے اسماءاوران کےخواص وآثار کا آدم علیہ السلام کوعلم دیا گیا،جوفرشتوں کے بس کا نہیں تھا،اور پھران مخلوقات کوفرشتوں کے سامنے کرکے سوال کیا گیا،کہ اگرتم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ ہم سے زیادہ کوئی مخلوق اعلم وافضل پیدانہیں ہوگی۔یا یہ کہ زمین کی خلافت ونیابت کے لئے فرشتے بہ نسبت انسان کے زیادہ موزوں ہیں

توان چیزوں کے نام اورخواص بتلاؤ جن پرخلیفہ زمین کوحکومت کرنا ہے۔ یہاں سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوگیا کہ حاکم کے لئے ضروری ہے کہ اپنی محکوم رعایا کے مزاج وطبائع سے اوران کے خواص وآثار سے پورا واقف ہو۔اس کے بغیر وہ ان پرعدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی نہیں کرسکتا۔ جو شخص یہ نہیں جانتا کہ بھوک سے کیسی اور کتنی تکلیف ہوتی ہے؟ اگراس کی عدالت میں کوئی دعوی کسی کوبھوکا رکھنے کے متعلق پیش ہوتو وہ اس کا فیصلہ کیا اور کس طرح کرے گا؟

غرض اسی واقعہ سے حق تعالی شانہ نے فرشتوں کو یہ بتلادیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم ہونے کودیکھنا نہیں، بلکہ اس کودیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پورا واقف ہو،ان کے استعمال کے طریقوں اوران کے ثمرات کوجانتا ہو، اگرتمہارا یہ خیال صحیح ہے کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں،توان چیزوں کے نام اورخواص بتلاؤ؟

فرشتوں کا اظہاررائے چونکہ کسی اعتراض یافخر وغروریااپنا استحقاق جتلانے کے لئے نہیں بلکہ محض اپنے خیال کا اظہار،ایک نیازمند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا،اس لئے فوراًبول اٹھے: قَالُوا سُبْحَانَکَ لاَ عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّکَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَکِيمُ ﴿۳۲﴾ پاک ہیں آپ،ہم کوعلم نہیں،مگر وہی جوآپ نے عطافرمایا،بیشک آپ بڑے علم وحکمت والے ہیں۔

دوسرا سوال اس جگہ یہ ہے،کہ فرشتوں کواس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خونریزی کرے گا،کیاانہیں علم غیب تھا،یامحض اٹکل اورتخمینہ سے انہوں نے یہ سمجھا تھا؟اس کا جواب جمہور محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ہی ان کوانسان کے حالت اوراس کے ہونے والے معاملات بتلادیئے تھے،جیسا کہ بعض آثار میں ہے کہ جب اللہ تعالی نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کوخلیفہ زمین بنانے کا ذکر فرمایا،توفرشتوں نے اللہ تعالی ہی سے اس خلیفہ کا حال دریافت کیا،اللہ سبحانہ وتعالی ہی نے ان کوبتلایا(روح المعانی)اس سے فرشتوں کوتعجب ہوا کہ جب انسان کا حال یہ ہے کہ وہ فساد وخون ریزی بھی کرے گا،تواس کونیابت زمین کے لئے منتخب فرمانا کس حکمت پرمبنی ہے؟اس کا ایک جواب توحق تعالی کی طرف سے آدم علیہ السلام کے علمی تفوق کا اظہار فرما کردیا گیا،اورفساد وخوں ریزی سے جوشبہ اس کے استحقاق نیابت پرکیا گیا تھا؟اس کا جواب(انی اعلم مالاتعلمون) میں اجمالا دے دیا گیا،جس میں اشارہ ہے کہ جس چیز کوتم خلافت ونیابت کے منافی سمجھ رہے ہودرحقیقت وہ ہی اس کی اہلیت کا بڑا سبب ہے،کیونکہ نیابت زمین کی ضرورت ہی رفع فساد کے لئے ہے،جہاں فساد نہ ہووہاں خلیفہ اورنائب بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں،غرض یہ بتلادیا گیا کہ منشائے الٰہی یہ ہے کہ جس طرح اس نے ایک ایسی مقدس معصوم مخلوق فرشتے پیدا کردئے جس سے کسی گناہ،خطاء کا صدور ہوہی نہیں سکتا،اورجس طرح اس نے شیاطین پیدا کردئے جن میں نیکی وبھلائی کی صلاحیت نہیں،اسی طرح ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا منشاٰ الٰہی ہے،جس میں

خیروشر، نیکی اور بدی کامخلوط مجموعہ ہو،اورجس میں خیروشر کے دونوں جذبات ہوں، اور جوجذبات شرکومغلوب کر کے خیر کے میدان میں آگے بڑھے،اوررضائے الٰہی کاخلعت حاصل کرے۔

اس قصہ آدمؑ اورتعلیم اسماء کے واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ زبان اورلغت کے اصل واضع خوداللہ تعالی ہیں، پھراس میں مخلوق کے استعمالات سے مختلف صورتیں اورمختلف زبانیں پیداہوگئیں،امام اشعری نے اسی آیت سے استدلال کر کے اللہ تعالی ہی کوواضع لغت قراردیاہے۔

اس واقعہ میں قران حکیم کے یہ بلیغ الفاظ بھی قابل نظر ہیں کہ جب فرشتوں کوخطاب کر کے فرمایا کہ ان چیزوں کے نام بتلاؤ،لفظ''انبؤنی'' ارشادفرمایا کہ مجھے بتلاؤ،اور جب آدم علیہ السلام کواسی چیز کا خطاب ہواتولفظ "انبئهم" فرمایا گیا،یعنی آدمؑ کوحکم ہوا کہ فرشتوں کویہ اسماء بتلائیں،اس طرز بیان کے فرق سے واضح ہوگیا کہ آدم علیہ السلام کومعلم کادرجہ دیا گیا،اورفرشتوں کوطالب علم کا،جس میں آدم علیہ السلام کی فضیلت وتفوق کاایک اہم صورت سے اظہارکیا گیاہے،اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علوم میں بھی کمی اورزیادتی ہوسکتی ہے، کیونکہ جس چیز کاان کوعلم نہیں تھا،آدم علیہ السلام کے ذریعہ ان کوبھی ان چیزوں کااجمالی طورپر کسی نہ کسی درجہ میں علم دیدیا گیا۔

زمین کاانتظام اوراس میں اللہ کا قانون نافذکرنے کے لئے اس کی طرف سے کسی خلیفہ کامقرر ہونا،جوان آیات سے معلوم ہوا،اس سے دستورمملکت کااہم باب نکل آیا،کہ اقتداراعلی تمام کائنات اور پوری زمین پرصرف اللہ تعالی کاہے،جیسا کہ قران مجید کی بہت سی آیات اس پرشاہد ہیں:ان الحکم الاللہ، (یوسف:۴۰،۶۷)اورلہ ملک السمٰوات و الارض (بقرہ:۱۰۷) اورالالہ الخلق و الامر (اعراف:۵۴)،وغیرہ،زمین کےانتظام کے لئے اللہ تعالی کی طرف سےخلیفہ آتے ہیں، جوباذن اللہ،زمین پرسیاست وحکومت اور بندگان اللہ تعالی کی تعلیم وتربیت کا کام کرتے،اوراحکام الٰہیہ کانفاذ کرتے ہیں،اس خلیفہ ونائب کاتقرر بلاواسطہ خوداللہ تعالی کی طرف سے ہوتاہے،اس میں کسی کےکسب وعمل کا کوئی دخل نہیں،اسی لئے پوری امت کااجماعی عقیدہ ہے، کہ نبوت کسبی چیزنہیں،جس کوکوئی اپنی سعی وعمل سے حاصل کرسکے، بلکہ اللہ تعالی ہی خوداپنےعلم وحکمت کے تقاضے سے خاص خاص افرادکواس کام کے لئے چن لیتے ہیں،قران حکیم نے جگہ جگہ اس کااظہارفرمایاہےارشادہے:اللہ یصطفی من الملائکة رسلاومن الناس ان اللہ سمیع بصیر (حج:۷۵)۔اللہ انتخاب کرلیتاہےفرشتوں میں سےاپنے رسول کواورانسانوں میں سے، بیشک اللہ تعالی سننےوالا دیکھنےوالا ہے۔

نیزارشادہے:اللہ اعلم حیث یجعل رسالته "(انعام:۱۲۴)اللہ تعالی ہی خوب جانتے ہیں، کہ اپنی رسالت کس

کوعطافرمادیں۔

یہ خلیفہ من اللہ بلا واسطہ حق تعالی سے اس کے احکام معلوم کرتے اور پھران کو دنیا میں نافذ کرتے ہیں، یہ سلسلہ خلافت کا آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر خاتم الانبیاء ﷺ تک ایک ہی انداز میں چلتا رہا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اس زمین پر اللہ تعالی کے اخری خلیفہ ہوکر بہت ہی اہم خصوصیات کے ساتھ تشریف لائے۔ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپؐ سے قبل انبیاء خاص خاص قوموں یا ملکوں کی طرف مبعوث ہوتے تھے، ان کا حلقہ حکومت و اختیار انہی قوموںؑ اور ملکوں میں محدود ہوتا تھا۔ابراہیم علیہ السلام ایک قوم کی طرف، اور لوطؑ دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے، موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام اوران کے درمیان آنے والے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے۔

رسول پاک ﷺ کو پورے عالم اوراس کی دونوں قوم، جنات وانسان کی طرف بھیجا گیا، آپؐ کا اختیار واقتدار پوری دنیا کی دونوں قوموں پر حاوی فرمایا گیا، قران کریم نے آپؐ کی بعثت ونبوت کے عام ہونے کا اعلان اس آیت میں فرمایا: **قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا الذی لہ ملک السمٰوٰت والارض** (اعراف:۱۵۸)۔آپؐ کہہ دیجئے کہ: اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف، اللہ وہ ذات ہے جس کے قبضہ میں ہے ملک آسمانوں اورزمین کا۔

اورصحیح مسلم :۵۲۳،۵۲۱، میں ہے کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تمام انبیاء پر چھ چیزوں میں خاص فضیلت بخشی گئی ہے ان میں سے **ایک یہ ھے** کہ مجھ کو تمام عالم کا نبی ورسول بنا کر بھیجا گیا۔

دوسری خصوصیت: خاتم الانبیاء ﷺ کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت ونیابت جس طرح خاص خاص ملکوں اورقوموں میں محدود ہوتی تھی، اسی طرح ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص ہوتی تھی، اس کے بعد دوسرا رسول آجاتا، تو پہلی رسول کی خلافت ختم ہوکر آنے والے رسول کی خلافت قائم ہوجاتی تھی۔ ہمارے رسول ﷺ کو اللہ تعالی نے خاتم الانبیاء بنادیا، کہ آپؐ کی خلافت قیامت تک قائم رہے گی، اس کا زمانہ بھی کوئی مخصوص زمانہ نہیں، بلکہ جب تک زمین وآسمان قائم اورزمانہ کا وجود ہے وہ بھی قائم ہے۔

تیسری خصوصیت: یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات وشریعت ایک زمانہ تک محفوظ رہتی اورچلتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں تحریفات ہوتے ہوئے وہ کالعدم ہوجاتی تھیں، اس وقت کوئی دوسرا رسول اوردوسری شریعت بھیجی جاتی تھی۔ ہمارے رسول ﷺ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کا دین آپؐ کی شریعت قیامت تک محفوظ رہے گی، قران مجید جو رسول پاک ﷺ پر نازل ہوا اس کے توالفاظ اورمعانی سب چیزوں کی حفاظت اللہ تعالی نے خود اپنے ذمہ لے لی، اورارشاد فرمایا: **انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ**

لحافظون(حجر: ۹) ۔ہم نے ہی قران نازل فرمایا،اور ہم اس کے محافظ ہیں۔اسی طرح رسول پاک ﷺ کی تعلیمات وارشادات جن کوحدیث کہاجاتا ہے،اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالی نے ایک خاص انتظام فرمادیا،کہ قیامت تک آپؐ کی تعلیمات اورارشادات کوجان سے زیادہ عزیز سمجھنے والی ایک جماعت باقی رہے گی،جو آپؐ کے علوم ومعارف اور آپؐ کے شرعی احکام صحیح صحیح لوگوں کوپہونچاتی رہے گی،کوئی اس جماعت کونہ مٹاسکے گا،اللہ تعالی کی تائید غیبی ان کے ساتھ رہے گی۔خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے انبیاءعلیہم السلام کی کتابیں اور صحیفیں سب مسخ ومحرّف ہوجاتے،اور بالاخر دنیا سے گم ہوجاتے،یاغلط سلط باقی رہتے تھے،رسول پاک ﷺ کی لائی ہوئی کتاب قران اورآپؐ کی بتلائی ہدایات،حدیث سب کی سب اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ قیامت تک موجودومحفوظ رہیں گی،اسی لئے اس زمین پرآپؐ کے بعدنہ کسی نئے نبی اوررسول کی ضرورت ہے،نہ کسی اورخلیفۃ اللہ کی گنجائش۔

چوتھی خصوصیت: رسول پاک ﷺ کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاءعلیہم السلام کی خلافت جومحدودزمانہ کے لئے ہوتی تھی،ہرنبی ورسول کے بعددوسرارسول منجانب اللہ مقرر ہوتا،اورخلافت کاکام سنبھالتا تھا۔خاتم الانبیاء ﷺ کازمانہ خلافت تاقیامت ہے،اس لئے قیامت تک آپؐ ہی اس زمین میں خلیفۃ اللہ ہیں،آپؐ کی وفات کے بعدنظام عالم کے لئے جونائب ہوگا،وہ خلیفۃ الرسول اورآپکانائب ہوگا۔صحیح بخاری رقم:۳۴۵۵،ومسلم:۱۸۴۲،کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **کانت بنوااسرائیل تسوسهم الانبیاء کلماهلک نبی خلفه نبی وانه لانبی بعدی وسیکون خلفاء فیکثرون** ۔بنی اسرائیل کی سیاست وحکومت ان کے انبیاءکرتے تھے،ایک نبی فوت ہوتا،تودوسرانبی آجاتاتھا،اورخبردارہو،کہ میرے بعدکوئی نبی نہیں،ہاں میرے خلیفہ ہوں گےاور بہت ہوں گے۔

پانچویں خصوصیت: رسول پاک ﷺ کی یہ ہے کہ آپؐ کے بعدآپؐ کی امت کے اجماع کواللہ تعالی نے وہ مقام عطافرمایا،جوانبیاءعلیہم السلام کاہوتا ہے،یعنی امت کے اجماع کومعصوم قراردیدیا،کہ آپؐ کی پوری امت کبھی گمراہی اورغلطی پرجمع نہ ہوگی،یہ پوری امت جس مسئلہ پراجماع اوراتفاق کرے وہ حکم الٰہی کامظہر سمجھاجائے گا،اسی لئے کتاب اللہ اورسنت رسول ﷺ کے بعداسلام میں تیسری حجت اجماع امت قراردی گئی ہے رسول اللہ ﷺ کاارشاد ہے: **لا تجتمع هذه الامة علی الضلالة (ترمذی:۲۱۶۷)**۔ میری امت کبھی گمراہی پرمجتمع نہ ہوگی۔اس کی مزید تفصیل اس حدیث سے معلوم ہوجاتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے: **لاتزال طائفة من امتی علی الحق منصورین لایضرهم من خالفهم حتی یأتی امر الله.(ابن ماجه:رقم:۱۰ وبخاری کتاب الاعتصام:ومسلم کتاب الامارة، والترمذی رقم:۲۲۲۹).** یعنی کہ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پرقائم رہے گی،دنیاکتنی ہی بدل جائے حق کتناہی مضمحل ہوجائے مگرایک جماعت حق کی حمایت

ہمیشہ کرتی رہے گی، اورانجام کار وہی غالب رہے گی۔اس سے بھی واضح ہوگیا کہ پوری امت کبھی گمرہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی ،اور جب کہ امت کا مجموعہ معصوم قرار دیا گیا تو خلیفہ رسول کا انتخاب بھی اسی کے سپرد کردیا گیااور خاتم الانبیاءﷺ کے بعد نیابت زمین اور نظم ونسق حکومت کے لئے انتخاب کا طریقہ مشروع ہوگیا، یہ امت جسے خلافت کے لئے منتخب کردے، وہ خلیفہ رسول کی حیثیت سے نظام عالم کا واحد ذمہ دار ہوگا اور خلیفہ سارے عالم کا ایک ہی ہوسکتا ہے۔خلفائے راشدین کے اخری عہد تک یہ سلسلہ خلافت صحیح اصول پر چلتا رہا،اوراسی لئے ان کے فیصلے صرف دینی اور ہنگامی فیصلوں کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ایک محکم دستاویزاورایک درجہ میں امت کے لئے حجت مانے جاتے ہیں، کیونکہ خودرسول پاکﷺ نے ان کے متعلق فرمایا:علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهديين عضوا عليها بالنواجذ، الحديث(ابن ماجه: ۴۲،ابوداود رقم:۴۶۰۷،ترمذی: ۲۶۷۶) ۔میری سنت کولازم پکڑو،اورسنت خلفاء راشدین کو۔خلفاءراشدہ اورصحابہ وتابعین کے بعدکچھ طوائف الملو کی کا اغاز ہوا،مختلف خطوں میں مختلف امیر بنائے گئے،ان میں سے کوئی بھی خلیفہ کہلانے کا مستحق نہیں،ہاں کسی ملک یاقوم کا امیر خاص کہا جاسکتا ہے، اور جب پوری دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع کسی ایک فرد پر متعذر ہوگیا،اور ہر ملک ،ہرقوم کا علیحدہ امیر بنانے کی رسم چل گئی،تو مسلمانوں نے اس کا تقرراسی اسلامی نظریہ کےتحت جاری رکھا،کہ ملک کے مسلمانوں کی اکثریت جس کوامیر منتخب کرےوہ،ہی اسی ملک کا امیراوراولوالامر کہلائے،قران مجید کےارشاد:وامرهم شوری بينهم (شوری:۳۸) کےعموم سےاس پراستدلال کیا جاسکتا ہے۔اسمبلیاں اسی طرز عمل کا ایک نمونہ ہیں،فرق اتنا ہے کہ جمہوری ملکوں کی اسمبلیاں اورانکے ممبران بالکل آزاداورخودمختار ہیں،محض اپنی رائے سے جوچاہیں،اچھایابرا قانون بناسکتے ہیں،اسلامی اسمبلی اوراس کے ممبران اورمنتخب کردہ امیرسب اس اصول وقانون کے پابند ہیں،جواللہ تعالی کی طرف سےاس کے رسولﷺ کےذریعہ ان کوملا ہے،اس اسمبلی یامجلس شوری کی ممبری کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں،اورجس شخص کویہ منتخب کریں،اس کے لئے بھی کچھ حدودوقیود ہیں،پھران کی قانون سازی بھی قران وسنت کے بیان کردہ اصول کے دائرہ میں ہوسکتی ہے،اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کاان کواختیار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے فرشتوں کو مخاطب کرکے جوارشادفرمایا کہ میں زمین میں اپنی طرف سے خلیفہ بنانے والا ہوں،اس سے دستور مملکت کی چنداہم دفعات پرروشنی پڑتی ہے:اول یہ کہ آسمان اورزمین میں اقتداراعلی اللہ تعالی کا ہے،دوسرے یہ کہ زمین میں اللہ تعالی کے احکام کی تنفیذ کے لئے اس کا خلیفہ اس کا رسول ہوتا ہے،اورضمنی طور پریہ بھی واضح ہوگیا کہ خلافت الھیہ کا سلسلہ جب رسولﷺ پرختم ہوگیا،تواب خلافت رسول کا سلسلہ اس کے قائم مقام ہوا،اوراس خلیفہ کا تقررملت کےانتخاب سے قرارپایا۔مزید تفصیل کے لئےتفسیر قرطبی ملاحظہ کریں۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَآئِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي

اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے کیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان (چیزوں)

بِأَسْمَآءِ هَٰؤُلَآءِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا

کے نام بتاؤ۔ انہوں نے کہا کہ تو پاک ہے، جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں

عَلَّمْتَنَآ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يَآ آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ

بیشک تو دانا (اور) حکمت والا ہے۔ (تب) اللہ تعالیٰ نے (آدم علیہ السلام کو) حکم دیا کہ اے آدم! تم ان (فرشتوں) کو ان (چیزوں) کے نام بتاؤ

فَلَمَّآ أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّيْ أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ

جب انہوں نے ان (چیزوں) کے نام بتائے تو (اللہ نے فرشتوں سے) کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں

وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَآئِكَةِ

اور زمین کی (سب) پوشیدہ باتیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو (سب) مجھے معلوم ہے۔ اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا

اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوْآ إِلَّآ إِبْلِيْسَ ؕ أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ

کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو وہ سب کے سب سجدہ میں گر پڑے مگر شیطان نے انکار کیا

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ [۲۰]

اور غرور میں آ کر کافر بن گیا۔

---

[۲۰] ربط آیات: پچھلے واقعہ میں جب آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہو چکی، اور دلائل سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ صلاحیت خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے، وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، اور ملائکہ کو ان میں سے بعض علوم حاصل ہیں، اور جنات کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے، اور اس حیثیت خاص سے کہ ملائکہ و جن ہر دو گروہ کے علوم کے یہ جامع ہیں، اس کا شرف ہر دو گروہ پر ظاہر ہو گیا، اب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس مقدمہ کو معاملہ سے بھی

ظاہر فرما دیں ،اور ملائکہ اور جنوں سے ان کی کوئی خاص تعظیم کرائی جائے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ ان دونوں سے کامل اور مصداق ہے۔

آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری،

کے ہیں۔اور آدم علیہ السلام ان علوم خاصہ میں ملائکہ اور جن ہر دو گروہ سے کامل اور دونوں کے علوم وقویٰ کو جامع ہیں۔اب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اس کامل کی کوئی ایسی تعظیم کرائی جائے کہ عملاً بھی یہ امر ظاہر ہو جاوے، کہ یہ ان دونوں سے کامل اور جامع ہیں ،جب تو یہ دونوں ان کی تعظیم کر رہے ہیں، اور گویا زبان حال کہہ رہے ہیں، کہ جو اوصاف ہم میں الگ الگ ہیں، وہ ان کے اندر یکجا ہیں، اس لئے جو عمل تعظیمی تجویز فرمایا گیا ہے، اس کی حکایت ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں ،سب فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کیا، اور غرور میں آ گیا۔اور یہ واقعہ قران کریم میں سات مرتبہ ذکر کیا گیا ہے:(۱) یہاں:(۲) سورۃ اعراف:ایت نمبر۱۱،سے :(۳)سورۃ حجر:۲۸،سے (۴)سورۃ بنی اسرائیل :۶۱،سے۔ (۵)سورۃ کہف:۵۰ ،سے (۶)سورۃ طٰہٰ :۱۱۵،سے ۔(۷)سورۃ صٓ :۷۱،سے۔جبکہ ہم یہاں تفصیل کرتے ہیں اور باقی جگہوں میں اس تفصیل پر اکتفاء کریں گے۔

اس آیت میں جو بات صراحتاً مذکور ہے، وہ تو یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا۔مگر آگے جب استثناء کر کے یہ بتلا دیا گیا، کہ سب فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا، تو اس سے ثابت ہوا کہ سجدہ آدم کا حکم اس وقت کی تمام موجودین کے لئے تھا، جیسا کہ سورۂ اعراف:۱۲، میں ہے، جن میں فرشتے اور ابلیس سب داخل ہیں، مگر حکم میں صرف فرشتوں کے ذکر پر اس لئے اکتفاء کیا گیا کہ وہ سب سے افضل اور اشرف تھے۔

اس ایت میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں، اور سورۃ یوسف میں یوسف علیہ السلام کے والدین اور بھائیوں کا مصر پہنچنے کے بعد یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا مذکور ہے، ''وخروا لہ سجدا''(یوسف:۱۰۰)۔یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سجدہ عبادت کے لئے نہیں ہوسکتا، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک وکفر ہے اور سجدہ عبادت ہے، جس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ کسی وقت کسی شریعت میں جائز ہو سکے، اس کے سوا کوئی احتمال نہیں کہ قدیم انبیاء کے زمانے میں سجدے کا بھی وہی درجہ ہوگا جو ہمارے زمانے میں سلام، مصافحہ، معانقہ اور دست بوسی یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانے کا ہے۔

جصاصؒ نے احکام القران میں یہی فرمایا ہے، کہ انبیاء سابقین کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم اور تحیہ کے لئے سجدہ

مباح تھا،شریعت محمدیہ میں منسوخ ہوگیا،اور بڑوں کی تعظیم کے لئے صرف سلام، مصافحہ کی اجازت دی گئی،رکوع۔سجدہ اور بہ ہیئت نماز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دیدیا گیا۔توضیح اس کی یہ ہے کہ اصل کفر وشرک اور غیراللہ کی عبادت تو اصول ایمان کے خلاف ہے، وہ کبھی کسی شریعت میں جائز نہیں ہوسکتے،لیکن کچھ افعال واعمال ایسے ہیں جو اپنی ذات میں شرک وکفر نہیں،مگر لوگوں کی جہالت اور غفلت سے وہ افعال ذریعہ شرک وکفر کا بن سکتے ہیں،ایسے افعال کو انبیاء سابقین کی شریعتوں میں مطلقاً منع نہیں کیا گیا، بلکہ ان کو ذریعہ شرک بنانے سے روکا گیا، جیسے جانداروں کی تصویر بنانا،اور استعمال کرنا،اپنی ذات میں کفر وشرک نہیں،اس لئے پچھلی شریعتوں میں جائز تھا۔

اسی طرح سجدہ تعظیمی پچھلی شریعتوں میں جائز تھا،لیکن آخر کار لوگوں کی جہالت سے یہی چیزیں شرک وبت پرستی کا ذریعہ بن گئیں،اور اسی راہ سے انبیاء علیہم السلام کے دین وشریعت میں تحریف ہوگئی،اور پھر دوسرے انبیاء اور دوسری شریعتوں نے آکر اس کو مٹایا،شریعت محمدیہ چونکہ دائمی اورابدی شریعت ہے، رسول کریم ﷺ پر نبوت ورسالت ختم اور آپ ﷺ کی شریعت اخری شریعت ہے،اس لئے اس کو مسخ وتحریف سے بچانے کے لئے ہر ایسے سوراخ کو بند کردیا گیا، جہاں سے شرک وبت پرستی آسکتی تھی۔

تصویر سازی اوراس کے استعمال کواس وجہ سے حرام کیا گیا،سجدہ تعظیمی اس وجہ سے حرام ہوا،ایسے اوقات میں نماز پڑھنے کو حرام کردیا گیا ہے،جن میں مشرکین اور کفار اپنے معبودوں کی عبادت کیا کرتے تھے،کہ یہ ظاہری مطابقت کسی وقت شرک کا ذریعہ نہ بن جائے۔صحیح مسلم :رقم:۲۲۴۹، میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: **قال رسول اللہ ﷺ لایقولن احدکم عبدی وامتی کلکم عبیداللہ،وکل نسائکم اماء اللہ............ ولایقل العبدلسیدہ ،ربی،ولکن لیقل سیدی .**

یعنی آقاؤں کو یہ حکم دیا کہ اپنے غلام کو عبد یعنی اپنا بندہ کہہ کر نہ پکاریں،اور غلاموں کو یہ حکم دیا کہ وہ آقاؤں کو اپنا رب نہ کہیں حالانکہ لفظی معنی کے اعتبار سے بندہ کے معنی غلام کے اور رب کے معنی پالنے والے اور تربیت کرنے والے کے ہیں، ایسے الفاظ کا استعمال ممنوع نہ ہونا چاہئے تھا،مگر محض اس لئے کہ یہ الفاظ موہم شرک ہیں،کسی وقت جہالت سے یہی الفاظ اقاؤں کی پرستش کا دروازہ نہ کھولدیں،اس لئے ان الفاظ کے استعمال کو روک دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ اور یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور بھائیوں کا سجدہ جو قرآن میں مذکور ہے یہ سجدہ تعظیمی تھا،جو ان کی شریعت میں سلام،مصافحہ،اور دست بوسی کا درجہ رکھتا تھا، اور جائز تھا،

شریعت محمدیہ کوکفروشرک کے شائبہ سے بھی پاک رکھنا تھا،اس لئے اس شریعت میں اللہ تعالی کے سوا کسی کو بقصد تعظیم بھی سجدہ یا رکوع کرنا جائز نہیں رکھا گیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ نماز جو اصل عبادت ہے،اس میں چار طرح کے افعال ہیں،کھڑا ہونا،بیٹھنا،رکوع،سجدہ ان میں سے پہلے دو۔یعنی کھڑا ہونا اور بیٹھنا تو ایسے کام ہیں،جو عادۃً بھی انسان اپنی ضرورتوں کے لئے کرتا ہے،اور عبادۃً بھی نماز میں کئے جاتے ہیں،مگر رکوع اور سجدہ ایسے فعل ہیں،جو انسان عادۃً نہیں کرتا،وہ عبادت ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔اس لئے ان دونوں کو شریعت محمدیہ میں عبادت ہی کا حکم دے کر غیر اللہ کے لئے ممنوع کردیا۔

اب یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ سجدہ تعظیمی کا جواز تو قرآن کی مذکورہ آیات سے ثابت ہے۔شریعت محمدیہ میں اس کا منسوخ ہونا کس دلیل سے ثابت ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث متواترہ مشہورہ سے سجدہ تعظیمی کا حرام ہونا ثابت ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں غیر اللہ کے لئے سجدہ تعظیمی کو جائز قرار دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ شوہر کو سجدہ کیا کریں مگر اس شریعت میں سجدہ تعظیمی مطلقا حرام ہے،اس لئے کسی کو کسی کے لئے جائز نہیں۔

یہ حدیث بیس (۲۰) صحابہ کرام کی روایت سے ثابت ہے،اصول حدیث کی معروف کتاب تدریب الراوی میں ہے کہ جس روایت کو دس صحابہ کرام نقل فرمادیں،تو وہ حدیث متواتر ہوجاتی ہے،جو قران کی طرح قطعی ہے،یہاں تو بیس صحابہ کرام سے مروی ہے۔بحوالہ بیان القران :از اشرف علی تھانویؒ۔اس مسئلہ کی اہتمام کی وجہ سے ہم بیان القرآن (۲۲/۱) کا تفصیل ناظرین کو پیش کرتے ہیں: الفقہ: سجدة التحية كان مشروعا فى شرع من قبلنا،ونسخ فى شرعنا،و الناسخ مارواه الترمذى عن ابى هريرة عن النبى ﷺ قال: لو كنت امرا احداان يسجد لأحدلأمرت المرأة ان تسجد لزوجها.وفى العزيزى قال الشيخ حديث صحيح الخ، وقال الترمذى وفى الباب عن معاذبن جبل ،وسراقه بن مالك ،وصهيب، و عقبه بن مالك بن جعشم ،وعائشة ،وابن عباس ،وعبدالله بن ابى اوفى ،وطلق بن على ،وام سلمة ،وانس ،وابن عمررضى الله عنهم .

وفى نيل الاوطاروقدروى حديث ابى هريرة المذكور.البزار باسنادفيه سليمان بن داود اليمانى وهوضعيف، واخرج قصة معاذ المذكورة فى الباب (واللتى عزاها الماتن الى احمدوابن ماجة عن عبدالله بن ابى اوفى)البزار -باسنادرجاله رجال الصحيح ،واخرجهاايضا البزارو الطبرانى

باسناداخروفيه النهاس بن قحم وهوضعيف ،واخرجهاايضا البزارو الطبرانى باسناداخررجاله ثقات، وقضية السجودثابتة ،عن حديث ابن عباسؓ عند البزار،ومن حديث سراقة عند الطبرانى ،ومن حديث عائشة عنداحمد وابن ماجة ،ومن حديث عصمة عند الطبرانى ،وعن غيرهؤلاء، وحديث عائشة الذى ذكره المصنف ساقه ابن اماجة باسنادفيه على بن زيدبن جدعان وفيه مقال،(ضعّفه كثيرون ووثقه بعضهم ،واخرج له مسلم مقرونابغيره كمافى التهذيب).وبقية اسناده من رجال الصحيح، واوردهذا الحديث ابن الجارودفى المنتقى فهوصحيح عنده، فانه لايأتى الابالصحيح كماصرح به السيوطى فى ديباجة "جمع الجوامع" وحديث عبدالله بن ابى اوفیؓ ساقه ابن ماجة باسنادصالح اه ،مختصرا،وفى الترغيب للمنذرى بعدروايت انس بن مالكؓ مع قصة الجمل رواه احمدباسنادجيد،رواه ثقات مشهورون ،و البزاربنحوه، ورواه النسائى مختصرا،وابن حبان فى صحيحه من حديث ابى هريرة بنحوه ،باختصار،وفيه بعدرواية قيس بن سعد،رواه ابوداودوفى اسناده شريک وقداخرج له مسلم ووثق، قلت لماسكت عنه ابوداودفهوحجة عنده، وفيه بعدحديث ابن ابى اوفى، رواه ابن ماجة وابن حبان فى صحيحه اهـ ،وساق فى كنز العمال بعدهذا الحديث متوناعديدة وطرقاكثيرة نسردمنهاسوى التى ذكرناهاانفا،حاكم عن بريدة ،وقيس بن سعد،ولم يتعقب عليهما السيوطى ،بل صححهمافى الصغيرصريحا،فهماحديثان صحيحان ،و الترمذى عن انس ،و الطبرانى فى الكبيرعن ابن عباسؓ ،و البيهقى عن ابى هريرة ،وعبد ابن حميدعن جابر،و الطبرانى فى الكبير،وسعيدبن منصورعن زيدبن ارقم اهـ ،وفى الخصائص الكبرى روايات كثيرة منهاروايةِ ثعلبة بن ابى مالک عند ابى نعيم ،ورواية يعلى بن مرة عند الطبرانى ، وابى نعيم ،ووجدت فى قرطاس عتيق بخطى ولم يحضرنى الآن من اين كنت اخذته ان الحديث رواه ابوداود والطبرانى و الحاكم و البيهقى عن قيس بن سعد،و الترمذى عن ابى هريرة ،و الدارمى و الحاكم عن بريدة ،واحمد عن معاذ ،و الطبرانى عن سراقة بن مالک ،وصهيب وعقبة بن مالک وغيلان بن مسلم .ورواه ابن ابى شيبة عن عائشة، و البيهقى ايضاعن ابى هريرةؓ كذافى "جمع الجوامع" للسيوطى انتهى مافى القرطاس.

فهذه اسانيدعديدة بعضهاصحيح وبعضهاحسن وبعضهاضعيف يقوى باخر ،ومنتهى هذه الاسانيدالى عشرين صحابيا،لواقتصرناعلى الطرق المارة. و الحديث اذاروى من عشرة فهومتواترعلى القول المختار(كمافى تدريب الراوى:)،فهذالحديث متواتر بالاولى ،وان اختلف احدفى تواتره للاختلاف فى العدد الذى يحصل به التواترفلايمكنه ان ينكرمن كونه مشهورا،ويكفى المشهور لنسخ المتواترعلى ماتقررفى الاصول،واطلنا الكلام فيه للضرورة الداعية فى هذا الزمان والايكفينااجماع الامة ،ولم تراحدمن السلف ولامن الخلف اختلف فى حرمة سجدة التحية مع التصفح كثيرمن كتب التفسيرو الحديث و الفقه. ومانقل عن بعض الصوفية فى كتب تواريخهم لم يثبت عنهم ،وان ثبت فلاعبرة بقولهم لانهم ليسوامن يعتد بقولهم فى الاجماع ،وان سلم كونهم ممن يعتدبقوله فى الاجماع فلايعتدبه ايضافى هذا المقام، لان الاجماع السابق لايرتفع بالاختلاف اللاحق ،نعم لايلام عليهم لعدم اشتغالهم بتحقيقات العلمية ،ومع ذلك لايحتج بقولهم وصنيعهم، لاسيمااذاثبت النكيرعن بعض اكابرهم ،ويحتاج الى هذا الكلام ،اذاسلم ان سجود الملائكة لآدم وسجوداخوة يوسف وابيه له كان سجودا حقيقياوكان تحية لهما،و الحال انه مختلف فيه فقال بعضهم لم يكن سجوداحقيقيابل هوكناية عن التعظيم، وقال بعضهم كان آدم ويوسف بمنزلة الكعبة لهم ،فاللام بمعنى الى ،وقال بعضهم اللام للسبب، اى كانت السجدة لله تعالى شكراعلىماانعم الله عليهم، لاجل يوسف ،وآدم على نبينا وعليهما السلام ،واذاجاء الاحتمال بطل الاستدلال ،وحينئذ لايحتاج الى اثبات النسخ ،ويثبت الحرمة بخبر الواحدايضا ،ونقول ايضاان الاية وان كانت قطعى الثبوت ولكنهاظنى الدلالة فلابعدفى نسخها،بحديث ظنى الثبوت قطعى الدلالة كمالايخفى ،والله اعلم بالصواب.

مذکورہ عبارت میں کچھ غلطیاں ہیں،اس کی اصلاح کے پیش نظر ہم مذکورہ احادیث کوتفصیل سے پیش کرتے ہیں، تاکہ مخالفین کواعتراض کی کوئی گنجائش نہ رہے،وہ یہ ہے کہ مولانا شرف علیؒ نے امام ترمذی سے جوروایات نقل کی ہیں،وہ چونکہ امام ترمذی نے فی الباب میں ذکر کیا ہے،اور باب میں چونکہ خاوند کے حقوق ذکر کئے جاتے ہیں،اس لئے مذکورہ احادیث میں حق الزوج ذکر ہے،اوراس کے ضمن میں بعض احادیث میں سجدے کاذکر بھی ہے،لیکن بعض میں نہیں۔تواسی وجہ سے ہم نے

یہاں مناسب سمجھا، کہ وہ احادیث جس میں سجدہ کے متعلق ذکر ہے، وہ تفصیل سے ذکر کریں، پہلی روایت ابو ہریرہؓ کا ہے۔

۱. عـن ابـی هـريــرة عن النبیﷺ، قال: لو كنت امر احدا ان يسجدلاحدلامرت المرأة ان تسجد لزوجها. ترمذی مع التحفة: ۳۵۸/۴.

۲۔ دوسری حدیث معاذؓ کا ہے: عـن مـعـاذبـن جبـل قـال قـال رسـول اللهﷺ: لو كنت امراً احدا ان يسـجـد لاحـدلامـرت الـمـرأة ان تسجدلزوجها، من حقه عليها. رواه احمدفی مسنده: ۳۸۱/۵. و الطبرانی: ۵۲/۲۰۔

۳. عـن عـائشة قـالـت: قال رسول اللهﷺ لو كنت امراً احداان يسجدلاحدلامرت المرأة ان تسجدلزوجها: ابن ماجة (۲/۴۰۲) ابن ابی شيبة ۳۰/۳۹۸. مسنداحمد: ۶/۷.

۴: عـن سـراقـه بـن مـالک بـن جـعشـم انـه قـال: يارسول اللهﷺ: اناكنانری ملوک العجم فيسـجـدوا لهم وانت احق ان نسجدلک، قال رسول اللهﷺ لو امرت احداان يسجدلاحدلامرت الـمــرأة ان تسجدلزوجها، كتاب العيال لابن ابی الدنيا. ۸/۱۲۱. طبرانی. ۷/۱۲۹.

۵. (عـن قيس بن سعدؓ قال: اتيت الحيرة فرأيتم يسجدون لمرزبان لهم، فقلت لَرسول اللهﷺ احـق ّان يسـجـدلـه، فـاتيت رسول اللهﷺ فقلت انی اتيتُ الحيرة، فرأيتهم يسجدون لمرزبان لهم فـانـت احـق بـان يُسـجـدلک، فـقـال لـی: ارأيـت لومـررت بقبـری، اكنـت تسجدلـه؟ فقلـت لا، قـال: لاتـفـعـلوا، لو كنت امراحدا ان يسجد لاحد، لامرت المرأة ان يسجدن لازواجهن، لماجعل اللهلهم عليهن من حق۔ ابوداود: رقم: ۲۱۴۰، حاکم: ۱۸۷/۲، ارواء: ۵۷/۷، ۵۸۔

یعنی قیس بن سعدؓ سے روایت ہے کہا، میں حیرہ آیا، وہاں میں نے لوگوں کو اپنے سرداروں کو سجدہ کرتے دیکھا، میں نے کہا رسول اللہﷺ زیادہ حق دار ہیں، کہ ان کو سجدہ کیا جاوے، میں رسول اللہﷺ کے پاس آیا میں نے عرض کی کہ میں حیرہ میں گیا، وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سرداروں کو سجدہ کرتے تھے، آپﷺ سجدہ کے زیادہ لائق ہیں، آپؐ نے فرمایا مجھ کو اس بات کی خبر دے، اگر تو میری قبر سے گذرے تو اس کو سجدہ کرے گا؟ میں نے کہا نہیں، فرمایا: اگر میں سجدہ کرنے کا حکم کرتا، تو سب سے پہلے عورتوں کو حکم کرتا، کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں، اس لئے کہ اللہ تعالی نے عورتوں پر مردوں کا حق رکھا ہے۔ طبرانی فی الكبير ۱۸/۳۵۱. ابوداود: ۲/۲۱۱.

۶: عن جابرؓ،قال: قال رسول اللہﷺلوکنت امراً احدا، یسجدلاحد، لکان النساء لازواجھن مصنف ابن ابی شیبة۶/۲۹۹ .

۷: عن ابن عباسؓ قال:(یعنی رسول اللہﷺ‘لا آمراحدا ان یسجدلاحد،ولوامرت احدا،یسجدلاحد،لامرت المرأةان تسجدلزوجھا.طبرانی۱۱/۳۵۷ .

۸: عن غیلان بن سلمةؓ، قال: کنامع النبیﷺفی سفره فقال: لوکنت امراً احداان یسجدلاحدلامرت المرأة ان تسجدلزوجھا(طبرانی:۱۸/۲۴۶)

۹: عن انسؓ ،فقال:ﷺ لایصلح لبشران یسجدلبشر،ولوصلح لبشر،ان یسجدلبشرلامرت المرأة ان تسجدلزوجھامن عظم حقه علیھا.(مسنداحمد:۲۰/۶۵.۶۴)و الترغیب:۲/۶۷۴ .

۱۰: عن صھیبؓ ،فقال: ﷺکذبوا علی انبیائھم کماحرفوا کتابھم ،لوامرت احداان یسجدلاحدلامرت المرأة ان تسجدلزوجھا.طبرانی فی الکبیر ۸/۳۶

۱۱: عن سلمانؓ،قالؐ: ولوامرت احداان یسجدلاحدلامرت المرأة ان تسجدلزوجھالعظم حقه علیھا.(اخبار اصفھان:۲/۱۹۳)

۱۲: عن بریـــــدةؓ ،فقالؐ: لوکنت امر احداان یسجدلاحدلامرت المرأة ان تسجد لزوجھا. مستدرک حاکم :۴/۱۷۲.

۱۳: عن زیدبن ارقمؓ ،ان معاذاقال :یارسول اللہ أرأیت اھل الکتاب یسجدون لأساقفتھم وبطارقتھم افلانسجدلک؟ قال: لوکنت امر احداان یسجدلاحد،لامرت المرأة ان تسجد لزوجھا،ولاتودی المرأة حق زوجھاحتی لوسئلھانفسھاعلی قتب لاعطته. طبرانی: ۵/۲۰۸

۱۴: عن عبداللہبن بی اوفیؓ، فقالؐ: لوکنت امر احداان یسجدلاحدلامرت المرأة ان تسجدلزوجھا.خصائص:۲/۲۵۵ .

۱۵: عن ثعلبة بن ابی مالکؓ، فقالوایارسول اللہ کنانحن احق بالسجودمن ھذه البھیمة، قال ﷺ لوینبغی لشیء من الخلق ان یسجد لشیء دون اللہلأنبغی للمرأة ان تسجد لزوجھا.(خصائص کبری للسیوطی:۲/۲۵۷).

۱۶ : عن يعلى بن مـــرة قال خرج النبیﷺ یومافجاء بعيريرغوحتى سجدله فقال المسلمون، نـحـن احـق ان نسـجـدلـلـنبـیﷺ فـقـال : لـو كـنـت امـر احداان يسجدلغیرالله لامرت المرأة ان تسجدلزوجها: خصائص ۲/۲۵۸)۔

۱۷: حدیث عمر موقوف: عمر رضی اللہ عنہ کو شام میں ایک دہقان ملاقات کے لئے آیا، دیکھتے ہی سربسجود ہوا، تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ماهـذا السجود؟قال: هكذانفعل بعظمائنا: فقال عمر: اسجد للذى خلقک. الحديث (التاريخ دمشق: ۱۰۷/۶۸. وابن ابی شيبة فی المصنف: ۶/۷۶.

۱۸ : رواية ابـی موسی جو کہ امام طبرانی اور ھیثمی نے مجمع الزوائد: ۳۲/۶، میں لمبی روایت نقل کی ہے درمیان میں لکھتا ہے: وقـدقـال لـه(نـجـاشی) عمرو وعمارة ،انهم لايسجدون لک،فلماانتهينابدرنامن عنده من القسيسين و الرهبان،اسجدوا للملک،فقال جعفر،انالانسجدالاالله .

۱۹: شُنیؒ، نے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی نے علیؓ کو سجدہ کیا، تو آپ نے منع کیا اور فرمایا: اسـجـدلله۔ابـن ابـی شيبة فی المصنف: ۶/۷۶.

۲۰: ایک روایت دانیال علیہ السلام سے بھی ابونعیم نے دلائل النبوۃ: ۸۳/۱، میں نقل کیا ہے لمبی حدیث ہے درمیان میں فرماتا ہے، فدعادانيال فادخل عليه ولم يدخل عليه احدالايسجدله ،فوقف دانيال ولم يسجد،فقال الـمـلک لـمـن فـی البيـت: اخـرجوافخرجوا،فقال بخت نصرلدانيال مامنعک ان تسجدلی؟فقال دانيـال ان لـی ربـااتـانـی هـذا العلم الذى سمعت به على ان لااسجدلغيره فخشيت ان اسجدلک فينسلخ عنی هذا العلم، ثم اصيرفی يدک اميا،فلاتنفع بی فتقتلنی، فرأيت ترک السجدة اهون من قتلی وخطرسجدة اهون من الكرب والبلاء الذى انت فيه،فتركت السجودنظراالی ذلک۔

اور ایک اثر عمر بن عبدالعزیز سے منقول ہے کہ: اس کو ایک دربان نے سجدہ کیا تو اس نے اس کو معزول کردیا، اور فرمایا انـمـا السـجـدة لله عزوجل: ۹ ۱/۱۳۶ . چونکہ پہلے ایک روایت کا ترجمہ گذر گیا، اس پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اب یہاں بعض بے ادب لوگ آدمؑ علیہ السلام کو کچھ غلط نسبت کرتے ہیں، اور چھ وجوہ سے اس کے لئے تمسک کرتے ہیں اس واقعہ سے: تو ہم ہر ایک کو تفصیل کے ساتھ مع جواب ذکر کرتے ہیں۔

پہلی وجہ: یہ نافرمان تھے اور نافرمانی کرنے والا ضرور صاحب کبیرہ ہوتا ہے، نافرمان ہونے پر نص قرآنی دلالت کرتی

ہے: وعصى آدم ربه فغوى،طٰہٰ: ۱۲۱۔تو اس کا جواب یہ ہے: معصیت نام ہے حکم کی مخالفت کا،اور حکم کبھی وجوب اور کبھی استحباب کے لئے ہوتا ہے،عرب کہتے ہیں:اشرت عليه في امر ولده بكذافعصاني ، میں نے فلاں کواس کے بیٹے کے متعلق رائے دی تو اس نے میری نہیں مانی ، یا میں نے دوا پینے کو کہا،تو اس نے میری نافرمانی کی (دوانہیں پی)اور جب امر وجوب اور استحباب دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے،تو یہ ممتنع نہ ہوگا کہ ''عصیان'' کا اطلاق آدم علیہ السلام پر اس لئے نہیں تھا کہ انہوں نے واجب کو چھوڑ دیا تھا، بلکہ ترک استحباب کی وجہ سے یہ اطلاق کیا گیا۔

دوسری وجہ:۔ آدم علیہ السلام نے توبہ کی تھی،جیسا کہ ارشاد ہے:فتلقى ادم من ربه كلمات فتاب عليه . بقرہ ۔پھر آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات حاصل کئے، پھر اللہ تعالی نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔اور توبہ کرنے والا نافرمان ہی ہوتا ہے، اس لئے کہ تائب اپنے کئے پر نادم ہوتا ہے۔اور اس کا نادم ہونا یہ درحقیقت اس بات کی اطلاع ہے کہ میں گناہ کر چکا ہوں،اب اگر وہ اس خبر واطلاع میں جھوٹا ہو،تو جھوٹ بولنے سے نافرمان ہوااور اگر سچا ہو تو یہ ہمارا مطلوب ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ جس نے گناہ کبھی نہ کیا ہو اس کی طرف سے بھی توبہ کرنا مخلوق سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف پوری طرح یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہونے کے لئے ایک اچھا اقدام ہے،اور اس کے مستحسن ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ ابتدا ہی سے ثواب کا مستحق ہوگا،اور اس کی دلیل ہماری، یہ دعا ہے:اللهم اجعلني من التوابين) پس اگر توبہ گناہ کرنے کے بعد ہی مستحسن قرار دی جائے تو پھر اس دعا کا یہ مطلب ہوگا کہ اے اللہ ہمیں گناہگار بنا، پھر توبہ کرنے والوں میں سے بنا، اور یہ ناجائز ہے۔جبکہ قرآن وحدیث میں توبہ اور استغفار کی بہت فوائد ذکر کی گئی ہیں،صرف گناہ معاف کرنے کیلئے استغفار وتوبہ مشروع نہیں۔مثلاً آیت سورۂ بقرہ:۵۸،واعراف:۱۶۸،وھود:۳،و۵۲،ونوح:۱۱۔وغیرہ۔اور اس باب میں احادیث بکثرت موجود ہیں۔

تیسری وجہ:۔ آدم علیہ السلام نے منہی عنہ (یعنی جس چیز سے انہیں روکا گیا تھا)اس کا ارتکاب کیا تھا۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:ولاتقرباهذه الشجرة:بقره. اور اس درخت کے قریب نہ جاؤ۔

ارشاد ربانی ہے:الم انهكماعن تلكما الشجرة:اعراف: ۲۲۔کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات غیر مسلم ہے کہ نہی حرام ہی کے ارتکاب سے روکنے کے لئے کی جاتی ہے، بلکہ نہی مشترک ہے تحریم اور تنزیہ دونوں کے درمیان۔اس ابہام کی تفسیر یہ ہے کہ نہیں کا مفہوم دلالت کرتا ہے کہ منہی عنہ (جس چیز سے روکا گیا) کا ترک بہتر ہے کرنے سے،اب رہی یہ بات کہ کرنے کی صورت میں کرنے والا عذاب کا مستحق ہوگا یا نہیں؟ تو یہ

نہی کے مفہوم سے خارج ہے اور اس حقیقت کے ہوتے ہوئے فریق مخالف کا استدلال ساقط ہو کر رہ گیا۔اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ نہی تحریم ہی کے لئے ہے تو یہ ارتکاب بھول کر کیا ہوا تھا،جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:**فنسی ولم نجدله عزما.طه :۱۱۵**. وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں پختگی نہ پائی۔

چوتھی وجہ:۔درخت سے پھل کھانے کی صورت میں اللہ تعالی نے انہیں ظالم کہا"**فتکونامن الظالمين**" (بقره) اور وہ خود بھی اپنے آپ کو ظالم کہتے ہیں۔اور یہ دعا مانگتے ہیں:**ربناظلمناانفسنا**(اعراف:۲۳)۔اس کا جواب یہ ہے کہ اولی اور بہتر عمل کو ترک کرنا بھی ظلم ہے،اس لئے کہ جب ثواب عظیم کا حقدار بننے کے لئے بہتر کام کرنے کی توفیق وقدرت دی گئی تو کسی عذر کے بغیر اس کو چھوڑ نا ثواب کے حصہ میں کمی کرنی ہوگی،اور ایسے شخص کو ظالم کہا جا سکتا ہے،اس لئے کہ درحقیقت "ظلم" چیز کو اپنے محل سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنے کا نام ہے۔اور یہاں بھی اسی طرح ہے۔

پانچویں وجہ:۔ آدم علیہ السلام خود یہ اقرار کرتے ہیں کہ اگر میرے لئے اللہ کی طرف سے مغفرت ومہربانی نہ ہوتی تو میں گھاٹے میں رہتا جیسا کہ فرمایا:**وان لم تغفرلناوترحمنالنكونن من الخاسرين**:اعراف۲۳۔اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ضرور تباہ ہو جائیں گے۔یہ اس بات کا مقتضی ہے کہ آدم علیہ السلام گناہ کبیرہ کے مرتکب تھے۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ارتکاب خلاف اولی پر محمول ہے جبکہ اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

چھٹا اعتراض: آدم علیہ السلام،شیطان کے وسوسے اور اس کے پھسلانے کی وجہ سے جنت سے نکالے گئے تھے،اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں صرف یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو جنت سے پھل کھانے کی وجہ سے نکالا گیا،اور یہ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ نکالنا سزا وتوہین کے طور پر تھا،اور کیسے ہو سکتا ہے جب کہ آدم علیہ السلام کو زمین میں خلافت ہی کے لئے پیدا فرمایا گیا،اور یہی ان کی خلقت کا حکمت اصلی تھا،تو یہ کہنا بے جا ہوگا کہ آدم علیہ السلام کو سزا وتوہین کے طور پر بھیج دیا گیا۔آیات سابقہ میں ہم تاویل کرنے پر مجبور اس لئے ہوئے ہیں،کہ اگر آدم علیہ السلام کو نفس الامر میں ظالم وعاصی قرار دیا جائے تو ان کے بارے میں معاذ اللہ جہنم کے مستحق ہونے کا فیصلہ بھی کرنا پڑے گا،اس لئے کہ ارشاد الہی ہے:**ومن يعص الله ورسوله فان له نارجهنم**(جن:۲۳). اور یہ بھی کہنا پڑے گا کہ وہ (نعوذ باللہ) ملعون ہے،اس لئے کہ ارشاد ہے:**الالعنة الله على الظالمين**(هود:۱۸)۔اور جب کہ امت کا اجماع ہے کہ نہ وہ جہنمی ہیں اور نہ ہی ملعون۔اس لئے ہمیں یہ تاویل کرنے پڑی اور یہ اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔آدم علیہ السلام کے متعلق دوسرا شبہ بھی ہے جس کا تفصیل سورت اعراف میں آئے گا۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَامِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ

اور ہم نے کہا کہ اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جہاں سے چاہو بلا روک ٹوک کھاؤ (پیو)

شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا

لیکن اس درخت کے پاس جانا نہیں ورنہ ظالموں میں ہو جاؤ گے پھر شیطان نے دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا

الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ

اور جس (عیش ونشاط) میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا تب ہم نے حکم دیا کہ (جنت سے) چلے جاؤ تم ایک دوسرے کے

عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

دشمن ہو اور تمہارے لئے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور معاش (مقرر کر دیا گیا) ہے ۔ [۲۱]

---

[۲۱] یہ آدم علیہ السلام کے قصہ کا تکملہ ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ، جب آدمؑ کی فضیلت اور خلافت ارضی کے لئے صلاحیت فرشتوں پر واضح کر دی گئی، انہوں نے تسلیم کرلیا، اور ابلیس اپنے تکبر اور معارضہ کی وجہ سے کافر ہوکر نکال دیا گیا، تو آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حواء کو یہ حکم ملا کہ تم دونوں جنت میں رہو، اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ مگر ایک معین درخت کے لئے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس نہ جانا، یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا، شیطان جو آدمؑ کی وجہ سے مردود ہوا وہ خار کھائے ہوئے تھا، اس نے کسی طرح موقع پا کر، اور مصلحتیں بتلا کر ان دونوں کو اس درخت کے کھانے پر آمادہ کر دیا، ان کی لغزش کی وجہ سے ان کو بھی یہ حکم ملا کہ اب تم زمین پر جا کر رہو، اور یہ بھی بتلا دیا کہ زمین کی رہائش جنت کی طرح بے غل وغش نہ ہوگی، بلکہ وہاں آپس میں اختلافات اور دشمنیاں بھی ہوں گی، جس سے زندگی کا لطف پورا نہ رہے گا۔ (وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ) یہ واقعہ آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ملائکہ کے سجدہ کے بعد کا ہے، بعض لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تخلیق اور سجدہ کا واقعہ جنت سے باہر کہیں ہوا ہے، اس کے بعد جنت میں داخل کیا گیا، لیکن ان الفاظ میں یہ مفہوم یقینی نہیں، بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تخلیق بھی جنت میں ہوئی، اور سجدے کا واقعہ بھی جنت میں پیش آیا، مگر اس وقت تک ان کو کوئی فیصلہ اس کے متعلق نہیں سنایا گیا تھا، کہ آپ کا مسکن ومستقر کہاں ہوگا؟ اس واقعہ کے بعد یہ فیصلہ سنایا گیا۔

"وَكُلاَ مِنۡهَا رَغَداً حَيۡثُ شِئۡتُمَا" "رغداً" کے معنی عربی میں اس نعمت ورزق کے ہیں جن کا حاصل کرنے میں کوئی محنت ومشقت بھی نہ ہو، اور وہ اتنی وسیع اور کثیر ہو کہ اس کے کم یا ختم ہو جانے کا خطرہ نہ ہو، معنی یہ ہوئے کہ آدم وحواء علیہما السلام کو فرمایا کہ جنت کے پھل بافراغت استعمال کرتے رہو، نہ ان کے حاصل کرنے میں تمہیں کسی محنت کی ضرورت ہوگی، اور نہ یہ فکر کہ یہ غذا ختم یا کم ہو جائے گی۔

" وَلَا تَقۡرَبَا هَـٰذِهِ الشَّجَرَةَ " کسی خاص درخت کی طرف اشارہ کرکے فرمایا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس کا پھل نہ کھاؤ، مگر تاکید کے طور پر عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ اس کے پاس بھی نہ جاؤ، اور مراد یہی ہے کہ کھانے کے لئے اس کے پاس نہ جاؤ، یہ درخت کونسا تھا؟ قران کریم نے متعین نہیں کیا، اور کسی مستند حدیث میں بھی اس کی تعین مذکور نہیں، ائمہ تفسیر میں سے کسی نے گندم کا درخت قرار دیا، کسی نے انگور کا، کسی نے انجیر کا، مگر جس کو قرآن وحدیث نے مبہم چھوڑا ہے، اس کو متعین کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے (قرطبی)۔ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِيۡنَ یعنی اگر آپ نے اس شجرہ ممنوعہ کو کھایا، تو آپ ظالموں میں داخل ہو جائیں گے۔

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيۡطَانُ عَنۡهَا "زلة" کے معنی عربی لغت میں لغزش کے ہیں۔ "ازلال" کے معنی کسی کو لغزش دینا، معنی یہ ہیں کہ شیطان نے آدمؑ وحواء کو لغزش دیدی، قرآن کے یہ الفاظ صاف اس کا اظہار کررہے ہیں کہ آدمؑ وحواء کی یہ خلاف ورزی اسی طرح کی نہ تھی جو عام گنہگاروں کی طرف سے ہوا کرتی ہے، بلکہ شیطانی تلبیس سے کسی دھوکہ فریب میں مبتلا ہو کر ایسے اقدام کی نوبت آگئی، کہ جس درخت کو ممنوع قرار دیا تھا، اس کا پھل وغیرہ کھا بیٹھے "عنھا" میں لفظ "عن" بمعنی سبب ہے، یعنی اس درخت کے سبب وذریعہ سے شیطان نے آدمؑ وحواء کو لغزش میں مبتلا کر دیا۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب شیطان کو سجدے سے انکار کی بناء پر پہلے ہی مردود کر کے جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ تو یہ آدمؑ وحواء کو بہکانے کے لئے جنت میں کیسے پہنچا؟ اس کا بے غبار جواب یہ ہے کہ شیطان کے بہکانے اور وہاں تک پہنچنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر ملاقات کے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان جنات میں سے ہے، اور یہ اللہ تعالی نے جنات کو بہت سے ایسے تصرفات پر قدرت دی ہے، جو عام طور پر انسان نہیں کر سکتے، انکو مختلف شکلوں میں متشکل ہو جانے کی بھی قدرت دی ہے، ہوسکتا ہے کہ اپنی قوت جنیہ کے ذریعہ مسمریزم کی صورت سے آدم وحواء کے ذہن کو متاثر کیا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رخصت ہوتے وقت یہ وسوسہ کیا ہو۔

اور شاید یہی سبب ہوا کہ ادم علیہ السلام کو اس کی دشمنی کی طرف دھیان نہ رہا، قران مجید کی ایت: "قاسمهما انی

لکمالمن الناصحین“(اعراف: ۲۱) سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے صرف وسوسہ اور ذہنی اثر ڈالنے سے کام نہیں لیا، بلکہ آدم وحواء سے زبانی گفتگو کر کے اور قسمیں کھا کر متاثر کیا۔

”فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ “یعنی شیطان نے اس دھوکہ اور لغزش کے ذریعے آدمؑ وحواء علیہما السلام کو ان نعمتوں سے نکال دیا، جن میں وہ آرام سے گذر بسر کر رہے تھے، یہ نکالنا اگرچہ بحکم الٰہی ہوا، مگر سبب اس کا شیطان تھا، اس لئے نکالنے کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی۔

”وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ“ یعنی ہم نے حکم دیا کہ نیچے اتر جاؤ، اس طرح کہ تم میں بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے، اس حکم کے مخاطب آدمؑ وحواء ہیں، اور اگر شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا، تو وہ بھی اسی خطاب میں شامل ہے، اس صورت میں باہمی عداوت ہونے کا مطلب یہ ہوگا، کہ شیطان تمہاری عداوت کا سلسلہ دنیا میں بھی جاری رکھے گا۔

”وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ “یعنی آدم وحواء علیہما السلام کو یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے، اور ایک میعاد معین تک کام چلانا ہے، یعنی زمین پر جا کر بھی دوام نہ ملے گا، کچھ مدت کے بعد اس گھر کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔

”اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ “میں آدم اور حواّ علیہما السلام دونوں کے لئے جنت کو مسکن بنانے کا ارشاد ہے، جس کو مختصر لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے ”اسکنا الجنة“ یعنی آپ دونوں جنت میں رہیں، جیسا کہ اس کے بعد ”کلا“ اور ”لاتقربا“ میں دونوں کو ایک ہی صیغہ میں جمع کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے خلاف ” انت وزوجک الجنة“ کے الفاظ کو اختیار کرنے میں صرف مخاطب آدم کو قرار دیا، اور انہی سے فرمایا کہ آپؑ کی زوجہ بھی جنت میں رہے۔ اس میں دو مسئلوں کی طرف اشارہ ہے، اول یہ کہ بیوی کے لئے رہائش کا انتظام شوہر کا ذمہ ہے، دوسرے یہ کہ سکونت میں بیوی شوہر کے تابع ہے، جس مکان میں شوہر رہے اس میں اس کو رہنا چاہئے۔

مسئلہ: لفظ ”اسکن“ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس وقت ان دونوں کے لئے جنت کا قیام محض عارضی تھا، دائمی قیام جو شان ملکیت کی ہوتی ہے وہ نہ تھی، کیونکہ لفظ ”اسکن“ کے معنی یہ ہیں کہ اس مکان میں رہا کرو یہ نہیں فرمایا کہ یہ مکان تمہیں دے دیا گیا، یہ تمہارا مکان ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کے علم میں تھا کہ ائندہ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آدم وحواء علیہما السلام کو جنت کا مکان چھوڑنا پڑے گا، نیز جنت کا استحقاق ملکیت ایمان اور عمل

صالح کر کے معاوضہ میں حاصل ہوتا ہے جو قیامت کے بعد ہوگا، اسی سے فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے کہ میرے گھر میں رہا کرو، یا یہ کہ میرا گھر تمہارا مسکن ہے، اسی سے مکان کی ملکیت اور دائمی استحقاق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا (قرطبی)۔

"**و کلامنھا رغدا**" : یعنی کھاؤ تم دونوں جنت سے بافراغت: اس میں بطرز مذکور سابق خطاب صرف آدم علیہ السلام کو نہیں کیا گیا، بلکہ دونوں کو ایک ہی لفظ میں شریک کر کے " کلامنھا " فرمایا، اس میں اشارہ اس کی طرف ہوسکتا ہے کہ غذا اور خوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں، وہ اپنی ضرورت اور خواہش کے وقت اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور یہ اپنی خواہش کی مطابق۔

"**رغدا حیث شئتما**" : لفظ " رغدا " ماکولات میں وسعت و کثرت کی طرف اشارہ ہے، کہ جو چیز جتنی چاہیں کھاسکتے ہیں، بجز ایک درخت کے اور کسی چیز میں رکاوٹ اور ممانعت نہیں، اور لفظ "**شئتما**" میں مقامات کی وسعت کا بیان ہے، کہ پوری جنت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں کھائیں، کوئی خطہ ممنوع نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ چلنے پھرنے اور مختلف مقامات سے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی ازادی انسان کا فطری حق ہے، ایک محدود و معین مقام یا مکان میں اگرچہ ضرورت و خواہش کی ساری چیزیں مہیا کردی جائیں، مگر وہاں سے باہر جانا ممنوع ہو تو یہ بھی ایک قسم کی قید ہیں، اس لئے آدم علیہ السلام کو کھانے پینے کے تمام چیزیں بکثرت و فراغت عطاء کردینے پر اکتفاء نہیں کیا گیا، بلکہ "**حیث شئتما**" فرما کر ان کو چلنے پھرنے اور ہر جگہ جانے کی آزادی بھی دی گئی۔ "**ولا تقربا ھذہ الشجرة**": یعنی اس درخت کی قریب بھی نہ جاؤ، ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت اس کے پھل کو نہ کھاؤ مگر احتیاطی حکم یہ دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ، اس سے اصول فقہ کا مسئلہ " سد ذرائع " ثابت ہوا، یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں۔ لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ ان چیزوں کے اختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہو جائے گا۔ تو اس جائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے۔ جیسا درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا اس کے پھل پھول کھانے کا، اس ذریعہ کو بھی منع فرمادیا گیا۔ اسی کا نام اصول فقہ کی اصطلاح میں " سد ذرائع " ہے۔

فَتَلَقّٰٓى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

پھر آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے (اور معافی مانگی) تو اس نے ان کا قصور معاف کر دیا بیشک وہ معاف کرنے والا اور صاحبِ رحم ہے۔[۲۲]

---

[۲۲] یہ کلمات وہی ہیں جو کہ سورت اعراف ایت نمبر:۲۳، میں موجود ہیں، یہی تفسیر تفسیر ابن کثیر، جواہر القرآن، اور دیگر مفسرین نے بھی کیا ہے، شاہ صاحبؒ نے تفسیر فتح الرحمٰن میں لکھا ہے: وآن کلمات این اند: قَالاَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۲۳﴾ (سورۃ اعراف)

تفسیر نعیمی نے یہاں غلط تفسیر کر کے حاکم والی روایت سے استدلال کیا ہے، لیکن یہ جمہور مفسرین اور روح قرآن سے مخالف ہے، اس کا ہم تفصیلی جواب لکھتے ہیں، تا کہ بعض کم علم لوگ اس پر غلط نہ ہو جائے، حافظ طبرانی، امام حاکم، حافظ ابونعیم، اور امام بیہقی نے سیدنا علیؓ اور عمرؓ سے مرفوعا روایت کی ہے، کہ جب آدم علیہ السلام پر عتاب ہوا، تو آپؑ فکر توبہ میں حیران تھے اس پریشانی کے عالم میں یاد آیا کہ وقت پیدائش میں نے سر اٹھا کر دیکھا تھا کہ عرش پر لکھا ہے "لا الـه الا الله محمد رسول الله" میں سمجھا تھا کہ بارگاہ الٰہی میں وہ رتبہ کسی کو میسر نہیں جو محمد ﷺ کو حاصل ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام اپنے نام اقدس کے ساتھ عرش پر مکتوب فرمایا، لہٰذا آپ نے اپنی دعا میں "ربنا ظلمنا" الایة، کے ساتھ یہ عرض کیا، اسئلک بحق محمد ﷺ ان تـغـفـر لـی، الخ، وحی نازل ہوئی کہ محمد ﷺ کون ہے؟ جن کے واسطے سے تم نے استغفار کی؟ عرض کیا کہ جب آپ نے مجھے پیدا کیا تھا تو میں نے عرش پر لکھا ہوا دیکھا تھا، کہ محمد ﷺ سے اونچی ہستی کوئی نہیں جن کا نام آپ نے اپنے نام کے ساتھ لکھا، وحی نازل ہوئی کہ وہ خاتم النبیین ہیں، تمہاری اولاد میں سے ہیں، اگر وہ نہ ہوتے تو تم بھی پیدا نہ کئے جاتے۔ فـضـائـل ذکـر ۹۵، ۹٦، نشـر الـطـیـب فـی ذکـر الـنـبـی ﷺ: ۱۳، نسـیـم الـریـاض ۳۹۸/۳. مـقـالات کـوثـری: ۳۹۱. تـفسـیـر نعیم الدین مرادابادی: ۱۲۔ یہ روایت مختلف سندوں کے ساتھ، مستدرک: ۶۱۵/۲۔ دلائل النبوۃ، امام بیہقی ۴۸۹/۵۔ اور معجم صغیر، امام طبرانی: ۸۲/۲، ۸۳۔ میں موجود ہے اور تینوں کا مرکزی راوی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ہے، جس کے بارے میں امام ابن حبان فرماتے ہیں: کان یقلب الاخبار وهو لا یعلم حتی کثر ذلک فی روایته مـن رفـع الـمـراسیل واسناد الموقوف فاستحق الترک. (المجروحین: ۵۹۳/۲). لاعلمی میں روایات میں ہیر پھیر کرتا تھا، یہاں تک کہ اس نے کثرت سے یہ کام شروع کیا۔ مرسل روایت کو مرفوع کہنے لگا، جس کے سبب سے اس لائق

ٹھہرا، کہ اسے چھوڑ دیا جائے، اوراس کی روایت کو نہ لی جائے۔امام ساجی نے فرمایا: ہمیں ربیع نے اوراسے امام شافعی نے بتایا کہ،عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے پوچھا گیا کہ کیا تیرے باپ نے تیرے دادا، رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث سنی، کہ نوح علیہ السلام کی کشتی نے بیت اللہ کا طواف کیا، اور مقام ابراہیم میں نماز پڑھی، اس نے کہاہاں، امام ساجی ہی فرماتے ہیں، منکرالحدیث ہے، امام طحاوی فرماتے ہیں حدیث کاعلم جاننے والوں کے نزدیک اس کی روایت نہایت ضعیف ہوتی ہے، امام حاکم اورامام ابونعیم نے فرمایا کہ: یہ اپنے باپ سے موضوع احادیث نقل کرتا ہے۔تہذیب التہذیب:۱۶۲/۶۔محمد بن عبداللہ بن حکیم فرماتے ہیں کہ میں نے امام شافعی کو کہتے ہوئے سنا، کہ امام مالک کے سامنے کسی نے کوئی حدیث بیان کی آپ نے پوچھا: **من حدثک؟ فذکر له اسنادامنقطعا،فقال اذهب الی عبد الرحمٰن بن زیدبن اسلم یحدثک عن ابیه عن نوح علیه السلام (المجروحین : ۲/ ۲۳ .تهذیب الکمال:۱۷، ۱۸).**

یہ تجھے کس نے بیان کی ہے؟ تو اس نے ایک منقطع سند بیان کی، اس پرامام مالک نے فرمایا: عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے پاس جاؤ وہ اس روایت کو اپنے باپ سے اوراس کا باپ نوح علیہ السلام سے اس کو بیان کرے گا۔اس راوی کی ایک منکرروایت یہ بھی ہے کہ **مامن عبدیمر بقبر رجل کان یعرفه فی الدنیافیسلم علیه الاعرفه وردعلیه السلام**۔میزان الاعتدال:۵۶۵/۱۔

جب کوئی زندہ شخص کسی مردہ کے قبر کے پاس سے گذرے اوران دونوں کی آپس میں جان پہچان ہواور یہ اسے سلام دے تو وہ مردہ ہواشخص اسے پہچان کراس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

امام حاکم، اسی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے بارے میں خود لکھتے ہیں: **روی عن ابیه احادیث موضوعة، لایخفی علی من تأملهامن اهل الصنعة ان الحمل فیهاعلیه.[المدخل الی الصحیح: ۱۵۴ ،ترجمه ۹۷]** یہ اپنے باپ کے سند سے موضوع احادیث کو روایت کرتا ہے۔علم حدیث وا ثار کے ماہرین کو خوب معلوم ہے۔کہ اس کا اصل ذمہ دار عبدالرحمٰن ہی ہے۔معجم صغیر طبرانی والی روایت میں تین ابتدائی راوی ماسوائے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے سب مجہول ہیں: **قال الهیثمی رواه الطبرانی فی الاوسط والصغیروفیه من لم اعرفهم .(مجمع الزوائد: ۸/ ۲۵۳)**۔بیہقی والی روایت میں عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے ساتھ عبداللہ بن فہری موجود ہے، جس کے بارے میں حافظ ذھبی اورحافظ ابن حجر فرماتے ہیں: کہ **روی عبدالرحمٰن بن زید خبرا باطلا،فیه ،یاادم لولا محمد ماخلقتک.رواه البیهقی فی دلائل النبوة.[میزان الاعتدال ۲/ ۴۵۰،لسان المیزان:**

۳۶۰/۳] اس نے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے ایک باطل روایت نقل کی ہے، کہ اے ادم علیہ السلام اگر محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں تمہیں پیدا نہ کرتا، اسے بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔ امام حاکم اگر چہ اس حدیث کے تصحیح میں فرماتے ہیں، (صحیحٌ) مگر حافظ ذہبی لکھتے ہیں: بـل مـوضـوع وعبدالرحمٰن واہ . تلخیص المستدرک: ۶۱۵/۲۔ صحیح نہیں، بلکہ یہ روایت موضوع ہے اور عبدالرحمٰن واہی [شدید کم زور] راوی ہے۔ یہ بھی فرمایا: خبـر بـاطـل. میـزان الاعتدال: ۵۰۴/۲. یہ روایت باطل ہے۔ اور حافظ ابن حجر بھی اس روایت کو باطل قرار دیتے ہیں۔ لسان المیزان: ۳۶۰/۳۔ نیز یہ روایت ارشاد ربانی: ''فتـلـقی ادم من ربه کلمات فتاب علیه'' سورة البقره ۔ اور: قَالاَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ، اعراف:۲۳۔ کے معارض ومخالف ہے لہٰذا قطعاناقابل استدلال اورناقابل التفات ہے۔

جبکہ حدیث کے الفاظ کچھ یوں ہے، حـدثـنا أبو سعید عمرو بن محمد بن منصور العدل، ثنا ابو الحسن محمد بن اسحاق بن ابراهیم الحنظلی، ثنا ابو الحارث عبدالله بن مسلم الفهری، ثنا اسماعیل بن مسلمة، انبأ عبد الرحمان بن زید بن اسلم، عن ابیه عن جده، عن عمر بن الخطابؓ قال: قال رسول الله ﷺ لمّا اقترف آدم الخطیئة قال یا رب اسئلک بحق محمد لما غفرت لی، فقال الله، یا آدم وکیف عرفت محمدا ولم اخلقه؟ قال یا رب لأنک خلقتنی بیدک ونفخت فیّ من روحک، رفعت رأسی فرأیت علی قوائم العرش مکتوبا: لا الـه الا الله محمد رسول الله، فعلمت انک لم تضف الی اسمک الا احب الخلق الیک، فقال الله، صدقت یا آدم، انه لأحب الخلق الیّ ادعنی بحقه فقد غفرت لک، ولولا محمد ما خلقتک. (حاکم فی المستدرک: ۶۱۵/۲ رقم: ۴۲۸۶). اس حدیث کی آخر میں ہے کہ، ولولا محمد ما خلقتک، اور یہ جملہ، آیت: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿۵۶﴾ ذاریات ، سے مخالف ہے۔



قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ

ہم نے فرمایا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا

غمناک ہوں گے ۔ اور جنہوں نے (اس کو) قبول نہ کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا

بِـآيٰتِنَـا أُوْلٰٓـئِكَ أَصْحَـابُ النَّـارِ هُمْ فِيْهَـا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

تو وہ دوزخ میں جانے والے ہیں (اور) وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے ۔

يَـا بَنِـىْ إِسْـرَائِيْـلَ اذْكُـرُوْا نِـعْمَتِىَ الَّتِىْ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوْا

اے آلِ یعقوب! میرے وہ احسانات یاد کرو جو میں نے تم پر کئے تھے اور اُس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا،

بِـعَهْدِىْٓ أُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَآمِـنُوْا بِمَا أَنْزَلْتُ

میں اُس اقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو, اور جو کتاب میں نے نازل کی ہے جو تمہاری کتاب

مُـصَـدِّقًـا لِّـمَـا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا

کو سچا کہتی ہے اس پر ایمان لاؤ اور اس سے منکر اوّل نہ بنو اور میری آیتوں میں ان کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ حاصل کرو[۲۳]

---

[۲۳] اس ایت میں اللہ تعالی کی ایات کے بدلے میں قیمت لینے کی ممانعت کا مطلب وہ ہی ہے جو آیت کے سباق وسیاق سے معلوم ہوتاہے، کہ لوگوں کے مرضی اوران کی اغراض کی خاطر اللہ تعالی کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر یا چھپا کر لوگوں سے پیسے لئے جائیں، یہ فعل باجماع امت حرام ہے۔ لفظ" قـلـيـلا " بڑھانے سے دولت دنیا کی حقارت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی میری آیتوں کے عوض تم جو رقم وصول کرتے ہو، وہ میری آیتوں یا دولت اخرت کی نسبت نہایت قلیل اور حقیر ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کی ایتوں کو تھوڑی رقم کے عوض بیچنا جائز نہیں ہے، اور زیادہ رقم کے عوض جائز ہے (من الکبیر:۱/۹۱، الروح:۱/۲۴۵ وغیرہما) حق چھپا کر پیٹ کا جہنم بھرنے کی یہ سنت آج بھی جاری ہے

، یہودیوں کی طرح بہت سے مولوی اور پیر آپ کو ایسے نظر آئیں گے جو لوگوں کو گیارھویں شریف کی ترغیب تو دیتے ہونگے ، اپنے دادا کی قبر پر حاضر ہو کر چڑھاوے اور نظریں پیش کرنے کی تلقین کرتے ہوں گے، حاجتوں اور مصیبتوں میں اولیاء اللہ کی قبروں پر حاضری دیکر انہیں مدد کے لئے پکارنے کی تعلیم بھی دیتے ہونگے ،مگر اپنے مریدوں کے سامنے آپ نے انہیں قران مجید کی ان ایتوں کا وعظ کہتے ہوئے کبھی نہیں سنا ہوگا ،جن میں اللہ تعالی نے غیر اللہ کی نذرونیاز اور چڑھاوے کو حرام کہا ہے، اور جن میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ میرے سوا کوئی حاجت روا اور مشکل کشا نہیں ،میرے سوا کوئی عالم الغیب اور کارساز نہیں، اس لئے میرے سوا حاجات ومشکلات میں کسی اور کومت پکارو، کیونکہ ایسا کرنے سے یہودیوں کی طرح انہیں بھی یقین ہے، کہ ان کی آمدنیاں بند ہو جائینگی اور ان کا جھوٹا وقار ختم ہو جائے گا۔

اس آیت کی ضمن میں بعض مفسرین نے **تعلیم قران پر اجرت لینے کامسئله** ذکر کیا ہے۔

فرماتے ہیں، کہ رہا یہ معاملہ، کہ کسی کو اللہ تعالی کی آیات صحیح صحیح بتلا کر یا پڑھا کر اس کی اجرت لینا کیسا ہے؟ اس کا تعلق ایت مذکورہ سے نہیں، خود یہ مسئلہ اپنی جگہ قابل غور و بحث ہے کہ تعلیم قرآن پر اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ فقہاء امت کا اس میں اختلاف ہے، امام مالکؒ،شافعی، احمد بن حنبل، جائز قرار دیتے ہیں، اور امام ابوحنیفہ اور بعض دوسرے ائمہ منع فرماتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے قران کو ذریعہ کسب معاش کا بنانے سے منع فرمایا ہے ۔لیکن متاخرین حنفیہ نے بھی جب ان حالات کا مشاہدہ کیا، کہ قرآن مجید کے معلمین کو اسلامی بیت المال سے گذارہ ملا کرتا تھا، اب ہر جگہ اسلامی نظام میں فتور کے سبب ان معلمین کو عموما کچھ نہیں ملتا، یہ اپنے معاش کے لئے کسی محنت ،مزدوری یا تجارت وغیرہ میں لگ جائیں، تو بچوں کو تعلیم کا سلسلہ یکسر بند ہو جائے گا، کیونکہ وہ دن بھر کا مشغلہ چاہتا ہے، اس لئے تعلیم قران پر تنخواہ لینے کو بضرورت جائز قرار دیا۔جیسا کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے، کہ آج کل اسی پر فتوی دینا چاہئیے ، کہ تعلیم قران پر اجرت وتنخواہ لینا جائز ہے، صاحب ہدایہ کے بعد آنے والے دوسرے فقہانے بعض ایسے ہی دوسرے وظائف جن پر تعلیم قران کی طرح دین کی بقاء موقوف ہے، مثلا امامت، اذان اور تعلیم حدیث، وفقہ، وغیرہ کو تعلیم قران کے ساتھ ملحق کر کے ان کی بھی اجازت دی (درمختار) ۔اس آیت کی تفسیر میں بعض علماء نے ایصال ثواب کے لئے ختم قران پر اجرت لینے کا بحث ذکر کیا ہے۔تفسیر روح المعانی نے :١٦/٥٥، میں لکھا ہے کہ: **ويدخل في العموم قرأة القران للموتى بالاجرة، فلاثواب فيها للميت ولاللقارى اصلا، وقدعمت البلوى بذلك و الناس عنه غافلون، واذانبهوا لاينتبهون، فانالله واناالیه راجعون** ۔اور ابن ابی العزؒ شرح

عقیدۃ الطحاویۃ:۲/۲/۶۷۲، میں لکھا ہے: واما استئجار قوم یقرؤن القران ویهدونه للمیت، فهذا لم یفعله احدمن السلف ولاامربه احدمن ائمة الدین، ولارخص فیه، و الاستجار علی نفس التلاوة غیر جائز بلاخلاف، وانما اختلفوا فی جوازالاستیجار علی التعلیم ونحوه، ممافیه منفعة تصل الی الغیر، و الثواب لایصل الی المیت الااذاکان العمل لله، وهذا لم یقع عبادة خالصة، فلایکون ثوابه ممایهدی الی الموتی، ولهذالم یقل احد، انه یکتری من یصوم ویصلی ویهدی ثواب ذلک الی المیت، لکن اذااعطی لمن یقرأ القران ویعلمه ویتعلمه معونة لاهل القرآن علی ذلک، کان هذامن جنس الصدقة عنه فیجوز، وفی" الاختیار"لو اوصی بان یعطی شیء من ماله لمن یقرأ القران علی قبره فالوصیة باطلة لانه فی معنی الاجرة, انتهی .وذکر الزاهدی فی" القنیه" انه لووقف علی من یقرأعندقبره فالتعین باطل ۔ابن عابدین شامی ردالمختار:۳۵/۵، میں لکھتا ہے کہ:قال تاج الشریعة فی شرح الهدایة ،ان القران بالاجرة لایستحق الثواب، لاللمیت ولاللقاری ،وقال العینی فی شرح الهدایة، ویمنع القاری للدنیا،و الآخذ و المعطی اثمان ،فالحاصل ان ماشاع فی زماننامن قراة الاجزاء بالاجرة لایجوز،لان فیه الامربالقرأة واعطاء الثواب للآمر، والقرأة لاجل المال، فاذالم یکن للقاری ثواب لعدم النیة الصحیحة فاین یصل الثواب الی المستاجر ،ولولا الاجرة ماقرأ احدلاحدفی هذا الزمان، بل جعلوا القران العظیم مکسبا ووسیلة الی جمع الدنیا. اناالله وانااليه راجعون ۔اوراسی طرح کا عبارت مجموعۃ الرسائل :۱۸۰، میں بھی لکھا ہے :اور بہت تفصیل کے بعدفرماتا ہے، کہ ہمارے مدعی کے اثبات کے لئے قرآن وسنت اوراجماع، قیاس ہے، اما الکتاب فقوله تعالی" ولاتشتروابایاتی ثمناقلیلا".واما السنة فکقوله علیه السلام" اقرؤا القران ولاتأکلوابه "الحدیث .اس روایت کومسند احمد نے :۲۸۸/۲۴پراور۲۹۵، پر، جبکہ ابن ابی شیبہ نے:۴۰۰/۲، ۴۰۱ ، اورطبرانی نے اوسط:۲۵۹۵، میں نقل کیا ہے۔ جبکہ ۱۷۱، میں فرماتا ہے:ولولا الدراهم التی تدفع له بمقابلة ذلک، لم یتعب نفسه فی ذلک ،ولم یسهرله جفنا،ولترک ذلک بالکلیة ،واتخذحرفة غیره، یتعیش منهافاذن لااجرله سوی مانواه، کمانطق به الحدیث الصحیح ،کماقدمناه، واذاکان لاثواب له فی قرائته وذکره، فای

شـــیء یهــدیـــه الـــی روح الـــذیـــن لـم یـدفـعـوالـــه هـذاالـمـال الافـی مـقـابـلة ثـواب هـذه القـرأةوالـذکـر،ولـوعـلـمواانه لاثواب له ولالهم لم یدفعواله فلساواحدا،واذالم تحصل لهم تلک المنفعة اوبطلت الاجارة والوصیة فبای وجه تحصل القربة، ویأخذ المدفوع الیه ذلک فی مذهب من المذاهب. اوراسی طرح:۱۷۳، میں بعض قراء کا عیوب ذکر کرتے ہیں: وکثیرامایدلس بعض فسقة القـراء فیسـقـط مـن بـعـض الاجـزاء شیئاسرا ،وربماسرقواالخبزو الطعام، زیادة علی مـایتنـاولونه من الحطام الحرام ،ثم یهبون ماتحصل منهم فی تلک الاوقات الی روح من کان سببـافی اجتماعهم علی تلک المنکرات ،و الجزاء من جنس العمل، فانظرمااقبح هذا الخلل، ولاحـول ولاقـوـة الابالله العلی العظیم ـمزید تفصیل کے لئے اس کتاب کاصفحہ:۱۲۵، ۱۲۹، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۹۰ـدیکھئے۔

اورتقی الدین برکوی، نے اس مسئلہ کے متعلق ایک رسالہ لکھی ہے: جوکہ '' انـقـاذ الهـالکین ''کی نام سے مشہور ہےاس کی اول میں لکھتا ہے: فهـذه رسـالة مـعـمولة لابطال ماشاع فی البلاد واشتهرفی مـابیـن العباد و العُبادمن اتخاذ القران العظیم، و الفرقان الکریم'' تنزیل من رب العلمین، لایمسه الا المطهرون ''مکسبابجمع الدنیا،وسبیلایشترون بایات الله ثمناقلیلا،یستبدلون الـذی هـوادنـی بـالـذی هـوخیـر،فهـم کـحـاطـب اللیل لایفرقون بین نفع وضر.فویل لهم ممایقرؤن وویل لهم ممایکسبون، فنعوذبالله ثم نعوذبه ان یبتلینا وایاکم به وبامثاله الخ ـیہ رسالہ کتاب شرح شرعۃ الاسلام کی حاشیہ:۱۰۶، پرموجود ہےـاردومیں ہم مذکورہ عبارات کا خلاصہ معارف القرآن:۲۰۸/۱، سےنقل کرتے ہیں ـفرماتے ہیں: علامہ شامی نے: درمختا کی شرح میں اوراپنے رسالہ شفاءالعلیل میں بڑی تفصیل اورقوی دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کردی ہے کہ تعلیم قرآن وغیرہ پراجرت لینے کوجن متاخرین فقہاء نے جائزقرار دیا ہے، اس کی علت ایک ایسی دینی ضرورت ہےجس میں خلل آنے سے دین کا پورانظام مختل ہوجاتا ہے، اس لئے اس کوایک ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدودرکھنا ضروری ہے، اس لئے مردوں کوایصال ثواب کے لئے ختم قران کرانایاکوئی دوسراوظیفہ پڑھوانااجرت کے ساتھ حرام ہے، کیونکہ اس پرکسی عام دینی ضرورت کامدارنہیں ،اوراجرت لیکر پڑھنا حرام ہوا،تواس طرح پڑھنے والااور پڑھوانے والا دونوں گنہگار ہوئے

اور جب پڑھنے والے ہی کو کوئی ثواب نہ ملا تو میت کو وہ کیا پہنچائے گا۔علامہ شامی نے اس بات پر فقہاء کی بہت سی تصریحات، تاج الشریعۃ ،عینی شرح ہدایہ، حاشیہ خیر الدین بر بحر الرائق ، وغیرہ سے نقل کی ہیں، اور خیر الدین رملی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے، کہ ایصال ثواب کے لئے قبر پر قرآن پڑھوانا یا اجرت دے کر ختم قران کرانا صحابہ وتابعین اوراسلاف امت سے کہیں منقول نہیں، اس لئے بدعت ہے (شامی ۱/۱۴۷)اوراسی طرح صلوٰۃ تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا بھی جائز نہیں ہے،محمد بن نصر المروزی نے ''قیام اللیل'' ۱۷۷ (مختصر) میں ایک عنوان لکھاہے کہ :**باب اخذالاجر علی الامامة فی رمضان**،اس میں ابن معقل کا واقعہ نقل کیا ہے، کہ **صلی بهم ،فی رمضان ،فلما کان یوم الفطر ارسل الیه عبیدالله بن زیاد بخمس مأة درهم، وحلة، فردها وقال، انا لا نأخذ علی کتاب الله اجرا** ۔اسی طرح کا ایک واقعہ ابن مقرن سے بھی نقل کیا ہے۔پھر آگے لکھتا ہے:**وسئل احمد عن امام قال لقوم اصلی بکم رمضان بکذا و کذا درهما ،قال اسئل الله العافیة من یصلی خلف هذا** ۔اور السنن والمبتدعات:۱۶۱، میں بھی یہ مسئلہ ذکر کیا گیا ہے۔

یہاں پر ابوحازمؒ کا واقعہ امام قرطبی نے وضاحت مسئلہ کے لئے نقل کیا ہے،ہم بھی اختصار سے اس کو نقل کرتے ہیں۔ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملک مدینہ طیبہ پہنچے،اور چند روز قیام کیا،تو لوگوں سے دریافت کیا کہ مدینہ طیبہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے کسی صحابی کی صحبت پائی ہو؟لوگوں نے بتلایا ہاں ابوحازم ایسے شخص ہیں،سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کران کو بلوالیا،جب وہ تشریف لائے تو سلیمان نے کہا کہ اے ابوحازم یہ کیا بے مروتی اور بیوفائی ہے؟ابوحازم نے کہا آپ نے میری کیا بے مروتی اور بے وفائی دیکھی ہے؟ سلیمان نے کہا کہ مدینہ کے سب سے مشہور لوگ مجھ سے ملنے آئے ،آپ نہیں آئے ،ابوحازم نے کہا،امیر المؤمنین میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں، اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں، جو واقعہ کے خلاف ہے،آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقف تھے،اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا،ایسے حالت میں خود ملاقات کے لئے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیوفائی کیسی؟

سلیمان نے جواب سنکر ابن شہاب زہری اور حاضرین مجلس کی طرف التفات کیا،تو امام زہری نے فرمایا کہ ابوحازم نے صحیح فرمایا،آپ نے غلطی کی۔اس کے بعد سلیمان نے روئے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کئے اور کہا اے ابوحازم ، یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو ویران اور دنیا کو آباد کیا ہے، اس لئے ابادی سے ویرانہ میں جانا پسند نہیں۔سلیمان نے تسلیم کیا،اور پوچھا کہ کل اللہ تعالی کے سامنے حاضری کیسے ہوگی؟ فرمایا کہ نیک عمل کرنے والا تو اللہ تعالی کے سامنے اسی طرح جائیگا جیسا کوئی مسافر سفر سے

واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے، اور برے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہوگا جیسا کوئی بھاگا ہوا غلام پکڑ کر آقا کے پاس حاضر کیا جائے۔سلیمان یہ سنکر رو پڑے، اور کہنے لگے، کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالی نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے، ابوحازم نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کے کتاب پر پیش کرو تو پتہ لگ جائے گا، سلیمان نے دریافت کیا کہ قران کی کس آیت سے یہ پتہ لگے گا؟ فرمایا اس آیت سے:''ان الابـرار لـفـي نـعيـم☆ و ان الـفـجـار لـفـي جـحـيـم '' (انـفـطـار: ۱۳، ۱۴)یعنی بلاشبہ نیک عمل کرنے والے جنت کی نعمتوں میں ہیں، اورنافرمان، گناہ شعار، دوزخ میں۔سلیمان نے کہا کہ اللہ تعالی کی رحمت تو بڑی ہے، وہ بدکاروں پر بھی حاوی ہے، فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْب'' مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (اعراف:۵۶)۔

یعنی اللہ تعالی کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے۔سلیمان نے پوچھا، اے ابوحازم، اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ عزت والا کون ہے؟ فرمایا وہ لوگ جو مروت اور عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔پھر پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا کہ فرائض وواجبات کی ادائیگی، حرام چیزوں سے بچنے کے ساتھ، پھر دریافت کیا، کہ کونسی دعا زیادہ قابل قبول ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص پر احسان کیا گیا ہو، اس کی دعا اپنی محسن کے لئے اقرب الی القبول ہے۔پھر دریافت کیا کہ صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ ہوسکے، اس طرح خرچ کرنا کہ نہ اس سے پہلے احسان جتائے اور نہ ٹال مٹول کر کے ایذا پہونچائے، پھر دریافت کیا کہ کلام کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص سے تم کو خوف ہو، یا جس سے تمہاری کوئی حاجت ہو، امید وابستہ ہو، اس کے سامنے بغیر کسی رد ورعایت کے حق بات کہہ دینا، پھر دریافت کیا کہ کونسا مسلمان سب زیادہ ہوشیار ہے؟ فرمایا وہ شخص جس نے اللہ تعالی کے اطاعت کے تحت کام کیا ہو، اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔پھر پوچھا کہ مسلمانوں میں کون شخص احمق ہے؟ فرمایا وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں مدد کرے. جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دوسری کی دنیا درست کرنے لئے اپنا دین بیچ دیا۔سلیمان نے کہا کہ صحیح فرمایا، اس کے بعد سلیمان نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا، کہ ہمارے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابوحازم نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے۔سلیمان نے کہا کہ نہیں، آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں، ابوحازم نے فرمایا، اے امیر المؤمنین، تمہارے اباواجداد نے بزور شمشیر لوگوں پر تسلط کیا۔اورزبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت قائم کی، اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا، اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے، کاش، آپ کو معلوم ہوتا کہ آپ کو مرنے کے

بعد کیا کہتے ہیں، اوران کو کیا کہا جا تا ہے؟ حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابوحازم کی اس صاف گوئی کو سن کر کہا کہ ابوحازم تم نے یہ بہت بری بات کہی ہے، ابوحازم نے فرمایا: کہ تم غلط کہتے ہو بری بات نہیں کہی ، بلکہ وہ بات کہی جس کا ہم کو حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالی نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے، کہ حق بات لوگوں کو بتلائیں گے ۔چھپائیں گے نہیں۔ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهُ (ال عمران:۱۸۷) یہی وہ بات ہے جس کے لئے یہ طویل حکایت، امام قرطبی نے ایت مذکورہ کی تفسیر میں درج فرمائی ،سلیمان نے پھر سوال کیا، کہ اچھا اب ہمارے درست ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا کہ تکبر چھوڑو۔ مروت اختیار کرو، اورحقوق والوں کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ تقسیم کرو۔سلیمان نے کہا کہ ابوحازم کیا ہوسکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں، فرمایا: اللہ کی پناہ ، سلیمان نے پوچھا یہ کیوں ؟ فرمایا: کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال ودولت وجاہ کی طرف کچھ مائل ہوجاؤں، جس کے نتیجے میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔ پھر سلیمان نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہوتو بتلائیے، کہ ہم اس کو پورا کریں، فرمایا ہاں ایک حاجت ہے، کہ جہنم سے نجات دلا دو اور جنت میں داخل کرادو، سلیمان نے کہا کہ یہ تو میرے اختیار میں نہیں، فرمایا کہ پھر مجھے آپ سے اور کوئی حاجت مطلوب نہیں، اخر میں سلیمان نے کہا کہ اچھا میری لئے دعا کیجئے، تو ابوحازم نے یہ دعا کی ، یا اللہ اگر سلیمان آپ کا پسندیدہ ہے، تو اس کے لئے دنیا واخرت کی بہتری کو آسان بنادے، اور اگر وہ آپ کا دشمن ہے، تو اس کی بال پکڑ کر اپنی مرضی اور محبوب کاموں کی طرف لے آ۔ اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا آپ نے حکم دیا ہے، سلیمان نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد سو۱۰۰ ،گنیاں بطور ہدیہ کے ابوحازم کے پاس بھیجیں، ابوحازم نے ایک خط کے ساتھ ان کو واپس کردیا۔ خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ سو دینار میرے کلمات کا معاوضہ ہیں، تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے، اور اگر اس نے بھیجا ہے کہ بیت المال میں میرا حق ہے۔ تو مجھ جیسے ہزار علماء اور دین کے خدمت کرنے والے ہیں، اگر سب کو آپ نے اتنا ہی دیا ہے، تو میں بھی لے سکتا ہوں، ورنہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ، ابوحازم کی اس ارشاد سے کہ اپنے کلمات نصیحت کا معاوضہ لینے کو خون اور خنزیر کی طرح قرار دیا ہے، اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑہتی ہے کہ کسی طاعت وعبادت کا معاوضہ لینا، ان کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ واقعہ: سنن دارمی نے:۳/۴٦٦، اور حلیۃ الاولیاء:۳/۲۳۴، اور ابن منظور نے :۱۰/۲٦٧، تہذیب میں نقل کیا ہے۔ ابن عساکر نے: تاریخ دمشق:۲۲/۳۳، میں نقل کیا ہے۔

وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ
اور مجھ ہی سے خوف رکھو ۔ اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ
وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۴۲﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ
اور سچی بات کو جان بُوجھ کر نہ چھپاؤ ۔ اور نماز پڑھا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو
وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۴۳﴾ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ
اور (اللہ تعالیٰ کے آگے) جھکنے والوں کیساتھ جھکا کرو، یہ کیا (عقل کی بات ہے کہ) تم لوگوں کو نیکی کرنے کو کہتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کئے دیتے ہو
وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ
حالانکہ تم (اللہ تعالیٰ کی) کتاب بھی پڑھتے ہو کیا تم نہیں سمجھتے۔ اور (رنج وتکلیف میں) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو
وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ ﴿۴۵﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ
اور بیشک نماز گراں ہے مگر ان لوگوں پر (گراں نہیں) جو عجز وانکساری کرنے والے ہیں۔ جو یقین کئے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں
وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿۴۶﴾ يٰبَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ
اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اے یعقوب کی اولاد! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کئے تھے
عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِينَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ
اور یہ کہ میں نے تمھیں تمام جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔ اور اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کچھ کام نہ
عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ
آئے گا اور نہ کسی کی سفارش منظور کی جائے اور نہ کسی سے کسی طرح کا بدلہ قبول کیا جائے اور نہ لوگ (کسی اور طرح)
يُنْصَرُونَ ﴿۴۸﴾ وَإِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ الْعَذَابِ
مدد حاصل کر سکیں۔ اور (ہمارے اُن احسانات کو یاد کرو) جب ہم نے تم کو فرعون سے نجات دی، وہ (لوگ) تمھیں بڑا دُکھ

يُذَبِّحُوْنَ أَبْنَآءَ كُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَ كُمْ وَفِيْ ذٰلِكُم بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
دیتے تھے تمہارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے

عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ
بڑی (سخت) آزمائش تھی۔ اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو پھاڑ دیا تو تمہیں نجات دی اور فرعون کی قوم کو غرق کر دیا

تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوْسٰىٓ أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ
اور تم دیکھ ہی تو رہے تھے۔ اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا تو تم نے ان کے پیچھے بچھڑے کو (معبود) مقرر کر لیا

بَعْدِهٖ وَأَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ
اور تم ظلم کر رہے تھے۔ پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معاف کر دیا تاکہ تم شکر کرو

تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَإِذْ آتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ
اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے عنایت کئے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

﴿۵۳﴾ وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ
اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بھائیو! تم نے بچھڑے کو (معبود) ٹھہرانے میں (بڑا) ظلم کیا ہے

الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا إِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا أَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ
تو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو اور اپنے آپ کو قتل کر ڈالو۔ تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے

بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى
، پھر اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور بیشک وہ معاف کرنے والا (اور) صاحبِ رحم ہے۔ اور جب تم نے (موسیٰ سے) کہا

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ
کہ اے موسیٰ! جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو سامنے نہ دیکھ لیں گے تم پر یقین نہ کریں گے تو تم کو بجلی نے آ گھیرا اور تم دیکھ رہے تھے

ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵٦﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ

پھر موت آجانے کے بعد ہم نے تمہیں از سرِ نو زندہ کر دیا تا کہ احسان مانو ۔ اور تم پر بادل کا سایہ کئے رکھا

الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا

اور (تمہارے لئے) من وسلویٰ اتارتے رہے کہ جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ (پیو)

ظَلَمُوْنَا وَلٰكِن كَانُوْا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ

مگر تمہارے بزرگوں نے ان نعمتوں کی کچھ قدر نہ جانی اور) وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑتے تھے بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے اور جب ہم نے (اُن سے) کہا

الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوْا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا

کہ اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ (پیو) اور (دیکھو) دروازے میں داخل ہونا تو سجدہ کرنا

حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ

اور حِطَّةٌ (یعنی توبہ) کہنا ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے تو جو ظالم تھے انہوں

ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ

نے اس لفظ کو، جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا بدل کر اس کی جگہ اور لفظ کہنا شروع کیا پس ہم نے ان ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا

السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَإِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا

انکے فسق ونافرمانی کی وجہ سے ۔اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے (اللہ سے) پانی مانگا تو ہم نے کہا

اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ

کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو (انہوں نے لاٹھی ماری) تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور تمام لوگوں نے اپنا اپنا

أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِن رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْأَرْضِ

گھاٹ معلوم کر (کے پانی پی) لیا (ہم نے حکم دیا کہ) اللہ کی (عطا فرمائی ہوئی) روزی کھاؤ اور پیو مگر زمین میں

مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا
فساد نہ کرتے پھرنا۔ اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم سے ایک (ہی) کھانے پر صبر نہیں ہوسکتا تو اپنے رب سے دعا
رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا
کیجئے کہ ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز (وغیرہ) جو نباتات زمین سے اُگتی ہیں ہمارے لئے پیدا کردے
وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ أَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا
انہوں نے کہا کہ بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے عوض ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو؟ (اگر یہی چیزیں مطلوب ہیں) تو کسی شہر میں جا اترو
فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ
وہاں جو مانگتے ہو مل جائے گا، اور (آخرکار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (و بےنوائی) ان سے چمٹا دی گئی اور وہ اللہ کے
مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِآيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّيْنَ بِغَيْرِ
غضب میں گرفتار ہوئے یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور (اس کے) نبیوں کو ناحق قتل کردیتے تھے
الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ
یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ مسلمان ہیں
هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ
یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست (یعنی کوئی شخص کسی قوم و مذہب کا ہو) جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لائے گا اور
صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
نیک عمل کرے گا تو ایسے لوگوں کو ان کے (اعمال کا) صلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ملے گا اور (قیامت کے دن) نہ ان کو کس طرح کا
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا
خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ اور جب ہم نے تم سے عہد (کر) لیا اور کوہِ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا (اور حکم دیا)

مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ

کہ جو کتاب ہم نے تمہیں دی ہے اس کو زور سے پکڑے رہو اور جو اس میں (لکھا) ہے اسے یاد رکھو تا کہ (عذاب سے) محفوظ رہو

تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِّنَ

تم اس کے بعد (عہد سے) پھر گئے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو تم

الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا

خسارے میں پڑ گئے ہوتے۔ اور تم ان لوگوں کو خوب جانتے ہو جو تم میں سے ہفتے کے دن (مچھلی کا شکار کرنے) میں حد سے تجاوز کر گئے تھے

لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا

تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل وخوار بندر ہو جاؤ۔ اور اس قصے کو اس وقت کے لوگوں کے لئے اور جو اُن کے بعد آنے والے تھے

خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ

عبرت اور پرہیز گاروں کے لئے نصیحت بنا دیا۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے

أَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً قَالُوْا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُوْنَ

کہ ایک گائے ذبح کرو۔ وہ بولے کہ کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ (موسیٰ نے) کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادان بنوں[۲۴]

---

[۲۴] اس واقعہ میں اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا مگر وہ خبث باطن کی وجہ سے اس حکم کو مذاق سمجھنے لگے، اور اس معاملہ کو چالیس سال تک ٹالتے رہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ، گائے ذبح کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص کو اس کے عمزادوں نے اس کی دولت حاصل کرنے کے لئے رات کی تاریکی میں قتل کر دیا، صبح ہوئی تو شور وغل بپا کر دیا، اور معاملہ موسی علیہ السلام کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے اللہ تعالی سے ہدایات حاصل کر کے انہیں گائے ذبح کر کے اس کا کوئی حصہ مقتول کے جسم پر لگانے کا حکم دیا، تا کہ وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا پتہ بتا دے، (ان روایات کے متعلق ابن کثیر لکھتے ہیں:

الظاهر انها ماخوذة من كتب بني اسرائيل، وهي مما يجوز نقلها ولكن لا نصدق ولا نكذب، فلهذا لا يعتمد عليها الا ما وافق الحق عندنا. والله اعلم) . اس واقعہ کا پہلا حصہ بعد میں (واذ قتلتم نفسا فادارأتم فيها) میں مذکور ہے۔اور ''واذقال موسى لقومه'' میں واقعہ کا اخری حصہ مذکور ہے۔ واقعہ کی ترتیب کواس لئے بدلا گیا، تا کہ ایک ہی واقعہ سے متعلق ان کی دو خباثتوں کی واضح طور پر نشاندہی کی جا سکے۔اول گائے ذبح کرنے کے سلسلے میں پس وپیش اور ٹال مٹول ۔ دوم بے گنا ہوں پر قتل کا الزام، اگر واقعہ کو اصل ترتیب سے ذکر کیا جاتا، تو اس سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا تھا، اکثر مفسرین کی یہی رائے ہے، لیکن شیخ حسین علی رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ یہ دو مستقل واقعے ہیں، جیسا کہ گذشتہ واقعات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ''واذ'' سے جتنے واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ سب مستقل واقعات ہیں، نیز بعض روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ گائے ذبح کرنے کے حکم اور گائے حاصل کر کے ذبح کرنے کے درمیان چالیس سال کا طویل وقفہ تھا: مدارک: ۴۴/۱، کبیر: ۵۶۴/۱، نعش کا اتنا عرصہ بے گور وکفن پڑا رہنا اور پھر متعفن نہ ہونا یہ امور بھی عقل وقیاس سے بعید ہیں، اس سے بھی اشارہ ملتا ہے کہ یہ ایک واقعہ نہیں بلکہ دو مستقل واقعے ہیں، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ پہلے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہو طویل پس وپیش اور جستجو کے بعد جب وہ مطلوبہ گائے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہوں تو قتل کا واقعہ پیش آ گیا ہو، اور انہیں اس گائے کا گوشت مقتول کے بدن سے لگانے کا حکم دیا گیا ہو۔تا کہ زندہ ہوکر اپنے قاتل کا نشاندہی کرے۔

وقيل انه يجوز ان يكون ترتيب نزولها على موسى عليه السلام على حسب تلاوتها بان يأمرهم الله تعالى بذبح البقرة ثم يقع القتل فيؤمروا بضرب بعضها(روح المعاني: ۲۸۵/۱ :وقرطبي: ۴۴۵/۱)

لیکن ایک سوال باقی رہ جائے گا کہ اس صورت میں گائے ذبح کرنے کے حکم کی وجہ کیا ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک واقعہ ہونے کی صورت میں جس چیز کو مفسرین کرام نے ذبح کے لئے گائے ہی کو منتخب کرنے کی حکمت کہا ہے، اس صورت میں وہی ذبح بقرہ کی علت ہوگی، مصریوں کے ساتھ صدیوں رہنے کی وجہ سے اسرائیلی بھی گوسالہ پرستی کے شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ وہ گائے کی پوجا کرتے اور اس کی تعظیم بجالاتے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے باوجود انہیں گوسالہ پرستی سے قدرے انس باقی تھی، اگر چہ عملی طور پر وہ گائے کی پوجا نہیں کرتے تھے، لیکن گوسالہ پرستی سے وہ پورے طور پر متنفر بھی نہیں ہوئے تھے، جبھی تو سامری کے

گوسالہ کو دیکھتے ہی اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، اس لئے ان کے سابق معبود کو ان کی نظروں میں ذلیل کرنے اور انہیں اس کی عبادت سے کلی طور پر متنفر کرنے کے لئے اللہ تعالی نے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا، تاکہ توحید کی جڑیں ان کے دلوں کی گہرائیوں میں پھیل کر خوب مضبوط ہو سکیں۔ وانـمـا امـر (والله اعـلـم) بـذبـح البـقـرة دون غيـرهـا، لانهـامن جنس ماعبدوه من العجل، ليهون عندهم ماكانوايرونه من تـعـظيـمـه. وليـعـلـم بـاجـابتهـم زوال مـاكـان فـي نـفـوذهم من عبادتـه. ماوردی، قرطبی ۔ وانـمـااختـص البـقـرمـن سـائـر الـحيـوانـات لانهم كانوايعظمون البقرويعبدونهامن دون الله فاختبروابذلک، الخ. (بحر).

بنی اسرائیل سمجھے، کہ: گائے تو ایک مقدس اور معظم جانور ہے، بھلا اللہ تعالیٰ اسے ذبح کرنے کا حکم کس طرح دے سکتا ہے؟ یا انہوں نے ذبح بقرہ کے ذریعے قاتل کے پتہ لگانے کو بعید از عقل سمجھا، اس لئے کہا ہو نہ ہو، موسیٰ علیہ السلام ہم سے ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔ ”قـال اعـوذبالله ان اكون الجاهلين“۔ کیونکہ احکام الٰہی کی تبلیغ میں تمسخر کرنا، جاہلوں اور بےوقوفوں کا کام ہے، اور انبیاء علیہم السلام کو یہ چیز زیب نہیں دیتی، لان الهزء فی اثناء تبليغ امر الله سبحانه، جهل وسفه، ابوالسعود)۔

”يبيـن لـناماهى“ سے اسرئیلیوں کے تعنت اور حکم الٰہی کے امتثال میں لیت ولعل کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، یہاں ,,مـاهـى،، کے ذریعے گائے کی حقیقت مختصہ سے سوال نہیں، بلکہ یہ سوال محض ایضاح حال کے لئے ہے ,,لافـارض ولابكر،، یعنی نہ بوڑھی ہو اور نہ بچی ”الفارض“ اسم لـلـمسـنة التى انقطعت ولادتها من الكبر“ والبكر“ اسم للصغيرة التى لم تلد من الصغر :(روح).

”عـوان بين ذالک“ یہ ماقبل کی تاکید ہے ”عوان“ اسے کہتے ہیں، جو مذکورہ دونوں عمروں کے درمیان ہو، وسط بين السنين (معالم) اى لاهى صغيرة ولاهى مسنة(قرطبى).

”فـافـعـلـوامـاتؤمـرون“ یعنی حکم کی تعمیل کرو اور زیادہ سوال و جواب نہ کرو, اى مـن ذبـح البـقـــرة ولاتـكرروا السوال ولاتعنتوا (روح)۔ تـجـديـد لـلامـر وتاكيد وتنبيه على ترک التعنت فيماتركوه (قرطبى). جب عمر کے متعلق اطمینان ہو گیا، تو اب رنگ کے متعلق سوال کر دیا ”صـفـراء فاقع لونها“ ”فاقع“ کے معنی تیز، زرد، رنگ والے کے ہیں، شديد الصفرة تكادمن صفرتهاتبيض ۔ ابن کثیر۔

"تسر الناظرين": یعنی اس کا تیز اور گہرا زرد رنگ بدنما نہ ہو بلکہ ایسا خوشنما ہو کہ دیکھنے والے اسے دیکھ کر راحت اور سرور محسوس کریں۔

"ان البقر تشابهه علينا" یہ اسرائیلیوں کی سرکشی اور ان کے خبث باطن کی انتہا ہے، کہ حکم الہی کی تعمیل میں کیسی چالاکی سے پس وپیش کر رہے ہیں۔ ان البقرة تشابه علينا، یعنی مذکورہ بالا اوصاف تو بہت سی گائیوں میں پائے جاتے ہیں، ان سے گائے کی تعین نہیں ہوتی، اس لئے مزید وضاحت فرمائی جائے۔

"وانا انشاء الله لمهتدون" بار بار سوال کی وجہ سے گائے کے حصول میں دشواری بڑھ رہی تھی، اس لئے اب انہوں نے اپنی غلطی محسوس کی، اور اس پر نادم ہوئے، اور آخری سوال میں اپنی کامیابی کو مشیت الٰہی سے متعلق کیا، گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں، کہ ہم مطلوبہ گائے حاصل کر کے ہی دم لیں گے۔ حدیث میں ہے کہ اگر وہ انشاءاللہ نہ کہتے تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے (قرطبی)۔

"لاذلول" یعنی اس سے محنت کا کام نہ لیا جاتا ہو۔ "تثير الارض ولاتسقى الحرث" یہ ماقبل کی تفسیر ہے، "مسلمة" بے عیب ہو، بريئة من العيوب (معالم:).

"لاشيه فيها" وہ یک رنگ ہو اور اس میں کسی دوسرے رنگ کا داغ دھبہ نہ ہو۔ ای ليس فيهالون يخالف معظم لونهاهي صفراء كلهالابياض فيهاولاحمرة ولاسواد(قرطبی).

"جئت بالحق" یہاں حق بمعنی حقیقت ہے یعنی اب تم نے مطلوبہ گائے کی ٹھیک ٹھیک حقیقت بیان کی ہے۔ ای اظهرت حقيقة ماامرنابه فالحق هنابمعنى الحقيقة (روح المعانی).

"فذبحوهاوماكادوايفعلون" یعنی ان کی طبیعت گائے کی ذبح کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی، اس لئے بار بار سوال کرتے تھے۔ ذبح تو کیا مگر بڑی مشکل سے بنی اسرائیل کو کوئی سی گائے ذبح کرنے کا حکم ملا تھا، مگر انہوں نے ازراہ تعنت اس میں موشگافیاں شروع کر دیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ بالا اوصاف کی گائے کے لئے ایک طرف تو انہیں بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی، اور دوسرا عرصہ دراز تک اس کی تلاش میں مارے مارے پھرے۔ عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں، کہ اگر وہ کوئی سی گائے لے کر ذبح کر ڈالتے تو ان کا کام بن جاتا، لو ذبحوا اىّ بقرة ارادوا، لاجزأتهم، ولكن شددواعلى انفسهم فشدد الله عليهم (روح المعانی)۔

مِنَ الْجَاهِلِیْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ قَالَ إِنَّهُ یَقُوْلُ إِنَّهَا

انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے التجا کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے کیسی ہے؟ (موسیٰ نے) کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ

بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِکْرٌ عَوَانٌ بَیْنَ ذٰلِکَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ

وہ گائے ہے نہ تو بوڑھی اور نہ بن بیاہی بلکہ ان کے درمیان (یعنی جوان) ہے پس جیسا تم کو حکم دیا گیا ہے ویسا کرو

﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ إِنَّهُ یَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ

انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ ہمیں یہ بھی بتا دے کہ اس کا رنگ کیسا ہے؟ (موسیٰ نے) کہا اللہ فرماتا ہے

صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا

کہ وہ ایک گائے ہے زرد خوب گہری ہے، کہ دیکھنے والوں کو خوش کر دیتا ہو۔ انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے پھر درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں

مَا هِیَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَیْنَا وَإِنَّا إِنْ شَآءَ

اس کی مزیدماہیت بتا دے ؟ کیونکہ اس گائے میں شبہ پڑا ہے ہم کو، (اگر) اللہ نے چاہا تو

اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ إِنَّهُ یَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْأَرْضَ وَلَا

ہمیں ٹھیک بات معلوم ہو جائے گی، کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے محنت کرنے والی نہیں۔ نہ تو زمین جوتتی ہے

تَسْقِی الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِیَةَ فِیْهَا قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ

اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہے۔ اس میں کسی طرح کا داغ نہیں ہو۔ کہنے لگے کہ اب تم نے سب باتیں درست بتا دیں،

فَذَبَحُوْهَا وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَأْتُمْ فِیْهَا وَاللّٰهُ

انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا اور وہ ایسا کرنے والے تھے ہی نہیں۔ اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا تو اس میں باہم جھگڑنے لگے

مُخْرِجٌ مَّا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا کَذٰلِکَ یُحْیِ

لیکن جو بات تم چھپا رہے تھے اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کرنے والا تھا۔ تو ہم نے کہا کہ اس کا کوئی سا ٹکڑا اس کو مارو۔ اس طرح

اللّٰهُ الْمَوْتٰی وَيُرِيْكُمْ آيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو [۲۵]۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہوگئے گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت اور پتھر تو بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے چشمے پھوٹ

الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا

نکلتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور ان میں سے پانی نکلنے لگتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں

يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ

کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے ۔ کیا تم امید رکھتے ہو کہ

يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ

یہ لوگ تمہارے (دین کے) قائل ہو جائیں گے؟ (حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلامِ الٰہی کو سنتے پھر

---

[۲۵]۔ پہلی تفسیر کے مطابق یہ مذکورہ واقعہ کا پہلا حصہ ہے جسے بعد میں ذکر کیا گیا ہے, اور دوسری تفسیر کے مطابق یہ مستقل واقعہ ہے, جو پہلے واقعہ کے بعد پیش آیا "ادارء تم" درء سے ماخوذ ہے جسکے معنی ہٹانے اور دفع کرنے کے ہیں، اور یہ اصل میں "تدارئتم" "تھا" "تاء" کو قرب مخرج کی وجہ سے دال سے تبدیل کیا گیا اور پھر اسے ساکن کرکے دوسرے دال میں ادغام کر دیا گیا، اور ابتداء میں ہمزہ وصل کا اضافہ کیا گیا، باب تفعل کا خاصہ مشارکت ہے، اس لئے مطلب یہ ہوا کہ تم میں سے ہر شخص قتل کا الزام دوسرے پر پھینکنے لگا" واللہ مخرج ما کنتم تکتمون"، یعنی جس چیز کو تم مسلسل چھپانے کی کوشش کررہے تھے، اللہ اسے ظاہر کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا "فقلنا اضربوہ ببعضها" "ہ" ضمیر نفس کی طرف راجع ہے، کیونکہ مونث معنوی ہے۔ اس کی طرف مذکر و مونث دونوں ضمیریں راجع ہوسکتی ہیں، اور "بعضها" کی ضمیر گائے کی طرف راجع ہے، مطلب یہ کہ گائے کے بدن کا کوئی سا حصہ مقتول کے بدن سے لگا دو، تو وہ زندہ ہوکر قاتل کا پتہ بتا دیگا۔

بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَالُوْآ آمَنَّا وَإِذَا

اسے سمجھ لینے کے بعد اس کو جان بوجھ کر بدلتے رہے ہیں۔ اور یہ لوگ جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں

خَلَا بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ قَالُوْآ أَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ

اور جس وقت آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جو بات اللہ نے تم پر ظاہر فرمائی ہے

لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ أَوَلَا

وہ تم ان کو اس لئے بتائے دیتے ہو کہ (قیامت کے دن) اُسی کے حوالے سے تمہارے رب کے سامنے تمہیں الزام دیں۔ کیا تم سمجھتے نہیں

يَعْلَمُوْنَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّوْنَ لَا

کیا یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ کو (سب) معلوم ہے اور بعض ان میں ان پڑھ ہیں

يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ

کہ اپنے خیالاتِ باطل کے سوا (اللہ کی) کتاب سے واقف ہی نہیں اور وہ صرف ظن سے کام لیتے ہیں تو اُن لوگوں کے لئے ہلاکت ہے

يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا

جو اپنے ہاتھ سے تو کتاب لکھتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے (آئی) ہے تا کہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت

بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيْهِمْ

حاصل کریں، ان کے لئے ہلاکت ہے اس لئے کہ اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں

وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَقَالُوْآ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً

اور (پھر) ان کے لئے ہلاکت ہے اس لئے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ (دوزخ کی) آگ ہمیں چند روز کے سوا

قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهُ

چھو ہی نہیں سکے گی۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے اقرار لے رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اقرار کے خلاف نہیں کرے گا

أَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٠﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّأَحَاطَتْ

(نہیں) بلکہ تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں مطلق علم ہی نہیں ہے۔ ہاں جو بُرے کام کرے اور اس کے گناہ

بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَأُوْلٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِيْنَ

اس کو گھیر لیں تو ایسے لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں (اور) وہ ہمیشہ اس میں (جلتے) رہیں گے

آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُوْلٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا

اور جو ایمان لائیں اور نیک کام کریں وہ جنت کے مالک ہوں گے (اور) ہمیشہ اس میں رہیں گے

خٰلِدُوْنَ ﴿٨٢﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ إِلَّا اللّٰهَ

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ

اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کیساتھ بھلائی کرتے رہنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا

حُسْنًا وَّأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ

اور نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے رہنا تو چند لوگوں کے سوا تم سب (اس عہد سے)

مُّعْرِضُوْنَ ﴿٨٣﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا

منہ پھیر کر بیٹھے۔ اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا

تُخْرِجُوْنَ أَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ أَنْتُمْ

اور اپنے کو اُن کے وطن سے نہ نکالنا تو تم نے اقرار کر لیا اور تم گواہ ہو ۔ پھر تم وہی ہو

هٰٓـؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُوْنَ

کہ اپنوں کو قتل کر دیتے ہو اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر ظلم سے چڑھائی کر کے انہیں وطن سے نکال بھی دیتے ہو

عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسٰرٰى تُفٰدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ

اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلا دے کر اُن کو چھڑوا بھی لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا

عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ

(یہ) کیا (بات ہے کہ) تم کتابِ (الٰہی) کے بعض احکام کو تو مانتے ہو اور بعض سے انکار کر دیتے ہو

مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّونَ

تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رُسوائی ہو اور قیامت کے دن

إِلٰى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٨٥﴾

سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں اور جو کام تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ ان سے غافل نہیں ہے ۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی، پس نہ تو ان سے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٨٦﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ

(اور طرح کی) مدد ملے گی ۔ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی اور ان کے پیچھے یکے بعد دیگرے

بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَأَيَّدْنٰهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ

پیغمبر بھیجتے رہے اور عیسیٰ بن مریم کو کھلے نشانات بخشے اور روح القدس (یعنی جبریل) سے ان کو مدد دی۔

أَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوٰى أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ

توجب کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسی باتیں لے کر آیا جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تھا تو تم سرکش ہو جاتے رہے اور ایک گروہ (انبیاء) کو تو جھٹلاتے رہے

وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا

اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے ۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارے دل پردے میں ہیں (نہیں) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے

مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

سب ان پر لعنت کر رکھی ہے پس یہ تھوڑے ہی ایمان لاتے ہیں۔ اور جب اللہ کے ہاں سے اُن کے پاس کتاب آئی

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا

جو اُن کی (آسمانی) کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے۔ اور وہ پہلے (ہمیشہ) کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے۔

جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

تو جس چیز کو وہ خوب پہچانتے تھے جب اُن کے پاس آ پہنچی تو اُس سے کافر ہو گئے پس کافروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے[٢٦]

---

[٢٦] کتاب سے مراد قران ہے اور تنوین اظہار عظمت کے لئے ہے، هو القران ،وتنكيره للتفخيم، ابو السعود. " مصدق لمامعهم "،مامعهم ، سے مراد تورات ہے، یعنی قران مسئلہ توحید میں، تردید شرک میں، نبوت میں ،اور دیگر کئی احکام میں تورات کی تائید و تصدیق کرتا ہے، قران کی صدق کی ایک دلیل تو یہ ہوئی" وكانوا من قبل يستفتحون" یہاں "يستفتحون" بمعنى يفتحون ہے، کیونکہ باب استفعال کی ایک خصوصیت موافقت مجرد ہے، جیسے استقرّ بمعنی قرّ ہے، اور، فتح، کے معنی بتانے اور خبر دینے کے بھی آتے ہیں، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، من قولهم فتح عليه ،اذاعلمه ووقفه كمافى قوله تعالى "اتحدثونهم بمافتح الله عليكم". روح المعانی، یعنی یہی یہودی اس سے پہلے کفار اور مشرکین کو بتایا کرتے تھے، عرب میں جو آخری نبی پیدا ہونے والا ہے، اس کے ظہور کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ اور اس نبی پر اللہ کی طرف سے ایک کتاب نازل ہوگی، اى يعرّفون المشركين ان نبيايبعث منهم وقدقرب زمانه. روح ،بحر . یہ قران اور صاحب قران کی صدق پر دلیل ہے۔ جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب آ گئی اور اللہ کا وہ رسول بھی آ گیا، جن کو وہ اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے، تو انہوں نے محض بغض و حسد اور ضد و عناد کی وجہ سے اور اپنے تقدس و اقتدار کی حفاظت اور حرص دنیا کی خاطر ان دونوں کا انکار کر دیا۔ بغضاوحسداوحرصاعلى الرياسة. مدارك. كفروا،لما،اولى ، کا جواب ہے، اور لماثانيه، اولى ، کی تاکید ہے، یالمااولى ، کا جواب محذوف ہے، اور یہ لماثانيه، کا جواب ہے۔" فلعنة الله على الكافرين" ان کافروں کے لئے کفر و انکار کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے دوری ہو۔ نہ دنیا میں ایمان کی توفیق نصیب ہوگی نہ اخرت میں نجات نصیب ہوگی۔ اس ایت کا ترجمہ احمد رضا خان بریلوی نے اس طرح کیا ہے: (اور لوگوں کو شبہ میں ڈالا ہے)" اور اس سے پہلے وہ اسی نبی کے وسیلہ سے

کافروں پر فتح مانگتے تھے'' جبکہ حاشیہ والا (مولوی نعیم الدین) اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں، کہ سید الانبیاء کی بعثت اور قران کریم کے نزول سے پہلے یہود اپنے حاجات کے لئے حضور کے نام پاک کے وسیلہ سے دعا کرتے، اور کامیاب ہوتے تھے۔اور اس طرح دعا کیا کرتے تھے، اللهم افتح علینا وانصرنا بالنبی الامی ،یارب ہمیں نبی، امی، کے صدقے میں فتح ونصرت عطا فرما۔مولوی حمداللہ جان، البصائر: ۲۱، ۳۰، میں لکھتے ہیں، یہ آیت بنوقریظہ کے متعلق نازل ہوئی ،جیسا کہ سدی سے روایت ہے: کہ جب اوس وخزرج اور مشرکین کی لڑائی ہوتی، تو وہ تورات نکال کر اس میں رسول اللہ ﷺ کا نام نکال لیتے، اور اپنے ہاتھ اس پر رکھ کر دعا کرتے کہ: اللهم انا نسئلک بحق نبیک الذی وعدتنا ان تبعثه فی هذا الزمان ان تنصرنا علی عدونا الیوم، تو ان کی مدد کی جاتی۔مولوی صاحب، یہ روایت مستدرک: ۶۵۲/۲، اور، دلائل النبوۃ، ودرمنثور، وغیرہ نے نقل کیا ہے، روایت حاکم اس طرح ہے: کہ اخبرنی الشیخ ابوبکر بن اسحاق، انبأ محمد بن ایوب ثنا یوسف بن موسی ،ثنا عبد الملک بن هارون بن عنترة، عن ابیه، عن جده، عن سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ قال: کانت یهود خیبر تقاتل غطفان ،فکلما التقوا هزمت یهود خیبر ،فعاذت الیهود بهذا الدعاء: اللهم انا نسئلک بحق محمد النبی الامی الذی وعدتنا، ان تخرجه لنا فی اخر الزمان، الا نصرتنا علیهم ،قال فکانوا اذا التقوا دعوا بهذا الدعاء، فهزموا غطفان ،فلما بعث النبی ﷺ کفروا به، فانزل الله ''وقد کانوا یستفتحون بک یا محمد علی الکافرین.

امام حاکم اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے، ادت الضـــــرورة الی اخراجه فی التفسیر وهو غریب من حدیثه ۔اس کی سند میں، عبد الملک بن ھارون ہے، اس کے متعلق، ابن حجر، لسان المیزان: ۸۶/۴، میں لکھتا ہے: متروک هالک ،اور امام ذہبی تلخیص المستدرک میں لکھتا ہے، هالک، جبکہ امام حاکم نے خود ہی اشارہ کیا کہ یہ ضعیف ہے۔اس روایت سے بعض مبتدعین توسل بالذوات الفاضلہ کے لئے استدلال کرتے ہیں۔اور نعیم الدین بریلوی اس آیت کی تفسیر کے بعد لکھتا ہے کہ: مسئلہ، اس سے معلوم ہوا کہ مقبولان کے حق کے وسیلہ سے دعا قبول ہوتی ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور سے قبل جہان میں حضور کی تشریف آوری کا شہرہ تھا، اس وقت بھی حضور کے وسیلہ سے خلق کی حاجت روائی ہوتی تھی، لیکن ان کا یہ استدلال صحیح نہیں اس لئے کہ یہ روایت صحیح نہیں ،جبکہ مدارک، اور خازن وغیرہ لکھتے ہیں: کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ جب وہ آجائے تو ہم ان کے ساتھ مل کر تمہیں ایسا قتل وغارت کرینگے، کہ تمہارا نام ونشان مٹ جائے گا۔مزید تفصیل کے لئے تفسیر احسن الکلام (پشتو) کو رجوع کریں۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا أَنْ يُّنَزِّلُ اللّٰهُ

جس چیز کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا وہ بہت بُری ہے یعنی اس جلن سے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے

مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْا بِغَضَبٍ

جس پر چاہتا ہے اپنی مہربانی سے (وحی) نازل فرماتا ہے۔ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب سے کفر کرنے لگے تو وہ (اس کے) غضب

عَلٰى غَضَبٍ وَّلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩٠﴾

بلائے غضب میں مبتلا ہو گئے اور کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے [٢٧]

---

[٢٧] یہاں ''اشتراء'' کے معنے بیچنے کے ہیں، یعنی جن چیز کے عوض انہوں نے اپنی جانیں بیچ دی ہیں، اور جس کام کیلئے انہوں اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے وہ بہت برا ہے، ''ان یکفروا بما انزل اللہ'' یہ ''بئس'' کا مخصوص بالذم ہے۔ یعنی جس برے کام کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا، وہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ایات بینات کا کفرو انکار ہے، اور ''ماانزل اللہ'' سے مراد قرآن ہے، جس کا ''کتاب مصدق'' کے الفاظ میں پہلے ذکر ہو چکا ہے، والمراد ، بماانزل اللہ، کتا ب مصدق، روح۔ ''بغیاان ینزل اللہ'' بغیا، ان یکفروا، کا مفعول لہ، ہے اوران کے کفروانکار کی علت بیان کر رہا ہے اور ''من فضلہ'' سے وحی مراد ہے، اور ''من یشاء من عبادہ'' سے مراد محمد ﷺ ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب نے قرآن کا انکار کسی غلط فہمی کی بنیاد پر نہیں کیا، وہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کو اچھی طرح جانتے ہیں، اور انکار محض بغض وحسد کی بناء پر کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آخری نبی بھی ہماری خاندان بنی اسرائیل ہی میں سے ہوگا، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ تو بنی اسماعیل میں پیدا ہو گیا ہے، تو حسد کرنے لگے کہ بنی اسماعیل کے پیغمبر پر کیوں وحی نازل ہوئی ہے؟ انهم ظنوا ان هذا الفضل العظيم بالنبوة المنتظرة يحصل فى قومهم فلماوجدوه فى العرب حملهم ذلک على البغي و الحسد (کبیر) ۔یعنی وہ دوہرے غضب کے مستحق ہو گئے۔ ایک غضب تو توحید کو چھوڑ کر شرک کرنے اور گوسالہ پرستی کی وجہ سے نازل ہوا، اور دوسرا غضب آخری نبی ﷺ کو نہ ماننے کی وجہ سے ۔''وللکافرین عذاب مهین'' اوران کافروں کے لئے ایسا عذاب تیار ہے جو ان کے بغض وعناد اور کبر وغرور کو توڑ کر انہی کو ذلیل وخوار کرے گا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَآ أَنزَلَ اللّٰهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو (کتاب) اللہ نے نازل فرمائی ہے اس کو مانو تو کہتے ہیں کہ جو کتاب ہم پر نازل ہوچکی ہے ہم تو اُسی کو مانتے ہیں

بِمَا وَرَآءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ

(یعنی) یہ اس کے سوا اور (کتاب) کونہیں مانتے حالانکہ وہ سچی ہے اور جو اُن کی کتاب ہے اس کی بھی تصدیق کرتی ہے۔

أَنبِيَآءَ اللّٰهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُم مُّوسٰى

(ان سے) کہہ دو کہ اگر تم صاحبِ ایمان ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو پہلے ہی کیوں قتل کیا کرتے؟ اور موسیٰ

بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ وَأَنتُمْ ظٰلِمُونَ ﴿٩٢﴾

تمہارے پاس کھلے ہوئے معجزات لے کر آئے تو تم ان کے (کوہِ طور) جانے کے بعد بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے اور تم ظلم کرتے تھے

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَآ آتَيْنٰكُم

اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور کوہِ طور کو تم پر اُٹھا کھڑا کیا (اور حکم دیا کہ) جو کتاب ہم نے تمہیں دی ہے

بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا

اس کو زور سے پکڑو اور سنو تو وہ (جو تمہارے بڑے تھے) کہنے لگے کہ ہم نے سن تو لیا لیکن مانتے نہیں

وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ إِن

اور ان کے کفر کے سبب بچھڑا ان کے دلوں میں رچ بس گیا تھا (اے پیغمبر ﷺ! ان سے) کہہ دو کہ اگر تم مومن ہوتو

كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩٣﴾ قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِندَ اللّٰهِ

تمہارا ایمان تم کو بُری بات بتاتا ہے ۔ کہہ دو کہ آخرت کا گھر اور لوگوں کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے نزدیک

خَـالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّـاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

صرف تمہارے ہی لئے مخصوص ہے تو اگر سچے ہو تو موت کی آرزو تو کرو [۲۸]

---

[۲۸] اس ایت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے ایک باطل قول کی تردید کی، بعد میں ان کو مباہلے کا چیلنج دیا ہے، یہ چیلنج ان کے اسی سب سے بلند بانگ دعوی کے جواب میں ہے، کہ ہم اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبروں کی اولاد ہیں، اس لئے ہم اللہ کے چہیتے اور محبوب ہیں، اور جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں جائے گا۔ سبب نزولها قولهم لن يدخل الجنة الخ ونحن ابناء الله واحباء ه الخ ولن تمسنا النار الخ (روح، قرطبی) معالم، ابن کثیر، تو اس کا جواب مباہلے سے دیا گیا۔

''الدار الاخرة'' سے مراد جنت ہے اور ''الناس'' سے مراد تمام وہ لوگ ہیں، جو ان کے دین پر نہیں تھے۔

''فتمنوا الموت''، یعنی ہر فریق دوسرے کی موت کی تمنا کرے، یعنی موت کی بد دعاء کرے، جیسا کہ مباہلہ میں ہوتا ہے۔ اى ادعوا بالموت على الكاذب من الفريقين و المراد منه المباهلة كما صح عن ابن عباس رضى الله عنهما وغيره من السلف. جامع البيان، قرطبى، ان كنتم صادقين: یعنی اگر تم اس دعوی میں سچے ہو کہ جنت صرف تمہارے ہی لئے ہے تو آؤ اور مباہلہ کرو۔ اور امام احمد نے: ۹۹/۴، میں یہ حدیث نقل کیا ہے کہ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لو ان اليهود تمنوا الموت لماتوا، ورأوا مقاعدهم من النار، ولو خرج الذين يباهلون رسول الله ﷺ لرجعوا لايجدون مالا ولا اهلا،

اس ایت کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ یہاں تمنی موت سے اپنی موت کی تمنا مراد ہے، یعنی اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو تو اللہ سے اپنے لئے موت مانگو کیونکہ جس شخص کو یقین ہو کہ وہ جنت میں جائے گا اس کی دلی خواہش یہ ہوگی کہ وہ دنیا کے تکلیفوں سے نجات پائے اور اخرت کی طرف منتقل ہو کر جنت میں اپنا بسیرا کرلے، لیکن ابن کثیر نے اس قول کو مرجوح کہا ہے۔ اور فرمایا ہے، کہ: یہ قول کچھ دل کو نہیں لگتا، اس لئے کہ بہت سے اچھے اور نیک آدمی بھی زندگی چاہتے ہیں، بلکہ حدیث میں ہے کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جسکی لمبی عمر ہوئی ہو، اور اعمال اچھے ہوں، علاوہ ازیں یہی قول یہودی بھی کہہ سکتے تھے، تو بات فیصلہ کن نہ ہوتی، ٹھیک تفسیر وہی ہے جو پہلے بیان ہوئی کہ دونوں فریق ملکر جھوٹے کی ہلاکت اور اس کی موت کی دعاء کریں، اس اعلان کے سنتے ہی یہودی تو ٹھنڈے پڑ گئے، اور تمام لوگوں پر ان کا جھوٹ کھل گیا۔ سورۃ جمعہ

ایت (٦) میں بھی یہودیوں کومباہلہ کی دعوت دی گئی ہے: وہاں سبب ذکر ہے اور یہاں مسبب اور''العمران'':٦١، میں عیسائیوں کومباہلہ کی دعوت ہے ۔اسی طرح مشرکین عرب سے بھی کہا گیا،سورۂ مریم:٧۵،یعنی ہم میں سے جوگمراہ ہو،اللہ تعالی اس کی گمراہی بڑھادے۔اس کی پوری تفصیل اس آیت کے تحت بیان ہوگی انشاءاللہ۔

علامہ امیرعلی نے مباہلہ کے متعلق کچھ احکام اورشرائط لکھے ہیں،جس کا حاصل یہ ہے: کہ اب مباہلہ جائز نہیں مگر کسی ایسے ہی امرمہم میں جوشرعی ہو،اوراس میں اشتباہ وعناد کیا گیا ہو،اور وہ بدون مباہلے کے دفع نہ ہوتا ہو،توروا ہے، بشرطیکہ مباہلے سے پہلے حجت پوری پوری قائم کردے،اورشبہ دورکرنے میں کوشش کرلے،اور پہلے نصیحت اورڈراوٴ دلادے، پھر اگروہ نفع نہ کرے اوریہی ضرورت پیش آوے کہ مباہلہ کیا جاوے،توروا ہے۔جیسا کہ حافظ ابن قیم کا بھی یہی قول معلوم ہوتا ہے۔کیونکہ انہوں نے صفات حق عزوجل کوظاہری معانی پررکھنے،اوراس کی مرادکوحق عزوجل کے سپردکرنے کی حقیقت پربدون تاویل وتحریف کے اپنے علماءزمانہ سے خانہ کعبہ کے رکن ومقام کے درمیان مباہلہ کرنے کوبلایا،مگرکسی نے قبول نہ کیا،اورحق اس مسئلہ میں اکابراہل اللہ کی طرف ہےاوراسی کےقریب قول عدم تاویل کا ہے،اورسب سے اخس قول تاویل ہے، اگرچہ متاخرین نے اس کومحکم ومضبوط قراردیالیکن وہ مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزورہے ۔(مواہب الرحمان:٣/٢١٧)۔امام ذہبی نے تاریخ اسلام (کبیر):١١/ص١٣،اورابن کثیرنے البدایہ والنہایہ:١٣/۵٨٢،میں یہ واقعہ ذکرکیاہے،کہ:**وقد كان عبدالله بن مصعب الزبيرى افترى عليه(يحى) لبغضه للطالبية،وزعم انه طلب اليه ان يخرج معه،فباهله يحى بحضرة الرشيد،وقام،فمات الزبيرى ليومه،وكان يحى قدطلب مباهلته وشبک يده فى يده وقال:قل:اللهم ان كنت تعلم ان يحى بن عبدالله بن حسن لم يدعنى الى الخلاف و الخروج على امير المومنين هذا،فكلنى الى حولى وقوتى واسحتنى بعذاب من عندك،آمين ،رب العالمين.قال:فتلجلج الزبيرى وقالها.ولماقال يحى مثله ماتلجلج.**

اورعبداللہ بن عباسؓ نے مسئلہ ظہار کے متعلق فرمایا تھا''**من شاء باهلته انه ليس للامة ظهار**''اس کوابن حجرنے اتحاف المہرۃ:٧/۴۴٢،میں ذکرکیا ہے۔جبکہ مصنف عبدالرزاق:١٠/٣۵۵،اورسنن سعید بن منصور:١/۴۴،میں اس سے،مسئلہ العول، میں بھی مباہلہ کی ذکرہے،اورابوداوٴدنے کتاب الطلاق باب عدۃ الحامل:٣/٣٦٢،میں عبداللہ بن مسعودؓ سے مباہلے کا ذکرنقل کیا ہے،اورتفسیرجمل نے:١/۴٣١،میں اس مسئلے کاتفصیل ذکرکیا ہے۔اورقوام السنۃ نے کتاب سیرالسلف:٣/١٠٦۴،میں واثق باللہ اورابن ابی دوٴادکا مباہلہ ذکرکیا ہے۔

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

لیکن اُن اعمال کی وجہ سے جواُن کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں یہ کبھی اُس کی آرزو نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے واقف ہے

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا

بلکہ اُن کو تم اور لوگوں سے کہیں زیادہ زندگی کے حریص دیکھو گے یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی۔

يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُّعَمَّرَ

ان میں سے ہر ایک یہی خواہش کرتا ہے کہ کاش وہ ہزار برس جیتا رہے مگر اتنی لمبی عمر اُس کو مل بھی جائے تو اُسے عذاب سے تو نہیں چھڑا سکتی

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ

اور جو کام یہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو دیکھ رہا ہے۔ کہہ دو کہ جو شخص جبرئیل کا دشمن ہو (اس کو غصے میں مر جانا چاہئیے)

فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

اس نے تو (یہ کتاب) اللہ کے حکم سے تمہارے دل پر نازل کیا ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ایمان والوں کے لئے

وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ

ہدایت اور بشارت ہے ۔ جو شخص اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کے پیغمبروں کا

وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

اور جبریل کا اور میکائیل کا دشمن ہو تو ایسے کافروں کا اللہ تعالیٰ دشمن ہے ۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيٰتٍ بَيِّنٰتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور ہم نے تمہارے پاس سلجھی ہوئی آیتیں ارسال فرمائی ہیں اور اِن سے انکار وہی کرتے ہیں جو بدکردار ہیں ۔

أَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ

ان لوگوں نے جب کبھی (اللہ سے) پختہ وعدہ کیا تو اُن میں سے ایک فریق نے اُس کو پھینک دیا

بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ

حقیقت یہ ہے کہ ان میں اکثر بے ایمان ہیں ۔ اور جب اُن کے پاس اللہ کی طرف سے پیغمبر آئے

لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتَابَ

اور وہ اُن کی کتاب کی بھی تصدیق کرتے ہیں تو جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی اُن میں سے ایک جماعت نے

كِتَابَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا

اللہ کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ جانتے ہی نہیں ۔ اور اُن (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے

الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ

جو سلیمان کے عہدِ سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیطان ہی

كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ

کفر کرتے تھے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور اُن باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے تھے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں

هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ أَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا

ہاروت اور ماروت پر اتری تھیں اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعہ) آزمائش ہیں

تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ

تم کافر نہ بنو،اور لوگ ان سے ایسا (جادو) سیکھتے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔

بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ

اور اللہ کے حکم کے سوا وہ اس سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے اور کچھ ایسے (منتر) سیکھتے جو اُن کو نقصان ہی پہنچاتے

وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهٗ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ

اور فائدہ کچھ نہ دیتے۔ اور وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسی چیزوں کا خریدار ہو گا اُس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں

وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

اور جس چیز کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا وہ بُری تھی۔ اگر وہ (اس بات) کو جانتے [۲۹]

---

[۲۹] اس ایت میں "الشیاطین" سے سرکش جن اور ابلیس کے چیلے مراد ہیں، جو لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، و المتبادر من الشیاطین مردة الجن، وھوقول الاکثرین. (روح المعانی). ان یہودیوں نے تورات میں اخری نبی پر ایمان لانے کے حکم ہی کو نہیں ٹھکرایا بلکہ انہوں نے تو تورات کی دعوت توحید کو بھی پامال کر دیا، اور اسے چھوڑ کر شیطانی جادو اور ٹوٹکوں کے پیچھے پڑ گئے، جو سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطانوں نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے گھڑے تھے، جب یہودیوں نے قران کی دعوت توحید کے مقابلہ میں غیر اللہ کی پکار کا جواز ثابت کرنے کے لئے تورات پیش کی، تو تورات مسئلہ توحید پر قران سے متفق نکلی، تو اب یہودی اپنی خفت مٹانے کے لئے جادو کی وہ پوتھیاں نکال لائے، جو شیطانوں نے لکھ کر سلیمان علیہ السلام اور ان کے مومن وزیر اصف بن برخیا اور ہاروت و ماروت فرشتوں کے ناموں سے مشہور کر رکھی تھیں، اور نسلا بعد نسل موجودہ یہود تک پہنچی تھیں: قال السدی عارضت الیھود محمدا ﷺ بالتوراة فاتفقت التوراة والقرآن، فنبذوا التوراة، واخذوا بکتاب اصف، وسحرھا ھاروت وماروت، قرطبی: کبیر، نیشابوری.

جادو میں چونکہ غیر اللہ کو پکارا جاتا ہے، اس لئے ایسا جادو صریح شرک اور کفر ہے، جب یہودی جادو، اور ٹوٹکوں کی پوتھیاں نکال لائے اور کہا دیکھو، یہ سلیمان علیہ السلام کے خاص نوشتے ہیں، اور وہ جادو کیا کرتے تھے، اور غیر اللہ کو پکارا کرتے تھے، بلکہ اسی کی بناء پر وہ جنوں پر حکومت کرتے تھے، تو اللہ تعالی نے یہودیوں کے اس دعوی کی تردید و تکذیب فرما کر سلیمان علیہ السلام کی اس کفر و شرک سے برائت کا اعلان فرمایا، کہ سلیمان پیغمبر نے تو ایسا کفر و شرک کبھی نہیں کیا، جو یہ لوگ ان کے ذمے لگا رہے ہیں، "ولکن الشیاطین کفروا" "لکن" ماقبل کی نفی اور مابعد کے اثبات کے لئے آتا ہے، یعنی سلیمان علیہ السلام نے یہ جادو اور کفر و شرک نہیں کیا بلکہ یہ سب شیاطین کی کارستانیاں ہیں۔ قتادہ کا بیان ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطانوں نے ایک کتاب تیار کی، جس میں جادو اور شرک تھا، اور لوگوں میں اس کی اشاعت کی، اور اس میں لکھا ہوا جادو لوگوں کو سکھانے لگے، جب سلیمان علیہ السلام کو اس کا علم ہوا، تو انہوں نے وہ کتابیں حاصل کر کے اپنے تخت کے نیچے دفن کرا دیں۔

جب ان کی وفات ہوگئی تو جنوں نے یہ کتابیں پھر سے نکال لیں، اوراب لوگوں میں مشہور کرنا شروع کر دیا کہ یہ سلیمان علیہ السلام کے مخصوص نوشتے اوران کا خاص علمی خزانہ ہے۔ جسے انہوں نے ہم سے چھپایا ہوا تھا، اور بعض نوشتوں کی ابتداء میں تو ان خبیثوں نے یہ الفاظ بھی بڑھا دیئے تھے ''**ھذا ما کتب اصف بن برخیاللملک سلیمان بن داؤد من ذخائر کنوز العلم**'' یعنی یہ علم کے ذخیروں میں سے وہ خزانہ ہے جسے اصف بن برخیا نے سلیمان علیہ السلام کے حکم سے لکھا تھا، جنوں نے یہ کتابیں نکال کر لوگوں میں پھیلانا، اورانہیں سکھانا شروع کر دیا۔ ابن جریر۔ رفتہ رفتہ یہی نوشتے اور پوتھیاں نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہودیوں کے پاس بھی پہنچ گئیں، اور بعض روایتوں میں ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیاطین اسمان کے قریب جا کر ائندہ کاموں سے متعلق فرشتوں کی باتیں سنتے اوران میں اپنی طرف سے سینکڑوں جھوٹ ملا کر کاہنوں اور نجومیوں کو بتاتے، اور وہ ان تمام باتوں کو کتابوں میں لکھ کر لوگوں میں پھیلاتے، اورانہیں سکھاتے، اور چونکہ کوئی بات سچی بھی ہو جاتی تھی، اس لئے انہوں نے لوگوں میں مشہور کر رکھا تھا، کہ جن غیب جانتے ہیں، اور یہ سلیمان علیہ السلام کا خاص علم ہے، اوراسی علم کے ذریعے انہوں نے جن وانس اور ہوا کو تابع کر رکھا ہے: مدارک، نیشاپوری۔ اگر اس روایت کو پیش نظر رکھا جائے تو ''شیاطین'' سے شیاطین الجن والانس دونوں مراد ہونے چاہئیں، کیونکہ اس کام کو شروع تو شیاطین الجن نے کیا تھا، لیکن لوگوں میں اسکی تعلیم واشاعت، شیاطین الانس کے ذریعے ہوئی۔

تحقیق السحر

اس آیت میں جادو کو کفر کہا گیا ہے، اس لئے جادو سے یہاں دواؤں کے ذریعے یا ہاتھ کی صفائی سے عجیب وغریب کرتب دکھانے مراد نہیں، کیونکہ بعض لوگ ان پر بھی جادو، اور سحر کا اطلاق کر دیتے ہیں، اور یہ کفر بھی نہیں بلکہ اس سے جادو کی وہ تمام قسمیں مراد ہیں، جن میں غیر اللہ کو پکارا جاتا ہے، اور ارواح خبیثہ سے استعانت کی جاتی ہے، اوراس میں شرکیہ وظائف پڑھے جاتے ہیں: **ویستعان فی تحصیلہ بالتقرب الی الشیطان بارتکاب القبائح قولا، کالرقی التی فیھا الفاظ الشرک الخ.** روح. شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ جادو کی تیرہ قسمیں ہیں، اور سب کا خلاصہ غیر اللہ کو پکارنا، غیر اللہ کو قادر، اور عالم الغیب سمجھنا ہے، اس کے بعد فرمایا ہے کہ جادوگر کی سزا قتل ہے، اور قتل کے بعد نہ اس کا جنازہ پڑھا جائے، اور نہ ہی اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ شیخ ؒ فرماتے ہیں، اے برادر! دعاء لغیر اللہ کہ بروئے اثار عجیبہ ظاہر میشود سحر است، ہمین است ماہیت در الفاظ، دعوت قمری ''ای **مرسل الرحمة ومنزل النعمة**'' ودر دعوت عطارد: ''**کل ماحصل لی من الخیر فھو منک**''۔

ونیز گویند ایھا العالم بحفیات الامور و المطلع علی السرائر ،ودر تفسیر عزیزی است اگر در سحر قولی یا فعلی که موجب کفر باشد مثل ذکر نام بتان وارواح خبیثہ بہ تعظیمکہ شایان رب العزت است مثلاً اثبات عموم علوم وقدرت وغیب دانی ومشکل کشائی یا ذبح لغیر اللہ یا سجدہ لغیر اللہ، وغیر ذلک واقع شود، بلاشبہ آن سحر کفر است ۔ وصاحب ان مرتد شود، انتہی مختصراً فی التوسل لابن تیمیہ: ۱۳۰۔ استغاثہ واقسام لغیر اللہ سحر است ۔

اسی طرح امام ابن تیمیہ ''قاعدہ جلیلیہ'' میں فرماتے ہیں کہ جادو میں غیر اللہ کو پکارنا لازم ہے، جس طرح یہودیوں نے اللہ کے معصوم پیغمبر سلیمان علیہ السلام کے ذمہ جادو اور غیر اللہ کو پکارنے جیسا شرک لگا دیا تھا، اور ثبوت میں غیر مستند نوشتے پیش کئے تھے، اسی طرح آج کل قران کی خالص توحید کے مقابلہ میں شرک پسند پیر اور بدعت نواز مولوی اپنے شرکیہ اعمال وعقائد اور بدعات کو جائز ثابت کرنے کے لئے امام ابوحنیفہؒ، شیخ عبد القادر جیلانی ، امام شعرانی اور دیگر بزرگان دین کا نام لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ مشائخ بھی غیر اللہ کو نہ صرف پکارنے کی اجازت دیتے تھے بلکہ خود بھی پکارا کرتے تھے، اور ثبوت ''قصیدہ نعمانیہ، قصیدہ غوثیہ، لطائف المنن ، اور بہجۃ الاسرار'' ایسی غیر مستند اور بے سروپا کتابیں پیش کرتے ہیں، حالانکہ یہ بزرگان دین اس قسم کی خرافات سے بالکل بری تھے، اگر قران کے مقابلے میں ایسی عبارتیں اور کتابیں بزرگوں کی طرف منسوب کر کے پیش کی جائیں، تو اگر واقعی وہ بزرگ اور اولیاء اللہ تھے جیسے مذکورہ بزرگان، تو اس نسبت کا صاف انکار کر دینا چاہئیے، جس طرح وضّاعوں اور کذّابوں نے رسول اللہ ﷺ کے ذمہ جھوٹی حدیثیں لگا دی ہیں، اسی طرح توحید کے غداروں اور سنت کے باغیوں نے یہ منگھڑت خرافات ان بزرگوں کے ذمہ لگا دی ہیں، اور اگر ان عبارتوں کی نسبت ان بزرگوں کی طرف صحت سے ثابت ہوجائے تو ان میں تاویل کی جائیگی، اور ان کا ایسا محمل بیان کیا جائیگا جو قواعد شرعیہ کے موافق ہو، اور اگر الفاظ میں تاویل کی گنجائش نہ ہو تو کہا جائے، کہ یہ کلمات اس شخص سے غلبہ حال کی حالت میں صادر ہوئے ہونگے، جس میں وہ معذور ہیں۔ بہر حال قواعد شرعیہ کے خلاف کسی کا کوئی قول قابل قبول نہیں، خواہ وہ کتنا ہی بڑا اولی اور امام کیوں نہ ہو، شریعت، اماموں، اور ولیوں کے تابع نہیں، بلکہ امام اور ولی شریعت کے تابع ہیں۔

''ومـاانـزل'' میں ''ما'' موصولہ ہے، نافیہ نہیں، جیسا بعض کو غلطی لگی ہوئی ہے، اس کا عطف ''مـاتتلو'' پر ہے یعنی یہودیوں نے تورات کا پیغام توحید چھوڑ چاڑ کر شیطانی ٹوٹکوں اور ہاروت اور ماروت کے جادو کی اتباع اور پیروی شروع کر دی، یہاں ''انـزل '' سے مراد وحی نہیں بلکہ الہام کے ذریعے تعلیم مراد ہے .الانـزال بـمـعـنـی الالھـام و التعلیم.معالم ''الملکین'' میں مشہور قرأت لام کے فتحے سے ہے القرأة المشهورة بفتح اللام ، کبیر ، اسی بناء

پر محققین کی رائے یہ ہے، کہ ھاروت وماروت دونوں فرشتے تھے، جنہیں لوگوں کے امتحان اور ابتلاء کے لئے اللہ تعالی نے زمین پر بھیجا تھا۔ ذھب کثیر من السلف الی انھما کانا ملکین من السماء وانھما انزلا الی الارض .ابن کثیر. وھذا الملکان انزلا لتعلیم السحر ابتلاء من اللہ تعالی علی الناس .روح المعانی .ان فرشتوں کو زمین پر اتارنے کی وجہ کے متعلق علمائے محققین نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں سحر اور جادو کا چرچا عام تھا، اور جادوگر بکثرت تھے، بعض دفعہ جادوگر نبوت کا دعوی کردیتے، اور جادو کے عجیب وغریب کرتب دکھا کر لوگوں سے اپنی جھوٹی نبوت منوالیتے، جادوگر لوگوں کو ایسے ایسے شعبدے دکھاتے کہ وہ حیران رہ جاتے، سفلی عملیات اور جادو کے ٹوٹکوں سے عوام اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں حق سمجھنے لگے، اور ان کے ذہنوں میں ایسی الجھنیں پیدا ہوگیں، کہ وہ جادو اور معجزے کے درمیان امتیاز نہیں کرپاتے تھے، اس طرح جادو کے ذریعہ روز بروز گمراہی پھیل رہی تھی، لوگ انبیاء علیہم السلام، اللہ کے نیک بندوں، اور جادوگروں، اور شعبدہ بازوں کو ایک ہی سمجھنے لگے، تو اللہ تعالی نے حق وباطل کا فیصلہ کرنے اور جادو اور معجزہ میں امتیاز قائم کرنے کے لئے، ان فرشتوں کو جادو کی حقیقت سے اگاہ کرکے، زمین پر بھیجا تھا، تاکہ لوگ جادو اور معجزہ کی حقیقت اور باہمی امتیاز کو سمجھ کر جادوگروں کے مکروفریب سے بچ سکیں، الکبیر، روح المعانی، والبحر۔

یہودیوں نے ہاروت وماروت کے متعلق ایک عجیب وغریب اور جھوٹا قصہ مشہور کررکھا تھا، جو کہ امام احمد نے مسند: ١٠/٧/٣١٧، میں اور عبد بن حمید [٧٨٧]، ابن حبان [٦١٨٦] ابن السنی [٦٦٢٢] سنن کبری: [١٠/٤و٥] وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ: حدثنا یحی بن ابی بکیر، حدثنا زھیر بن محمد عن موسی بن جبیر عن نافع، مولی عبداللہ بن عمرؓ عن عبداللہ بن عمرؓ، انه سمع نبی اللہ ﷺ یقول: ان آدم ﷺ لما اھبطه اللہ تعالی الی الارض قالت الملائکة ای ربّ : أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء ، وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّيْ أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ ﴿بقرہ، ٣٠﴾ قالوا ربنا نحن اطوع لک من بنی آدم، قال اللہ تعالی للملائکة: ھلموا ملکین من الملائکة حتی یھبط بھما الی الارض فننظر کیف یعملان، قالوا ربنا ھاروت وماروت، فاھبطا الی الارض ومثّلت لھما الزھرة امرأةً من احسن البشر، فجائتھما فسئلاھا نفسھا، فقالت لا واللہ حتی تکلما بھذہ الکلمة من الاشراک. فقالا واللہ لا نشرک باللہ ابداً، فذھبت عنھما ثم رجعت بصبی تحمله، فسئلاھا نفسھا فقالت: لا واللہ حتی تقتلا ھذا الصبی، فقالا واللہ لا نقتله ابدا، فذھبت ثم رجعت بقدح خمر تحمله

فشـربـا،فسـكـرا،فوقعاعليها،وقتلا الصبى ،فلما افاقا،قالت المرأة والله ماتركتماشيئامماابيتماه علىّ الاقدفعلتماحين سكرتما، فخُيّرابين عذاب الدنياوالاخرة، فاختاراعذاب الدنيا.

جس کا ماحصل یہ ہے، کہ اللہ نے ان دونوں فرشتوں کوبطورازمائش، بشری لوازمات دیکرزمین پر بھیجا، توانہوں نے ایک کنجری زہرہ کے ورغلانے پرشراب نوشی کی، ایک بچہ ناحق قتل کیا۔اورزہرہ کنجری سے منہ کالا کیا،اس کے بعدانہوں زہرہ کنجری کواسم اعظم بتادیا،اوروہ اس کے ذریعے اسمان پر چلی گئی،تواللہ نے اسے زہرہ سیارہ بنادیا۔ھاروت وماروت اپنے گناہوں کی وجہ سے اسمان پرنہ جاسکے،اوراب نہیں الٹالٹکا کرعذاب دیاجارہاہے۔تعجب ہے کہ بعض مفسرین نے یہ جھوٹا قصہ بلانکیراپنی کتابوں میں درج کیاہے لیکن محققین علماءنے اس پرشدیدانکارکیاہے،جبکہ اس حدیث کے متعلق شعیب الارنووط تعلیق (مسنداحمد) میں لکھتاہے:اسـنـاده ضـعيف ،ومتنــه بـاطـل ،مـوسى بن جبير.وهو الانصارى الـمـدنـى الـحـذاء،ذكـره ابـن حبـان فى الثقات:۷/۴۵۱،وقال يخطئ ويخالف، وقال ابن القطان لايعـرف حـالـه،وقـال الـحـافـظ فـى الـتـقـريب مستور.وزهيربن محمد، هوابو المنذر الخراسانى الـمـروزى الـخـرقـى، ذكـره ابوذرعة فى اسامى الضعفاء ،وقال ابوحاتم محله الصدق ،وفى حفظه سـوء ،واخـتـلف قـول ابـن معين فيه، فوثقه مرة وضعفه اخرى،وضعفه النسائى ،وذكره ابن حبان فى الثـقـات:وقـال يـخـطئ ويـخـالف،وقـال الـدارمى له اغاليط كثيـــرة،وقال الساجى صدوق منكر الحديث،وذكره العقيلى وابن الجوزى و الذهبى فى جملة الضعفاء ،وبقية رجاله ثقات. و الصحيح ان هـذا الـحديث لاتصح نسبته الى النبى ﷺ،وانماهومن قصص كعب الاحبار،نقله عن كتب بنى اسـرائيـل،فـقـداخـرج عبـد الـرزاق فـى تفسيره: ۱/۵۳،وعنه ابن جرير:رقم:۱۶۸۴،۱۶۸۵،عن سـفيـان الثـورى عـن موسى بن عقبة عن سالم عن ابن عمرؓ،عن كعب الاحبار،قال ذكرت الملائكة اعمال بنى آدم الخ، واسناده صحيح على شرط الشيخين وهو اصح واوثق من السند المرفوع.

وقـدذكـره ابـن كثيـرفـى الـتـفسيـر،نقله عن هذا الموضع،وقال هذاحديث غريب من هذا الـوجـه ، ورجـالـه كلهم ثقات من رجال الصحيحين الاموسى بن جبيرهذا،وهو الانصارى السلمى مـولاهـم،وقـدتـفـردبـه عـن نـافع عن ابن عمرؓ عن النبىﷺ،ثم ذكرابن كثيرمتابعين له من طريقين آخـريـن عـن نافع،احدهمامن رواية ابن مردويه باسناده الى عبدالله بن رجاء،عن سعيدبن سلمة ،عن

موسى بن سرجس،عن نافع عن ابن عمرؓ عن النبیﷺ،ثانیهمامن تفسیر الطبری باسناده من طریق الفرج بن فضاله،عن معاویة بن صالح عن ابن عمرؓ،عن النبیﷺ،ثم قال ابن کثیر،وهذان ایضاغریبان جدا،واقرب مایکون فی هذا،انه من روایة عبدالله بن عمرؓ،عن کعب الاحبار،لاعن النبیﷺ،وبعدان اوردابن کثیرحدیث عبد الرزاق الصحیح فی التفسیرقال:فهذا اصح واثبت الی عبدالله بن عمرؓ من الاسنادین المتقدمین،وسالم اثبت فی روایة ابیه عن مولاه نافع،فدار الحدیث ورجع الی نقل کعب الاحبار،عن کتب بنی اسرائیل.

وذکرابن کثیرنحوامن ذلک فی تاریخه البدایة و النهایة: ۱/ ۳۷،۳۸،ثم قال هذا من اخباربنی اسرائیل ،کماتقدم من روایة ابن عمرؓ عن کعب الاحبار،ویکون من خرافاتهم التی لایعوّل علیها. اوراس روایت کوبزار نےنقل کیا ہے(۲۹۳۸،زوائد)اورپھرفرماتا ہے کہ بعض رواۃ نے اس روایت کوعن نافع عن ابن عمرؓموقوف نقل کیا ہے،اورمیرے نزدیک زہیر نے اس کومرفوع کیا ہے،حالانکہ یہ معتبر حافظ(قابل اعتبار)نہیں تھے۔ امام بیہقی اس روایت کےنقل کرنے کے بعدفرماتے ہیں:رواه موسی بن عقبه عن نافع عن ابن عمرؓ عن کعبؓ قال...... الحدیث وهذا اشبه۔الارنووطآگےلکھتاہےکہ:واورده الهیثمی فی مجمع الزوائد:۵/ ۶۸.وقال رواه احمدو البزارورجاله رجال الصحیح خلاموسی بن جبیروهوثقة،واخرجه بسیاق آخرموقوفا الحاکم فی المستدرک ۴/ ۶۰۷،۶۰۸.من طریق یحی بن سلمه بن کهیل عن ابیه عن سعیدبن جبیرعن ابن عمرؓ ،وقال هذاحدیث صحیح الاسنادولم یخرجاه، وَتَرْکُ حدیث یحی بن سلمة عن ابیه من المحالات التی یردهاالعقل،فانه لاخلاف انه من اهل الصنعة ،فلاینکرلابیه ان یخصه باحادیث یتفردبهاعنه، فتعقبه الذهبی بتضعیف یحی بن سلمة هذابقوله ،قال النسائی متروک وقال ابوحاتم منکر الحدیث، قلناوضعفه ایضایحی بن معین وقال لیس بشیء ،وقال البخاری فی حدیثه مناکیر،وقال الترمذی یضعف فی الحدیث، وقال ابن حبان منکر الحدیث جدا،یروی عن ابیه اشیاء لاتشبه حدیث الثقات ،کانه لیس من حدیث ابیه ،فلمااکثرعن ابیه مماخالف الاثبات ،بطل

الاحتـجـا ج بـه ،الا فيـمـاوافق الثقات،وقال ابن نميرليس ممن يكتب حديثه ،وكان يحدث عن ابيه احـاديث ليس لهااصول ،وقال ابن سعدكان ضعيفا جدا،وقال ابو داودليس بشئ ،وقد اورد الحافظ حـديـث احمدهذافى القول المسدد:٣٨، ٣٩،وقال اورده ابن الجوزى من طريق الفرج بن فضالة، عـن مـعـاوية بـن صالح عن نافع ،وقال لايصح ،و الفرج بن فضالة ضعفه يحى ،وقال ابن حبان يقلب الاسـانيـد،ويـلـزق المتون الواهية بالاسانيد الصحيحة، ثم دافع الحافظ ''ولم يصنع شيئا''عن رواية احـمـدفـقـال وبيـن سيـاق مـعـاوية بـن صـالـح وسيـاق زهيـرتفاوت ،وقداخرجه من طريق زهيربن مـحـمدايضا،ابوحاتم بن حبان فى صحيحه وله طرق كثيـرة جمعتهافى جزء مفرديكاد الواقف عليه ان يقطع بوقوع هذه القصة لكثرة الطرق الواردة فيها،وقوة مخارج اكثرها،والله اعلم.

قـلناقدتقدم ان ا بن كثيرقداشارالى رواية معاوية بن صالح هذه،وانه لايعول عليها،و الفرج بـن فـضـالة الـراوى عـن مـعـاوية بـن صـالـح:ضـعيف.ومهمـاكثـرت الطـرق الواردة فـى هذه الـرواية،فـانهـاكـلهاضعيفة،فلاتقوى بمجموعهافى مثل هذا المطلب.قال الشيخ احمدشاكررحمه اللهفـى تـعليقه على المسند،اماهذا الذى جزم به الحافظ بصحة وقوع هذه القصة لكثرة طرقهاوقوة مـخارج اكثرها،فلا،فانهاكلهاطرق معلولة او واهية الى مخالفتها الواضحة للعقل،لامن جهة عصمة الـمـلائـكة الـقطعية فقط.بل من ناحية ان الكوكب الذى تراه صغيرافى عين الناظرقديكون حجمه اضـعـاف حـجـم الكرة الارضية بالآلاف المؤلفة من الاضعاف،فانى يكون جسم المرأة الصغيرالى هـذه الاجـرام الـفـلـكية الهـائلة.قلنالم يردفى هذاالخبرعند من خرجه ان المرأة التى تسمى الزهرة قـدمسـخـت نـجـمـا،قال ابن حبان بعدان اورد الحديث الزهرة هذه امرأة كانت فى ذلك الزمان، لا،انها الزهرة التى هى فى السماء ، التى هى من الخنس.

جبکہ اس کے متعلق الشیـخ عبـد الـغـنـی الـنابلسی الدمشقی الحنفی نے ایک کتاب بنام ''برہان الثبوت فی تبرئۃ ہاروت وماروت'' لکھاہے ،اوراس کتاب میں تصحیح ابن حجروسیوطی پر مفصل ردکیاہے اورفرمایاہے :وانـظـروتـأمـل فـی قـول الـحـافـظ ابـن حـجـر ،یـکـاد الـواقف علیه یقطع بوقوع هذه القصة،یعنی

انهـاغيـرواقـعة عـلـى جهة القطع،بل هو امرمظنون،ثم علله بكثرة الطرق الواردة فيها،وهى مختلفة اختلافاكبيرابحيث ان بعضهالايطابق بعضامتناواسنادا.

وأنـا أورد لـک جـمـيـع طرقها التى ذكرالسيوطى، انهابلغت نيفاوعشرين طريقا،حتى ترى الاختـلاف الـواقـع فيهـا،فـلاتـغتـربهـا،وتـرجع الى عصمة جميع الملائكة، المقطوع بهاعندعلماء الاسـلام، الـواردفـى كتـاب الله تـعـالـى،وعـلـيـه اجـمـاع اهـل السـنة و الـجـمـاعة وجـمـهـور العلماء.ص:۲۵۵.

امام رازیؒ فرماتے ہیں:واعـلـم ان هـذه الـرواية فاسدة مردودة غيرمقبولة لانه ليس فى كتاب مـايـدل عـلـى ذلک بـل فيـه مـايبطلها.(كبير). قرطبی لکھتے ہیں:قـلـنـاهـذاكـلـه ضعيف وبعيدعن ابن عـمـروغيـره لايـصح منـه شيء . امام ابوحیان رقمطراز ہیں:وهـذاكـلــه لايـصـح منـه شيء ،و الملائكة معصومون لايعصون الله ماامرهم ويفعلون مايؤمرون ، البحر۔

علامہ خازن لکھتے ہیں، فبـان بهـذه الـوجوه ركة هذه القصة .علامہ سید محمود الوسی،امام رازی کا مذکورہ بالاقول نقل کرکے فرماتے ہیں:ونص الشهاب العراقى على ان من اعتقدفى هاروت وماروت انهماملكان يعذبان على خطيئتهمامع الزهرة فهوكافربالله العظيم.روح۔

یہ واقعہ موضح قران میں بھی ہے،جوشاہ عبدالقادرمحدث دہلوی کے نام پر کتابی صورت میں چھپی ہوئی ہے، مگر محققین،مثلامحدث العصر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالی کے نزدیک یہ تفسیر شاہ عبدالقادر کی نہیں ہے،کسی نے لکھ کران کے نام منسوب کردی ہے،شاہ صاحب کی ''موضح قران'' صرف وہی حواشی ہیں،جوقران مجید کے حاشیہ پر چھپے ہوئے ہیں،بعض ناشرین نے اب ان میں بھی کچھ اورردبدل کردیا ہے۔

''يـعـلـمان'' تعليم سے ہے اور تعلیم کے معنی یہاں درس وتدریس کے نہیں ہیں، بلکہ یہاں تعلیم بمعنی اعلام ہے، انـه مـن الاعـلام لامـن التـعـليـم فيعلمان بمعنى يعلمان، قرطبى.وقرأ طلحه بن مصرف، يُعْلِمانِ من الاعـلام لامـن التـعـليم وعليهاحمل بعضهم قرأة التشديد.روح ۔اور''من'' زائدہ ہے،تاکید استغراق کے لئے۔روح۔''فتنۃ'' کے معنی ازمائش اورامتحان کے ہیں:وامـا الـفتـنـة فـى هـذا الـمـوضـع فـان معناها الاختيار والابتلا.ابن جرير. الفتنة، الاختبار والامتحان.ابوسعود۔یعنی جب کوئی ان دونوں فرشتوں کے پاس جادوسیکھنے

کے لئے آتا، تو وہ پہلے از راہ خیر خواہی اس پر واضح کر دیتے تھے، کہ دیکھو جادو پر اعتقاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا کفر ہے، اور ہم تو محض اس لئے بھیجے گئے ہیں، تا کہ جادو اور معجزہ کا فرق لوگوں پر واضح کر دیں، لہذا جادو کے اصول ہم تمہیں بتلائیں گے ان کو ناجائز طور پر استعمال نہ کرنا، اور اس طرح ہم تمہارے لئے ازمائش وامتحان کا ذریعہ ہیں۔ دیکھنا کہیں جادو کے پیچھے پڑ کر اپنا ایمان نہ ضائع کر بیٹھنا۔ مذکورہ بیان سے ہاروت وماروت فرشتوں کا دامن بھی شرک وجادو سے پاک ہوگیا، جو کہ یہودیوں نے ان کے ذمہ لگایا تھا۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ وہ خود جادو نہیں کیا کرتے تھے، اور نہ ہی غیر اللہ کو پکارتے تھے، وہ تو اللہ کے حکم سے محض لوگوں کے امتحان کے لئے جادو کی حقیقت واضح کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ فرشتوں کے روکنے کے باوجود اس جادو کو ناجائز طور پر استعمال کرنے لگے، اور زیادہ تر خاوند، بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کے لئے اسے استعمال کرتے تھے۔

" **وماهم بضارين به من احدالاباذن الله**"۔ جادو ٹو ٹکے اور تعویذ گنڈے سے جو بھی اثار ظاہر ہوتے ہیں، وہ اللہ کے حکم اور اس کی قضا سے ہوتے ہیں، کیونکہ فاعل اور موثر حقیقی وہی ہے نہ کہ یہ چیزیں۔ یہ چیزیں تو محض اسباب کا درجہ رکھتی ہیں: **قال سفيان الثوری الابقضاء ہ وقدرته ومشيته. معالم**۔ اس لئے ضروری نہیں کہ ہر ٹو ٹکے او تعویذ گنڈے کا اثر ظاہر ہو۔

یہ بد بخت یہودی جو کچھ سیکھ رہے تھے، اس کے ذریعہ دوسروں کو نقصان پہنچانا تو ان کے بس کی بات نہ تھی، البتہ یہ جادو، دنیا اور اخرت میں ان کے لئے سراسر نقصان ہی نقصان تھا، اور اس میں انہیں ذرہ برابر بھی فائدہ نہ تھا۔

"**ولقدعلموا**" "علموا" کا فاعل یہودیوں کے علماء ہیں، **قیل عائد علی علماء الیهود، بحر**، **اشتراه**، میں ضمیر مفعول "**ماتتلو**" کی طرف راجع ہے، جس سے مراد جادو ہے، اور "**اشتراء**" سے مراد استبدال ہے:

ای استبدال ماتتلوا الشياطين بكتاب الله. ابو سعود۔ یعنی ان یہودیوں کے مولویوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جس نے اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر اس پر جادو اور سحر کی پوتھیوں کو ترجیح دی، اور توحید سے منہ موڑ کر شرک اور غیر اللہ کو پکارنے میں لگ گیا، وہ اخرت میں سخت بدنصیب ہوگا۔ اللہ کی کتاب سے تورات یا قران مجید مراد ہے۔ ابوحیان ایک صورت یہ بھی لکھتے ہیں کہ (**اشتراه**) کی ضمیر تورات یا قران شریف کی طرف عائد ہو، اور، اشترا، بمعنی بیع ہو، یعنی جس نے تورات یا قران کو چھوڑ کر اس کے عوض جادو کی کتابوں پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ (بحرمحیط)۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللهِ خَيْرٌ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٣﴾

اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو اللہ کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔ اگر وہ اس سے واقف ہوتے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا

اے اہلِ ایمان! (گفتگو کے وقت پیغمبرﷺ سے) ''رَاعِنَا'' نہ کہا کر۔ [٣٠]

انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور اُنْظُرْنَا کہا کرو اور خوب سن رکھو اور کافروں کے لئے دُکھ دینے والا عذاب ہے۔ جو لوگ کافر ہیں،

مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ أَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاللّٰهُ

اہلِ کتاب یا مشرک، وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے خیر (وبرکت) نازل ہو اور اللہ تعالیٰ تو جس کو چاہتا ہے

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿١٠٥﴾

اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل کا مالک ہے۔

---

[٣٠] اس ایت میں اس بات کی ہدایت ہے کہ ایسے الفاظ مت کہو جس میں ایہام شرک ہو۔اسی وجہ سے رشید احمد گنگوہی، درود تاج کو سم قاتل قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس میں ''دافع البلاء'' وغیرہ شرکیہ الفاظ ہیں۔ فتاوی رشیدیہ (١٤٩)۔ تاویل اس لئے نہیں ہوسکتی کہ اس کا قائل مہدی علی شیعہ ہے جس کے غلط عقائد معلوم ہیں۔

''راعنا'' کی دو توجیہ ہیں: ''رعونت'' سے مشتق ہے یعنی احمق یا ''راعینا'' بمعنی چرواہا۔ عام مفسرین کا یہ قول ہے، اور جناب شیخ حسین علی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کا مقصد یہ تھا کہ ہم نبی کریمﷺ کی زندگی میں موقع ادب میں راعنا کہیں گے اور راعنا تو رعایت سے مشتق ہے، لہٰذا ہم رسول پاک کی وفات کے بعد کہیں گے کہ غیر اللہ نگہبان ہوسکتا ہے، کیونکہ ہم رسول اللہ کی حیات میں آپؐ کو راعنا کہتے تھے، اور آپؐ نے اس کی تردید نہیں فرمائی۔ باجودیکہ رسولؐ کی زندگی میں تو ماتحت الاسباب رعایت جائز تھی، لیکن اللہ تعالی نے فرمایا، راعنا، کا لفظ ہی چھوڑ دو، جو کہ شرک کا بیج ہے، اس جگہ ''وانظرنا'' کا لفظ کہو، جس میں شرک کا وہم نہیں ہے۔

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا

ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اس کو فراموش کرا دیتے ہیں تو اُس سے بہتر یا ویسی ہی

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۰۶﴾

اور آیت بھیج دیتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے؟ [۳۱]

---

[۳۱] نسخ سے مراد یہ ہے کہ ایت کا حکم اٹھ جائے لیکن اس کی تلاوت باقی رہ جائے اور ''انسا'' سے مراد یہ ہے کہ تلاوت اور حکم دونوں اٹھ جائیں، یہ راعنا کو منسوخ کر کے اس کی جگہ انظرنا کہنے کے حکم کی طرف اشارہ ہے'' نأت بخیر منها او مثلها''، یعنی اگر ہم کسی حکم کو منسوخ کر دیتے ہیں تو وہ بھی ہماری حکمت و مصلحت کے عین مطابق ہوتا ہے، اور ہم منسوخ شدہ حکم کی جگہ اس سے زیادہ مفید اور زیادہ آسان یا نفع اور سہولت میں اس کے برابر دوسرا حکم نازل کر دیتے ہیں۔ ای بما هو انفع لكم واسهل عليكم واكثر لاجركم او مثلها فى المنفعة و الثواب الخ، معالم. ''الم تعلم ان الله على كل شىء قدير'' یہاں استفہام تقریری ہے اور اس کا مخاطب ہر سامع ہے، هذا ستفهام معناه التقرير، و الاولى ان يكون المخاطب السامع. بحر۔

مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب تو اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اپنے بندوں پر احکام میں ردبدل اور محوواثبات کا اسے پورا پورا اختیار ہے، لہٰذا اس پر کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ اس سے اصل دعوی کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالی ہی ہر چیز پر قادر ہے اور وہ انسانوں کی تمام حاجتیں اور ضرورتیں پوری اور ان کی تمام مشکلات آسان کر سکتا ہے، تو پھر اس کے سوا کیوں کسی اور کو پکارا جائے اور کیوں کسی اور سے استعانت کی جائے ،اس آیت کا دوسرا ربط یہ ہے کہ اگر ہم کوئی ایسی رسم منسوخ کر دیں جو موہم شرک ہو تو اس کی جگہ اس سے بہتر طریقہ رائج کرا دیتے ہیں جس طرح راعنا کا لفظ منسوخ کر کے اس کی جگہ انظرنا کا لفظ کہنے کا حکم دیا ہے۔

فائده: متقدمین علماء، نسخ کواس کے وسیع معنوں میں لیتے تھے، یعنی وصف ایت کے مطلق تغیر کونسخ کہتے تھے، اس لئے ان کے نزدیک پانچ سو سے بھی زیادہ آیتیں منسوخ ہیں، لیکن متاخرین نے نسخ کومحدود معنی میں استعمال کیا، یعنی ایت کا حکم مع التـــلاوة یابدون التلاوة اٹھادینے کونسخ کہتے ہیں۔اس لئے اس مفہوم کے پیش نظر بیس سے زیادہ ایتیں منسوخ نہیں ہیں، جیسا کہ علامہ سیوطی نے الاتقان میں بسط وتفصیل سے ذکر کیا ہے، لیکن امام ولی اللہ محدث دہلوی الفوز الکبیر کے باب دوم، فصل دوم میں اس مفہوم کے تحت صرف پانچ ایتوں کومنسوخ مانتے ہیں، اور باقی تمام ایتوں کی توجیہ فرماتے ہیں، جناب شیخ رحمہ اللہ ان پانچ ایتوں کوبھی منسوخ نہیں مانتے، اورشاہ صاحب کی طرز بیان پران پانچوں ایتوں کی ایسی توجیہ فرماتے ہیں کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پانچوں آیتوں کا حکم بھی تاقیامت باقی ہے، ان پانچ ایتوں کی توجیہ اپنی اپنی جگہ آئے گی، انشاء اللہ تعالی۔بعض لوگ نسخ پراعتراض کرتے ہیں، کہ اللہ تعالی پہلے ایک حکم دیکر پھرا سے واپس کیوں لیتا ہے، تواس کا جواب یہ ہے کہ نسخ کے معنی پہلا حکم واپس لینے کانہیں بلکہ اس سے پہلے حکم کی مدت کی انتہاء کا بیان مقصود ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف اس مدت تک تھا۔ اس کے بعد کے لئے نہیں۔جیسا طبیب، ڈاکٹر مریض کوایک نسخہ ایک خاص مدت تک لکھتا ہے، پھر بعد میں اس کو بدل دیتا ہے۔نسخ میں علماء، مفسرین کا بہت اختلاف ہے، لیکن اس اختلاف کا حاصل یہ ہے کہ نسخ کی چارقسمیں ہیں:

(۱) نسخ القران بالقران جیسے و الــلّٰتــی یـأتیـن الـفـاحشة الی قـولــه فـامسـكـوهـن فـی الـبیـوت نساء(۱۵)۔ایت رجم (سورۂ نور:۲) سے منسوخ ہے وغیرہ۔

(۲) نسخ القران بالحدیث جیسے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:لا وصیة لـوارث، یعـنـی وارث کےحق میں وصیت کا حکم اس حدیث سے منسوخ ہوا، اسی طرح شادی شدہ زنا کار سے جلد کااسقاط اوررجم کا اثبات بھی حدیث سے ثابت ہے، جبکہ قران کریم میں صرف زانی، غیرشادہ شدہ کے لئے جلد کا حکم ہے، اس کوصرف سنت نے ساقط کیا، جوکہ نبی کریم ﷺ کا فعل ہے۔قرطبی۔

(۳) نسخ الحدیث بالحدیث جیسے رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **كنت نهيتكم عن زيارة القبور ،الا فزوروها، كنت نهيتكم عن لحوم الاضاحى الافكلوهاوادخروها.**

(۴) نسخ الحدیث بالقران جیسے کہ شام یعنی بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم کتاب اللہ میں نہیں ہے اس کے باوجود اس طرف کو چھوڑ کر بیت اللہ کی طرف منہ پھیرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم حدیث کے ذریعہ تھا جس کو تحویل قبلہ کی آیتوں نے منسوخ کردیا۔قرطبی۔امام شافعی نسخ مخالف یعنی نسخ الحدیث بالقران، نسخ القرآن بالحدیث،نہیں مانتے، کہتے ہیں کہ اس سے مخالف کو اعتراض کا موقع ملے گا، کہ خود باری تعالی پیغمبرؑ کی بات ردکرتے ہیں، یا پیغمبر علیہ السلام باری تعالی کی بات ردکرتے ہیں۔تو ہم کیسے مانیں۔امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ مخالف کے اعتراض کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ مخالف تو توافق کی صورت میں بھی اعتراض کرسکتا ہے، کہ اللہ تعالی، یارسول اللہ ﷺ اپنی بات خود نہیں مانتے۔

نسخ کی دوسری تقسیم

(۱) الفاظ اور حکم دونوں منسوخ ہوچکے ہوں۔جیسے سورت احزاب،سورت بقرہ سے بڑی تھی،لیکن آپؐ سے بھلادی گئی۔**عن ابى بن كعب قال: كم تقرؤون سورة الاحزاب؟قال:بضعاوسبعين اية.قال:لقدقرأتهامع رسول الله ﷺ مثل البقرة،اوأكثرمنها،وان فيهااية الرجم.(مسنداحمد:۱۳۴/۳۵).**

(۲) صرف الفاظ منسوخ ہوں حکم باقی ہو۔جیسے یہ روایت: **قال زرّ،قال لى ابى بن كعب : كأيّن تقرأسورة الاحزاب؟اوكأيّن تعدهاقال:قلت له ثلاثاوسبعين آية،فقال:قط،لقدرأيتهاوانهالتعادل سورة البقرة،ولقدقرأنافيها" الشيخ و الشيخة اذا زنيافارجموهما البتة نكالامن الله والله عزيز حكيم. (مسنداحمد:۱۳۴/۳۵).**

.یا یہ آیت: **قال انسؓ فقرأنافيهم قرانا ثم ان ذلك رفع، بلغوا عنا قومنا انا قدلقينا ربنافرضى عنا وارضانا.(بخارى كتاب المغازى رقم:۴۰۹۰).**

یا یہ: **عشر رضاعات معلومات یحرمن(ثم نسخن) بخمس معلومات ۔** الفاظ منسوخ ہیں، الفاظ منسوخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے نماز نہیں ہوتی اور وحی متلو نہیں کہلاتی۔ یہ حدیث عائشہ سے منقول ہے، جو مسلم :۳/۹۱۲، مترجم، عربی نمبر:۳۵۸۲، میں ہے۔ تفصیلی روایت ایسی ہے:

عن عائشه رضی الله عنها انها قالت کان فیما انزل من القران، عشر رضعات معلومات یحرمن، ثم نسخن ،بخمس معلومات، فتوفی رسول اللهﷺ وهی فیمایقرأمن القران.

عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں، کہ پہلے قران مجید میں یہ نازل ہوا تھا، کہ دس چکیوں سے حرمت لازم آتی ہے پھر وہ منسوخ ہوگیا۔ پھر پانچ چکیوں سے حرمت کا حکم ہوا، اور رسول اللہﷺ کے وصال تک قران مجید میں اسی طرح پڑھا جاتا تھا۔

(بعد میں یہ الفاظ بھی منسوخ ہوئے، لیکن اکثر صحابہ یہ اس لئے تلاوت کرتے تھے، کہ انہوں کو نسخ کا علم نہ تھا، یہ روایت ابوداوٗد نے بھی کتاب الرضاع میں نقل کیا ہے، مزید تشریح کے لئے کتاب (المنہل) مطالعہ کیجئے۔

(۳) حکم منسوخ ہو الفاظ باقی ہو جیسے قدماء کے نزدیک ایات عفو، آیات قتال، سے منسوخ ہیں۔

نسخ کی تیسری تقسیم

(۱) حدیث متواتر کے ذریعہ کتاب اللہ کی نسخ ذاتی جائز ہے۔

(۲) حدیث مشہور کے ساتھ کتاب اللہ کی نسخ وصفی جو کہ مطلق حکم کے تفسیر کا نام ہے، جائز ہے۔

(۳) خبر واحد کے ذریعہ کتاب اللہ کا بیان جائز ہے، اور جب **محتف بالقرائن** ہو تو نسخ بھی جائز ہے۔

متواتر حدیث ،کتاب اللہ کی طرح علم یقینی کا فائدہ دیتا ہے، اور خبر مشہور علم طمانیت کا فائدہ اور خبر واحد علم ظنی کا فائدہ دیتا ہے۔ خبر متواتر وہ ہے کہ سب قرنوں میں اس کو اتنے لوگوں نے نقل کیا ہو، کہ قومیت، زبان اور وطن کے اختلاف کی وجہ سے ان کا جھوٹ پر اجتماع محال ہو۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ
تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کی ہی ہے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ أَمْ تُرِيْدُوْنَ أَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ
دوست اور مدد گار نہیں ۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے اسی طرح کے سوال کرو
كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ
جس طرح کے سوال پہلے موسیٰ سے کیے گئے تھے اور جس شخص نے ایمان (چھوڑ کر اس) کے بدلے کفر لیا وہ سیدھے رستے
السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيْمَانِكُمْ
سے بھٹک گیا ۔ بہت سے اہلِ کتاب اپنے دل کی جلن سے یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لا چکنے کے بعد تم کو پھر
كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا
کافر بنا دیں حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے تو تم معاف کر دو اور درگزر کرو
وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾
یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا (دوسرا) حکم بھیجے بیشک اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے ۔
وَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ
اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو بھلائی اپنے لئے آگے بھیج رکھو گے اسکو اللہ کے ہاں پا لو گے۔
عِنْدَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ
کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے ۔ اور (یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ ان کے سوا کوئی جنت
إِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا أَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ
میں نہیں جائے گا ۔ یہ ان لوگوں کے خیالاتِ باطلہ ہیں (اے پیغمبر ان سے) کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو ۔

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ

ہاں جو شخص اللہ کے آگے گردن جھکا دے (یعنی ایمان لے آئے) اور وہ نیکو کار بھی ہو تو اُس کا صلہ

عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اُس کے پروردگار کے پاس ہے اور ایسے لوگوں کو (قیامت کے دن) نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصَارٰى لَيْسَتِ

اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی رستے پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی رستے پر نہیں

الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتَابَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

حالانکہ دونوں کتابِ (الٰہی) پڑھتے ہیں۔ اسی طرح بالکل انہی کی سی بات وہ لوگ کہتے ہیں جو (کچھ) نہیں جانتے (یعنی

مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ

مشرک) تو جس بات میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا فیصلہ کر دے گا۔

﴿۱۱۳﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهُ وَسَعٰى فِيْ

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کا ذکر کئے جانے کو منع کرے

خَرَابِهَا أُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوْهَا إِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا

اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو۔ ان لوگوں کو کچھ حق نہیں ہے کہ وہ اُن میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے۔ اُن کے لئے دنیا میں

خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ

رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ اور مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے۔

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

تو جدھر تم رخ کرو ادھر اللہ کی وجہ (رضا) ہے بیشک اللہ تعالیٰ وسعت والا اور باخبر ہے

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ

اور یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے (نہیں) وہ پاک ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے

لَّهُ قٰنِتُوْنَ ﴿١١٦﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا

سب اسی کا ہے اور سب اس کے فرمانبردار ہیں۔ (وہی) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ جب کوئی کام کرنا چاہتا

فَإِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿١١٧﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

ہے تو اس کو ارشاد فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ اور جو لوگ (کچھ) نہیں جانتے (یعنی مشرک) وہ کہتے ہیں کہ

لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ أَوْ تَأْتِيْنَا آيَةٌ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے تھے

مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيٰتِ

وہ بھی انہیں کی سی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ جو لوگ صاحبِ یقین ہیں ان کے (سمجھانے کے) لئے

لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿١١٨﴾ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَلَا

ہم نے نشانیاں بیان کر دی ہیں۔ (اے محمد ﷺ!) ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے

تُسْئَلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿١١٩﴾ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا

اور اہلِ دوزخ کے بارے میں تم سے کچھ پرسش نہیں ہو گی۔ اور تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے

النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى

اور نہ عیسائی یہاں تک کہ اُن کے مذہب کی پیروی اختیار کر لو (ان سے) کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت (یعنی دین اسلام) ہی ہدایت ہے

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ

اور (اے پیغمبر) اگر تم اپنے پاس علم (یعنی وحی الٰہی) کے آ جانے پر بھی ان کی خواہشوں پر چلو گے تو تمہیں (عذابِ) الٰہی

مِـنْ وَّلِـيٍّ وَّلَا نَـصِيْـرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّـذِيْـنَ آتَيْـنَـاهُـمُ الْـكِتٰبَ يَتْـلُـوْنَـهٗ

سے (بچانے والا) نہ کوئی دوست ہوگا نہ کوئی مددگار۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو (ایسے) پڑھتے ہیں

حَـقَّ تِلَاوَتِـهٖ اُوْلٰٓـئِكَ يُـؤْمِـنُـوْنَ بِـهٖ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِـهٖ فَاُوْلٰٓـئِكَ هُمُ

جیسا اس کے پڑھنے کا حق ہے تو یہی لوگ اس پر ایمان رکھنے والے ہیں اور جو لوگ اس کو نہیں مانتے وہ

الْخَاسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ يٰبَنِـىْٓ اِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ

خسارہ پانے والے ہیں ۔ اے بنی اسرائیل! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کئے

وَاَنِّـىْ فَـضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّـقُـوْا يَوْمًالَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ

اور یہ کہ میں نے تمہیں اہلِ عالم پر فضیلت بخشی ۔ اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی شخص کے کچھ کام نہ آئے گا

نَّـفْـسٍ شَيْـئًاوَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ

اور نہ اس سے کوئی بدلا قبول کیا جائے گا اور نہ اس کو کسی کی سفارش کچھ فائدہ دے اور نہ لوگوں کو (کسی اور طرح کی) مدد مل سکے

﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَـلٰـى اِبْـرَاهِيْـمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَـالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ

اور جب اللہ نے چند باتوں میں [۳۲] ابراہیم کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میں تمہیں لوگوں کا

لِـلـنَّـاسِ اِمَـامًـا قَـالَ وَمِـنْ ذُرِّيَّتِـىْ قَـالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

پیشوا بناؤں گا۔ انہوں نے کہا کہ میری اولاد میں سے بھی (پیشوا بنائیو تو اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ میرا وعدہ ظالموں سے نہیں[۳۳]

---

[۳۲] "ابتــلاء" کے معنی امتحان اور آزمائش کے ہیں جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے، تو اس سے اس کا مقصد بندوں کے احوال کو جاننا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تو پہلے بھی جانتا ہے، بلکہ اس سے ان کے احوال کا خود ان کے لئے اور دوسرے لوگوں کے لئے اظہار مقصود ہوتا ہے تا کہ خود ان بندوں پر اپنی حقیقت واضح ہو جائے، اور دوسروں کو اس سے سبق حاصل ہو سکے۔ و ابتـلاء الله الـعبـادليــس ليـعـلـم احـوالهـم بـالابتـلاء لانـه عالم بهم ولكن ليعلم

العباد احوالهم: معالم التنزیل ۔''اذ'' کا عامل ''قال'' ہے جو آگے آرہا ہے: و الاختیار ان یکون العامل فیہ ملفوظا بہ وھو قال ''انی جاعلک''، بحر، ''کلمات'' کلمہ کی جمع ہیں، اور اس سے مراد وہ امور اور احکام ہیں، جن میں اللہ تعالی نے ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا تھا، ان کلمات کے بارے میں مفسرین نے بہت سے اقوال ذکر کئے ہیں۔ بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اس سے مراد خصائل فطرت ہیں، یعنی کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، ناخن تراشنا، بغلوں اور زیر ناف کے بال صاف کرنا، اور مونچھوں کے بال تراش کرنا، اور بال میں کنگی کرنا، ختنہ کرنا، استنجاء کرنا۔ جبکہ یہ حدیث مستدرک: ۲/۶۵۶، کتاب التفسیر میں عبداللہ بن عباسؓ سے نقل ہے کہ: عن ابن عباسؓ فی قولہ عزجل: ''وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ'' قال ابتلاء الله بالطهارة ،خمس فی الرأس وخمس فی الجسد،فی الرأس قص الشوارب ،و المضمضة، و الاستنشاق، و السواک ،وفرق الرأس، وفی الجسد، تقليم الاظفار ،وحلق العانة ،و الختان ،ونتف الابط ،وغسل مكان الغائط ،و البول بالماء . اور درمنثور نے: ۱/۲۱۰، میں بیہقی وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ اور بعض نے اسی قسم کے کچھ اور احکام نقل کئے ہیں، لیکن اتنے بڑے جلیل القدر پیغمبر کا ابتلاء، اور پھر ایسے آسان احکام۔ یہ بات قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ ان خصائل کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مگر حدیث میں یہ کہیں مذکور نہیں، کہ جن کلمات میں ان کا امتحان لیا گیا تھا وہ یہ خصائل ہیں، اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ اس سے مراد بیٹے، اور پیاری جان کی قربانی ہے، جیسا کہ سورۂ صافات: ۱۰۱، سے، یا باپ کو توحید کا مسئلہ بیان کرنا، جیسا کہ سورۂ مریم: ۴۱، میں ہے، یا بادشاہ کے ساتھ مناظرہ کرنا، کمافی بقرہ: ۲۵۸، یا قوم کے ساتھ مناظرہ، اور جھگڑہ کرنا، جیسا کہ سورۂ انعام: ۷۵، اور بیوی و بچے کو صحرا میں چھوڑنا، کمافی سورۂ ابراہیم: ۳۵، قوم سے برائت کرنا، جیسا کہ سورة ممتحنة: ۴، میں ہے: بحر وابن کثیر۔

[۳۳] عہد، سے مراد وہی عہد امامت ہے جس سے نبوت مراد ہے، فلمتبادر من العهد، الامامة، وليست هي ههنا الا النبوة، روح۔ اور ''ظالمین'' سے مراد، نافرمان ہیں، مطلب یہ ہوا کہ تمہاری اولاد سے جو نافرمان ہونگے وہ اس نعمت سے محروم رہیں گے۔ اور فرمانبرداروں میں سے جنہیں اللہ چاہے گا، مرتبہ نبوت عطا فرمائے گا۔ بیضاوی لکھتا ہے: کہ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام معصوم عن الخطاء ہیں،

(مسئلة عصمت الانبیآء)

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ہم نے اللہ تعالی کی برگزیدہ ہستیوں، انبیآء علیہم السلام کی مدافعت کیلئے تفصیل سے

لکھا ہے، اور ہم نے اس میں یہ واضح کیا ہے کہ رذیل لوگوں نے انبیآ ءعلیہم السلام سے جرائم اور گناہوں کا جوصدور جائز رکھا ہے اوران کی طرف جن قبائح اور ناشائستہ امور کی نسبت کی ہے وہ جھوٹ اور بہتان ہے اور حجت سے عاری، محض گمان ہے، خواہ مخواہ خالی پیٹ ڈکارنے لگے ہیں، اور بے محل طمع میں مبتلاء ہیں، حالانکہ نہ تو ان میں اس مضبوط بازوؤں کے ساتھ ٹکرانے کی طاقت ہے، اور نہ ہی یہ لوگ شیر کی چال چل سکتے ہیں، كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِن يَقُولُونَ إِلَّا كَذِباً ﴿۵﴾ (کہف)

یادرکھیئے کہ اس مسئلہ میں اختلاف کے چار مقامات ہیں:

پہلا اختلاف: عقیدہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے، کہ انبیآ ءعلیہم السلام کفراور بدعت سے محفوظ ومعصوم ہیں، بجز خوارج کے فرقہ فضیلیۃ کے کہ ان ہاں انبیآ ءعلیہم السلام معصوم نہیں، اس لئے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ انبیآ ءعلیہم السلام سے گناہوں کا صدور جائز ہے اور ہر گناہ ان کے ہاں کفر ہے، تو اس طرح کفر کا صدور بھی ان سے جائز ہوا، اور روافض کہتے ہیں کہ انبیآ ءعلیہم السلام کیلئے تقیہ کے طور پر کلمہ کفر کا اظہار بھی جائز ہے۔

دوسرا اختلاف: اللہ تعالیٰ کے تمام احکام اور شرائع سے متعلق ہے، اس پر بھی امت کا اجماع ہے، کہ انبیآ ءعلیہم السلام سے اس مسئلے میں تحریف اور خیانت کا صدور جائز نہیں، نہ قصداً اور نہ سہواً، ورنہ پھر تو شریعت کی کسی چیز پر بھی اعتماد باقی نہیں رہے گا۔

تیسرا اختلاف: فتویٰ سے تعلق رکھتا ہے، سو اس پر اجماع ہے کہ انبیآ ءعلیہم السلام سے قصداً خطا کا صدور جائز نہیں، سہواً میں اختلاف ہے۔

چوتھا اختلاف: انبیآ ءعلیہم السلام کے افعال واحوال سے متعلق ہے، اس میں پانچ مذاہب ہیں:

(۱) حشویہ: ان کا مذہب یہ ہے کہ انبیآ ءعلیہم السلام کا صغائر وکبائر پراقدام جائز ہے۔

(۲) اکثر معتزلہ: قصداً کبیرہ کا ارتکاب جائز نہیں صغیرہ کا جائز ہے، بشرطیکہ اس سے کوئی جائے خلاصی نہ ہو، اگر ہو تو پھر جائز نہیں، جیسے کہ ناپ تول میں ایک دانے سے کم کی کمی کرنا۔

(۳) ابوعلی الجبائی کا مذہب ہے: انبیآ ءعلیہم السلام سے قصداً کبیرہ وصغیرہ کا صدور جائز نہیں، لیکن تاویل میں خطا کی بنا پر ان سے گناہ کا صدور جائز ہے۔

(۴) ابواسحاق ابرہیم بن یسار النظام معتزلی کا مذہب ہے: انبیآء علیہم السلام سے کبیرہ وصغیرہ کا صدور نہ تو قصداً جائز ہے اور نہ تاویلاً وخطائاً، البتہ سہواونسیاناً گناہ کا صدور جائز ہے، لیکن ان کو اس سہو اور نسیان پر تنبیہہ کی جاتی ہے، کیونکہ ان کا علم کامل ہے تو ان پر اس معاملہ میں بیدار رہنا واجب ہے۔

(۵) شیعہ: ان سے نہ تو کبیرہ گناہ کا صدور جائز ہے، اور نہ ہی صغیرہ کا، نہ قصداً اور نہ تاویلا، اور نہ سہوونسیان کے ساتھ۔

اسی طرح وجوب عصمت کے وقت میں بھی اختلاف ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ انبیآء علیہم السلام ابتداء، ولادت سے آخر عمر تک معصوم ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ یہ عصمت زمانہ نبوت میں واجب ہے، زمانہ نبوت سے قبل واجب نہیں، یہی قول ہمارے اکثر اصحاب رحمہم اللہ کا بھی ہے۔ (اہل السنۃ و الجماعۃ)۔ اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انبیآء علیہم السلام زمانہ نبوت میں قصداً صغائر وکبائر سے معصوم ہیں۔ اور سہواً صغائر وکبائر کا صدور ان سے جائز ہے۔ انبیآء علیہم السلام کی عصمت کے اس وجوب پر پندرہ دلائل پیش کیئے جاتے ہیں۔

پہلی دلیل: اگر انبیآء علیہم السلام سے گناہ صادر ہوں، تو پھر امت کے عام گنہگارروں کی بہ نسبت انبیآء علیہم السلام دنیا میں مذمت اور آخرت میں عذاب کے زیادہ مستحق ہوں گے، اور یہ باطل ہے، تو پھر ان سے گناہ کا صدور بھی باطل ہے۔

ملازمہ: وجہ اس کی یہ ہے کہ بندوں کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان میں سب سے بڑی نعمت نبوت اور رسالت ہے، اور جسے اللہ تعالیٰ نے نعمتیں زیادہ دی ہوں، اس کا نافرمانی کرنا بہت گھناؤنا ہے، اس پر صریح عقل کے دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ نقل بھی تین طریقوں سے اس کی تائید کرتی ہے۔

(۱) حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے ازواج مطہرات کو، ﴿یانسآء النبی لستن کاحدمن النسآء﴾ [احزاب: ۳۲] اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو۔ اور ارشاد ہے۔ ﴿یانسآء النبی من یأ ت منکن بفاحشة مبینةیضٰعف لهاالعذاب ضعفین﴾ [احزاب: ۳۰] اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کھلی ہوئی بدکاری کرے، تو اسے دگنا عذاب دیا جائے گا۔

(۲) محصن (شادی شدہ) کو سنگسار اور غیر شادی شدہ کو کوڑے لگایا جاتے ہیں۔

(۳) غلام پر آزاد کی بہ نسبت آدھی حد جاری کی جاتی ہے۔

لہٰذا ان تینوں دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر انبیآء علیہم السلام سے گناہ صادر ہوں تو پھر وہ امت کے عام گنہگاروں کی بنسبت دنیا میں زیادہ مذمت اور آخرت میں زیادہ عذاب کے مستحق ہوں گے۔ جب کہ یہ بالاجماع باطل

ہے۔اس لئے کہ کوئی بھی یہ کہنا گوارہ نہیں کرتا کہ پیغمبر، اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو سب سے اچھی حالت کا حامل ہو، اور رتبہ میں ہر ایک سے کمتر ہو۔ یہ انبیآ ءعلیہم السلام سے گناہ سرزد نہ ہونے کی پہلی دلیل ہے۔

دوسری دلیل: اگر انبیآ ءعلیہم السلام سے گناہ سرزد ہوتو پھر ان کی گواہی قابل قبول نہ ہوتی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**یاایھاالذین اٰمنوا ان جاء کم فاسق بنبأفتبینوا**﴾[**حجرات ۶/**] اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی سی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کیا کرو۔ اس آیت میں فاسق کے قول کی تحقیق اور اس کی گواہی قبول ہونے سے توقف کا حکم دیا گیا ہے۔ جب کہ انبیآ ءعلیہم السلام کا مردودالشہادۃ ہونا باطل ہے۔ اس لئے کہ جس کی گواہی دنیاوی معاملات میں معتبر نہ ہوتو ان کی گواہی کو کیسے قبول کیا جائے گا ان ادیان کے بارے میں جو قیامت تک باقی رہیں گے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نبی علیہ السلام قیامت کے دن اپنی امت کے لئے گواہی دیں گے۔ اور یہ امت پہلی امتوں پر، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿**وکذالک جعلناکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیداً**﴾[**بقرہ ۱۴۳/**] اور اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا، تاکہ تم اور لوگوں پر گواہ ہو، اور رسول اللہ ﷺ تم پر گواہ ہو۔ اور جو قیامت کے دن سارے انبیآ ءعلیہم السلام کے لئے گواہ ہوں گے، تو ان کی گواہی جنت کے بارے میں کیسے قابل قبول ہوگی؟۔

تیسری دلیل : اگر انبیآ ءعلیہم السلام سے گناہ صادر ہوں، تو پھر انہیں تنبیہ کرنا ضروری ہوتا، اس لئے کہ دلائل نیکیوں کے حکم کرنے اور برائیوں سے روکنے کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں، جب کہ انبیآ ءعلیہم السلام کو زجر وتوبیخ کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**ان الذین یؤذون الله ورسوله لعنهم الله فی الدنیا والآخرة**﴾[**احزاب ۵۷:**] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ نے دنیا واخرت میں لعنت کی ہے۔ پس انبیاء علیہم السلام سے گناہ کا صادر ہونا ممتنع ہوا۔

چوتھی دلیل: اگر نبی اکرم ﷺ سے فسق صادر ہو، تو یا ہمیں اس فسق میں ان کی پیروی کا حکم ہوگا اور یہ جائز نہیں، اور یا ان کی اتباع کا حکم نہ ہوگا اور یہ بھی باطل ہے، اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿**قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله**﴾[**آل عمران ۳۱/**] کہدو اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو، تو میری تابعداری کرو، تاکہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے۔ اور جب یہ دو باطل قسمیں نبی ﷺ سے فسق سرزد ہونے کی صورت میں جنم لیتی ہیں، تو ان سے فسق کا سرزد ہونا ہی محال ہوگا۔

پانچویں دلیل :اگر انبیآءعلیہم السلام سے گناہ صادر ہوں تو پھر وہ ضرور جہنم کی وعیدات کے مستحق ہوں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ومن یعص اللہ ورسولہ یدخلہ نارا خالداًفیہا ولہ عذاب مھین﴾[النسآء ۱۴/] اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے، اور اس کی حدود سے نکل جائے، اللہ تعالیٰ اسے آگ میں ڈالیں گے، یہ اس میں ہمیشہ رہے گا، اور اس کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔اور ملعون بھی ہوں گے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿الا لعنۃ اللہ علیٰ الظٰلمین﴾[ھود ۱۸/] خبردار ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔حالانکہ باجماع امت یہ باطل ہے، تو انبیآءعلیہم السلام سے گناہ کا صادر ہونا باطل ہے۔

چھٹی دلیل:انبیآءعلیہم السلام نیکی کرنے اور بدی چھوڑنے کا حکم دیتے تھے۔پس اگر نیکی چھوڑ دیتے اور گناہ کا ارتکاب کرتے، تو ضرور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے تحت آجاتے۔

(۱)﴿یاایھاالذین آمنوا لم تقولون مالا تفعلون کبر مقتا عنداللہ ان تقولوا مالاتفعلون﴾[صف ۲/،۳]

اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں، اللہ کے نزدیک بڑی ناپسند بات ہے جو کہو اور اس کو کرو نہیں۔

(۲)﴿اتأمرون الناس بالبر وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتٰب﴾[البقرۃ/۴۴] کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو، اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، پھر کیوں نہیں سمجھتے ؟ اگر انبیآءعلیہم السلام سے گناہ صادر ہو تو اس زجر وتوبیخ کے بھی مستحق ہوں گے۔اور ظاہر یہ طرزِ عمل انتہائی قبیح ہے انبیآءعلیہم السلام اس سے پاک ہیں جیسا کہ اس طرزِ عمل سے شعیب علیہ السلام نے یوں برائت کا اعلان کیا ہے۔﴿وماارید ان اخالفکم الیٰ ماانھٰکم عنہ﴾[سورۃ ھود/۸۸] اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس کام سے تمہیں منع کروں، اس کے خلاف کروں۔

ساتویں دلیل : اللہ تعالیٰ ابراہیم، اسحاق، یعقوب علیہم السلام کی صفت میں فرماتے ہیں ﴿انھم کانوا یسارعون فی الخیرات ﴾[الانبیاء/ ۹۰] یقیناً یہ لوگ نیک کاموں میں دوڑ پڑتے تھے۔یہاں طریقہ استدلال یہ کہ الخیرات میں الف لام جمع پر داخل ہو کر عموم کا فائدہ دے رہا ہے، لھذا لفظ ''الخیرات'' ہر جائز ومناسب فعل کے کرنے اور ناجائز فعل کے چھوڑنے کو شامل ہوگا، اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انبیآءعلیہم السلام ہر نیکی کو کرنے اور ہر برائی کو چھوڑنے والے تھے، اور یہی ہمارا مدعیٰ ہے۔

آٹھویں دلیل :اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وانھم عندنالمن المصطفین الاخیار﴾[صٓ/۴۷] یقناً وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ نیک بندوں میں سے تھے۔اس آیت میں یہ دونوں لفظ،، المصطفین ،الاخیار ؛؛ ساری نیکیاں کرنے

اور ساری برائیاں چھوڑنے کو شامل ہیں، اسلئے کہ اس جیسے لفظ سے استثناء کرنا جائز ہے، جیسا کہ عرب کہتے ہیں: **فلان من المصطفین الاخیار الافی کذا**۔ اور استثناء کی حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر حرف استثناء نہ آتا تو مستثنیٰ ضرور مستثنیٰ منہ میں داخل ہوتا۔ پس یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام زندگی کے ہر شعبے میں برگزیدہ و چنیدہ ہی ہوا کرتے تھے، اور صرف یہ نہیں بلکہ اس قسم کے بلند و بالا تعریفی کلمات قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کیلئے جا بجا استعمال کئے گئے ہیں۔

(۱) ارشاد ربانی ہے: ﴿**اللہ یصطفی من الملائکة رسلاً و من الناس**﴾ [حج/۷۵] اور اللہ تعالیٰ فرشتوں اور آدمیوں میں سے ہی پیغام پہنچانے کے لئے چن لیتا ہے۔

(۲) ﴿**ان اللہ اصطفی آدم و نوحا و آل ابراھیم و آل عمران علیٰ العٰلمین**﴾ [آلعمران/۳۳] بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم (علیہم السلام) کی اولاد کو اور عمران کی اولاد کو سارے جہان سے پسند کیا ہے۔

(۳) اور ابراہیم علیہ السلام کے حق میں فرمایا گیا: ﴿**ولقد اصطفینٰہ فی الدنیا و انه فی الآخرة لمن الصالحین**﴾ [البقرة/۱۳۵] اور ہم نے تو اسے دنیا میں بھی بزرگی دی تھی، بے شک وہ اخرت میں بھی اچھے لوگوں میں سے ہوگا۔

(۴) موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔ ﴿**یٰموسی انی اصطفیتک علی الناس برسٰلتی و بکلامی**﴾ [اعراف/۱۴۴] اے موسیٰ (علیہ السلام) میں نے تجھے پیغمبری اور ہم کلامی سے دوسرے لوگوں پر امتیاز دیا ہے۔

(۵) ابراہیم، اسحاق، یعقوب علیہم السلام کو ذکر کر کے فرمایا: ﴿**واذکر عبادنا ابراھیم و اسحاق و یعقوب اولی الایدی والابصار . انا اخلصنٰھم بخالصة ذکری الدار**﴾ [ص/۴۵، ۴۶] اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کو یاد کر، جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے، بیشک ہم نے انہیں ایک خاص فضیلت دی، یعنی ذکر آخرت کے لئے چن لیا تھا۔

اعتراض: ''اصطفاء'' کی صفت سے متصف ہونا گناہ سے مانع نہیں ہے. سورة فاطر میں ہے ﴿**ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا فمنھم ظالم لنفسه و منھم مقتصد و منھم سابق بالخیرات باذن اللہ**﴾ [فاطر/۳۲] پھر ہم نے اپنی کتاب کا ان کو وارث بنایا، جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا، پس بعض ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں، اور بعض ان میں سے میانہ رو ہیں، اور بعض ان میں سے اللہ کے حکم سے نیکیوں میں پیش قدمی کرنے والے ہیں۔ پس اس آیت میں مصطفین (برگزیدہ) لوگوں کی تین قسمیں بیان فرمائی گئیں (۱) ظالم (۲) مقتصد (۳) سابق بالخیرات۔ جبکہ ظالم کا ظلم تو بدترین گناہ ہے۔

جواب: ''**فمنھم**'' کے اندر ضمیر ''**عبادنا**'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ''**الذین اصطفینا**'' کی طرف نہیں، اس لیے نحوی

قواعد کے مطابق ضمیر کو مرجع قریب کی طرف لوٹانا واجب ہوتا ہے۔

نویں دلیل:۔ سورۃ ص میں اللہ تعالیٰ شیطان کی قسم کی حکایت فرماتے ہیں ﴿قال فبعزتک لاغوینهم اجمعین ﴿۸۲﴾ الا عبادک منهم المخلصین ﴿۸۳﴾ عرض کی کہ تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کردوں گا، مگر ان کو جو تیرے خالص بندے ہوں گے۔تو اس آیت میں ابلیس نے مخلصین ہی کو اپنے اضلال اور اغوا سے مستثنیٰ اقرار دیا، اور کامل مخلص انبیآ ء علیہم السلام ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، علیہم السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿انا اخلصناهم بخالصة﴾ اور یوسف علیہ السلام کے حق میں ارشاد ہے ﴿انه من عبادنا المخلصین﴾ ابلیس کا یہ اقرار کہ میرے گمراہ کن حربوں سے مخلصین ہی بچ سکتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی یہ گواہی کہ انبیآ ء علیہم السلام مخلصین میں سے ہیں۔اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ ابلیس کی گمراہ کن تدابیر اور دلفریب وسوسوں سے انبیآ ء علیہم السلام محفوظ ہو کر چلے گئے تھے، اور اس سے یہ بات یقینی طور پر سامنے آتی ہے کہ ان سے کوئی بھی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا۔

دسویں دلیل:۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ولقد صدق علیهم ابلیس ظنه فاتبعوه الا فریقا من المؤمنین﴾ [سباء:۲۰] اور البتہ ابلیس نے ان پر اپنا گمان سچ کر دکھایا سوائے ایمانداروں کے ایک گروہ کے، سب اسکے تابع ہوگئے۔اس آیت کریمہ میں اتباع ابلیس سے بچنے والے گروہ کے متعلق یہی کہا جائے گا۔کہ وہ انبیآ ء علیہم السلام تھے ،اس لئے کہ اگر یہ انبیآ ء علیہم السلام کے گروہ نہ ہوں تو یہ لوگ انبیآ ء علیہم السلا م سے بہتر ٹھرے۔جیسا کہ ارشاد ہے:﴿ان اکرمکم عند الله اتقکم﴾[حجرات :۱۳] اللہ کے نزدیک عزت والا تم میں سے وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔اور یہ بالاجماع باطل ہے، کیونکہ انبیآ ء علیہم السلام سے کوئی بھی افضل نہیں ہوسکتا۔لہذا اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جس جماعت نے ابلیس کی اتباع نہیں کی وہ انبیآ ء علیہم السلام ہی کی جماعت تھی، اور جو ابلیس کی اتباع کرے گا، وہ گنہگار ہوگا پس یہ دلیل ہے، اس پر کہ انبیآ ء علیہم السلام نے کسی قسم کے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔

گیارویں دلیل :۔ اللہ تعالیٰ نے مکلفین کو دو گروہ میں تقسیم فرمایا ہے (۱) حزب الشیطان (۲) حزب اللہ۔حزب الشیطان کے بارے میں ارشاد باری ہے ﴿اولٓئک حزب الشیطٰن الا ان حزب الشیطٰن هم الخاسرون﴾ [مجادلہ:۱۹] یہی شیطان کا گروہ ہے خبردار یقیناً شیطان کا گروہ ہی نقصان اٹھانے والا ہے۔اور حزب اللہ کے متعلق ارشاد ہے ﴿اولٓئک حزب الله الاان حزب الله هم المفلحون﴾ [مجادلہ:۲۲]۔یہی اللہ کا گروہ ہے خبردار بے شک اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہونے والا ہے۔اور بلاشبہ شیطانی گروہ تو وہی ہوگا جو شیطان کی چاہت اور اس کی مرضی کے مطابق چلے گا، پس اگر انبیآ ء علیہم السلام سے شیطانی عمل سرزد ہو جائے تو وہ بھی (نعوذ باللہ) شیطان کے گروہ میں

شمار ہوں گے۔اوران پر یہ آیت کریمہ صادق ہوگی ﴿الا ان حزب الشیطان هم الخاسرون ﴾اورامت کے نیک عمل لوگوں پر یہ آیت صادق ہوگی ﴿الا ان حزب الله هم المفلحون ﴾ اوراس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ امت کے بعض افراد انبیآءعلیہم السلام سے بہتر ہیں جبکہ یہ نتیجہ صریح البطلان ہے۔

بارویں دلیل:۔ ہمارے اصحاب (رحمهم اللّٰہ تعالیٰ) یہ کہتے ہیں کہ انبیآءعلیہم السلام فرشتوں سے بہتر ہیں،اور یہ حقیقت دلائل سے ثابت ہے کہ فرشتوں نے کسی قسم کے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔پس اگر انبیآءعلیہم السلام سے گناہ صادر ہونا تسلیم کیا جائے تو فرشتوں سے ان کی افضلیت ممتنع ہوگی،اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار﴾ [صٓ:۲۸] کیا ہم کردیں گے ان کو جو ایمان لائے اور نیک کام کیئے،ان کی طرح جو زمین میں فساد کرتے ہیں،یا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کردیں گے۔

تیرھویں دلیل:۔ اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کے حق میں فرماتے ہیں ﴿انی جاعلک للناس اماما﴾ [بقرہ:۱۲۴] بے شک میں تجھے لوگوں کیلئے پیشوا بنادوں گا۔اور یہ پیشوا وہی ہوتا ہے جس کی اقتداء کی جاتی ہے۔پس اگر ابراہیم علیہ السلام سے نافرمانی سرزد ہوجاتی تو لوگوں کا اس گناہ میں بھی اقتداء کرنا واجب ہوجاتا۔اور یہ باطل ہے۔

چودھویں دلیل:۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿لاینال عهدی الظالمین ﴾[بقرہ:۱۲۴] میرا عھد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔اور جو بھی گناہ کا ارتکاب کرے گا وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہوگا،اس لئے کہ ارشاد باری ہے ﴿فمنهم ظالم لنفسه ﴾ [فاطر:۳۲]۔جب تو یہ مقدمہ پہچان چکا،تو اب ہم کہتے ہیں کہ جس عہد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا یا تو یہ عہد نبوت ہوگا اور یہ بعینہ ہمارا مقصود ہے،اور یا عہد امامت مراد ہوگا،اوراس صورت میں تو یہ ہمارے مدعی کیلئے زیادہ واضح دلیل ہوگی۔اس لئے کہ امامت رتبہ میں نبوت سے کم ہوا کرتی ہے۔جب عہد امامت نافرمان وعاصی کو حاصل نہیں ہے تو کیسے ان کے ساتھ عہد نبوت کرکے ان کو نبوت دی جائے گی۔

پندرھویں دلیل :۔ منقول ہے کہ خزیمہؓ نے ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کے دعوے کے مطابق گواہی دی .جب کہ وہ لین دین کے وقت موجود نہ تھے۔[تو اس گواہی پر اعتراض کرنے والوں نے اعتراض کیا] تو خزیمہؓ نے کہا کہ جب میں عالم بالا کی خبروں کے بارے میں ان کی تصدیق کررہا ہوں تو کیوں دنیاوی معاملہ میں ان کی تصدیق نہ کروں؟ جب اس کا تذکرہ دربار رسول اللہ ﷺ میں ہوا تو آپ ﷺ نے اسکی تصدیق فرمائی اوران کو ذوالشہادتین (یعنی ان کی گواہی دو کے برابر ہے) کا لقب عطا فرمایا،(ابوداؤد:رقم:۳۶۰۷ج:۳/۳۰۱ کتاب الاقضیہ) تو اگر انبیآءعلیہم السلام سے گناہ سرزد ہونا جائز ہوتا تو خزیمہؓ کی یہ گواہی ناجائز ہوتی ۔

(ملخص از کتاب عصمۃ الانبیاء)

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ؕ

اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا

وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن

اور (حکم دیا کہ) جس مقام پر ابراہیم کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنا لو اور ابراہیم اور اسماعیل کو کہا

طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿۱۲۵﴾

کہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَّارْزُقْ أَهْلَهُ

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ اے اللہ! اس جگہ کو امن کا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں میں سے

مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ

جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں ان کے کھانے کو میوے عطا کرتو (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ جو کافر ہوگا میں اس کو بھی کسی قدر فائدہ دوں گا

قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۱۲۶﴾

(مگر) پھر اس کو (عذابِ) دوزخ کے (بھگتنے کے) لئے ناچار کر دوں گا اور وہ بُری جگہ ہے ۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا

اور جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے (تو دعا کئے جاتے تھے کہ) اے اللہ ہم سے یہ خدمت قبول فرما

إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن

بیشک تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے ۔ اے رب ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری

ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ

اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بناتے رہنا اور (اے اللہ) ہمیں ہمارے طریقِ عبادت بتا اور ہمارے حال پر (رحم کے ساتھ) توجہ فرما

الرَّحِيمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ

بیشک تو توجہ فرمانے والا مہربان ہے ۔ اے پروردگار ان (لوگوں) میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث فرما

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

جو ان کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے۔

وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ

اور اُن (کے دلوں) کو پاک صاف کیا کرے بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے۔ اور ابراہیم کے دین سے کون رُوگردانی کرسکتا ہے

إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ

سوائے اس کے جو نہایت نادان ہو۔ ہم نے ان (ابراہیم علیہ السلام) کو دنیا میں بھی منتخب کیا تھا اور آخرت میں بھی وہ

لَمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿۱۳۰﴾ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ

(زمرۂ) صلحاء میں ہوں گے۔ جب اُن سے اُن کے رب نے فرمایا کہ اسلام لے آؤ تو انہوں نے عرض کیا کہ میں رب العالمین کے آگے سرِ اطاعت خم کرتا ہوں

﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يٰبَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ

اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی کہ اے ہمارے بچو! اللہ تعالیٰ نے

اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ ﴿۱۳۲﴾ أَمْ كُنْتُمْ

تمہارے لئے یہی دین پسند فرمایا ہے خبردار تم مسلمان ہی مرنا ۔بھلا جس وقت ۔

شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي

یعقوب وفات پانے لگے تو تم اس وقت موجود تھے جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟

قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلٰهًا

انہوں نے کہا کہ آپ کے معبود اور آپ کے دادا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے

وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ

اور ہم اسی کے حکم بردار ہیں۔ یہ جماعت گزر چکی ان کو ان کے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تمہیں تمہارے اعمال (کا)

وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَقَالُوْا كُوْنُوْا

اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پُرسش تم سے نہیں ہو گی ۔ اور (یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ

هُوْدًا أَوْ نَصَارٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ

یہودی یا عیسائی ہو جاؤ تو سیدھے رستے پر لگ جاؤ گے۔ (اے پیغمبران سے) کہہ دو (نہیں) بلکہ (ہم) دین ابراہیم

حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا

(اختیار کئے ہوئے ہیں) جو ایک اللہ ہی کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ (مسلمانو) کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو ہم پر اُتری

وَمَا أُنْزِلَ إِلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْمَاعِيْلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا

اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر

أُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَا أُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ

اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں اُن پر اور جو اور پیغمبروں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملیں اُن پر (سب پر ایمان لائے)

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَإِنْ

ہم اُن پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (معبودِ واحد) کے فرمانبردار ہیں۔ تو اگر یہ لوگ بھی

آمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَّإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ

اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لے آئے ہو تو ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر منہ پھیر لیں تو وہ

فِيْ شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

(تمہارے) مخالف ہیں اور اُن کے مقابلے میں تمہیں اللہ ہی کافی ہے اور وہ سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔[۳۴]

---

[۳۴] شروع سورۂ بقرہ سے یہاں تک ایمان کی حقیقت کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان کی گئی ہے، اس آیت میں ایک ایسا اجمال ہے جو تمام تفصیلات اور تشریحات پر حاوی ہے کیونکہ "امنتم" کے مخاطب رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام ہیں، اس آیت میں ان کے ایمان کو ایک مثالی نمونہ قرار دیکر حکم دیا گیا ہے، کہ اللہ تعالی کے نزدیک مقبول و معتبر صرف اس طرح کا ایمان ہے جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے اختیار فرمایا، جو اعتقاد اس سے سرِ مو مختلف ہو، اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔

توضیح اس کی یہ ہے، کہ جتنی چیزوں پر یہ صاحبان ایمان لائے ان میں کوئی کمی زیادتی نہ ہو، اور جس طرح اخلاص کے ساتھ ایمان لائے، اس میں کوئی فرق نہ آئے کہ وہ نفاق میں داخل ہے، اور اللہ تعالی کی ذات وصفات، فرشتے اور انبیاء علیہم السلام و رسل، اسمانی کتابیں اور ان کی تعلیمات کے متعلق جو ایمان واعتقاد رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا، وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے، اس کے خلاف اس میں کوئی تاویل کرنا، یا کوئی دوسرے معنی مراد لینا اللہ کے نزدیک مردود ہے، فرشتوں اور انبیاء و رسل کے لئے جو مقام آپ ؐ کے قول و عمل سے واضح ہوا اس سے ان کو گھٹانا یا بڑھانا ایمان کے منافی ہے۔

اس توضیح سے ان تمام باطل فرقوں کے ایمان کا خلل واضح ہو گیا جو ایمان کے دعویدار ہیں، مگر حقیقت ایمان سے بے بہرہ ہیں، کیونکہ زبانی دعوی ایمان کا تو بت پرست مشرکین بھی کرتے تھے، اور یہود و نصاری بھی، اور ہر زمانے میں زندیق و ملحد بھی، مگر چونکہ ان کا ایمان اللہ پر، اور رسولوں پر، اور فرشتوں پر اور یوم قیامت وغیرہ پر اس طرح کا نہیں تھا، جیسا رسول اللہ ﷺ کا ہے، اس لئے وہ اللہ کے نزدیک مردود و نامقبول ہوا۔

مشرکین میں سے بعض نے تو فرشتوں کے وجود ہی کا انکار کیا، بعض نے ان کو اللہ کی بیٹیاں بنا دیا، دونوں کی تردید "بمثل ماامنتم به" سے ہو گئی، یہود و نصاری کے بعض گروہوں نے اپنے پیغمبروں کی مخالفت اور نافرمانی کی، یہاں تک کہ بعض کو قتل بھی کر دیا، اور بعض گروہوں نے ان کی عزت و عظمت کو اتنا بڑھایا کہ اللہ یا، اللہ کا بیٹا یا، اللہ کا مثل بنا دیا، یہ دونوں قسم کی افراط و تفریط ضلالت و گمراہی قرار دی گئی۔

شریعت اسلام میں رسول کی عظمت و محبت فرض ہے، اس کے بغیر ایمان ہی نہیں ہوتا، مگر رسول کو کسی صفت علم، یا قدرت وغیرہ میں اللہ کے برابر کر دینا گمراہی اور شرک ہے، قرآن کریم نے شرک کی حقیقت یہی بیان فرمائی ہے، کہ غیر اللہ کو کسی صفت میں اللہ کے برابر کریں " اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "(شعراء:۹۸) کا یہی مفہوم ہے، آج بھی جو لوگ رسول کریم ﷺ کو عالم الغیب اور اللہ کی طرح ہر جگہ موجود و حاضر ناظر کہتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کی عظمت و محبت کا حق ادا کر رہے ہیں، حالانکہ وہ خود نبی کریم ﷺ کے حکم کی

اور عمر بھر کی کوششوں کی صریح مخالفت کر رہے ہیں، اس آیت میں ان کے لئے بھی سبق ہے کہ رسول اللہ کی عظمت و محبت اللہ کے نزدیک ایسی ہی مطلوب ہے، جیسی صحابہ کرامؓ کے دل میں، آپ کی تھی، اس سے کمی بھی حرام ہے اور اس میں زیادتی بھی غلو اور گمراہی ہے۔

اسی طرح جن فرقوں نے رسول کریم ﷺ پر ختم نبوت کا انکار کر کے نئے نبی کے لئے دروازہ کھولنا چاہا، اور قران کریم کی واضح تصریح خاتم النبیین کو اپنے مقصد میں حائل پایا، تو انہوں نے رسول و نبی کی بہت سی قسمیں اپنی طرف سے اختراع کر لیں، جن کا نام نبی ظلی، نبی بروزی وغیرہ رکھ دیا، اور ان کے لئے گنجائش نکالنے کی کوشش کی، مذکور الصدر آیت نے ان کے دجل و گمراہی کو بھی واضح کر دیا، کیوں کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے ایمان بالرسل میں کسی ظلی و بروزی کا کہیں نام و نشان نہیں، یہ کھلا ہوا زندقہ اور الحاد ہے۔

اسی طرح وہ لوگ جن کے قلب و دماغ صرف مادے اور مادیات میں کھوئی ہوئے ہیں عالم غیب اور عالم آخرت کی چیزیں جب انہیں مستبعد نظر آتی ہیں، تو طرح طرح کی تاویلوں میں پڑ جاتے ہیں، اور اپنے نزدیک اس کو دین کی خدمت سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس کو **اقرب الی الفهم** کر دیا، مگر چونکہ وہ تاویلیں "**بمثل ماامنتم به**" کے خلاف ہیں، اس لئے سب مردود و باطل ہیں، آخرت کے تمام حالات و واقعات جس طرح قرآن و سنت میں وارد ہوئے ہیں ان پر بغیر کسی جھجک اور تاویل کے ایمان لانا ہی درحقیقت ایمان ہے، حشر اجساد کے بجائے حشر روحانی اور عذاب و ثواب جسمانی و روحانی، اسی طرح وزن اعمال میں تاویلیں کرنا سب اللہ کے نزدیک مردود، باطل اور گمراہی ہے۔

یہاں ابن کثیر لکھتا ہے کہ اگر یہ کفار بھی تم جیسا ایمان لائیں، یعنی تمام کتابوں، اور رسولوں کو مان لیں، تو حق و رشد، ہدایت و نجات پائیں گے۔ اور اگر باوجود قیام حجت کے پھر بھی باز رہے تو یقیناً حق کے خلاف پر ہے۔ جبکہ جواہر القرآن میں ہے: کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا ایمان معیاری اور عنداللہ مقبول تھا، اور وہ ہدایت یافتہ تھے، کیونکہ یہود و نصاری اور مشرکین کا ہدایت یافتہ ہونا ان جیسا ایمان لانے پر موقوف کیا گیا ہے۔ "**فسيكفيكهم الله**" میں واضح فرمادیا کہ آپؐ اپنے مخالفوں کی زیادہ فکر نہ کریں، ہم خود ان سے نمٹ لیں گے، اور یہ ایسا ہی ہے، جیسا دوسری آیت میں "**وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ** ﴿۶۷﴾ مائدہ) میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمادیا، کہ آپؐ مخالفین کی فکر نہ کریں، اللہ تعالی ان سے آپؐ کی حفاظت خود کریں گے۔ نافع بن ابی نعیم کہتے ہیں، کہ کسی خلیفہ کے پاس عثمانؓ کی تلاوت والا قرآن مجید بھیجا گیا، زیاد نے یہ سن کر کہا! کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ جب عثمانؓ کو لوگوں نے شہید کیا اس وقت یہ کلام اللہ ان کی گود میں تھا، اور آپ کا خون ٹھیک ان الفاظ پر پڑا تھا "**فسيكفيكهم الله**" کیا یہ صحیح ہے؟ نافع نے کہا بالکل ٹھیک ہے میں نے خود اس آیت پر ذوالنورین کا خون دیکھا تھا۔ (ابن کثیر). اور امام بیہقی نے شعب الایمان: ۱۸۳/۵، واحمد فی الزہد: ۱۵۹، میں عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ: **كان عثمان يقرأفي المصحف وهوفي حجره فكانت اول قطرة قطرت من دمه على هذه الاية**۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿۱۳۸﴾

(کہہ دو کہ ہم نے) اللہ کا رنگ (اختیار کرلیا ہے) اور اللہ سے بہتر رنگ کس کا ہوسکتا ہے؟ اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔[۳۵]

قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا

(ان سے) کہو کہ کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ وہی ہمارا اور تمہارا رب ہے اور ہمیں ہمارے اعمال (کا بدلہ ملے گا)

وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿۱۳۹﴾ أَمْ تَقُولُونَ

اور تمہیں تمہارے اعمال (کا) اور ہم خاص اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ (اے یہود و نصاریٰ) کیا تم اس بات کے قائل ہو

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ

کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد یہودی یا عیسائی تھے؟

نَصَارٰى قُلْ ءَ أَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللّٰهُ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ

(اے محمد ﷺ! ان سے) کہو کہ بھلا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ؟ اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی شہادت (یعنی

---

[۳۵] اس آیت میں نصاریٰ کی اس رسم باطل پر رد ہے، جو کہ یہاں بعض مفسرین وغیرہ نے ذکر کیا ہے، کتاب النکت للسرخسیؒ: ۱۴۰ (وهو شرح لزيادات الزيادات) ومعناه (اصباغ الاولاد) انهم كانوا ياخذون ماء من عين، بقرب ميلاد عيسى عليه السلام (اى وقت ولادة عيسى عليه السلام) يسمونه ماء العمودية، يجعلون ذلك في قدر، ثم يغمسون اولادهم فيزعمون انهم يتطهرون بذلك عن كل شوب الا النصرانية۔ کتاب النکت میں امام سرخسیؒ (جو کہ کتاب الزیادات کی شرح ہے) لکھتا ہے کہ: ''صبغ''، کا معنی یہ ہے کہ یہ نصاریٰ ایک چشمے سے، (عیسیٰ علیہ السلام کے وقت ولادت کے قریب)، پانی لیتے تھے، اور اس کو عمودی پانی سے موسوم کرتے تھے، اور اس پانی کو ایک ہانڈی میں ڈالکر پھر بچوں کو اس میں نہلاتے اور یہ گمان کرتے کہ اس عمل سے ہمارے یہ بچے تمام مذاہب وعقائد باطلہ سے پاک ہوتے ہیں، اور نصرانیت کے علاوہ تمام ادیان وافکار سے مبراء ہوتے ہیں۔

مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ

اس گواہی) کو جو اس کے پاس (کتاب میں موجود) ہے چھپائے اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

یہ جماعت گزر چکی ان کو (وہ ملے) گا جو انہوں نے کیا اور تمہیں وہ جو تم نے کیا اور جو عمل وہ کرتے تھے اُن کی پرسش تم سے نہیں ہوگی

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا

احمق لوگ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلے پر (پہلے سے چلے آتے) تھے (اب) اس سے کیوں منہ پھیر بیٹھے؟

عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

تم کہہ دو کہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے وہ جس کو چاہتا ہے سیدھے رستے پر چلاتا ہے ۔[۳۶]

﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

اور اسی طرح ہم نے تم کو امتِ معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کو دین بیان کرتے رہو

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

اور پیغمبر تم کو بیان کرے گا۔ [۳۷]

---

[۳۶] امام بخاری نے براءؓ سے (كتاب الصلواة، باب التوجه نحو القبله) روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے مدینہ آئے تو بیت المقدس کی طرف سولہ ۱۶، یا سترہ ۱۷، مہینے نماز پڑھی، مگر آپ ؐ کی یہ خواہش تھی کہ قبلہ طرف کعبہ کے ہو۔ چنانچہ سب سے پہلے جو نماز طرف کعبے کے پڑھی، عصر کی نماز تھی، آپ ؐ کے ہمراہ ایک قوم نے بھی پڑھی، ان میں سے ایک کا گذر مسجد بنوسلمہ والوں پر ہوا، وہ لوگ رکوع میں تھے، اس نے کہا میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نماز کعبہ کی طرف پڑھی ہے، وہ سب لوگ مکہ کی طرف پھر گئے، کچھ لوگ جو پہلے قبلے پر، قبل تحویل

کے طرف کعبے کے مر گئے تھے، ہم ان کے حق میں کچھ نہ کہہ سکتے تھے، اس پر اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی۔

''سفھاء'' سے مراد یا تو مشرکین مکہ تھے یا یہود اور بعض نے منافقین ذکر کئے ہیں، لیکن لفظ اپنے عموم کے لحاظ سے سب کو شامل ہے، اس لئے اس کو عموم پر محمول کرنا ہی بہتر ہے (کبیر)۔

[۳۷] یہاں تفسیر نعیمی والے نے کچھ یوں تفسیر کیا ہے، امت کو تو رسول اللہ ﷺ کی اطلاع کے ذریعہ سے احوال امم، وتبلیغ انبیاء کا علم قطعی ویقینی حاصل ہے، اور رسول اللہ ﷺ بکرم الہی نور نبوت سے ہر شخص کے حال، اور اس کی حقیقت ایمان اور اعمال نیک وبد اور اخلاص ونفاق سب پر مطلع ہیں۔

اس کا جواب تفسیر جواہر القرآن نے تفصیل سے دیا ہے، لکھتا ہے: یہ مرکزیت تمہیں اس لئے عطاء کی ہے تا کہ میرا پیغمبر تم کو میری توحید بتائے اور میرے احکام سے تم کو آگاہ کرے، اور تم دوسرے لوگوں کو توحید بتاؤ، اور ان تک میرے احکام پہنچاؤ، اس میں خطاب صحابہ کرام سے ہے''اور شہداء'' شہید کی جمع ہے۔ جو شہادت سے ماخوذ ہے، جن کے معنی ہیں بیان کرنا، اس لئے شہید اور اسی طرح شاہد کے معنے ہونگے۔ اللہ کے توحید بیان کرنے والا، اور راہ حق بتانے والا، جیسا کہ علامہ ابن صفی حنفی نے لکھا ہے: انا ارسلناک شاھدا اللہ بالوحدانیة (جامع). یعنی اپ کو ہمنے توحید بیان کرنیوالا بنا کر بھیجا، اسی طرح سورۂ مائدہ میں ''وکانوا علیہ شھدا'' کے تحت علامہ موصوف لکھتے ہیں: رقباء لئلا یبدل (جامع). یعنی علماء یہود تورات کے محافظ تھے کہ اس میں تبدیلی نہ ہونے پائے، اور مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے سورۂ مزمل میں ''شاہدا'' کا ترجمہ بتانے والا کیا ہے۔ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِداً عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولًا. (۱۵). ہم نے بھیجا تمہاری طرف رسول بتانے والا تمہارا۔ لیکن شرک پسند اور بدعت نواز مولوی کہتے ہیں کہ، یہاں شہید کے معنی گواہ کے ہیں، اور گواہ صرف وہی ہوسکتا ہے جو موقع پر موجود ہو، اور واقعہ کو اپنی انکھوں سے دیکھے، جب اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو امت پر گواہ فرمایا، تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ ہر امتی کے ساتھ موجود ہوتے ہیں، اور اس کی تمام حرکات وسکنات کو دیکھتے ہیں، ورنہ گواہ نہیں بن سکتے، تو اس سے ثابت ہوا کہ آپ ہر جگہ اور ہر وقت حاضر وناظر ہیں۔

پہلا جواب: لفظ ''شہید'' یہاں بمعنی گواہ نہیں، بلکہ جیسا کہ پہلے جامع البیان اور ترجمہ موضح قران کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں شہید کے معنی بیان کرنے والے اور بتانے والے کے ہیں۔ اور سیاق وسباق کے اعتبار سے بھی یہی

معنی موزوں ہیں کیونکہ اسی ایت میں صحابہ کرام کے لئے بھی لفظ ''شہداء'' کا استعمال کیا گیا ہے۔اور یہ لفظ بعینہ وہی مفہوم ادا کررہا ہے جو سورۂ آل عمران میں ایک پوری ایت میں بیان کیا گیا ہے: كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ (الاية:۱۱۰)

دوسرا جواب: اگر مان لیا جائے کہ اس ایت میں شہید بمعنی گواہ ہے،لیکن یہ دعوی غلط ہے کہ گواہ صرف وہی شخص بن سکتا ہے جو موقع پر موجود ہو اور واقعہ کو اپنی انکھوں سے دیکھے کیونکہ فقہاء کرام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ گواہی کے لئے واقعہ کا انکھوں سے مشاہدہ کرنا ضروری نہیں، کیونکہ قران مجید میں وارد ہے: وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا إِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٢٦﴾(يوسف)۔

یہاں اس شخص کو شاہد (گواہ) فرمایا جس نے زلیخا کی دست اندازی کا اپنے انکھوں سے مشاہدہ نہیں کیا تھا، بلکہ محض علامات کی بناء پر گواہی دی،تو معلوم ہوا کہ گواہی کے لئے مشاہدہ ضروری نہیں،اسی طرح اگر ایک شخص موقعہ پر موجود نہ ہو لیکن واقعہ کی خبر اس تک کسی ایسے معتبر اور باوثوق ذریعہ سے پہنچ جائے جس سے اس کو واقعہ کی صداقت کا یقین ہو جائے، تو اس کے لئے گواہی دینا جائز ہے، چنانچہ ہدایہ:۱۵۷/۳، میں ہے انمايجوز للشاهدان يشهدبالاشتهار و ذلك بالتواتر اواخبار من يثق به۔

تیسرا جواب: ''شہید'' کے معنی یہاں نگہبان اور رقیب کے ہیں ،اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کا رسول تم پر (یعنی صحابہ کرام پر) نگہبان ہو،تاکہ تم دین اسلام سے نہ ہٹنے پاؤ اور دین میں تحریف نہ ہونے پائے۔اور تم ان لوگوں پر نگہبان ہو، جو تم سے دین سکھیں۔جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: قیامت کے دن میں دیکھوں گا، کہ میرے امت کے کچھ لوگ لائے جارہے ہونگے لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھ تک حوض کوثر تک پہنچیں انہیں جہنم کی طرف لے جایا جائے گا،تو میں کہوں گا کہ یہ تو میرے امتی ہیں،تو مجھے جواب ملے گا کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے کچھ کیا ہے آپ ﷺ کو معلوم نہیں تو:۔فاقول كماقال العبد الصالح: ﴿وكنت عليهم شهيدامادمت فيهم فلماتوفيتنى كنت انت الرقيب عليهم.﴾ (صحيح بخارى:٢/٦٦٥).

''میں اس کے جواب میں وہی کچھ کہونگا جو اللہ کے نیک بندہ عیسی علیہ السلام کہے گا کہ جب تک میں ان میں موجود تھا ان پر نگران رہا اور جب تو نے مجھے اٹھالیا تو تو ہی ان کا نگہبان تھا'' اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے خود بیان

فرمادیا کہ جب تک میں ان میں موجود رہا، ان کے حالات سے آگاہ رہا، تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا گواہ ہونا صحابہ کے لئے ہے، اور ہر امتی پر گواہ نہیں ہے اور نہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔

چوتھا جواب: یا گواہ سے مراد یہ ہے کہ جب قیامت کے دن آپ کی امت پہلی امتوں پر گواہی دے گی کہ ان کے پیغمبروں نے ان کو اللہ کے احکام پہنچائے ہیں اور آپ اپنی امت پر تبلیغ رسالت کی گواہی دیں گے۔ جیسا کہ قتادہؒ فرماتے ہیں: **لتكونوا شهداء على الناس لتكون هذه الامة شهداء على الناس ان الرسول قدبلغكم ويكون الرسول على هذه الامةشهيداان قدبلغ ماارسل به (ابن جرير)** . جیسا کہ حدیث میں ہے: **يجاء بنوح عليه السلام يوم القيامة فيقال له هل بلغت فيقول بلغت يعنى نعم يارب فيسئل امته هل بلغكم فيقولون ماجاء نامن نذيرفيقال من شهودك فيقول محمد وامته فقال رسول الله ﷺ فيجاء بكم فتشهدون (صحيح البخارى: ٢/١٠٩٢)** . یعنی "قیامت کے دن نوح علیہ السلام سے سوال ہوگا کیا تو نے میرے احکام اپنی امت تک پہنچائے تو وہ جواب دیں گے کہ اے میرے رب میں نے پہنچا دیے۔ پھر اللہ تعالی ان کی امت سے سوال فرمائے گا کیا اس نے تم کو میرے احکام پہنچائے تھے؟ تو وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا آیا ہی نہیں، تو نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا۔ تیرے گواہ کون ہے؟ تو وہ جواب دیں گے کہ محمد ﷺ اور آپ کی امت میری گواہ ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: چنانچہ پھر تمہیں بلایا جائے گا اور تم گواہی دو گے"۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ قوم نوح امت محمدیہ پر اعتراض کرے گی کہ تم کس طرح گواہی دے سکتے ہو تم اس وقت موجود نہیں تھے۔ تو امت محمدیہ جواب دے گی: **ان الله تعالى بعث الينارسولاوانزل عليه الكتاب فكان فيماانزل الينا خبركم** یعنی "اللہ تعالی نے ہماری طرف اپنا رسول بھیجا اور اس پر کتاب نازل فرمائی اور اس پر کتاب نازل فرمائی اور اس میں تمہارا ذکر بھی فرمایا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی توحید اور اس کے احکام کما حقہ پہنچائے تھے۔"

پانچواں جواب: اگر بالفرض مان لیا جائے کہ تمام دلائل قطعیہ اور نصوص صریحہ کے خلاف یہاں لفظ شہید کے معنی حاضر و ناظر ہی کے ہیں اور اس سے نبی علیہ السلام کا حاضر و ناظر ہونا ثابت ہو رہا ہے، تو پھر صرف نبی علیہ السلام ہی کو نہیں بلکہ ساری امت محمدیہ کو حاضر و ناظر ماننا پڑے گا۔ کیونکہ اسی آیت میں امت محمدیہ کے لئے بھی لفظ شہداء

استعمال کیا گیا ہے جو شہید کی جمع ہے۔ بلکہ اس صورت میں تو امت کا رتبہ نبی ﷺ سے بھی بڑھ جائے گا۔ کیونکہ آپؐ تو صرف اپنی امت کے گواہ ہیں، اور یہ امت پہلی تمام امتوں پر گواہ ہے۔ جیسا کہ "لتکونوا شهداء على الناس" سے ظاہر ہے۔

چھٹا جواب: اگر شہید کے وہی معنی تسلیم کر لئے جائیں جو مبتدعین کہتے ہیں تو اس آیت اور قران مجید کی دوسری آیتوں کے درمیان ایسا اختلاف اور تضاد رونما ہوگا جس کا اٹھانا ممکن نہیں ہوگا۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں یہ آیت ہے مدینہ منورہ میں سب سے پہلے نازل ہوئی۔ اس کے بعد تقریبا سولہ، سترہ، سورتیں اور نازل ہوئیں اور ان کے بعد سورۂ منافقون نازل ہوئی جس کا شان نزول صحیح روایتوں کے مطابق یہ ہے: کہ غزوہ تبوک کے سفر میں عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین نے موقع پا کر اپنے ساتھی منافقین سے کہا کہ اس پیغمبر اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔ ان کی وجہ سے ہمیں بہت تکلیف ہے۔ جب ہم مدینہ واپس پہنچیں گے تو (العیاذ باللہ) ان کمینوں کو شہر سے نکال دیں گے۔ عبداللہ کی یہ باتیں ایک کم سن صحابی، زید بن ارقم نے سن لیں اور اپنے چچا سے کہہ دیں، انہوں نے سارا ماجرا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کر دیا۔ تو آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی کو بلا کر پوچھا تو اس نے قسمیں کھا کر نبی علیہ السلام کو یہ باور کرا دیا کہ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ چنانچہ آپ نے زید بن ارقم کو جھٹلا دیا اور عبداللہ بن ابی کو سچا مان لیا تو اس پر سورۂ منافقون نازل ہوئی جس سے آپ پر حقیقت حال منکشف ہوئی۔

اگر آپ حاضر و ناظر ہوتے تو یقیناً آپ کو عبداللہ بن ابی کی باتیں معلوم ہو جاتیں اور آپ زید بن ارقم کی تصدیق فرماتے، اور عبداللہ کی قسموں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کو جھٹلا دیتے۔ اسے لئے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شہید کے معنی یہاں حاضر و ناظر کے نہیں ہے جیسا کہ فریق مخالف کا زعم ہے۔

ایک شبہ بعض مبتدعین یہاں شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کی ایک عبارت پیش کر کے اس سے نبی علیہ السلام کا حاضر و ناظر ہونا ثابت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ شاہ صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: یعنی "و باشد رسول شما، بر شما گواہ، زیرا کہ او مطلع است بنور نبوت، برتبہ ہر متدین بدین خود، کہ درکدام درجہ از دین من رسیدہ، الخ۔ (تفسیر عزیزی)۔

یعنی "اور ہو رسول تمہارا تم پر گواہ، کیونکہ آپ نور نبوت سے اپنے ہر امتی کا رتبہ جانتے ہیں۔ کہ وہ کس=

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا

اور جس قبلہ پر تم (پہلے) تھے اُس کو ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا

إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ

کہ ظاہر کریں[۳۸] کہ کون (ہمارے) پیغمبر کا تابع رہتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں کو)

لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ

گراں معلوم ہوئی مگر جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی ہے (وہ اسے گراں نہیں سمجھتے) اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو یونہی ضائع کردیں

إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ۞[۱۴۳] قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ

اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بڑا مہربان اور رحمت والا ہے۔ (اے محمد ﷺ!) ہم تمہارا آسمان کی طرف منہ پھیر پھیر کر دیکھنا

فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ

دیکھ رہے ہیں پس ہم تمہیں اسی قبلہ کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو منہ کرنے کا حکم دیں گے۔ تو اپنا منہ مسجد حرام

= درجہ پر پہنچا ہے، تو اس سے معلوم ہوا، کہ آپؐ ہر امتی کے تفصیلی حالات سے آگاہ ہیں اور حاضر و ناظر ہیں۔

جواب: یہ عبارت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ کی نہیں ہے، بلکہ مدرج ہے، بعد میں کسی نے بڑھائی ہے، کیونکہ اس کے بعد آگے چل کر شاہ صاحب لکھتے ہیں شہادت در ینجا بمعنی گواہی نیست، بلکہ بمعنی اطلاع و نگہبانی است تا از جادہ حق بیرون نروند، چنانچہ، واللہ علی کل شیء شهید، ودر موقولہ عیسی علیہ السلام، کہ "وكنت عليهم شهيدامادمت فيهم فلماتوفيتنى كنت انت الرقيب عليهم وانت على كل شيء شهيد، تفسیر عیزیزی"۔ یعنی اس آیت میں شہادت کے معنی گواہی کے نہیں بلکہ اطلاع اور نگہبانی کے ہیں، تاکہ وہ راہ حق سے باہر نہ جا سکے، جیسا کہ، والله على كل شيء شهيد، میں اور عیسی علیہ السلام کے قول "كنت عليهم شهيدا" میں شہید بمعنی گواہ نہیں بلکہ اس کے معنی نگران اور نگہبان کے ہیں، یہ عبارت اس بات کا کھلا ہوا قرینہ ہے، کہ پہلی عبارت شاہ صاحب کی نہیں ہے۔ کیونکہ دوسری عبارت میں انہوں نے لفظ شہید کا جو مفہوم بیان فرمایا ہے، وہ پہلی عبارت کے بالکل منافی ہے۔

الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ

(یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو اور تم لوگ جہاں ہوا کرو (نماز پڑھنے کے وقت) اسی مسجد کی طرف منہ کر لیا کرو

وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ

اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ (نیا قبلہ) اُن کے رب کی طرف سے حق ہے

رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا

اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن سے بے خبر نہیں ہے۔ اور اگر تم ان اہل کتاب کے پاس تمام نشانیاں بھی لے کر آ ؤ

الْكِتٰبَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ

تو بھی یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کریں اور تم بھی اُن کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہو

وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ

اور اُن میں سے بھی بعض بعض کے قبلے کے پیرو نہیں ہیں اور اگر تم باوجود اس کے کہ تمہارے پاس دانش (یعنی اللہ کی وحی) آ چکی ہے

مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِينَ ﴿۱۴۵﴾ الَّذِينَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ

اُن کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو ظالموں میں (داخل) ہو جاؤ گے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے

يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ

وہ ان (پیغمبر آخرالزماں) کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں مگر ایک فریق اُن میں سے سچی

وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۱۴۶﴾ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿۱۴۷﴾

بات کو جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔ (اے پیغمبر یہ نیا قبلہ) تمہارے رب کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا

اور ہر ایک (فرقے) کے لئے ایک سمت ہے جدھر وہ (عبادت کے وقت) منہ کیا کرتے ہیں تو تم نیکیوں میں سبقت حاصل کرو تم

تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۴۸﴾

جہاں ہوں گے اللہ تم سب کو جمع کر لے گا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ

اورتم جہاں سے نکلو (نماز میں) اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو بلاشبہ وہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے

مِنْ رَّبِّكَ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اور تم جہاں سے نکلو

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

مسجد محترم کی طرف منہ (کر کے نماز پڑھا) کرو اور مسلمانو تم جہاں ہوا کرو اسی (مسجد) کی طرف رخ کیا کرو

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ

(یہ تاکید) اس لئے (کی گئی ہے) کہ لوگ تمہیں کسی طرح کا الزام نہ دے سکیں

إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي

مگر اُن میں سے جو ظالم ہیں (وہ الزام دیں تو دیں) سو اُن سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا

وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۰﴾

اور یہ بھی مقصود ہے کہ میں تمہیں اپنی تمام نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہِ راست پر چلو ۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا

جس طرح (منجملہ اور نعمتوں کے) ہم نے تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے

وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا

اور تمہیں پاک بناتا اور کتاب (یعنی قرآن) اور دانائی سکھاتا ہے اور ایسی باتیں بتاتا ہے جو تم پہلے نہیں جانتے تھے

تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

پس تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا اور میرا احسان مانتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ

اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لیا کرو بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں اُن کی نسبت یہ نہ کہنا

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

کہ وہ مرے ہوئے ہیں بلکہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے ۔[۳۹]

---

[۳۸] "**لنعلم**" استقبال کے لئے ہے لہذا اس سے شبہ پڑتا ہے، کہ اس سے پہلے اللہ تعالی کو معلوم نہیں تھا کہ کون مانے گا اور کون نہیں مانے گا، حالانکہ یہ چیز اہل اسلام کے عقیدہ کے خلاف ہے، کیونکہ اللہ تعالی تو ازل سے ابد تک تمام کلیات اور جزئیات کا علم رکھتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں علم سے مراد خارج میں تمیز اور اظہار ہے، روح المعانی میں ہے: **اريد به التميز فی الخارج**، اور مدارک میں ہے: **فوضع العلم موضع التميز لان به يقع التميز**۔

یعنی ہم نے تحویل قبلہ اس لئے کی ہے، تاکہ ہمارے پیغمبر کے فرمانبرداروں اور نافرمانوں میں امتیاز ہو جائے، جو لوگ تحویل قبلہ کے حکم کو بخوشی مان لیں گے، وہ فرمان بردار ہوں گے، اور جو نہ مانیں گے بلکہ اس کا مذاق اڑائیں گے، وہ نافرمان ہوں گے، چنانچہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس موقع پر کئی مسلمان مرتد ہو گئے۔ مگر یہ وہی مسلمان تھے جو بظاہر مسلمان کہلاتے تھے، لیکن حقیقت میں مسلمان نہیں تھے، یعنی منافقین، یہ لوگ پہلے تو پوشیدہ طور پر مخالفت کرتے

تھے،مگرتحویل قبلہ کے موقع پرعلانیہ اس کاتمسخراڑاناشروع کردیا،تاکہ مخلص مسلمانوں کے دلوں میں بھی شبہات پیداہوجائیں،تحویل قبلہ بھی مخلص ومنافق اورطیب وخبیث کے درمیان امتیاز کرنے کاایک ذریعہ ہے۔

"**وان کانت لکبیرة الاعلی الذین ھدی اللّٰہ**"ہدایت سےمرادایمان ہے،ای **خلق الھدی الذی ھو الایمان فی قلوبھم(قرطبی)**۔یعنی تحویل قبلہ ایک بھاری ازمائش تھی مگرجن کے دلوں میں اللہ تعالی نے ایمان پیداکردیاتھاان کے لئے اس کامقابلہ کرنااسان تھا،کیونکہ وہ نہ تومصلحتوں کودیکھتے ہیں نہ حکمتوں کو،ان کی زندگی کاماحصل توبس ایمان وتسلیم ہے جہاں حکم ہواوہی سرجھکادیا۔

"**قدنری تقلب وجھک فی السماء**" نبی کریمﷺ کی خواہش تھی کہ کعبہ کوآپؐ کاقبلہ بنادیاجائے،کیونکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کاقبلہ تھا،نیزاہل عرب کے لئے اس میں زیادہ کشش تھی،اورانہیں اسلام سےقریب لانے کے لئے ایک عمدہ ذریعہ تھا،اہل کتاب میں سےجنہوں نےایمان لاناتھا،وہ ایمان لاچکے تھےاورجوباقی تھےان کےایمان سےآپؐ مایوس تھے،جیساکہ:"**افتطمعون ان یومنوالکم**"الایہ،اور"**لن ترضی عنک الیھودو لا النصاری**"الایہ، سے واضح ہے،اورآپؐ کویہ توقع بھی تھی کہ تحویل قبلہ ہوجائے گی،کیونکہ اب دین کی امامت وسیادت بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل کی طرف منتقل ہوچکی تھی۔اس لئے اب ضروری تھاکہ قبلہ وہی مقررہو۔جوابراہیم اوراسماعیل علیہماالسلام کاتھا،اس لئے آپؐ وحی کی آمدکی توقع پربارباراسمان کی طرف نظراٹھاکردیکھتے،تواللہ تعالی نے فرمایاکہ ہم آپؐ کی بے چینی اورانتظارکودیکھ رہے ہیں،مگربعض حکمتوں کےتحت اب تک آپ کوتحویل قبلہ کاحکم نہیں دیا۔ایت کامذکورہ بالامطلب اس آیت کی بناپرہے جس میں یہ مذکورہے کہ نبی کریمﷺ وحی کی امدکےمنتظررہتے تھےاوربوجہ اشتیاق باربار اسمان کی طرف نظر اٹھاکردیکھتے تھے۔

اورشیخ حسین علیؒ فرماتے ہیں،کہ لفظ "**تقلب**"**باب تفعل** سے ہے،جس کاخاصہ تکلف ہے،صراح،میں ہے،**تقلب الشیٔ ظھراً لبطن ،کالحیة تتقلب فی الرمضاء**،۔یعنی سخت گرمی میں سانپ کےتکلیف کےساتھ چلنے پرتقلب کالفظ بولتے ہیں،توآیت کامطلب یہ ہوگا"کہ ہم دیکھ رہے ہیں تکلیف اورناگواری کے ساتھ آپ کے بارباراآسمان کی طرف دیکھنےکو،کہ کہیں تحویل قبلہ کاحکم نہ آجائے"۔کیونکہ آپؐ کی خواہش یہ تھی،ابھی تحویل قبلہ نہ ہو،اوربیت المقدس ہی قبلہ رہے،تاکہ اس معاملہ میں یہودیوں سےموافقت رہےاورشایدوہ اسی وجہ سےایمان قبول کرلیں،آیت کایہ مفہوم شیخؒ نے بیان فرمایاہے،اورچونکہ لغت اورعرف کےبھی مطابق ہے،جبکہ اسلام کےکسی منصوص اورقطعی حکم کی مخالفت

بھی نہیں ہوئی، اس لئے آیت کی یہ تفسیر وتاویل بعض علماء نے صحیح مانا ہے۔

اور بعض نے فرمایا ہے کہ یہ صحیح نہیں، اس لئے کہ یہ بخاری کی اس روایت سے مخالف ہے جو کہ پہلے ذکر کی گئی، اس میں یہ جملہ تھا، کہ: **وکان رسول اللہ ﷺ یحب ان یوجه الی الکعبة، فانزل اللہ عزوجل ﴿قدنری تقلب وجهک فی السماء﴾ ،فتوجه نحو القبلة** ۔یعنی رسول اللہ ﷺ دل سے یہ چاہتے تھے، کہ آپ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہو۔ آخر اللہ تعالی نے یہ آیت اتاری۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ رسول کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ دل میں ایک چیز کو پسند کرے اور ظاہر زبان پر دوسری چیز کا اظہار کرے۔ یہ وجہ بھی ہے کہ تفعل ہر وقت تکلف کے لئے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات تکرار اور کثرت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور "ترضٰها" فعل مضارع ہے حال اور استقبال دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ بعض اوقات بمعنی ماضی بھی استعمال ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

[۳۹] اس آیت میں اللہ تعالی نے شہدآء کی ایک بہت بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے، کہ ان کو دنیا سے رخصت ہو جانے اور فی سبیل اللہ قتل ہو کر طبعی موت پا جانے کے بعد عالم برزخ میں ایک امتیازی زندگی اور حیات عطا کی جاتی ہے، جو دوسرے غیر شہداء مومنین کو حاصل نہیں ہوتی، اور اس حیات کا تعلق چونکہ عالم برزخ سے ہے، اس لئے اس کے متعلق ارشاد فرمایا کہ تم اپنے حواس ومشاعر سے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس مسئلہ کی مکمل تحقیق ہم یہاں کرتے ہیں تاکہ کسی کو اس مسئلے کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ حیات شہدآء کے بارے میں قرآن مجید کی دو آیتیں ہیں، ایک تو یہی، دوسری آیت سورت آل عمران: ۱۶۹، ۱۷۰، میں ہے یہاں فرمایا کہ ان کو مردہ مت کہو اور وہاں فرماتا ہے کہ شہداء کو مردے مت سمجھو، حالانکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شہداء قتل کر دیئے جاتے ہیں، اور ان کی روحیں ان کے ابدان عنصریہ سے پرواز کر جاتی ہیں۔

اور ان کے ابدان سے اس طرح جدا ہو جاتی ہیں، کہ ان سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ بیضاوی وغیرہ نے لکھا ہے کہ: **ولکن لاتشعرون، ماحالهم وهو تنبیه علی ان حیاتهم لیست بالجسد ولا من جنس مایحس به من الحیوانات وانما هی امر لایدرک بالعقل بل بالوحی** ، لیکن تم نہیں جانتے کہ وہ کس حال میں ہیں، اور یہ اس امر پر تنبیہ ہے کہ ان شہدآء کی حیات جسمانی نہیں اور نہ زندوں کی مانند ظاہری حواس سے محسوس قسم کی زندگی ہے، اور نہ اس کا ادراک عقل سے ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس کی کیفیت کا ادراک صرف وحی سے ہو سکتا ہے، اور مولانا شاہ عبد العزیز دہلویؒ فرماتے ہیں، حیات شہداء بمعنی تعلق ارواح با بدان است برائے استفاء لذاتی کہ موقوف برآلات بدنیست نہ

تعلق ارواح بابدان سابقہ ونہ بقائے روح بادراک وشعورالخ عزیزی: ٦٨٥:١، یعنی حیات شہداء کا مطلب یہ ہے کہ وہ لذات حاصل کرنے کے لئے جن کا حصول آلات پر موقوف ہے، ارواح ابدان مثالیہ سے متعلق ہوجائیں یہ مطلب نہیں کہ ارواح سابقہ (عنصری) ابدان سے متعلق ہوجائیں اورنہ یہ کہ روح کا ادراک وشعور باقی رہے۔

عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللهﷺ لما اصیب اخوانکم باحد جعل الله عزوجل ارواحهم فی اجواف طیر خضر ترد انهار الجنة تأکل من ثمارها وتأوی الی قنادیل من ذهب فی ظل العرش فلما وجدوا اطیب مشربهم وماکلهم وحسن مقیلهم قالوا یالیت اخواننا یعلمون بما صنع الله لنا لان لایزهدوا فی الجهاد ، ولا ینکلوا عن الحرب، فقال الله عزوجل ،انا ابلغهم عنکم فانزل الله عزوجل هؤلاء الایات علی رسوله: ال عمران: ١٦٩ .اخرجه ابن ابی شیبة: ٥/٢٩٤، ٢٩٥ ،وهناد فی الزهد: ١٥٥، وابن ابی عاصم فی الجهاد: ١٩٤ :١٩٥، و الطبری :٤/١٧٠، ١٧١ .واخرجه عبدالله ابن مبارک فی الجهاد: ٦٢،وابوداود:رقم ٢٥٢٠،وابویعلی:رقم ٢٣٣١ ،و البیهقی: ٩/١٦٣ ۔رسول اللہﷺ نے فرمایا جب تمہارے بھائی میدان احد میں شہید کردئے گئے، تو اللہ تعالی نے ان کی روحوں کو سبز پرندوں کے قالبوں میں داخل فرمادیا، جو جنت کی نہروں سے سیراب ہوتے اوراس کے میوے کھاتے ہیں، اور رات کو عرش کے سائے میں سونے کی قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں۔ جب ان روحوں نے اپنے کھانے اور پینے اورسونے کی خوشی حاصل کی، تو کہا کون ہے جو ہماری طرف سے ہمارے بھائیوں کو یہ خبر پہنچائے کہ ہم جنت میں زندہ ہیں، اورکھانے کھاتے ہیں، تاکہ وہ بہشت کو حاصل کرنے میں بے رغبتی نہ کریں، اورلڑائی کے وقت سستی نہ کریں، تو اللہ تعالی نے فرمایا: میں پہنچاؤں گا ان کو تمہاری خبر، پس اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی: ترجمہ: جولوگ اللہ تعالی کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ مت سمجھو، بلکہ وہ جیتے ہیں اپنے رب کے پاس کھانے کھلوائے جاتے ہیں، خوش ہیں ان نعمتوں پر جو اللہ تعالی نے ان کو دی ہیں، اورخوشخبری حاصل کرتے ہیں ان لوگوں پر جو ابھی تک نہیں آئے کہ تم ہرگز مت ڈرو، اورنہ رنجیدہ ہوں۔

یہ روایت ابن عباسؓ سے موقوف بھی منقول ہے کہ، **ارواح الشهداء تجول فی طیر خضر ترد انهار الجنة تعلق من ثمر الجنة .سعیدبن منصور: ٢/٢١٧** ،یعنی شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے قالبوں میں گھومتی اور جنت کے میوے کھاتی ہیں۔

اسی طرح ایک روایت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی منقول ہے کہ: **قال مسروق سألنا عبدالله عن هذه الایة:**

وَلَا تَـحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتاً ط بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿١٦٩﴾ قال :اناقدسألناعن ذلک فقال: ارواحهم فی جوف طیر خضر ،لهاقنادیل معلقة بالعرش تسرح من الجنة حیث شأت ثم تـأوی الـی تـلـک الـقـنـادیـل ،فـاطـلـع الیهـم ربهـم اطـلاعة فـقـال هل تشتهون شیئا،قالوا ای شیء نشتهـی؟ونحن نسرح من الجنة حیث شئنا،ففعل ذلک بهم ثلاث مرات ،فلمارؤاانهم لم یترکوامن ان یسألوا،قالوایارب نریدان تردارواحنافی اجسادنا،حتی نقتل فی سبیلک مرة اخری، فلمارأی ان لیـس لهـم حـاجة تـرکـوا ۔مسلم:رقم ۱۸۸۷۔مسند دارمی:۴۲/۹،ابن ابی شیبۃ:۳۰۸/۵،ترمذی:رقم ۳۰۱۱،ابن ماجہ:۲۸۰۱،بیہقی سنن کبری:۱۶۳/۹۹۔مسند ابی داؤدطیالوسی:۱۵۱/۱:۔مسروق سے روایت ہے، کہا،ہم نے عبداللہ بن مسعودؓ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا۔ترجمہ,,اورنہ خیال کران لوگوں کوجواللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں مردہ، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے ہاں رزق دیئے جاتے ہیں،آخرآیت تک۔اس نے کہا،ان کی روحیں سبز پرندوں کے شکموں میں ہیں،عرش کے نیچےان کے لئے قندیلیں لٹکائی گئی ہیں، جہاں سے چاہتے ہیں جنت کے میوے کھاتے ہیں، پھران قندیلوں کی طرف ٹھکانا پکڑتے ہیں۔ان کا پروردگاران کی طرف جھانکا،فرمایاتم کسی بات کی خواہش رکھتے ہو؟انہوں نے کہاہم کس چیز کی خواہش رکھیں جبکہ ہم جہاں سے چاہتے ہیں جنت کے میوے کھاتے ہیں،تین مرتبہ اللہ تعالی اس طرح فرمائے گاجب وہ دیکھیں گے کہ ان کوچھوڑانہیں جارہا،پوچھنے سے کہیں گے اے ہمارے پروردگارہم چاہتے ہیں کہ تو ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں واپس لوٹادے، یہاں تک کہ ہم ایک مرتبہ اور تیری راہ میں مارے جائیں۔جب اللہ تعالیٰ دیکھتاہے کہ ان کوکچھ حاجت نہیں ہے تو چھوڑ جاتے ہیں۔

عبداللہ ابن مسعودؓ سے ایک موقوف روایت ابن ابی عاصم کتاب الجہاد :۵۱۷/۲،میں اورطبرانی:معجم کبیر: ۲۴۹/۱۰،میں نقل کرتے ہیں کہ:حدّث ان الثـمانية عشر الذی قتلوامن اصحاب رسول اللهﷺ جعل الله ارواحهـم فـی الـجنة فی طیر خضر ۔یعنی وہ اٹھارہ(۱۸)صحابہ کرام جوایک معرکے میں شہادت پاگئے تھے،ان کے ارواح سبز پرندوں کے پیٹوں میں ڈال کر جنت میں داخل کروائے،ان محدثین نے اس روایت کوموقوف اورمرفوع نقل کیاہے۔

ایک اورروایت کعب بن مالکؓ سے بھی منقول ہے کہ رسول اللہﷺ نےفرمایا:ان ارواح الشهـداء فـی طـائـر خـضـر تـعـلق من ثمر الجنة ،وقرئ علی سفیان، نسمة تعلق فی ثمرة اوشجرة الجنة ۔مسنداحمد:

۱۴۳/۴۵، وسنن سعید بن منصور:۲۵۶۰۔ترمذی:۱۶۴۰، ابن ابی عاصم کتاب الجہاد:۲/۵۲۱، طبرانی: ۱۹ص۶۶۔ حمیدی:۲/۳۸۵،ابن عبدالبر:۱۱:۰۷۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں جنت کے میوے کھاتی ہیں۔

اسی طرح ایک روایت جابرؓ سے بھی منقول ہے:**قـال سـمعت جابر بن عبداللهيقول لماقتل عبدالله بن عـمرو بن حرام يوم احد قال رسول الله ﷺ:ياجابر الااخبرک ماقال الله عزوجل لابيک ؟قلت بلیٰ ،قـال :مـاكـلـم اللهاحـدا الامـن وراء حـجاب،وكلم اباک كفاحا،فقال:ياعبدی،تمن علیّ اعطک ،قال: يارب تحيينی فاقتل فيک ثانية قال: انه سبق منی انهم اليها لايرجعون (يسٓ: ۳۱),,قال يارب فـابلغ من ورآئی ،، فانزالله هذه الاية : وَلَا تَـحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتاً ط بَلْ أَحْيَاء عِندَ رَبِّهِـمْ يُـرْزَقُـونَ﴿ ۱٦۹ : ال عـمـران﴾ ابـن مـاجـه :۳/ ۳٦۵ ،رقـم: ۲۸۰۰. و التـرمـذی:رقم: ۳۰۱۰،كتاب التفسير.**

جابرؓ سے روایت ہے کہ جب احد کی لڑائی میں عبداللہ بن عمرو بن حرامؓ (جابرؓ کے باپ) مارے گئے،تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:اے جابرؓ میں تجھ سے بیان کروں؟ جواللہ تعالی نے فرمایا تیرے باپ سے،میں نے عرض کیا بیان کیجئے،آپ ﷺ نے فرمایا:اللہ تعالی نے کسی سے بات نہیں کی مگر پردے کے پیچھے،اور تیرے باپ سے سامنے ہو کر بات کی،اور فرمایا:اے میرے بندے مجھ سے کچھ خواہش کر،تو میں تجھ کو دوں،تیرے باپ نے کہا:اے میرے مالک،مجھ کو پھر جلا دے،تاکہ میں تیری راہ میں دوبارہ مارا جاؤں،اللہ تعالی نے فرمایا:یہ میرا قول ہو چکا ہے،کہ وہ دنیا میں دوبارہ نہیں جاویں گے،تب تیرے باپ نے کہا:اچھا اے میرے مالک جو لوگ دنیا میں رہ گئے ہیں،ان کو میرا حال پہنچا دے،اس وقت اللہ تعالی نے یہ آیت اتاری:

ایک روایت ابوسعید خدریؓ سے منقول ہے کہ:**قال النبی ﷺان ارواح الشهداء فی طير خضر ترعی فـی ريـاض الـجـنة، ثم يكون مأواهاقناديل معلقة بالعرش، فيقول الرب لهم هل تعلمون كرامة اكرم مـن كرامة اكرمتكموها ،فيـقـولـون لا،الاان وددنـاانک اعدت أرواحنافی اجسادناحتی نقاتل مرة اخــری فــنــقـتــل فــی سبيــلک ۔**کتاب الجہاد ابن ابی عاصم:۲:۵۱۸،کتاب الزہد للھناد:۱/۱۲۱،ابن ابی حاتم: ۱/۲۶۳۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کی صورت میں جنت کے باغوں میں چرتی ہیں،

اور پھر عرش سے معلق قندیلوں میں آرام کرتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کیا جو اعزاز و اکرام میں نے تمہیں عطا کیا ہے اس سے بہتر تمہارے علم میں ہے؟ تو وہ کہتے ہیں نہیں، البتہ ہماری آرزو ہے کہ تو ہماری روحوں کو ہمارے جسدوں میں لوٹا دے، یہاں تک کہ ہم جہاد کریں اور ایک بار پھر تیری راہ میں جام شہادت نوش کریں۔

اس کے علاوہ صحابہ کرام اور سلف صالحین سے اور روایات بھی مروی ہیں۔ جن کا حاصل یہ ہے کہ ان کی روحوں کو طیوری قالبوں میں داخل کر کے علیین میں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اب ہم بطور نمونہ بعض مفسرین کے اقوال پیش کرتے ہیں، امام رازی تفسیر کبیر: ۱۴۸/۴، میں لکھتا ہے کہ: **هذه الارواح بعد المفارقة تتألم وتلتذالی ان یردهاالله تعالی الی الابدان یوم القیامة، فهناک یحصل الالتذاذ و التألم للابدان، فهذاقول قال به عالم من الناس، قالواوهب، ان لم یقم برهان قاهرعلی القول به ،ولکن لم یقم دلیل علی فساده ،فانه ممایؤید الشرع وینصرظاهر القرآن ،ویزیل الشکوک و الشبهات عماوردفی کتاب اللهمن ثواب القبروعذابه فوجب المصیرالیه** ۔یعنی بدن سے جدا ہونے کے بعد یہ روحیں لذتیں والم محسوس کرتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن ان کے بدنوں میں لوٹا دے تو وہاں لذت والم ان عنصری بدنوں کو بھی حاصل ہوگا۔ یہ قول ہے جس کا ایک عالم قائل ہے۔ انکا کہنا ہے فرض کرو کہ اس قول پر کوئی برہان قاہر قائم نہیں ،لیکن اس کے فساد پر بھی کوئی دلیل موجود نہیں۔ کیونکہ یہ قول شریعت کی تائید کرتا ہے اور ظاہری قران کی حمایت کرتا ہے، اور کتاب اللہ وارد قبر کے ثواب وعقاب کے بارے میں جو شکوک وشبہات رونما ہوتے ہیں ان کو دور کر دیتا ہے، اس لئے اس کی طرف رجوع واجب ہے۔

اور امام محمد بن احمد القرطبی تفسیر قرطبی میں لکھتا ہے: **وقال اخرون ان ارواحهم فی اجواف طیر،وانهم یرزقون فی الجنةیأکلو ن ویتنعمون ، وهذا هو الصحیح من الاقوال، لان ماصح به النقل فهو الواقع وحدیث ابن عباسؓ نص یرفع الخلاف، وکذلک حدیث ابن مسعوداخرجه مسلم**۔ دوسروں نے کہا ہے کہ (حیات شہداء کا مطلب یہ ہے کہ) ان کی روحیں پرندوں کے قالبوں میں ہیں ،اوران کو جنت میں رزق ملتا ہے وہ کھاتے اور عیش کرتے ہیں ،تمام اقوال میں یہی قول صحیح ہے۔ کیونکہ جو بات نقل صحیح سے ثابت ہو۔ نفس الامر میں وہی درست ہے۔ اور ابن عباسؓ کی حدیث تو اس پر نص ہے جو اختلاف کو اٹھا دیتی ہے۔ اسی طرح ابن مسعودؓ کی حدیث جس کی امام مسلم نے تخریج کی ہے۔

علامہ سید محمود الالوسیؒ اس جسد عنصری کی حیات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **واما القول بحيات هذا الجسدا لرميم مع هدم بنيته وتفرق اجزائه وذهاب هيئته وان لم يكن ذٰلک بعيداعن قدرة من يبدأ الخلق ثم يعيده ،لکن ليس اليه کثير حاجة ولافيه مزيدفضل ولاعظيم منة، بل ليس فيه سوى ايقاع ضعفة المؤمنين بالشکوک والاوهام وتکليفهم من غير حاجة بالايمان بمايعدون قائله من سفهة الاحلام** ۔یعنی باقی رہا اس بوسیدہ جسم کی حیات کا قول، باوجودیکہ اس کی بنیاد گر چکی ہو، اس کے اجزاء متفرق ہو چکے ہوں اور صورت مٹ چکی ہو۔ اگرچہ یہ اس کی قدرت سے بعید نہیں جس نے خلق کو از سر نو پیدا کیا اور دوبارہ بھی پیدا کرے گا۔ لیکن اسکی نہ کوئی ضرورت ہے نہ اس میں کوئی زیادہ فضیلت ہے اور نہ اس میں کوئی بڑا انعام ہے بلکہ اس میں ضعیف الایمان لوگوں کو شکوک وشبہات ڈالنے کے سوا اوران کو بلاضرورت ایک ایسی بات پر ایمان لانے کی تکلیف دینے کے سوا کوئی فائدہ نہیں جس کے قائل کو وہ کم عقل لوگوں میں شمار کریں۔

اس کے علاوہ دیگر مفسرین کے اقوال بہت زیادہ ہیں، لیکن ہم یہاں مولانا اشرف علی تھانویؒ (بیان القران:۱/۸۷،۸۸) کی عبارت نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں کہ: ایسے مقتول کو شہید کہتے ہیں، اوراس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دوسرے مردوں کی سی موت سمجھنے کی ممانعت کی گئی ہے ، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے، اوراسی سے جزاء وسزا کا ادراک ہوتا ہے۔ لیکن شہید کو اس حیات میں اور مردوں سے ایک گونہ امتیاز ہے، اور وہ امتیاز یہ ہے کہ اس کی یہ حیات آثار میں اوروں سے قوی ہے، جس طرح انملہ یعنی سر انگشت، میں ذکاء حس کہ آثار حیات سے ہے بہ نسبت عقب یعنی پاشنہ کے طبعا وحسا قوی ہے، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلاف معمولی مردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے، کہ اس کا جسد باوجود مجموعہ گوشت وپوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثل جسد زندہ کے صحیح سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس امتیاز کی وجہ سے شہدا کو ’’احیاء‘‘ کہا گیا، اوران کو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی ممانعت کی گئی۔ اور یہ حیات ہے جس میں انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ قوت اور امتیاز رکھتے ہیں، حتیٰ کہ بعد موت ظاہری کے سلامت جسد کے ساتھ ایک اثر اس حیات کا اس عالم کے احکام میں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مثل ازواج احیاء کے ان کی ازواج سے کسی کو نکاح جائز نہیں ہوتا۔ اوران کا مال میراث میں تقسیم نہیں ہوتا۔ پس اس حیات میں سب سے قوی تر انبیاء علیہم السلام، پھر شہداء، پھر اور معمولی مردے، البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء اور صالحین بھی

اس فضیلت میں شہدا کے شریک ہیں۔

اور سیوطیؒ نے شرح الصدور:۳۲۱، میں "فی اجواف طیر" کا یہ معنی کیا ہے کہ :وقال القابسی:انکر العلماء روایة (فی حواصل طیر خضر)لانها حینئذتکون محصورة ومضیقاعلیها،وردّبان الروایة ثابتةو التاویل محتمل بان یجعل "فی"بمعنی"علی"والمعنی ارواحهم علی جوف طیر خضر کقوله تعالی : وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوعِ النَّخْلِ طه: ۷۱.ای علی جذوع النخل.وجائزان یسمی الطیر جوفا،اذهو محیط به ومشتمل علیه.قاله عبد الحق.

وقال غیره لامانع من ان تکون فی الاجواف حقیقة،ویوسعهاالله لها،حتی تکون اوسع من الفضاء. الخ.

وقال القرطبی(التذکره: ۱۷۹) فی حدیث کعب:نسمة المؤمن طائر،وهویدل علی ان نفسهاتکون طائرا،ای علی صورته،لانهاتکون فیه ویکون الطائر ظرفالها.وکذافی روایة عن ابن مسعودؓ،عندابن ماجة:ارواح الشهداء عندالله کطیر خضر،وفی لفظ عن ابن عباسؓ:تجول فی طیر خضر،وفی لفظ ابن عمرو:فی صورطیر بیض.وفی لفظ عن کعب:ارواح الشهداء طیر خضر.وقال وهذاکله اصح من روایة"فی جوف طیر خضر".

ایک اعتراض اور اس کا جواب

سیوطی نے شرح الصدور:۳۲۲،اور ابن رجب نے اھوال القبور:۱۲۳، میں لکھا ہیں:فان قیل الاموات کلهم کذالک، فکیف خصص هٰؤلاء ؟فالجواب ان الکل لیس کذالک لان الموت عبارة عن ان تنزع الروح عن الاجساد لقوله تعالی" اللهیتوفی الانفس حین موتها" ای یأخذهاوافیة من الاجساد، و المجاهدتنقل روحه الی طایر خضر،فقدانتقل من الجسد الی آخر،بخلاف غیره، فان ارواحهم تنفی من الاجساد.

اگر کوئی کہے کہ تمام مردوں کا حال یہی ہے (کہ ان کی روحیں زندہ ہوتی ہیں) تو پھر شہداء کی کیا خصوصیت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے، کہ تمام مردے شہیدوں کی مانند نہیں ہیں، کیونکہ موت کے معنی ہیں روح کو جسد سے نکال لینے کے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے(الله یتوفی الانفس) الا یة۔یعنی وہ روحوں کو جسدوں سے بالکلیہ نکال لیتا ہے،اور شہید کی روح سبز پرندے کے قالب میں منتقل کردی جاتی ہے،اب شہید کی روح تو ایک جسد سے دوسرے جسد میں منتقل ہوگئی،لیکن

دوسرے مردوں کی روحوں کو اجساد سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔اور بیضاوی نے تفسیر:۱/۸۲، میں بھی اس طرح لکھا ہے۔
مذکورہ تفصیل سے آیت میں جو اشکال تھا حل ہوا، کہ شہداء تو قتل ہو چکے ہیں، ہم نے انہیں اپنے ہاتھوں سے قبروں میں دفن کیا ہے، ان کے تر کے تقسیم ہو چکے ہیں، اور انکی بیویاں بیوہ ہو چکی ہیں، تو پھر وہ زندہ کس طرح ہیں؟
چونکہ انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں ، اس وجہ سے بعض نے ان آیات سے حیات الانبیاء کے متعلق استدلال کیا ہے، بطریق دلالت النص (یعنی کوئی چیز نص سے بطریق اولی ثابت ہو) تو جب شہداء کی حیات اس آیت سے بطریق عبارت النص ثابت ہوئی، تو انبیاء علیہم السلام شہداء سے افضل واعلی ہیں تو اس لئے اس آیت سے بطریق دلالت النص ان کے لئے بھی حیات ثابت ہوئی۔
توتکمیل فائدہ کے لئے اس مسئلہ کو بھی تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں: حیات الانبیاء کا مقصد یہ ہے کہ وہ برزخ میں زندہ ہیں، جیسا کہ سیوطی نے شرح الصدور:۳۲۵، اور روح المعانی نے:۱۵/۱۶۱، میں لکھا ہے: **اما الانبياء عليهم السلام فلاشک ان ارواحهم عندالله فی اعلی عليين، وقدثبت فی الصحيح ان اخر كلمة تكلم بها رسول الله ﷺ عندموته، اللهم الرفيق الاعلى (صحيح البخاری رقم:۴۴۳۷)**. بہرحال انبیاء علیہم السلام کی روحیں تو بلاشک وتردد اللہ کے جوار رحمت میں اعلی علیین میں مقیم ہیں، چنانچہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وفات کے وقت اخری بات جو زبان مبارکہ سے ارشاد فرمائی، وہ یہ تھی کہ اے اللہ! مجھے رفیق اعلی میں لے جا۔(تفسیر مظہری:۱۰/۲۲۴، اور روح المعانی:۱۵/۱۶۲، میں بھی ایسی عبارت موجود ہے)۔
تفسیر جواہر القران نے یہاں خوب تفصیل کی ہے، تکمیل فائدہ کے لئے اس عبارت کو پیش کرتے ہیں: اس دنیا آب وگل سے رحلت وانتقال کی کیفیت اللہ تعالی نے تمام بنی آدم کے لئے ایک ہی مقرر فرمائی ہے، اور وہ ہے موت، اور اس سے کسی فرد بشر کو مفر نہیں جیسا کہ ارشاد ہے: **كل نفس ذائقة الموت**.(الانبیاء:۳۵) یعنی ہر جی موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے، خوا پیغمبر ہو یا غیر پیغمبر، عیسی علیہ السلام کے سوی اللہ کے تمام پیغمبر ساغر موت نوش فرما چکے ہیں۔(ادریس ،الیاس اور خضر علیہم السلام کے بارے میں محقق اور صحیح مذہب یہی ہے کہ وہ فوت ہو چکے ہیں) چنانچہ یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ارشاد الہی ہے ﴿**ام كنتم شهداء اذحضر يعقوب الموت**﴾ ۱۳۳، بقرہ، کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام پر موت کا وقت آیا، یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ﴿**حتى اذاهلک قلتم لن يبعث الله من بعده رسولا**﴾ .غافر: ۳۴. یہاں تک جب وہ فوت ہو گئے تم کہنے لگے: کہ اب تو اللہ تعالی کوئی رسول نہیں بھیجے

گا،سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:﴿فلـمـاقضيناعليه الموت مادلهم على موته الادابة الارض تـأكـل مـنسأتـه﴾. سبـا: ۱۴۔پس جب ہم نے اس (سلیمان علیہ السلام) پر موت کاحکم جاری کر دیا،توان (جنوں) کواس کی موت کا پتہ کسی نے نہ دیا،مگر گھن کے کیڑے نے جواس کے عصا کو کھا تا تھا،اور خود جناب نبی کریمﷺ کے بارے میں ارشادفرمایا:﴿انک میت وانهم میتون﴾ (الزمر: ۳۰) آپﷺ کوبھی مرناہےاوران کوبھی مرناہے، علاوہ ازیں نبی کریمﷺ کی موت پر تمام صحابہ کرامؓ کا اجماع بھی ہو چکا ہے،جیسا کہ صحیح حدیثوں میں موجود ہے کہ جب نبی کریمﷺ کی وفات ہوئی تو عمرؓ اس صدمہ جانکاہ کی شدت کو برداشت نہ کر سکے اوراز خود رفتہ ہوکراعلان کرنے لگے، خبر دار کوئی یہ مت کہے کہ نبی کریمﷺ فوت ہوگئے ہیں۔ورنہ میں اس کی گردن اڑادوں گا۔

جب ابوبکرالصدیقؓ نے صورت حال دیکھی تو آپ نے تمام صحابہ کرام کے سامنے ایک بلیغ خطبہ ارشادفرمایا،اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:مـن كـان يـعبـدمـحمدافان محمداقدمات ،و من كان يعبدالله فان الله حى لايموت ، وقـال ﴿انک میت وانهم میتون﴾ صحیح بخاری: ۱/۷۵۱، تم میں سے جومحمدﷺ کی عبادت کرتا تھا،وہ سن لے کہ آپؐ تو فوت ہوگئے،اور آپؐ پر موت وارد ہوچکی اور جواللہ کی عبادت کرتا تھا،سواللہ زندہ جاوید ہے،اور یہ آیت بھی پڑھی:ترجمہ: بیشک آپؐ کوبھی مرناہےاوران کوبھی مرنا ہے،ابوبکرالصدیقؓ نے جب خطبہ دیا تو صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے بھی ان کی کسی بات پر انکار نہیں کیا،اور عمرؓ نے بھی تسلیم کرلیا کہ واقعی آپؐ وفات پا چکے ہیں،چنانچہ تمام صحابہ کرام نے یہی سمجھ کر کہ آپؐ وفات پا چکے ہیں،آپؐ کے جسداطہر کو قبر مبارک میں دفن کیا،الغرض موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں،تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام بنی آدم اسی دراوزے سے گزر کر عالم برزخ پہنچے،اور جو باقی ہیں وہ بھی اسی دروازے سے گزریں گے، اور موت کے معنی ہیں،روح کا بدن عنصری سے نکل جانا،اوراس سے جدا ہوجانا۔

امام راغب اصفہانی اس آیت میں موت کامفہوم اس طرح بیان فرماتے ہیں: وقـولــه كـل نـفــس ذائقة الـموت، فـعبارة عن زوال القوة الحيوانية وابانة الروح عن الجسد.(مفردات ۴۹۴). یعنی موت قوت حیات کے زائل ہوجانے اورروح کے بدن سے جدا ہوجانے کا نام ہے،علامہ ابوعبداللہ قرطبی لکھتے ہیں: واجـل الموت هـو الوقت الذى فى معلومه سبحانه وتعالى ان روح الحى تفارق جسده.(قرطبی) اجل موت اس وقت کا نام ہے جس میں اللہ تعالی کے علم کے مطابق جاندار کی روح اس کے بدن سے جدا ہوگی۔

علامہ سیوطی فرماتے ہیں:قـال العلماء الموت ليس بعدم محض ولافناء صرف ،وانماهوانقطاع

تعلق الروح بالبدن، ومفارقة، وحيلولة بينهماوتبدل حال وانتقال من دارالى دار(شرح الصدور: ۳۴،وبشرى الكئيب. على حاشية شرح الصدور ۱۵،۱۶۱)۔یعنی علماء نے کہا ہے کہ موت عدم محض اورفناءصرف کا نام نہیں بلکہ موت بدن سے تعلق روح کے منقطع ہوجانے ،روح اور بدن میں جدائی اور پردہ حائل ہوجانے اورایک دار(دنیا) سے دوسرے دار(عالم برزخ) کی طرف منتقل ہونے سے عبارت ہے ۔اورعلامہ سیدمحمودآلوسی حنفیؒ رقمطراز ہیں: الاماتة بمعنی اخراج الروح وسلب الحياة(روح)یعنی اماتت کے معنی ہیں روح کا نکال لینا اورزندگی کا سلب کرلینا،اورپھرموت کی یہ کیفیت مذکورہ بالامفہوم کے ساتھ سب کے لئے یکساں ہے۔اورتمام بنی آدم، انبیاء،شہداء، اورعامة المسلمین پرموت ،اخراج روح ازبدن اورابانت روح ازجسدہی کے طریقے پروارد ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرطبی نے:۲۷۶/۴، میں یہ حدیث نقل فرمایا ہے کہ :ان جميع الانبياء قبض ارواحهم ملك الموت وهو الذى سيقبض روحى ،یعنی تمام انبیاءعلیہم السلام کی روحیں ملک الموت نے قبض کیں،اوروہی میری روح کوبھی قبض کرے گا۔

اورعائشہؓ بیان فرماتی ہیں:فقبضه وان رأسه لبين سحرى ونحرى ،یعنی جب اللہ تعالی نے آپ ﷺ کی روح قبض فرمائی اس وقت آپ ﷺ کا سرمبارک میرے سینے اورحلق کے درمیان تھا۔اس حدیث کے تحت حافظ ابن حجرفرماتے ہیں:فى رواية همام عن هشام بهذا الاسناد،وعنداحمد:رقم:۲۴۹۰۵،و البيهقى فى دلائل النبوة:۲۱۳/۷،نحوه وزاد،فلماخرجت نفسه لم اجدريحاقط اطيب منها ۔اس روایت کوامام احمدنے بھی اس سند کے ساتھ ہشام سے بواسطہ ہمام روایت کیا ہے،اوراس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔عائشہؓ فرماتی ہیں،جب آپ ﷺ کی روح مبارک بدن سے نکلی توایسی خوشبوآئی کہ میں نے اس سے عمدہ خوشبوکبھی نہیں سونگھی۔

اس مسئلہ میں احادیث بہت زیادہ ہیں،بعض محدثین نے اپنی تصانیف میں اس کے متعلق عنوانات لکھے ہیں، جبکہ بعض نے مستقل رسائل،جیسا کہ امام بیہقی وغیرہ ،لیکن بخوف طوالت ہم بعض وہ روایات نقل کرتے ہیں، جوکہ امام بخاری نے،باب مرض النبى ﷺ ووفاته ،كتاب المغازى: میں نقل کی ہیں:

(۱) حدثنامحمدبن عرعرة حدثناشعبة عن ابى بشرعن سعيدبن جبيرعن ابن عباسؓ قال كان عمربن الخطابؓ يدنى ابن عباسؓ فقال له عبد الرحمٰن بن عوفؓ ان لناابناء مثله فقال انه من حيث تعلم فسأل عمرؓ ابن عباسؓ عن هذه الاية ﴿اذاجاء نصرالله و الفتح﴾فقال اجل رسول الله ﷺ اعلمه

اياه فقال مااعلم منهاالاماتعلم ۔[حدیث نمبر۴۴۳۰]۔

ابن عباسؓ نے کہا کہ عمرؓ مجھ کو اپنے پاس بٹھایا کرتے اس پر عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہنے لگے کہ ان کے برابر تو ہمارے بیٹے ہیں عمرؓ نے کہا تم اس کی وجہ جانتے ہو؟ (کہ میں ابن عباسؓ کی کیوں تعظیم کرتا ہوں؟) پھر انہوں نے مجھ سے اس ایت کو پوچھا اذاجــاء نــصــر الله ،الایة، میں نے کہا: یہ نبی ﷺ کی وفات کا اشارہ ہے اللہ تعالیٰ نے یہ سورت اتار کر اپ ﷺ کو خبر دی کہ اب وفات کا وقت آن پہنچا، عمرؓ نے کہا میں بھی یہی سمجھتا ہوں جو تم سمجھے۔

(۲) **حـدثـنـا يسـرة بن صفوان بن جميل اللخمي حدثناابراهيم بن سعدعن ابيه عن عروة عن عـائشةؓ قـالـت دعـا الـنبي ﷺ فـاطـمة في شكـواه الـذي قبض فيـه فسـارهـابشيء فبكت ثم دعـاهـافسـارهـابشي فضحكت فسألناعن ذٰلک فقالت سارني النبي ﷺ انه يقبض في وجعه الذي توفي فيه فبكيت ثم سارني فاخبرني اني اول اهله يتبعه فضحكت** ۔۴۴۳۳۔

عائشہؓ نے فرمایا کہ نبی ﷺ نے اس بیماری میں جس میں آپ کے وفات ہوئی فاطمہؓ کو بلایا ان کے کان میں بات کی وہ رونے لگیں، پھر بلایا اور کان میں بات کی، تو وہ ہنس دیں ہم فاطمہؓ سے (جب آپ ﷺ کی وفات ہوگئی) اس کی وجہ پوچھی انہوں نے کہا: پہلے تو نبی کریم ﷺ نے میرے کان میں یہ فرمایا تھا کہ میں اس بیماری سے بچنے والا نہیں یہ سنکر میں رو پڑی، پھر کان میں مجھ سے فرمایا کہ میں آپ کے عزیزوں میں سب سے پہلے آپ سے ملوں گی تو میں ہنسنے لگی۔

(۳) **عـن عـائشة قـالـت لـمـامـرض الـنبي ﷺ مـرض الـذي مـات فيه جعل يقول (في الرفيق الاعلى)** ۔۴۴۳۵۔

عائشہؓ نے فرمایا: جب نبی کریم ﷺ موت کی بیماری میں مبتلا ہوئے تو فرماتے تھے یا اللہ بلند رفیقوں میں رکھ (یعنی پیغمبروں میں)۔

(۴) **عـن عبـادبـن عبـدالله بـن زبيـران عائشة اخبرته انها سمعت النبي ﷺ واصغت اليه قبل ان يموت وهومسندالىّ ظهره يقول:اللهم اغفرلي وارحمني والحقني بالرفيق** ۔۴۴۴۰۔

عائشہؓ نے کہا: کہ وفات سے پہلے میں نے کان لگا کر نبی ﷺ کی بات سنی، آپ ﷺ اپنی پیٹھ کا ٹیک مجھ پر لگائے ہوئے تھے اور یہ فرما رہے تھے یا اللہ مجھ کو بخش دے مجھ پر رحم کر۔ مجھ کو بلند رفیقوں سے ملا دے۔

(۵) **عـن عـائشةؓ قـالـت مـات الـنبي ﷺ وانـه لبيـن حـاقـنتـي وذاقـنتي فلااكره شدة الموت**

لاحدابدابعد النبیﷺ .۴۴۴۶۔

عائشہؓ نے فرمایا: نبی کریمﷺ نے میری دگدگی اورٹھوڑی کے بیچ میں انتقال فرمایاجب سے میں نے نبیﷺ پرموت کی سختی دیکھی اس کے بعد سے میں موت کی سختی کسی کے لئے برانہیں سمجھتی۔

(٦) عـن عـائشـةؓ ان رسـول اللهﷺ كـان يسـأل فـی مـرضه الذی مات فيه يقول: اين اناغدااين انـاغـدا؟يـريـديـوم عـائشـةؓ فـاذن لـه ازواجـه يـكـون حيـث شـاء فـكان فی بيت عائشة حتی مات عـنـدهـا .قـالـت عـائشـةؓ فـمـات فی اليوم الذی كان يدورعلی فيه فی بيتی فقبضه الله وان رأسه لبين نـحـری وسـحـری وخـالط ريقه ريقی ثم قالت دخل عبدالرحمٰن بن ابی بكرومعه سواک يستن به فـنـظـر اليـه رسول اللهﷺ فقلت له اعطنی هذا السواک ياعبدالرحمٰن فاعطانيه فقضمته ثم مضغته فاعطيته رسول اللهﷺفاستن به وهو مستندالی صدری. ۴۴۵۰۔

عروہ نے کہامجھ کومیرے والدنے خبردی انہوں نے عائشہؓ سے انہوں نے کہانبیﷺ نے جس بیماری میں انتقال فرمایااس میں یوں پوچھتے تھےکل میں کہاں ہونگا؟ کل میں کہاں ہوں گا؟ اپﷺ کا مطلب یہ تھا کہ عائشہؓ کی باری کب آئے گی؟ یہ حال دیکھ کرآپﷺ کی بیبیوں نے آپ کواجازت دی۔ جہاں چاہے وہاں رہیں۔آپؐ کی وفات تک عائشہؓ ہی کے پاس رہے عائشہؓ کہتی ہے کہ آپﷺ کی وفات جس دن ہوئی وہ دن میری باری کا تھا۔اللہ نے اس وقت آپؐ کی روح قبض کی جب آپﷺ کا سرمیری دگدگی اورسینہ کے درمیان تھا ،اوراللہ تعالی نے آپؐ کااورمیراتھوک ملادیا۔ہوایہ کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ ایک مسواک لئے ہوئے آئے جس کووہ اپنے دانتوں پررگڑاکرتے تھے۔نبیﷺ نے اس مسواک کودیکھامیں نے کہاعبدالرحمٰن یہ مسواک مجھ کودے انہوں نے دیدی میں نے اس کوتراش کردانتوں سے چبایا۔پھروہ مسواک نبیﷺ کودی آپﷺ نے میرے سینے پرٹیکالگائے ہوئے دانتوں پرپھیری۔

(٧) عـن عـائشةؓ قـالـت توفی النبیﷺ فی بيتی وفی يومی وبين سحری ونحری وكانت احدا نـاتـعـوذه بـدعـاء اذامـرض فـذهبـت اعوذه فرفع رأسه الی السماء وقال فی الرفيق الاعلی.ومرعبد الـرحـمٰـن بـن ابـی بـكـرؓ وفـی يـده جـريـدة رطبة فنظر اليه النبیﷺفظننت ان له بهاحاجة فاخذتها فـمـضـغـت رأسهـاونـفـضـتهـافدفعتهااليه فاستن بهاكاحسن ماكان مستناثم ناولنيهافسقطت يده اوسقطت من يـــده فجمع الله بين ريقی وريقه فی اخريوم من الدنياواول يوم من الاخرة. ۴۴۵۱۔

عائشہؓ نے کہا: نبی ﷺ نے میرے گھر میں میری باری کے دن میرے سینے اور دگدگی کے بیچ میں وفات پائی۔ اور ہم لوگوں کا قاعدہ تھا جب آپ ﷺ بیمار ہوتے تو دعا پڑھ کر آپ ﷺ کے واسطے پناہ مانگتے۔ میں نے آپ ﷺ کے لئے پناہ مانگنا شروع کی، (معوذتین سورتین پڑھ کر) آپ ﷺ نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا فرمایا (یا اللہ) بلند رفیقوں میں رکھ، بلند رفیقوں میں رکھ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ ادھر آ نکلے انکے ہاتھ میں تازہ ٹہنی تھی آپ ﷺ نے اُدھر نگاہ ڈالی، میں سمجھ گئی کہ مسواک کرنا چاہتے ہیں میں نے اس کو لے لیا اور چبا کر جھاڑ کر آپ ﷺ کو دی آپؐ بہت اچھی طرح سے اس کو دانتوں پر پھیرا، پھر وہ مسواک مجھ کو دیتے وقت آپ ﷺ کا ہاتھ گر گیا، یا مسواک آپ ﷺ کے ہاتھ سے گر پڑی اللہ تعالی نے دنیا کے اخری دن اور آخرت کے پہلے دن میں میرا اور آپؐ کا تھوک ملا دیا۔

(۸) عن ابی سلمة ان عائشة اخبرته ان ابابکرؓ اقبل علی فرس من مسکنه بالسنح حتی نزل فدخل المسجدفلم یکلم الناس حتی دخل علی عائشةؓ فتیمم رسول اللهﷺوهو مغشیً بثوب حبرة فکشف عن وجهه ثم اکب علیه فقبّله وبکی ثم قال بابی انت وامی والله لایجمع الله علیک موتتین اما الموتة التی کتبت علیک فقدمتها. یہ حدیث تفصیل کے ساتھ سورت ال عمران:۱۴۴ کے ذیل میں آئے گا۔۴۴۵۲۔

ابن شہاب نے کہا مجھ کو ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے خبر دی ان کو عائشہؓ نے (جب آپ ﷺ کی وفات ہوگئی) ابوبکرؓ ایک گھوڑے پر سوار اپنے گھر جو سنح میں تھا آئے، گھوڑے سے اتر کر مسجد میں آئے، کسی سے بات نہیں کی، میرے حجرے میں آئے، نبی ﷺ کی نعش کی طرف گئے آپ ﷺ کو ایک یمن کے کپڑے سے ڈھانپ دیا تھا انہوں نے کپڑا اٹھایا۔ پھر آپ ﷺ کے اوپر اوندھے گر کر روئے، بوسہ دیا، کہنے لگے، میرے ماں باپ آپؐ پر صدقے اللہ تعالیٰ دوبار آپؐ کو نہیں مارے گا، بس ایک موت جو اللہ تعالی نے آپؐ کے لئے لکھ دی تھی وہ ہو چکی۔

(۹) عن عائشةؓ وابن عباسؓ ان ابابکرؓ قبلّ النبیﷺ بعدموته .۴۴۵۵.

عائشہؓ اور عبداللہ بن عباسؓ دونوں فرماتے ہیں کہ ابوبکر الصدیقؓ نے نبی کی وفات کے بعد آپ ﷺ کو بوسہ دیا.

(۱۰) عن انس قال لماثقل النبیﷺجعل یتغشاه فقالت فاطمةؓ واکرب اباه فقال لهالیس علی ابیک کرب بعد الیوم فلمامات قالت یاابتاه اجاب ربادعاه یاابتاه من جنة الفردوس مأواه یاابتاه الی جبرئیل ننعاه فلما دفن قالت فاطمةؓ یاانسؓ اطابت انفسکم ان تحثواعلی رسول اللهﷺ

التراب. ۴۴۶۲. [تلک عشرة کاملة]

جب نبیﷺ کی بیماری سخت ہوگئی تو آپﷺ پر غشی طاری ہونے لگی، فاطمہؓ آپﷺ کی صاحب زادی نے یہ حال دیکھ کر فرمایا، ہائے میرے باپ پر کیسی سختی ہورہی ہے آپؐ نے فرمایا بس آج ہی کا دن ہے، اس کے بعد تیرے باپ پر کوئی سختی نہ ہوگی۔ جب آپؐ کی وفات ہوگئی تو فاطمہؓ یوں کہہ کر (رونے لگیں) ہائے بابا آپؐ نے اپنے رب کا بلاوا منظور کیا، ہائے بابا آپ نے جنۃ الفردوس میں ٹھکانہ بنایا، ہائے بابا میں جبریل کو آپؐ کی موت کی خبر سناتی ہوں، جب آپؐ دفنائے جاچکے تو فاطمہؓ نے انسؓ سے کہا، تم لوگوں نے یہ کیسے گوارا کیا کہ اللہ کے رسولﷺ پر مٹی ڈالو۔

اس مسئلہ میں مذکورہ احادیث کے علاوہ باقی روایات کے حوالہ جات مع راوی (یعنی صحابی) ذکر کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

[۱] انسؓ ،بخاری: کتاب الوفاة: نسائی: ۳۸۷/٦. [۲] ابی بن کعبؓ، ابن ماجه: ۱٦۳۳. [۳] ابو الدرداءؓ ،ابن ماجه: ۱٦۳۷. [۴] ابوسعیدخدریؓ: بخاری: با ب هجــــرة النبیﷺ واصحـابـه: ۵۵۲/۱. دارمی: ۳۷. [۵] ابوجحیفهؓ ،بخاری. باب صفة النبیﷺ: ۵۰۱/۱. [٦] ابوبردهؓ، بخاری باب ماذکر من درع النبیﷺ: ۴۳۸/۱. [۷] ابوذرغفاریؓ ،باب السؤال باسماء الله تعالی: ۱۱۰۰/۲. [۸] انس بن مالکؓ ،دارمی: ۱۴۱/۱ و الترمذی: ۲٦۱۸ مسلم: ۲۴۵۴. [۹] ابوهریرهؓ ،بخاری: ۷۴۸/۲ باب کان جبرئیل یعرض القران. [۱۰] ابوبکرؓ: طبقات الکبری لابن سعد: [۱۱] اُسیدبن حضیر ،بخاری: باب قول النبیﷺ للأنصار، اصبروا: ۵۳۵/۱. [۱۲] ابن عباسؓ ،ابن ماجه: ۱۴۵۷ نسائی: ۳۷۹/٦. [۱۳] علی ابن الحسینؓ عن رجل، مشکــواة رقم: ۵۹۱۸. [۱۴] عمرؓ ،طبقات ابن سعد: ۴۰۷/۲، [۱۵] جویریهؓ: طبقات ابن سعد: ۴۰۷/۲. [۱٦] عمروبن الحارثؓ ،بخاری: کتاب الوصایا، حدیث ۲۷۳۹ ص ۳۸۲/۱. [۱۷] حذیفهؓ ،بخاری باب السؤال باسماء الله تعالی: ۱۱۰۰/۲. [۱۸] جبیربن مطعمؓ، بخاری: ۵۱٦/۱. [۱۹] جندبؓ، طبقات کبری ابن سعد: ۳٦۹/۲. [۲۰] عبیدالله بن عدی بن خیارؓ ،بخاری ،باب قتل حمزهؓ: ۵۸۳/۱. [۲۱] سهل بن سعدؓ ،بخاری ،باب ماکان النبیﷺ واصحابه یأکلون: ۸۱۴:۲. [۲۲] طلحة بن عبیداللهؓ ،تفسیرابن عباسؓ تحت آیت ۵۳: سورت

احزاب.[۲۳]ام سلمہؓ،نسائی: ۳۸۸/۴ و ابن ماجه۱۶۲۵ .[۲۴]حفصہؓ ، مؤطاء امام مالکؒ:۴۸.
مسندابی عوانہ: ۲۱۹/۲ .[۲۵]ام أیمنؓ،سنن دارمی: ۴۰.[۲۶]ام الفضل بنت الحارثؓ
،بخاری: ۶۳۷/۲باب مرض النبیﷺ.[۲۷]ابن عمرؓ،ابن ماجه: ۱۶۳۲ ، بخاری:
۳۰۵.۱۸۷.۵ .[۲۸]ابوایوب [۲۹]زیدبن ثابتؓ: ترمذی: ۴۱.[۳۰]علیؓ،طبقات الکبری ابن
سعد: ۳۸۵/۲.ابن ماجه:۱۴۶۷ .[۳۱]محمدبن قیسؓ:طبقات ابن سعد [۳۲]صنابحی عن رکبؓ،
بخاری: ۲۴۲/۱ .[۳۳]قیس بن جریرعن رکبؓ، [۳۴]جابربن عبداللهؓ ،بخاری باب اذاوهب هبة
: ۳۵۴/۱.[۳۵]عبدالله بن عمروبن العاصؓ،بخاری: ۲۸۵/۱ .باب کراهیة الصخب فی
السوق.[۳۶]مالک بن اوس بن الحدثانؓ، باب فرض الخمس بخاری:۴۳۵.
[۳۶]عثمانؓ،طبقات کبری ابن سعد: ۴۰۵/۲،ومشکواة المصابیح باب عذاب القبر. [۳۷]
عبدالله بن مسعودؓ،مسندابی عوانه: ۲۴۹/۲ .بخاری:۹۲۶، باب الاخذبالیدین. طبقات کبری ابن
سعد: ۳۷۷/۲.[۳۸]معاویهؓ،سنن کبری [۳۹]مغیرة بن شعبةؓ،طبقات الکبری: ۴۰۰/۲. [۴۰]
ابوعبیدة بن الجراحؓ، [۴۱]ابوسفیان ابن الحارثؓ مواهب اللدنیه: ۳۷۶/۴.[۴۲]سالم بن عبیدؓ،
نسائی: ۳۹۵/۶ ،وابن ماجه:۱۲۳۴ ،بیهقی دلائل النبوة:۲۱۱/۷ .[۴۳]عباس ابن عبد المطلب
،طبقات الکبریٰ ابن سعد: ۳۸۵/۲.دارمی:۳۷.[۴۴]عبیدبن عمیرؓ ،طبقات ابن سعد: ۳۷۷/۲.
[۴۵]کعب بن مالکؓ:طبقات ابن [۴۶]مخرمه بن نوفلؓ: مستدرک: ۵۲۳/۳.[۴۷]ابوذویب
الهذلیؓ ، مواهب [۴۸]أسماء بنت عمیسؓ ،طبقات کبری ابن سعد: ۳۸۵/۲.[۴۹]ابو الحویرثؓ:
طبقات ابن سعد: ۳۷۸/۲.[۵۰]ابوعسیمؓ،:طبقات کبری ابن سعد: [۵۱]سعدبن ابی
وقاصؓ:طبقات کبری ابن سعد: [۵۲] ابومویهبہؓ،دارمی:۳۸، باب وفات النبیﷺ،حاکم
:۵۵/۳،مسند احمد :۴۸۹/۳.[۵۳]سلمان فارسیؓ ،کنز العمال:۴۷۶/۷.و الجامع الکبیر:
۱۶۷/۹ . [۵۴]ابومرحب سوید بن قیسؓ:دلائل النبوة :۲۵۵/۷ .[۵۵]ابولیلیٰ اوس بن اوس
الخولیؓ:مسند احمد : ۲۶۰/۱ .[۵۷]دغفل بن حنظلةؓ:دلائل النبوة :۲۴۰/۷،مسند ابی یعلیٰ
رقم :۱۵۷۵ ،شمائل ترمذی : ۳۶۶.[۵۸]فضل بن عباسؓ:ابن حبان :رقم : ۳۵۳۰.[۵۹] قثم بن

عباسؓ،:ابن ماجة :رقم :۱۲۲۸ .

اس مسئلہ کے متعلق ابن قیمؒ قصیدہ نونیہ:ص۱۳۰، میں بیان فرماتا ہے:

لو کان حیا فی الضریح حیاته	قبل الممات بغیر ما فرقان
ما کان تحت الارض بل من فوقها	والله هذی سنة الرحمٰن
اتراه تحت الارض حیا ثم لا	یفتیهم بشرائع الایمان
ویریح امته من الآراء	و الخلف العظیم وسائر البهتان
ام کان حیا عاجزا عن نطقه	وعن الجواب لسائل لهفان
وعن الحراک فماالحیات فما الحیات اللات	قد اثبتموا ها اوضحوا ابیان

یعنی اگر نبی کریم ﷺ قبر میں اسی طرح زندہ ہوتے جس طرح دنیا میں زندہ تھے وفات سے پہلے، تو قبر کے بجائے زمین کے اوپر زندہ رہتے ، کیونکہ اللہ رحمٰن کا طریقہ یہی ہے، ذرا اتنا تو سوچ اور خیال کر کہ اگر آپؐ قبر میں زندہ موجود ہیں تو پھر مسائل ایمان کے فتوے کیوں نہیں دے رہے؟ امت آئے دن فتنوں اور اختلافات کا شکار ہے۔ مگر آپؐ خاموش ہیں۔ کیا آپؐ کو العیاذ باللہ خاکم بدہن بولنے اور جواب دینے کی توفیق نہیں۔ اگر حس و حرکت نہیں پھر زندگی کے کیا معنے۔ سوچ سمجھ کر جواب دے۔ (فرمایا):

ولقداتوا یوما الی العباس ☆ یستسقون من قحط وجدب زمان

هذا وبینهم وبین نبیهم ☆ عرض الجدار وحجرة النسوان

فنبیهم حی ویستسقون ☆ غیر نبیّهم حاشا اولی الایمان

یعنی قحط وخشک سالی سے مجبور صحابہ عباسؓ کے پاس استسقاء کے لئے آئے حالانکہ تمہارے عقیدہ کے مطابق آپ ﷺ قبر میں بذات خود بنفس نفیس زندہ موجود تھے، اور فرق اور فاصلہ بھی صرف حجرات کی دیوار ہی کا ہے۔ اس سے بڑھ کر حیرت انگیز امر کیا ہوسکتا ہے کہ زندہ ہستی (نبی پاک) کو چھوڑ کر ایک امتی سے استسقاء کی دعاء کرائی جارہی ہے۔ یہ عقیدہ چونکہ انتہائی مضحکہ خیز ہے، اس لئے ابن قیم، ابن معطلہ کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

و الترب تحتهم وفوق رؤسهم	وعن الشمال ثم عن ایمان
مثل الذی قدقلتموه معاذنا	باللهمن افک ومن بهتان

بل عندربهم تعالی مثل ما قدقال فی الشهداء فی القرآن

یعنی جن کے نیچے بھی مٹی ہواوران کے سروں پر بھی، اوردائیں بائیں بھی، غرض مٹی میں محصوراور گیرے ہوئے بھی کوئی زندگی ہے، تمہارے اس افک اور بہتان سے اللہ کی پناہ، حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ عنداللہ ویسے ہی زندہ ہیں جیسا کہ اللہ تعالی نے شہداء کی زندگی کا قرآن پاک میں اعلان فرمایا ہے۔ چونکہ یہ عقیدہ معطلہ اورابن فورک کا عقل اور نقل کے سراسر خلاف ہے اس لئے حافظ ابن قیمؒ کو جوش آتا ہے اورانتہائی غصے سے فرماتے ہیں:

یاقومنااستحیوامن العقلاء و المبعوث بالقرآن و الرحمٰن

واللہ لاقدر الرسول عرفتم کلاولا للنفس والانسان

من کان ھذا القدرمبلغ علمه فلیستربالصمت و الکتمان

ولقدابان اللہ ان رسوله میت کماقدجاء فی القرآن

یعنی اے قوم! تمہیں اللہ تعالی، قرآن بلکہ خود رسول اللہ ﷺ اوراہل عقل ودانشمندوں سے شرم آنی چاہئے۔ کیونکہ نہ ہی تو تم نے اللہ تعالی اوراس کے رسول کے قدرومرتبہ کو پہچانا، اورنہ ہی تم نے انسانیت کی قدروعظمت اورنفس یاروح کی شان وکمال کو سمجھا۔ جوکوئی اس درجہ عقل وفہم سے محروم ہے تواسے بالکل خاموش رہتے ہوئے وقت گذارنا چاہئے، اللہ تعالی نے قرآن مجید میں بالکل واضح الفاظ میں (انک میت) کا اعلان فرما کر نبی ﷺ کی وفات ظاہر فرمادی، مگر تم ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں رٹ لگارہے ہو۔ کہ آپ ﷺ زمین کے نیچے زندہ ہیں۔ اورابن کثیر البدایہ والنہایۃ: ۲۶۶/۵، (م: ۱۳۴۸) میں لکھتا ہے: **واختلف المتأخرون من اصحاب الشافعیؒ فی مشروعیة الصلوة علی قبرعلیه السلام لغیر الصحابة رضی اللہ عنھم ،فقیل نعم: لان جسده علیه السلام طری فی قبره لان اللہ تعالی قدحرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء ،کماوردبذلک الحدیث فی السنن وغیرھافھوکالمیت الیوم وقال الاخرون لایفعل لان السلف ممن بعد الصحابةؓ لم یفعلوه ولوکان مشروعالبادروا الیه ولثابرواعلیه، واللہ اعلم۔**

یعنی امام شافعیؒ کے متاخرین اتباع نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قبرمبارک پرنماز جنازہ اب صحیح ہے یانہیں؟ تو بعض کا کہنا ہے کہ صحیح ہے، اس وجہ سے کہ تازہ موجود ہے جس طرح تدفین کے وقت تھا، اس لئے کہ اللہ تعالی نے انبیاء علیہم السلام کے جسوں (بدن) کو زمین پرحرام کردیا ہے، جس کے متعلق حدیث سنن وغیرہ میں ذکر ہے

آپ قبر میں ایسے ہیں جیسے آج فوت ہوئے ہوں۔

جبکہ ہدایہ:۱/۱۶۰، میں ہے:ان صلى الولى لم يجز لاحد ان يصلى بعده لان الفرض يتادى بالاولى وتنفل بها غير مشروع ولهذا رئينا الناس تركوا عن اخرهم الصلاة على قبر النبى ﷺ وهو اليوم كما وضع. الخ.

اورابن ہمامؒ نے فتح القدیر:۱/۴۵۸، میں لکھا ہے:ولو كان مشروعا لما اعرض الخلق كلهم من العلماء و الصالحين و الراغبين فى التقرب عليه السلام بانواع الطرق عنه، وهذا دليل ظاهر عليه فوجب اعتباره،

اورعنايه شرح هدايه میں برهامش فتح القدير، اكمل الدين محمد بن محمود البابرتیؒ نے لکھا:وقوله وهو اليوم كما وضع لان لحوم الانبياء عليه السلام حرام على الارض. به ورد الاثر.

اور كبيرى :۵۴۰، میں ہےولو شرع التنفل بها يصلى على قبره عليه السلام الى يوم القيامة لانه الآن كما وضع، لان الارض لاتأكل اجسام الانبياء .

اوربدائع الصنائع: ۱/ ۳۱۱، میں علامہ کاسانیؒ نے لکھا ہے:و الدليل عليه لان الامة توارثت ترك الصلوة على النبى ﷺ وعلى خلفاء الراشدين و الصحابةؓ ،ولوجاز لما ترك مسلم الصلوة عليهم ، خصوصا على رسول الله ﷺ لانه فى قبره كما وضع ،وان لحوم الانبياء حرام على الارض، به ورد الاثر،وتركهم ذالك اجماعا منهم دليل على عدم جواز التكرار.

اورمستخلص شرح كنز: ۱۵۱ ،میں ہے: انه فى القبر اليوم كما وضع لان لحوم الانبياء حرام على الارض .كمافى الهدايه: ۶۰ .

اسی طرح بحر الرائق میں ابن نجیمؒ نے لکھا ہے،اوراسی طرح ابن عابدین شامی نے رد المختار ودیگر رسائل میں بھی تحریر فرمایا ہے۔

حاصل بحث ،کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام طیبہ کو مٹی نہیں کھاتی، بلکہ وہ صحیح سلامت اسی حالت میں ہیں کہ جس حالت میں انہیں قبر میں رکھا گیا تھا۔صاحب الہدایہ، ابن الہمام، صاحب عنایہ،صاحب الکفایہ، صاحب مستخلص۔ تمام فقہاء کرام کا یہی قول ہے ۔امام ابوحنیفہؒ کے قول پر اس بحث کا اختتام کرتے ہیں۔علی القاریؒ نے شرح فقہ

اکبر:۱۳۱، میں یہ قول نقل کیا ہے کہ: ورسول اللہ ﷺ مات علی الایمان۔

اب ہم قائلین حیات کے بعض دلائل پیش کرتے ہیں، ان کا ایک دلیل حدیث ابو ہریرہؓ ہے، جو کہ امام احمدؒ نے مسند احمد: ۱۶/۴۷۷، میں نقل کیا ہے: عن رسول اللہ ﷺ قال: مامن احد یسلم علیّ الارد اللہ عزوجل الیّ روحی حتی ارد علیہ السلام۔ یعنی کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ پر سلام کہتا ہو مگر یہ کہ اللہ تعالی مجھ پر میری روح کو لوٹا دیتا ہے، حتی کہ میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ اس روایت کو ابوداوٗد نے: ۲۰۴۱، میں اور بیہقی نے: سنن کبری: ۲۴۵/۵، میں۔ اور حیات الانبیاء: ۲۶، میں نقل کیا ہے اگرچہ بعض علماء نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے لیکن اس کے مختلف سندیں ہیں بلحاظ مختلف طرق یہ حدیث حسن ہے۔ (حاشیہ مسند احمد اور حاشیہ حیات الانبیاء میں اس حدیث پر تحقیق کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ روایت حسن ہے) ظاہر یہ ہے کہ رد الروح کا مفہوم و معنی یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا جسد اطہر اور روح الگ الگ ہیں، جس سے ہمارا مدعی ثابت ہوتی ہے نہ کہ ان کا اگرچہ بعض علماء نے یہ معنی نہیں لیا ہے۔

محدث شیخ عبد الحق دہلوی شارح مشکواۃ (لمعات: ۱۹۲/۳) میں لکھتا ہے: روح لوٹنے کا مطلب اس مقدس حدیث کے متعلق یوں بیان فرمایا ہے: قولہ ردّ اللہ علیّ روحی، لیس المراد بعود الروح عودھا بعد المفارقة عن البدن وانما المراد انہ ﷺ فی البرزخ مشغول حول الملكوت مستغرق فی مشاهدة رب العزة عزوجل كما كان فی الدنیا فی حالة الوحی فی احوال الاخـــرة. عبر عن افاقته من تلک المشاهدة وذلک الاستغراق برد الروح (لمعات التنقیح: ۱۹۲/۳، باب الصلوة علی النبیؐ۔ یعنی روح کے لوٹنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ روح بدن سے نکل کر پھر بدن میں لوٹ آتی ہے، بلکہ یہ مراد ہے کہ نبی ﷺ کی روح طیبہ عالم برزخ میں مشاہدہ ربانی میں مشغول و مستغرق ہے جیسا کہ دنیاوی زندگی میں نزول وحی کی حالت میں مستغرق ہو جاتی تھی اسی مشاہدہ واستغراق سے افاقہ کا نام رد روح ہے۔

امام سیوطیؒ اس اشکال سے (کتاب انباء الاذکیاء: ۴۳، میں ضمن حیات الانبیاء، وضمن الحاوی: ۱۵۲) مختلف جوابات دیتے ہوئے مذکورہ جواب کے بعد فرماتے ہیں: ثم ظهر لی جواب ثالث عشر. وهو ان المراد بالروح الملک الذی وكل بقبره ﷺ یبلغه السلام و الروح یطلق علی غیر جبرئیل ایضا من الملائكة قال الراغب، اشراف الملائكة تسمى ارواحا. انتهىٰ. ومعنى ”ردالله الى روحی“ ای بعث الی الملک الموکل بتبلیغی السلام هذا غایة ماظهر والله اعلم۔ یعنی پھر تیرواں جواب میری ذہن میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ

روح سے وہ فرشتہ مراد ہے جو آپﷺ کے قبر شریف پر درود وسلام کے پہنچانے پر مقرر ہے اور روح کا لفظ جبرئیل علیہ السلام کے سوا اور فرشتوں پر بھی بولا جاتا ہے۔امام راغب نے مفردات میں بھی یہی فرمایا ہے:اب:ردالله علی روحی کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالی اس فرشتہ کو میرے پاس بھیجتا ہے جو درود وسلام پہنچانے پر مقرر ہے میری تحقیق کی یہ انتہا ہے واللہ اعلم۔

علامہ عبدالحلیم لکھنویؒ فرہنگی محلی نور الایمان:۱۴، میں ایسے رد روح کی تشریح فرماتے ہیں'' **فمعناه ان روحی له اشتغال واستغراق شهودی بحضرت الرب الاعلی واذاسلم احدعلیّ یتوجه روحی الیه فردالروح کنایة عن التوجه والاقبال** ''یعنی رد روح کے یہ معنی ہیں کہ میری روح مشاہدہ الہی میں مشغول ومستغرق ہوتی ہے، اور جب کوئی مسلمان مجھ پر درود وسلام پڑھتا ہے تو میری روح اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے، بس رد روح سے روح کی متوجہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔رد بمعنی پھیر دینا، ہٹا دینا، رخ موڑنا اور قاسم العلوم والخیرات، مولانا نانوتویؒ آب حیات'':۲۳۱، میں ارشاد فرماتے ہیں،اس صورت میں معنی حدیث شریف کے یہ ہوں گے کہ جب کوئی رسول اللہﷺ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالی آپؐ کے روح پر فتوح کو اس حالت استغراق فی ذات اللہ وتجلیات اللہ سے جو بوجہ محبوبیت وحبیبیت تامہ آپ کو حاصل رہتی ہے۔ہوش عطا فرما دیتا ہے۔

اور علامہ سمہودی ''وفاء الوفاء'':۱۳۵۴/۴، میں فرماتے ہیں:ان **السبکی قال: یحتمل ان یکون ردامعنویا وان تکون روحه الشریفة مشتغلة بشهود الحضرة و الملأ الاعلی عن هذا العالم واذاسلم علیه اقبلت روحه علی هذا العالم لتدارک السلام وتردعلی المسلّم یعنی ان لروحه الشریفة التفات روحانی** ،یعنی علامہ سبکی فرماتے ہیں:یہ ممکن ہے کہ رد روح سے رد معنوی مراد ہو،اس لئے کہ آپ کی روح طیبہ اس عالم دنیا سے گذر کر مقام ملأ اعلی میں تجلیات الہی میں مستغرق ہوتی ہے۔جب کوئی آپﷺ پر درود وسلام پڑھتا ہے تو اس عالم دنیا کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے،اور سلام کا جواب دیتی ہے۔اس رد روح کے معنی التفات روحانی ہے نہ رد حقیقی۔

علامہ بیضاوی کی بھی یہی رائے ہے:**و الروح ملک موکل علی الارواح او جنسها او جبرئیل او خلق اعظم من الملائکة**،تفسیر سورت نباء : ۴۴۵ ،روح سے وہ فرشتہ مراد ہے جو تمام فرشتوں کا افسر ہے، یا تمام فرشتے یا جبرئیل امین یا فرشتوں سے بڑھ کر کوئی اور مخلوق مراد ہو۔

ان حوالہ جات سے یہی بات ثابت ہو رہی ہے کہ سید الانبیاء والرسلﷺ کی روح طیبہ عالم قدس رفیق اعلی میں

مشاہدہ الٰہی میں مستغرق ہوتی ہے، اسی استغراق سے وقفہ کی حالت میں درود وسلام پڑھنے والے کی طرف روح طیبہ کا توجہ فرمانا ردروح سے تعبیر کیا گیا ہے، اگر آپ ﷺ اپنی عرفی قبر میں بجسد ہ وروحہ دنیا کی طرح زندہ تشریف فرما ہوتے اور گوشہ نشینوں کی طرح حجرہ شریفہ کی قبر اطہر میں زندہ جلوہ افروز ہوتے تو پھر اس تعبیر کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس قدر تاویلات کرنیکا کیا مقصد تھا جو ایک دونہیں بلکہ تیرہ تاویلات ہیں اس قسم کی اضطراب والی حدیثیں بہت کچھ ہیں۔

تبلیغ صلاۃ وسلام کے متعلق علامہ طیبیؒ شرح مشکواۃ المصابیح: ۳۶۳/۲، میں ارشاد فرماتے ہیں **قـولـه: فـان صـلاتـكـم تبـلـغني، وذلک ان النفوس القدسية اذاتجردت عن العلائق البدنية وعرجت واتصلت بالملأالاعلى ولم يبق لهاحجاب فيرى الكل كالمشاهدبنفسهاوباخبار الملک لها۔** یعنی یہ نفوس قدسیہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح طیبات جب بدنی تعلقات سے جدا ہوتی ہے تو ملأ اعلی میں پہنچ جاتی ہیں، اور پھر کوئی پردہ باقی نہیں رہتا۔ دنیاوی زندگی کی طرح ہر چیز کا مشاہدہ کرتی ہیں یا فرشتوں کے ذریعہ اطلاع پاتی ہیں۔ اور اس جملے کے تائید ان دوروایتوں سے ہوتی ہے:

[١] **عـن ابـن مسـعـودؓ عـن الـنبـي ﷺ قـال: ان لله ملائكة سياحين في الارض يبلغوني عن امتي السـلام. نسـائـي: ۴۳/۳، شـعـب الإيـمـان: ۱۴۰/۳،** یعنی ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، یقیناً اللہ تعالی کے لئے کچھ فرشتے ہیں پھرنے والے، پہنچاتے ہیں مجھ پر میری امت کی طرف سے سلام۔

[٢] **عـن ابـن عبـاسؓ قـال: لـيـس احدمن امة محمد ﷺ صلى عليه صلاة الاوهي تبلغه يقول له الـمـلک: فـلان يصلي عليک كذا وكذاصلاة. شعب الإيمان: ۴۱/۳.** یعنی عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے امتیوں میں سے کوئی آپؐ پر درود بھیجتا ہے تو آپؐ کو بتا دیا جاتا ہے ایک فرشتہ فرماتا ہے کہ، فلاں نے آپ پر اتنی بار درود بھیجا ہے.

ان کی ایک دوسری دلیل روایت ابن ماجہ ہے جو کہ ۱۶۳۷، پر ہے، ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **اكثـروا الـصلـوة عليَّ يوم الجمعة فانه مشهود تشهده الملائكة وإن أحدالن يصلي عليّ إلا عـرضـت عـلـيّ صـلا ته حتى يفرغ منها، قال قلت وبعد الموت؟ قال وبعد الموت. ان الله حرم على الارض ان تـأكل اجساد الانبياء فنبي الله حيٌّ يرزق.** یعنی جمعہ کے دن مجھ پر بہت زیادہ درود بھیجو اس لئے کہ جمعہ کے دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور جو کوئی مجھ پر درود بھیجے گا اس کا درود مجھ پر پیش کیا جائے گا۔ جس وقت اس سے فارغ

ہوگا، میں نے عرض کیا، کیا آپؐ کے مرنے کے بعد بھی؟ آپؐ نے فرمایا میرے مرنے کے بعد بھی، کیونکہ اللہ تعالی نے حرام کردیا ہے زمین پر پیغمبروں کا جسم کھانا،غرض یہ ہے کہ اللہ کے نبی زندہ ہیں اوران کو روزی ملتی ہے۔

یہ روایت اسی نمط سے دیگر محدثین نے بھی نقل کی ہے لیکن اخری جملہ پرابن ماجہ متفرد ہے، اوراس کا یہ سند ضعیف ہے دوجگہوں میں انقطاع ہے،عبادہ بن نسی کی ابوالدرداء سے روایت صحیح نہیں جبکہ زید بن ایمن کا عبادہ سے سماع ثابت نہیں۔

علی القاریؒ مرقات:۲۴۲/۳،اورمبارک پوری مرعات المفاتیح :۴۴۰/۴،اورشیخ عبد الحق اشعۃ اللمعات :۵۱۶/۱، میں مزید لکھتے ہیں کہ:ثم هذه الجملة يحتمل ان تكون من قول النبیﷺ نتيجتاللكلام ،ويحتمل ان تكون من قول الراوى استفادة من كلامه وتفريعاعليه یعنی یہ جملہ (فنبی الله حیٌّ يرزق) یاتو رسول اللہﷺ سے صادرشدہ ہے جوبطورنتیجہ کلام کے بیان فرمایا ہو، یا یہ نیچے کسی روای کا قول ہے یعنی مدرج ہے۔

ان کا ایک اور(مستدل) حدیث جوکہ مشکواۃ المصابیح نے رقم :۸۹۴، میں امام بیہقی سے نقل کیا ہے کہ:عن ابی هريرةؓ قال قال رسول اللهﷺ من صلى علیّ عندقبری سمعته ومن صلى علیّ نائياابلغته.(شعب الايمان: رقم: ۱۴۸۱)(۱۴۰/۳) یعنی جس نے میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھا تو میں اسے خودسنتا ہوں اورجس نے مجھ پر درود دور سے پڑھا تو وہ مجھے فرشتوں کے واسطے بتلایا جاتا ہے۔یہ حدیث مختلف کتابوں میں مذکور ہے اختصار سے ہم اس کا ذکر کرتے ہیں:

طریق اول: طبرانی عن العلاء بن عمرو الحنفى عن محمدبن مروان(كذاب متروك الحديث)عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی هريرةؓ قال قال رسول اللهﷺ من صلى على من قريب سمعته ومن صلى على نائياابلغته.

طریق ثانی: عقيلى .شيخ عقيلى عن احمدبن ابراهيم عن العلاء بن عمرو الحنفى عن محمدبن مروان عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی هريرةؓ قال قال رسول اللهﷺ من صلى علیّ عندقبری من قريب سمعته ومن صلى على نائياابلغته. ۱۳۶/۴ ،تاريخ الخطيب:۲۹۱/۳ .

طریق ثالث: ابو الشيخ عن عبدالرحمن بن احمد الاعرج(مجهول العدالة)عن الحسن بن الصباح عن ابی معاوية عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی هريرةؓ قال قال رسول اللهﷺ من صلى

علی من قریب سمعته و من صلی علی من بعیداعلمته۔

اس روایت کے متعلق (الصارم المنکی :۱۹۰) میں لکھتا ہے کہ:قلت هذالحديث موضوع علی رسول اللهﷺ ولم يحدث به ابوهريرةؓ ولا ابو صالح ولا الاعمش ،یعنی میں (مسمی با بن عبدالہادی) کہتا ہوں کہ یہ حدیث منگھڑت ہے نبی کریمﷺ پر۔نہ یہ حدیث ابو ہریرہؓ نے بیان فرمائی ہے اور نہ ہی ان کے شاگرد ابوصالح نے اور نہ ہی ابوصالح کے شاگرد اعمش نے۔پھر اس عبارت کی کچھ سطروں کے بعد ابوالشیخ اصفہانی کی سند پر بحث کرتے ہیں اسی صفحہ ۱۹۰، میں وقدروى بعضهم هذا الحديث من رواية ابى معاوية عن الاعمش وهوخطاء فاحش وانماهو محمدبن مروان تفردبه وهومتروک الحديث، یعنی بعض نے یہی حدیث ابی معاویہ عن الاعمش کے طریق سے روایت کی ہے مگر یہ اس (بعض) کی فاحش غلطی ہے۔اصل میں یہ روایت محمد بن مروان سے ہے جو اس حدیث کی روایت کرنے میں متفرد (یعنی اکیلا) ہے اور محمد بن مروان کے سوا کسی نے یہ حدیث بیان نہیں کی۔نہ ابومعاویہ نے اور نہ کسی اور راوی نے۔اور محمد بن مروان کی اپنی حالت یہ ہے کہ وہ متروک الحدیث ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ حدیث صحیح نہیں بلکہ ضعیف اور ساقط الاعتبار ہے،اس وجہ سے ابن الجوزی نے اس کو کتاب الموضوعات:۱/۳۰۲ میں ذکر کیا ہے۔بعض کو یہ وہم ہوا ہے کہ سیوطیؒ نے تعقبات میں اور ابن تیمیہ وغیرہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔تو اس کا جواب ناصر الدین الالبانی نے سلسلہ ضعیفہ:۲۰۳، میں دیا ہے کہ:موضوع بهذا التمام اخرجه ابن شمعون فى الامالى: ۱۹۳/۲، (۲)و الخطيب فى تاريخه ۲۹۱/۳، ۲۹۲،وابن عساكر: ۲/۷۰/۱٦، من طريق محمدبن مروان عن الاعمش عن ابى صالح عن ابى هريرةؓ مرفوعاواخرج طرفه الاول ابوبكربن الخلادفى الجزء الثانى من حديثه :۱۱۵ /۲،وابوهاشم السيلقى فى ماانتقاه على ابن بشرويه ۵٦/۱ ،و العقيلى فى الضعفاء ۳۹۸،وقال لااصل له من حديث الاعمش وليس بمحفوظ ولايتابعه الامن هودونه، يعنى ابن مروان هذاثم روى الخطيب باسناده عن عبدالله بن قتيبة قال سألت ابن نميرعن هذا الحديث فقال دع، ذامحمدبن مروان ليس بشىء.قلت ومن طريقه اورده ابن الجوزى فى الموضوعات من رواية العقيلى ثم قال: لايصح، محمدبن مروان هوالسدى الصغير كذاب، قال العقيلى لااصل لهذا الحديث وتعقبه السيوطیؒ فى اللآلى: ۲۸۳/۱ ،بقوله قلت اخرجه البيهقى فى شعب الايمان بهذا الطريق واخرج له شواهدقلت

ثـم ساقه السيوطیؒ وبعضهاصحيح مثل قولهﷺ:ان لله ملائكة سياحين فی الارض يبلغونی عن امتی السـلام.وقـولـه ﷺمـامـن احـديسـلم علیّ الاردالله علی روحی، الحديث.وتقدم ذكره قريباوهی كـلهـاانـمـاتشهـدلحديث فی الجملة، واما التفصيل الذی فيه،وانه من صلی علیّ عندقبره ﷺفانه ليسـمعه،فليس فی شیء منهاشاهدعليه.وامانصفه الاخرفلم يذكر السيوطیؒ ولاحديثاواحدايشهدله نعم ،قال السيوطی ثم وجدت لمحمدبن مروان متابعاعن الاعمش. اخرجه ابو الشيخ فی الثواب .

حـدثـنـاعبـد الـرحـمٰن بـن احـمـد الاعـرج حدثنا الحسن بن الصباح حدثناابومعاويه عن الاعـمـش به قلت ورجال هذا السندكلهم ثقات معروفون غيرالاعرج هذا،و الظاهرانه الذی اورده ابـو الشيـخ نـفسـه فـی طبقات الاصبهانيين :٣١٣ ،فقال القاضی عبدالرحمٰن بن احمد الطبری،ثم روی عـنـــه حــديثيـن ولـم يـذكـرفيــه جـرحـاولا تـعـد يـلافهـومـجهـول، فـقـول الـحـافـظ فـی الـفتـح:٦/ ٣٧٩،سـنـده جيـدغيـرمـقبـول ،ولهـذاقال ابن القيم فی هذا السند،انه غريب، كمانقله السـخـاوی عنه فی القول البديع فی الصــلوة علی الحبيب الشفيع :١١٦ ،وقال ابن عبد الهادی فی الصارم المنكی فی الردعلی السبكی:١٩٠ .

وقـدروی بـعـضـهـم هـذا الـحـديـث مـن رواية ابـی مـعاويه عن الاعمش وهوخطاء فاحش وانـمـاهومحمدبن مروان تفردبه،وهومتروک الحديث متهم بالكذب،علی ان هذه المتابعة ناقصة اذليـس فيهـامـافـی رواية مـحـمـدبـن مروان وكفی بهاامردنياه كذالک اورده الحافظ ابن حجرو السـخـاوی مـن هـذاا لوجه خلافالمالفظه المذكورفی روايت السدی، كمالايخفی علی المشتغلين بهذا العلم الشريف.

وقـال شيخ الاسلام ابن تيميهؒ فی الردعلی الاخنائی:٢١٠، ٢١١،وهذا الحديث وان كان صحيحا،لعله يعنی فی الجملة فاسناده لايحتج به، وانمايثبت معناه باحاديث اخر،فانه لايعرف الامن حـديـث مـحـمـدبن مروان السدی الصغيرعن الاعمش، وهوعند اهل المعرفة بالحديث موضوع عـلـی الاعـمـش، وجـمـلـة الـقول ان الشرط الاول من الحديث ينجومن اطلاق القول بوضعه لهذه المتابعة التی خفيت علی ابن تيميهؒ ،وامثاله ،واماباقيه فموضوع لخلوه من الشاهد۔

حاصل یہ ہوا کہ یہ حدیث ساقط الاعتبار ہے، جبکہ دوسری حدیثوں کی معارض بھی ہے۔جن میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود نہیں سنتے بلکہ اللہ تعالی نے ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو کہ آپ ﷺ کو درود وسلام پہنچاتا ہے۔ جو کہ ابوداؤد، ونسائی نے عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ: **ان للہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی عن امتی السلام**۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تحقیق اللہ تعالی کے لئے کچھ فرشتے ہیں پھرنے والے، پہنچاتے ہیں مجھ پر میری امت کی طرف سے سلام ۔ اس روایت کو ابن حبان نے ۲۲۹۳، میں اور حاکم نے :۲/۴۲۱، میں نسائی نے :۴۳/۳، میں نقل کیا ہے۔اوراس معنی کی دیگر روایات بھی ہیں مذکور پر اکتفاء کرتے ہیں۔ بنابراصول حدیث یہ حدیث منکر بھی ہوا۔

ان کی ایک دلیل حدیث انسؓ ہے کہ: رسول پاک ﷺ نے فرمایا ''**الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون**'' ۔ یعنی انبیاء حیات ہیں اور قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔اس روایت کو ابویعلی نے اپنی مسند: ۶/۱۴۷ ،امام بیہقی نے حیات الانبیاء:۱۷، ۱۸، میں اور بزار نے :۲۵۶، میں ابونعیم نے اخبار اصبہان :۲/۳۸، میں نقل کیا ہے مختلف طرق سے۔جس سے حدیث صحیح لغیرہ کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔

جبکہ اس کا ایک صحیح شاہد بھی انسؓ سے مسلم کتاب الفضائل اور کتاب الایمان باب الاسراء:۱/۹۹، اور مسند احمد: ۳/۱۲۰، غیرہ نے نقل کیا ہے۔لیکن اس کا معنی یہ ہے کہ قبر سے مراد برزخ ہے نہ کہ یہ گھڑا۔

شیخ عبدالحق اشعۃ اللمعات:۱/۶۲، میں اور تکمیل الایمان:۱۵، میں فرماتے ہیں کہ اہل السنّت کے اعتقادات میں سے ایک اعتقاد عذاب قبر ہے اور قبر سے مراد عالم برزخ ہے، جو دنیا کے اور اخرت کے دار کے درمیان واسطہ ہے، اوراس عالم کا تعلق دونوں مقاموں کے ساتھ ہے، قبر سے مراد گھڑا نہیں کہ مردہ کو جس میں دفناتے ہیں ۔امام راغب مفردات: ۳۹۸، میں قبر کے معنے ''**مقر المیت**'' لکھتے ہیں۔شاہ ولی اللہ اپنی کتاب الخیر الکثیر :۱۵۸، میں **الخزانۃ التاسعۃ فی احکام نشأۃ المعاد** کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: **ولھا اربع منازل، المنزل الاول: عالم البرزخ وسماہ رسول اللہ ﷺ بالقبر** ، یعنی اخروی نشاۃ کی چار منزلیں ہیں ان میں سے پہلی منزل عالم برزخ ہے، جس کا نام رسول اللہ ﷺ نے قبر فرمایا ہے۔کشف مغالطات:۱۵۹، میں ابراہیم دہلوی لکھتا ہے کہ قبر اس گھڑے کا نام نہیں ہے جہاں جسد خاکی مدفون کرکے خاک ڈالتے ہیں بلکہ حقیقی قبر عالم برزخ ہے۔

مولانا اشرف علی مجالس الحکمۃ :۴۳، اور اشرف الجواب:۳/۲۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، میں لکھتا ہے کہ قبر سے مراد حدیث میں عالم برزخ ہے نہ حفرہ (یعنی گھڑا) مظاہر حق : ۶۲،نور الصدور:۱۰۰، ۱۲۳، میں بھی یہی لکھتے ہیں، نظم

الفرائد:۱۷۱، میں احسن سنبھلی لکھتا ہے کہ: و المراد بالقبر ليس مايحفر ويدفن فيه الميت بل المراد به عالم البرزخ مما بعد الموت الى يوم النشور، سلیمان ندوی سیرۃ النبی ﷺ ۲۶۸/۴، کے حاشیہ میں بھی یہی تحقیق لکھتا ہے، مولانا ادریس کاندہلوی رسالہ عالم برزخ :۲۵، میں اور شبیر احمد عثمانی تفسیر عثمانی میں یہی تحقیق کرتا ہے۔ وحید الزمان موطاً کے ترجمہ:۹۶، ۹۷، میں بھی ایسی تحقیق کرتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی مالا بدمنہ:۱۲، میں تفسیر ماجدی:۱۱۷۶، میں مفتی کفایۃ اللہ جواہر ایمان:۶، میں یہی معنے مراد لیتے ہیں۔

تو اس تحقیق سے ثابت ہوا کہ مذکورہ حدیث میں قبر سے عالم برزخ مراد ہے نہ کہ یہ گھڑا۔ جبکہ ان لوگوں کا ایک دوسری مستدل خود اس سے خلاف ہے جو کہ انسؓ سے امام بیہقی نے حیات الانبیاء:۱۸، کنز العمال:۳۲۲۳۰، میں نقل کیا ہے کہ: ان الانبياء لايتركون فى قبورهم بعد اربعين ليلة ولكنهم يصلون بين يدى الله حتى ينفخ فى الصور ۔ یعنی انبیاء کو چالیس راتوں کے بعد ان کی اپنی قبروں میں رہنے نہیں دیا جاتا بلکہ وہ اللہ تعالی کے حضور میں نماز پڑھتے ہیں تا آنکہ صور پھونکا جائے گا۔

اگرچہ یہ حدیث صحیح نہیں خود امام بیہقیؒ اس حدیث کی صحت میں تردد کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ: وهذا ان صح بهذا اللفظ ، یعنی اول تو دل تسلیم نہیں کرتا کہ یہ حدیث صحیح ہو اور اگر ثابت ہو جائے کہ واقعی حدیث کے یہی الفاظ ہیں تو اس کی توجیہ کرنی پڑے گی، جبکہ اس حدیث کی سند میں محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلی ہے جو کہ تمام اصحاب الجرح والتعدیل کے نزدیک ضعیف ہے۔

اور اس کے علاوہ ایک اور صحیح حدیث عبداللہ بن عمرؓ سے صحیح بخاری :۶۲/۱، میں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کچھ نماز اپنی گھروں میں ادا کیا کرو اور انہیں قبریں نہ بناؤ۔ اجعلوا فى بيوتكم من صلاتكم ولاتتخذوها قبورا۔ علماء کرام نے اس حدیث کے کئی مطلب لئے ہیں اور سب صحیح ہیں۔

ایک مطلب تو یہ ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ دوسرا یہ کہ گھروں میں نوافل پڑھنا مندوب اور مستحب ہے، تو نبی کریم ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ تم مردوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں میں (قبروں) میں نماز نہیں پڑھتے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ گھروں میں مردوں کو دفن نہ کرو، اور بغوی نے شرح السنۃ میں اکثر اہل علم کا قول ابن منذر سے نقل فرمایا ہے، کہ اس حدیث سے علماء کرام نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ قبرستان نماز کی جگہ نہیں ہے، كذا فى فتح البارى: ۹۵/۲۔

اور شیخ عبدالحق لمعات:۱۹۳/۳، میں اس حدیث کی تشریح میں کہ:(سمعت رسول اللهﷺ يقول لاتجعلوا بيوتكم قبوراً الحديث) ۔فرماتا ہے ای لاتکونوافی بیوتکم کالموتی فی القبور لایصلون ولایعبدون الخ۔اس کے علاوہ اکثر شراح حدیث نے اس کا یہی مقصد لکھا ہے:۔

ان کا ایک اور مستدل واقعہ معراج ہے۔جو کہ کئی طرق سے مفسرین اور محدثین نے نقل کیا ہے تفصیل سورۃ اسراء میں آئے گی۔اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث ابی ہریرہؓ میں تصریح موجود ہے کہ:ثم اتی ارواح الانبیاء (یعنی ارواح الانبیاء کواللہ تعالی نے متشکل کر کے رسول اللہﷺ کو دکھایا) جبکہ بعض روایات میں لفظ تمثیل بھی ذکر کیا گیا ہے اور امام ذہبی تاریخ اسلام:۲۷/۱، میں اس حدیث کوان الفاظ سے نقل کرتے ہیں::ثم اتی ارواح الانبیاء اور:۲۶۹/۱، میں ان مختلف احادیث کونقل کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ :فكيف الجمع بين هذه الاحاديث وبين ماتقدم من انه رأى هؤلاء الانبياء في السمٰوات وانه راجع موسى؟فالجواب انهم مثلواله فرأهم غيرمرة، فرأى موسى في مسيره قائمايصلى في قبره ثم رأه في بيت المقدس ثم رأه في السماء السادسة هووغيره فعرج بهم كماعرج بنبينا، والانبياء احياء عندربهم كحياة الشهداء عندربهم، وليست حياتهم كحياة اهل الدنياولاحياة اهل الاخرة ،بل لون اخركماوردان حياة الشهداء بان جعل الله ارواحهم في اجواف طير خضرتسرح في الجنة وتأوى الى قناديل معلقة تحت العرش فهم احياء عندربهم بهذا الاعتباركمااخبرسبحانه وتعالى واجسادهم في قبورهم.وهذه الاشياء اكبرمن عقول البشروالايمان بهاواجب، كماقال تعالى ، الذين يؤمنون بالغيب ،بقره۔اسی طرح جواب ابن حجر نے فتح الباری:۱۶۰/۷، میں دیا ہے۔

مذکورہ حدیث ابو ہریرہؓ سے بزار نے (کشف)رقم ۵۵):۴۰/۱،اور طبری نے تہذیب الآثار جزء ثانی:۲۷، میں اور تفسیر سورۃ اسراء:۵۰۸/۶، اور ابن ابی حاتم نے :۳۲۱۱/۷، میں امام بیہقی نے دلائل النبوۃ:۴۰۰/۲، اور ہیثمی نے مجمع الزوائد:۲۳۸/۱، میں بزار سے نقل کرنے کے بعد فرماتا ہے رواه البزار،ورجاله موثوقون) اور ابن حجر نے فتح الباری:۵۹۹/۷،اور ابو یعلی نے ابطال التاویلات:۱۲۳/۱، میں فرمایا ہے کہ :وقدجاء هذافي حديث المعراج في رواية ابي حفص بن شاهين وابي طالب بن العشارى ،قال فيه ،ثم اتينابيت المقدس فنشرلي ارواح الانبياء فصليت معهم،فبين ان النشركان على الارواح وقدذكر ابوبكر الخلال في كتاب السنة هذه

اللفظة،جبکہ حدیث جابر بن عبداللہ میں لفظ (مثّل) ہے فرماتا ہے:سمعت رسول اللهﷺيقول لما كذبتني قريش قمت فمثل الله لي بيت المقدس۔

اس پر دلالت مضمون حدیث بھی کرتا ہے کہ:رسول اللہﷺ کا گذر ایک ایسے مقام پر ہوا کہ وہاں چھوٹا بل تھا یعنی زمین میں سوراخ تھا،اس سے ایک بڑا اژدھا نکلا اور وہ چاہتا تھا کہ پھر اس میں چلا جاوے مگر نہ جاسکتا تھا،اور وہ صورت اس شخص کی تھی کہ وہ کوئی کلمہ عظیمہ کہہ دیتا ہے اور پھر اس کو اس پر ندامت ہوتی ہے اور اس کے بارے میں جواب نہیں دے سکتا۔اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی دیکھے کہ ان کا شکم گھڑے کی مانند بڑا تھا اس میں سانپ تھے کہ وہ باہر سے نظر آتے تھے۔اوران میں سے ایک سانپ دوسرے کو کاٹتا تھا اور وہ لوگ سودخور تھے، پھر ایسے لوگوں کی طرف گذرے کہ ان کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹ کے مانند تھے، وہ لوگ آگ کا انگارہ نگلتے تھے اور وہ ان کے نیچے سے نکلا کرتا تھا، یہ لوگ وہ اشخاص تھے جو کہ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے تھے، پھر نبی کریمﷺ کچھ عورتوں کی طرف سے گذرے کہ ان کے ہاتھ باندھے ہوئے تھے اور سرنگوں منہ لٹکائے ہوئے تھیں ،اور وہ زانیہ عورتیں تھیں ،پھر ایسے لوگوں کی طرف گذرے کہ ان کے پہلو کا گوشت کاٹا جاتا تھا اور وہ لوگ اپنے دانتوں سے کچلتے تھے وہ لوگ چغلخور تھے۔

پھر بیت المقدس کے پاس پہنچے آپؐ نے مسجد میں نماز پڑھی اور وہاں انبیاء علیہم السلام کی ارواح موجود کی گئیں۔ابن جریر:۵۰۸۳/۶۔محمد بن درویش الحوت اسنی المطالب:۲۵۷،میں لکھتا ہے وكذارؤيته للانبياء ليلة الاسراء هي تمثيل لارؤية جسم وكذارؤيته لموسى وهوقائم يصلي في قبره،و رؤيته لادم عليه السلام في السماء الدنياوعن يمينه باب الجنة وعن يساره باب النارفانه تمثيل ـ

ان روایات میں دیگرامتیوں کے متعلق بھی ذکر ہے، جو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔تفسیر مظہری: ۲۲۴/۱۰،میں لکھا ہے کہ:ارواح الانبياء تخرج من جسدهاوتسيرمثل صورتها الخ ۔فیض الباری:۴۲/۳،میں شاہ انور نے لکھا ہے:ثم هذه ابدان مثالية لهم .لانهم ارواح مجردة ۔بیضاوی:۴۷۳/۱،میں ایک حدیث نقل کیا ہے،جس میں الفاظ یہ ہیں کہ: مثّل لي الانبياء عليهم السلام فصليت بهم ۔مولانا اشرف علی تھانوی کتاب التکشف:۴۵۰،میں یہی لکھتا ہے:اس معنی کے وضاحت کے لئے کہ یہ حیات برزخی ہے اور روح جسد عنصری سے الگ ہے، ہم دو انبیاء کرام کا ذکر کرتے ہیں،تاکہ کمزور عقیدے والوں کا شک زائل ہوجائے ،مسند ابی یعلی:۲۳۶/۱۳،میں ابوموسی اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:اتى النبيﷺ اعرابيافاكرمه فقال له ائتنافاتاه فقال رسول

اللهﷺسل حاجتک فقال ناقة نركبهاواعنزايحلبهااهلی ،فقال رسول اللهﷺعجزتم ان تكونوا مثل عجوزبنی اسرائیل .قال ان موسی لماساربنی اسرائیل من مصرضلوا الطريق فقال ماهذا؟فقال علماؤهم ان یوسف لماحضره الموت اخذعلیناموثقامن الله ان لانخرج من مصرحتى ننقل عظامه معناقال فمن يعلم موضع قبره قال عجوزمن بنی اسرائیل فبعث اليهافاتته فقال دلني على قبريوسف قالت حتى تعطيني حکمی قال ماحكمک؟ قالت اكون معک فی الجنة فكره ان يعطيهاذلک فاوحى الله اليه ان اعطهاحکمهافانطلقت بهم الى بحيرة (موضع مستنقع ماء) فقالت انضبواهذا الماء فانضبواقالت احتفرواواستخرجوا عظام یوسف فلمااقلوها الى الارض اذا الطريق مثل ضوء النهار۔

یعنی رسول اللہ کسی اعرابی کے ہاں مہمان ہوئے اس نے آپﷺ کی بڑی خاطر تواضع کی ،واپسی میں آپﷺ نے فرمایا کبھی ہم سے مدینہ میں بھی مل لینا، کچھ دنوں بعد اعرابی آپؐ کے پاس آیا رسول اللہﷺ نے فرمایا: کچھ چاہئے؟ اس نے کہاہاں ایک تواونٹنی دیجئے مع ہودج کے اور ایک بکری دیجئے جو دودھ دیتی ہو، آپؐ نے فرمایاافسوس تو نے بنی اسرائیل کی بڑھیا جیسا سوال نہ کیا،صحابہ نے پوچھاوہ واقعہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایاجب موسیٰ کلیم اللہ بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو راستہ بھول گیا، ہزارکوشش کی لیکن راہ نہیں ملتی تھی ،آپ نے لوگوں کو جمع کر کے پوچھا یہ کیااندھیر ہے؟ تو علماء بنی اسرائیل نے کہا: بات یہ ہے کہ یوسفؑ نے اپنے اخری وقت میں ہم سے عہد لیا تھا کہ جب ہم مصر سے چلیں تو آپ کا تابوت بھی یہاں سے لیتے جائیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کون جانتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا تابوت کہاں ہے؟ سب نے انکارکردیا کہ ہم نہیں جانتے ، ہم میں سے سواایک بوڑھی کے اورکوئی بھی آپ کی قبر سے واقف نہیں ،آپ نے اس بڑھیا کے پاس آدمی بھیج کراس سے کھلوایا کہ مجھے یوسف کی قبر دکھلا۔ بوڑھی نے کہاہاں دکھلاؤں گی لیکن پہلے اپنا حق لے لوں،موسیٰ علیہ السلام نے کہاتو کیا چاہتی ہے؟اس نے جواب دیا کہ جنت میں آپ کا ساتھ میسر ہوآپ پراس کا یہ سوال بہت باری پڑا،اسی وقت وحی آئی کہ اس کی بات مان لو،اوراس کی شرط منظور کرلو،اب وہ آپ کوایک جھیل کے پاس لے گئی جس کے پانی کارنگ بھی متغیر ہوگیا تھا۔کہا کہ اس کا پانی نکال ڈالو،جب پانی نکال ڈالااورزمین نظر آنے لگی تو کہااب یہاں کھودو،کھودنا شروع ہواتو قبر ظاہر ہوگئی تابوت ساتھ رکھ لیا۔اب جو چلنے لگے تو راستہ صاف نظر آنے لگااورسیدھی راہ

لگ گئے۔

اس روایت کو حاکم نے مستدرک:۳/۱۷۱،۴۵۲، میں نقل کیا ہے، اور اس پر باب باندھا ہے(نقل عظام یوسف علیه السلام من مصر فی عهدموسی علیه السلام)اور ہیثمی نے مجمع الزوائد:۱۰/۲۶۷، میں نقل کیا ہے اور فرمایا ہے ورجال ابی یعلی رجال الصحیح وهذا الذی حملنی علی سیاقها ۔جبکہ مسند ابی یعلی کی تحقیق کرنے والے(حسین سلیم) نے اس کو حسن کہا ہے، ابن حبان نے صحیح:۲/۵۰۰، میں اس پر عنوان باندھا ہے، اور ابن ابی حاتم نے تفسیر:۸/۲۶۸۷میں مجاہد سے مرسل نقل کیا ہے جوکہ اس کے لئے ایک شاہد ہے، اورسیوطی نے درمنثور: ۲۹۸/۶، میں قتادہ سے،اورجرجانی نے تفسیر درج الدرر:۳/۱۲۰۰، میں ابن عباسؓ سے ،اورابونعیم نے حلیۃ الاولیاء:۶/۲۷، میں کعب سے،اورطبرانی نے الاوسط:۷۷۶۷، میں علیؓ سے نقل کیا ہے، اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث صحیح ہےاورابن کثیر نے جواس حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ هذاحدیث غریب جدا،یہ حکم صحیح نہیں۔

دوسری روایت دانیال علیہ السلام کی ہے: کہ عمرؓ کے زمانے میں ابوموسی اشعری کی سپہ سالاری میں جب سوس فتح ہوا تو ایک بہت مکلّف مکان میں دانیال نبی علیہ السلام کی نعش مبارک ملی، جو فارس وغیرہ کے قدیم دستور کے موافق دوائیں اورخوشبوئیں لگا کر رکھی ہوئی تھی۔کسی عضو کی صورت وھیئت میں فرق نہیں آیا تھااورابوموسیؓ نے ان کی نسبت عمرؓ کو خط لکھا عمرؓ نے جواب دیا: کہ ان کو بیر کے پتے اورخوشبودار پانی سے غسل دے کر دفن کردو۔ابوموسیؓ نے عمرؓ کی تحریر کے موافق غسل وکفن کے بعد نماز پڑھ کر سوس کے نہر سے کنارہ پر دفن کرکے اس طرف کو پانی جاری کرادیا۔اس روایت کو ابن ابی شیبہ نے:اس طرح نقل کیا ہے حدثنا حمادبن سلمه عن ابی عمران الجونی عن انسؓ انهم لمافتحوا تستر قال:فوجدرجل انفه ذراع فی التابوت کانوایستظهرون ویستمطرون به فکتب ابوموسیؓ الی عمربن خطابؓ بذلک فکتب عمرؓ،ان هذانبی من الانبیاء والنارلاتأکل الانبیاء والارض لاتأکل الانبیاء فکتب ان انظرانت واصحابک .یعنی اصحاب ابی موسی فادفنوه فی مکان لایعلمه احدغیرکماقال فذهبت اناوابوموسی فدفناه!.مصنف ابن ابی شیبه:۱۳/۲۸ ،تاریخ دمشق:۳۴۴/۵۸، ۳۴۱.دلائل النبوة للبیهقی: ۳۸۲/۱، ۳۹۰.تاریخ طبری: ۴۰۰/۱، ۲/۵۰۵، الاصابه: ۲۳۶/۶ ،تاریخ اسلام للذهبی:۲۸۷/۵، البدایه و النهایه: ۳۷۵/۲.قصص الانبیاء للثعلبی: ۱۸۹ ،وتاریخ قزاعی:۳۴۔

خلیفہ ثانی نے حکم دیا کہ جس طرح میت کو غسل دیا جاتا ہے، اسی طرح اس پیغمبر کو غسل دو، اور جس طرح میت کو کفن دیا جاتا ہے، اسی طرح اس کو کفن دو، اور جس طرح میت پر نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے، اسی طرح اس پر بھی نماز جنازہ پڑھو۔ اور لحد کھود کر دفن کر دو۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ انبیاء علیہم السلام قبض روح کے بعد عام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں، یعنی جسد اور روح علیحدہ علیحدہ مکانوں میں ہوتے ہیں۔

ایسا ایک واقعہ قرآن کریم نے سورۂ بقرہ ۲۵۹، میں عزیر علیہ السلام کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کی تفصیل ابن جریر وغیرہ نے ذکر کی ہے، جبکہ سلیمان علیہ السلام کا واقعہ جو سورۂ سبا:۱۴، میں ہے، بھی اس مسئلے کی وضاحت کرتی ہے۔

جبکہ رسول اللہ ﷺ کی وفات اور جسد عنصری وروح کے علیحدہ علیحدہ ہونے کی ایک دلیل ان لوگوں کا یہ واقعہ ہے، جو کہ شذرات الذہب: ۲۳۰/۴، وفاء الوفاء: ۶۴۸/۲، میں نور الدین سلطان کے متعلق نقل کیا ہے کہ: بعض عیسائی بادشاہوں نے یہ سازش کی تھی اور ۵۵۷ء میں دو مراکشی عیسائیوں کے ذریعہ اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی، اپنی طرف سے اس سازش میں بڑی باریک بینی اور مہارت سے کام لیا گیا تھا۔

لیکن قدرت وقوت الہیٰہ ہر چیز پر غالب ہے۔ اور چونکہ اللہ تعالی نے آپؐ کی حفاظت وعصمت کا وعدہ کر رکھا ہے، اس لئے اللہ تعالی نے خوب حفاظت فرمائی اور عیسائیوں کی سازش کو ناکام ونامراد کر دیا۔ مؤرخین نے اس سازش کا مفصل بیان کیا ہے، سمہودی کہتے ہیں: کہ علامہ جمال الدین نے ایک رسالہ لکھا ہے، جسکا موضوع یہ ہے کہ عیسائیوں کو ملازم نہ رکھا جائے۔ اس میں انہوں نے ذکر کیا، کہ مصر کے ایک عادل حکمران نور الدین زنگی شہید کے دور میں عیسائیوں نے ایک بہت بڑی سازش کی، اور انہیں پختہ یقین تھا کہ اس میں وہ کامیاب ہوجائیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطان نور الدین زنگی تہجد گذار تھا، اور اوراد ووظائف کا پابند تھا ایک رات تہجد کے بعد سو گیا تو خواب میں رسول اکرمؐ کی زیارت ہوئی آپ دو سرخ رنگ کے آدمیوں کی طرف اشارہ فرما کر ارشاد فرما رہے تھے "**انجدنی انقذنی من هذين**" مجھے ان دونوں سے بچاؤ۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا، وضوء کر کے نماز ادا کی اور سو گیا، تو ویسی ہی خواب پھر دیکھی، اور آنکھ کھل گئی اس نے پھر نماز ادا کیا اور سو گیا، تو تیسری مرتبہ پھر وہی خواب آئی تو اس کی نیند اڑ گئی، اس کا ایک وزیر جمال الدین موصلی بہت نیک شخص تھا، اسے اسی رات کو ہی طلب کر لیا۔

اور اس سے خواب کا واقعہ بیان کیا، اس نے کہا! تو بیٹھے کیوں ہو؟ ابھی مدینہ منورہ چلو اور کسی کو خواب نہ بتلانا، اس نے راتوں رات ہی تیاری کی، اور بیس ساتھی لیکر ہلکی پھلکی سواریوں پر روانہ ہو گیا، وزیر موصوف بھی ہمراہ تھا، بہت سامان

بھی ساتھ لیا، سولہ روز میں مدینہ طیبہ پہنچ گیا، شہر سے باہر ہی غسل کیا، مسجد شریف میں حاضر ہو کر ریاض الجنۃ میں نوافل ادا کیئے، اور بارگاہ نبوت میں سلام عرض کیا، اور بیٹھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ کہ اب کیا کرے، وزیر نے اٹھ کر اعلان کر دیا جبکہ اہل مدینہ مسجد میں جمع ہو چکے تھے کہ سلطان نبی اکرم ﷺ کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے ہیں، خیرات کیلئے مال بھی لائیے ہیں، سب اہل مدینہ کی فہرست بنائی جائے، بعد میں سلطان نے سب کو حاضری کا حکم دیا، جو شخص بھی پیش ہوتا بادشاہ اسے بڑے غور سے دیکھتا، تاکہ جو اشخاص نبی اکریم ﷺ نے خواب میں دکھائے ہیں انہیں پکڑا جا سکے، لیکن ان شکلوں والے نہ مل سکے، ہر شخص کو عطیہ دیتے اور رخصت کر دیتے، تا آنکہ اہل مدینہ سے کوئی باقی نہ رہا۔

اب سلطان نے پوچھا کہ کوئی باقی تو نہیں رہا؟ سب نے کہا نہیں، سلطان نے کہا سوچو اور خوب غور کر لو، اخر لوگوں نے بتلایا اور تو کوئی نہیں صرف مراکشی بزرگ ہیں، جو کسی سے کچھ نہیں لیتے، وہ بڑے نیک اور امیر لوگ ہیں، محتاجوں کو بڑا صدقہ خیرات دیتے ہیں، ہمیشہ روزہ رکھتے ہیں، تہجد گذار ہیں، ریاض الجنۃ میں نماز ادا کرتے ہیں، ہر صبح بارگاہ نبوت میں صلاۃ وسلام پیش کرتے ہیں، روزانہ جنت البقیع میں حاضری دیتے ہیں، ہفتہ میں ایک دفعہ مسجد قبا جاتے ہیں۔

الغرض اہل مدینہ نے ان کی بہت تعریف کی، بادشاہ نے یہ سن کر سبحان اللہ کہا، اور انہیں خواب کا واقعہ نہ بتایا، اور حکم دیا کہ انہیں میرے پاس لاؤ، انہیں بلایا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم دولت مند ہیں، صدقہ قبول نہیں کرتے، سلطان کے اسرار پر جب انہیں لایا گیا تو اس نے فورا پہچان لیا کہ یہ تو وہی ہیں، جو خواب میں دکھلائے گئے ہیں، اور نبی کریم ﷺ نے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا: انجدنی انقذنی من ھذین'، بادشاہ نے پوچھا کہ کہاں کے رہنے والے ہو؟ تو انہوں نے کہا مراکش سے ہم حج کے لئے آئے تھے، ایک سال کے لئے رسول اللہ ﷺ کے پڑوس میں رہنے کا ارادہ کر لیا ہے، بادشاہ نے کہا سچ سچ بتلا دو، وہ اس پر چپ ہو رہے، بادشاہ نے ان کی رہائش کا پوچھا تو بتلایا گیا کہ ایک مسافر خانہ میں جو حجرہ شریفہ کے قریب ہے، سلطان انہیں پکڑ کر اس مکان میں لے آیا، وہاں بہت مال پڑا ہوا تھا، سلطان اکیلا اس مکان میں پھرتا رہا ایک جگہ سے بوریاں اٹھائی تو اس کے نیچے سرنگ نظر آ گئی جو تازہ کھدی ہوئی حجرہ شریفہ کو جا رہی تھی۔

لوگ یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے، سلطان نے کہا اب مجھے سچ سچ بتا دو اور خوب مارا، آخر انہوں نے اعتراف کر لیا کہ وہ عیسائی ہیں، اور ان کے بادشاہ نے انہیں مراکشی حاجیوں کے بھیس میں بھیجا ہے، اور بہت زیادہ مال و دولت

دیا ہے،اورایک خطرناک کام سرانجام دینے کو کہا ہے،جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ کام سرانجام پا جائے گا۔اور وہ یہ تھا کہ نبی ﷺ کی ذات اقدس تک پہنچیں، اور جو شیطان نے ان کے ذہن میں ڈالا تھا اس پر عملدرآمد کریں، کہ آپ کو یہاں سے نکال لے جائیں،اوراس کا جونتیجہ ہوگا سو ہوگا،اس لئے وہ مسجد کے جنوبی طرف قریب ترین مسافر خانہ میں مقیم ہوگئے اوراپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا اس طرح شروع کیا کہ رات کو کھدائی کرتے اور مراکشی لوگوں کے تھیلوں جیسے ان کے پاس تھیلے ہوتے جن میں مٹی ڈال کر یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ بقیع کے زیارت کو جارہے ہیں وہاں جا کر مٹی قبروں کے درمیان ڈال دیتے، یہ کام وہ عرصہ سے کررہے تھے، جب وہ حجرہ شریفہ کے قریب پہنچے تو آسمان سخت کڑکا اور بجلی چمکی اور ایسا زلزلہ آیا کہ معلوم ہوتا تھا، پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جائیں گے۔

اسی رات کی صبح کو آپ (سلطان) آ پہنچے اور ہمیں پکڑ کر اعتراف جرم کروالیا، جب انہوں نے اعتراف جرم کرلیا اور سلطان کے ذریعہ یہ سازش پکڑی گئی تو سلطان نے کہا کہ الحمدللہ، اللہ تعالی نے اس کام کے لئے مجھے منتخب فرمایا، کسی اور کا انتخاب نہیں کیا، اس کے بعد سلطان پر سخت رقت طاری ہوئی اور بہت رویا۔اور انہیں مارڈالنے کا حکم دیا، حجرہ شریفہ سے متصل جو کھڑکی بقیع کی طرف کھلتی تھی اس کے نیچے ان کی گردن اڑادی، پھر سلطان نورالدین زنگی اپنے ملک کو واپس چلا گیا اور عیسائیوں کے خلاف جنگی کاروائیاں بڑھادیں، اور انہیں سرکاری ملازم نہ رکھنے کا حکم جاری کیا۔(جسم مبارکہ کی چوری کی سازشیں تقریبا پانچ مرتبہ کی گئی ہے، تفصیل کے لئے کتاب: التحفة اللطيفة :۲/۲۴۷، وفاءالوفاء:۲/۶۵۳، البدایۃ والنہایۃ:۱۳/ص۲،۳، دیکھیں،

مذکورہ تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ انبیاء علیہم السلام شہداء جیسے برزخ میں زندہ ہیں، خود یہ تصریح امام بیہقی نے دلائل النبوۃ:۲/۳۸۸، اور کتاب حیات الانبیاء:۲۹، میں کی ہے فرماتا ہے: **والانبياء صلوات الله عليهم احياء عندربهم كالشهداء** ۔یعنی انبیاء علیہم السلام کے ارواح طیبہ وفات کے بعد اللہ کے ہاں زندہ ہیں، جیسا کہ شہداء کرام، اور یہی معنی زرقانی نے شرح مواہب:۵/۳۳۳، میں بھی ذکر کیا ہے، آخر میں ہم علامہ محمد بن درویش الحوت کا قول، جو کہ انہوں نے اسنی المطالب میں ذکر کیا ہے:۵۸۳، ۶۱۴، ۶۱۹، لکھتا ہے کہ:

فهذه الاخبار بمجموعهاتدل على حياته وحياة جميع الانبياء عليهم السلام، ولكنهاعلى نحوماوصف، لاكحياتنا لانه لماقبض رسول الله ﷺ كان كبقية الموتى من حيث فقد الروح وخروجهامن الجسم الكريم ولوكانت حياته كحياتنالخاطبهم حين اختلفوافي امر الخلافة، وفي

محل دفنه، وفي ميراثه، حين اختلفت فاطمة وابوبكرؓ على ذلک وعلى الارض اللتي ادعتهامن ارض فدک بنواحي خيبر،وانه ا عطاهالها،وكالخلاف بين على وعائشة وبين عليّ ومعاويه رضي الله عنهم اجمعين.فظهوره ﷺللصحابة لنزع ا لخلافات المذكورة وهم اولى الناس بهذه الكرامة بل هم اكرم الخلق بعده اولى، واهم من ظهوره لغيرهم وهذابيّن جليّ، فعلم ان حياة الانبيالاتدرک حقيقتها،وانمانعتقدان لهم مزيةعلى غيرهم من الموتى۔

انبیاءعلیہم السلام کی حیات برزخی ہے، جو دنیوی حیات سے مشابہ نہیں اور نہ نیند سے مشابہ ہے،اور نہ باقی لوگوں کی موت کے مانند ہے، بلکہ اللہ تعالی ان کے ابدان مکرمہ کو بوسیدگی اورفناء سے محفوظ رکھتا ہے، اوربعض اوقات روح نورانیت سے کوئی سرّ ان پرلوٹا تا ہے،

چنانچہ بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ امت کا سلام آپؐ پر پیش ہوتا ہے۔بعض حدیثوں میں ہے، کہ آپؐ کی روح آپؐ پرلوٹائی جاتی ہے، تاکہ آپؐ سلام کہنے والا کا جواب دیں۔ بعض حدیثوں میں ہے، جو دور سے سلام بھیجے اس کا سلام فرشتے کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے،بعض حدیثوں میں ہے عرض کیا گیا، کہ آپؐ پرصلوۃ وسلام کس طرح پیش ہوگا،آپؐ تو بوسیدہ ہو چکے ہوں گے تو فرمایا: اللہ نے زمین پر پیغمبروں کا گوشت کھانا حرام کردیا ہے، یہ احادیث مجموعی طور پر نبی کریمﷺ اور دیگر تمام صحابہ کرام کی حیات پر دلالت کرتی ہے،لیکن یہ حیات وہی ہے جو ہم نے پہلی بیان کی ہےیعنی برزخی ہے، ہماری حیات کی طرح نہیں ہے کیونکہ جب رسول اللہﷺ کی روح قبض کی گئی تو جسم مبارک سے روح کے نکلنے میں اور بدن میں روح موجود نہ ہونے میں آپؐ دوسرے اموات کی مانند تھے اگر آپؐ کی حیات ہماری حیات کی مانند ہوتی تو جب صحابہ کے درمیان خلافت کے معاملہ میں اختلاف ہوا تھا، اس وقت آپؐ ان سے مخاطب ہوتے تو معلوم ہوا کہ انبیاءعلیہم السلام کی حیات کی حقیقت کا ادراک نہیں ہوسکتا پس ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ دوسری اموات پر ان کوفوقیت اورفضیلت حاصل ہے۔مزید تحقیق کے لئے محمد حسین نیلویؒ کی کتاب نداءحق مطالعہ کیجئے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ
اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے
وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۵﴾
تو صبر کرنے والوں کو (اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو۔
الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿۱۵۶﴾
ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کا مال ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں
أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ﴿۱۵۷﴾
یہی لوگ ہیں جن پر اُن کے رب کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہی سیدھے رستے پر ہیں۔
إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا
بیشک (کوہِ) صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے
جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ
اُس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کا طواف کرے (بلکہ طواف ایک قسم کا نیک کام ہے) اور جو کوئی نیک کام کرے تو اللہ تعالیٰ
شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵۸﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى
قدر شناس اور دانا ہے۔ جو لوگ ہمارے احکام اور ہدایات کو جو ہم نے نازل کی ہیں (کسی غرض فاسد سے) چھپاتے ہیں
مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ
باوجودیکہ ہم نے اُن کو لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے اپنی کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے ایسوں پر اللہ
وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿۱۵۹﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا
اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ ہاں جو توبہ کرتے ہیں اور اپنی حالت درست کر لیتے اور (احکامِ الٰہی کو)

وَبَيَّنُوْا فَأُوْلَـٰٓئِکَ أَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

صاف صاف بیان کر دیتے ہیں تو میں اُن کے قصور معاف کر دیتا ہوں اور میں بڑا معاف کرنے والا (اور) رحم کرنے والا ہوں [۴۰]

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولٰٓئِکَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ

جو لوگ کافر ہوئے اور کافر ہی مرے اُن پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے ۔

وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ

وہ ہمیشہ اسی (لعنت) میں (گرفتار) رہیں گے اُن سے نہ تو عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ وَإِلٰـهُكُمْ إِلٰهٌ وَاحِدٌ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ

اور نہ انہیں (کچھ) مہلت ملے گی ۔ اور (لوگو) تمہارا معبود ایک ہی (یعنی اللہ تعالیٰ) ہے[۴۱] اُس بڑے

---

[۴۰] اس ایت میں مولوی صاحبان کے توبہ کی قبولیت کی شرائط ذکر ہیں :(۱)توبہ کرنا(۲)اپنی اصلاح کرنا(۳)بیــنــوا یہ مراد یہ ہے کہ جوحق یہ لوگ چھپاتے رہیں اب اسے خوب بیان کریں۔جبکہ منافقین کےتوبہ کی شرائط چار ہیں: جوکہ سورت نساء:۱۴۶، میں ذکر ہیں اور عام لوگوں کی توبہ کی دو شرط ہیں جوکہ سورت ال عمران:۸۹، میں مذکور ہیں۔

[۴۱] الـہ بمعنی معبود ہےاوروہ عبادت سےمشتق ہے،اورلفظ عبادت کے معنے کی تحقیق سورت فاتحہ میں گذر گئی ہے، قران مجید میں عبادت کی زیادہ تر چار قسمیں آئی ہیں :۱:غائبانہ حاجات میں پکارنا،۲:نذرونیاز دینا،۳:سجدہ کرنا،۴:طواف کرنا۔

اگرغائبانہ حاجات میں اللہ تعالیٰ کو پکارا گیا،اوراس سے ڈرکریااس سےامیدرکھ کراس کے سامنے سجدہ کیا گیا، اوراس کے نام کی نذرونیاز دیگئی،اوراس کے گھر (بیت اللہ) کا طواف کیا گیا،تو یہ سب کچھ اللہ کی عبادت ہوگی،اوراگر یہ امور غیراللہ کے لئے کئے گئے :مثلاً کسی پیغمبرکو غائبانہ حاجات میں پکارا گیا۔یا اس سے ڈرکریاامیدرکھ کراس کی قبر کے سامنے سجدہ کیا گیا۔اس کے نام کی نذر ونیازدی گئی،یااس کی قبر کا طواف کیا گیا،تو یہ اس کی عبادت ہوگی۔ان تمام اقسام کوکماحقہ سمجھنے کئے لئے عبادت کے معنی سمجھنے ضروری ہیں۔

(قانون لفظ ''الــــہ'') جہاں کہیں قرآن مجید میں ''الہٰ'' کا لفظ آجائے اور غیر اللہ سے الہ ہونے کی نفی کی جارہی ہو، وہاں غیر اللہ سے (خواہ وہ نبی ہو یا ولی) غائبانہ حاجت میں مافوق الاسباب متصرف فی الامور ہونے کی نفی کی جائے گی، اور علم غیب کی بھی نفی کی جائے گی۔

لیکن زیادہ تر متصرف فی الامور ہونے کی نفی کی جاتی ہے، کیونکہ اس سے علم غیب کی نفی لازم آتی ہے۔جیسا کہ سورت مائدہ: ۱۷،نمبرایت سے ۲۱،تک۔

یہاں ان ایات میں عیسی علیہ السلام اوران کی والدہ محترمہ سے ''الہ'' ہونے کی نفی کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں محتاج ہیں، اور نفع ونقصان کا اختیار بھی نہیں رکھتے ،اور ہر شے کو جاننے والے بھی نہیں۔ یہاں بھی مقصد یہ ہے کہ غائبانہ حاجات میں عیسی علیہ السلام اوران کی والدہ نافع اور ضار نہیں۔اوراسی طرح سورت انعام کا ایت: ۱،۲،۳،۱۲،اور ۱۷، دیکھئے توان ایات کا حاصل یہ ہے کہ امور مذکورہ فی الایات میں غائبانہ اور مافوق الاسباب متصرف صرف اللہ کریم ہی ہے، اور ہر شے کا جاننے والا بھی وہی ہے۔لہذا اگر وہ کوئی ضرر پہنچانا چاہے تو کوئی دور نہیں کرسکتا اور اگر وہ نفع پہنچانا چاہے تو قادر ہے،اوراسے کوئی روک نہیں سکتا۔چوتھی ایت پہلی تین ایت پر متفرع ہے،اوران ایات کے بعد: أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَى قُل لَّا أَشْهَدُ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَـٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنَّنِي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿۱۹﴾ (انعام)۔ سے نتیجہ نکالا گیا کہ اللہ تعالی کے سوا کوئی دوسرا الہ نہیں، کیونکہ کسی میں یہ امور مذکورہ ، مافوق الاسباب، غائبانہ حاجات میں نہیں پائے جاتے ،اوراسی طرح سورت ال عمران اول سے...... '' كيف يشـاء '':۶،تک،ان ایات سے دلیل بیان کی گئی ہے،جس میں دو امور غائبانہ حاجات میں ظاہری اسباب کے علاوہ بیان کئے گئے ہیں،۱: متصرف فی الامور اللہ تعالی ہی ہے (۲) ہر شے کا جاننے والا بھی اللہ تعالی ہی ہے۔اس کے بعد **لااله الاهو العزيزا لحكيم** سے نتیجہ نکالا گیا۔

اسی طرح سورت قصص ایت ۶۸ ، سے ۷۳،تک،ان ایات میں بھی وہی دعویٰ اور دلائل توحید ہیں،اوران دلائل میں ان ہی دو امور یعنی غائبانہ حاجات میں متصرف اور غیب دان اللہ تعالی ہی ہے ،کوخوب واضح کیا گیا ہے۔اس ایت میں ''ولـــه الـحـكـم '' سے غائبانہ حاجات میں نفع ونقصان کا حکم مراد ہے،اور ظاہری اسباب کے ماتحت حکم مراد لینے سے بہتر ہے۔اسی طرح سورت طٰہٰ کی اول ایتوں میں بھی ذکر مافوق الاسباب امور میں متصرف اور غیب دان ہونے کا ہے۔

اب اگــر کــوئــی ســوال کــریــے : کہ اگر اللہ تعالی کو عالم الغیب بالذات اور غائبانہ حاجات میں متصرف فی الامور بالذات تسلیم کرلیا جائے ،جیسا اس کے شایان شان ہے، اور انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ اور اولیاء کرام کو عالم الغیب

بالعرض، یعنی بالواسطہ باعلام اللہ (عطائی) اور غائبانہ حاجات میں متصرف فی الامور بالعرض یعنی بتملیک اللہ، یعنی اللہ کی دی ہوئی طاقت سے تسلیم کیا جائے، جیسا کہ ان کے شایان شان ہے، تو کیا پھر بھی شرک ہوگا۔ شرک تو تب ہوتا کہ ان کو بھی بالذات مانا جاتا۔

تو جواب یہ ہے کہ مشرکین مکہ اپنے معبودوں کو غائبانہ حاجات میں متصرف فی الامور بالذات نہیں مانتے تھے، بلکہ انہیں متصرف فی الامور بالعرض بتملیک اللہ، جان کر پکارتے تھے، جیسا کہ مشرکین مکہ بوقت تلبیہ حج کہا کرتے تھے: **لبیک لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک الاشریکاھولک تملکہ وماملک** ۔ابن کثیر: ۴۴۵/۴۔ اسی طرح صحیح مسلم ۳۷۶/۱، اور بخاری، میں ابوجہل کا تلبیہ ایا ہے۔ اسی طرح: **مانعبدھم الالیقربناالی اللہ زلفی** (سورت الزمر: ۳)۔ اس ایت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: انہوں نے بتوں کی طرف قصد کیا کہ انہیں ملائکہ مقربین کی صورتوں پر بنالیا تھا۔ اوران کی عبادت ملائکہ مقربین کی عبادت کے قائمقام سمجھ کر کی، تاکہ وہ اللہ تعالی کے ہاں ان کے رزق اور مدد اور جنہیں امور دنیا سے خیال کیا جاسکتا ہے، کے لئے اللہ تعالی سے سفارش کریں۔ اور قیامت کے تو منکر ہی تھے۔

اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں ایت کریمہ: ''**فلاتجعلو اللہ اندادا**'' (بقرہ:۲۲) لکھا ہے: جان لے کہ دنیا بھر میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اللہ کا ایسا شریک مانے جو کہ وجود، قدرت، علم اور حکمت میں اس کے برابر ہو۔ یہ ان میں سے ہے جن کا وجود ابھی تک نہیں ہوا۔ اور اللہ تعالی کے سوا دوسروں کو معبود بنانا، تو اس کے قائل بکثرت موجود ہیں۔

دوسرا سوال: قران مجید نے: ''**فلاتجعلو اللہ انداد**'' میں ''ند'' کی نفی کی ہے، جس کے معنی مساوی اور مماثل کے ہیں، معلوم ہوا کہ کسی کو اللہ کے مساوی اور مماثل نہ بنانا چاہئے۔

جواب: تفسیر ابوسعود میں اس مقام پر لکھا ہے کہ چونکہ ان لوگوں نے اللہ تعالی کی عبادت کے بجائے اپنے معبودوں کی عبادت شروع کردی تھی۔ اللہ کریم نے زجر سے فرمایا کہ انہوں نے اللہ تعالی کے لئے ند بنالئے ہیں، جو کام اللہ تعالی کے لئے کرنا چاہئے تھا وہ انہوں نے اپنے معبودوں کے لئے شروع کردیا۔

سوال: اگر انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام اور ملائکہ عظام کو غائبانہ حاجات میں متصرف فی الامور بالعرض بھی نہ مانا جائے بلکہ اللہ جل شانہ کے دربار میں سفارشی سمجھ کر پکارا جائے تو کیا یہ بھی شرک ہے؟۔

جواب: یہ بھی شرک ہے، مکہ کے مشرک اپنے معبودوں کو سفارشی سمجھ کر پکارتے تھے، جیسا کہ پہلی ایت میں ''**مانعبدھم**

الالیقربناالی الله زلفی ”سورت الزمر(۳)۔اورسورت یونس میں ہے: وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّهِ مَا لاَ يَضُرُّهُمْ وَلا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلاء شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللّهِ ﴿۱۸﴾ اللہ کے سوا ان معبودان باطلہ کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

امام رازی اور علامہ ابوسعود نے لکھا ہے: علماء نے اس میں اختلاف کیا کہ انہوں نے پتھروں کے حق میں کیسے کہا کہ یہ اللہ تعالی کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔اوراس میں کئی قول نقل کئے ہیں: جن میں سے چوتھا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں، پیروں اور فقیروں کی شکلیں ان بتوں کی سی بنالیں، اور گمان کیا کہ جب یہ ان مورتیوں کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں، تو وہ پیغمبر اور پیر وفقیر اللہ کے ہاں ان کے سفارشی ہوتے ہیں۔اس زمانہ میں اس کی نظیر بہت سے لوگوں کا، پیروں،فقیروں کی قبروں کی تعظیم میں مشغول ہونا ہے، اس اعتقاد پر کہ جب وہ ان کی قبروں کی تعظیم کرینگے تو وہ اللہ کے ہاں ان کے سفارشی ہونگے کیا انہوں نے اللہ کے سوا اوروں کو سفارشی بنالیا ہے؟ سورۂ زمر میں ہے: أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللهِ شُفَعَاء قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لا يَمْلِكُونَ شَيْئاً وَلا يَعْقِلُونَ ﴿۴۳﴾

فرما دیجئے کہ وہ اگر چہ کسی چیز کے مالک بھی نہ ہوں اور نہ ہی سمجھتے ہوں۔تب بھی۔

سوال: ”من دون الله“ بت تھے، ان کو پکارنا، اور سفارشی بنانا، بیشک شرک ہے، لیکن اولیائے کرام وغیرہ کو پکارنا اور سفارشی بنانا کیونکر شرک ہے؟

جواب: پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مشرکین مکہ جنہیں سفارشی بناتے تھے، وہ انبیاء علیہم السلام، اولیاء کرام اور ملائکہ تھے، ان کی صورتوں پر بت بنا کر ان کی عبادت کرتے تھے، جیسا کہ تفاسیر کے حوالہ جات نیز بخاری شریف وغیرہ کے حوالہ سے بیان ہو چکا ہے کہ ودّ، سواع وغیرہ بزرگان دین میں سے تھے۔”ان الذين تدعون من دون الله عبادامثالكم “. الاعراف: (۱۹۴) جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہوں وہ تم جیسے بندے ہیں۔

سوال: اگر ہر وقت انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کو غائبانہ حاجات میں حاجت روا نہ سمجھا جائے، بلکہ ان کو بعض وقت سفارشی سمجھ کر پکارا جائے، اور بعض اوقات اللہ تعالی کو پکارا جائے تو کیا یہ بھی شرک ہے؟۔

جواب: مشرکین مکہ بھی اپنے معبودوں کو ہر وقت اور ہر کام میں نہیں پکارتے تھے، بلکہ زیادہ کھٹن کاموں میں وہ اللہ تعالی ہی کو پکارتے تھے۔جیسا کہ سورت یونس آیت: ۲۲، اور سورت عنکبوت ایت: ۶۵، سورت الروم ۳۴، سورت لقمان ایت: ۳۲، سورت نحل: ۵۳، ۵۴، سورت انعام: ۶۳، اور سورت الزمر: ۸، میں ملاحظہ کریں۔

اورحدیث میں ہے:عن عمران بن حصینؓ قال: قال النبیﷺ لابی ،یاحصین کم تعبد الیوم الھا؟قال ابی سبعة،ستافی الارض وواحدافی السماء ،قال فایھم تعدلر غبتک ورھبتک؟قال الذی فی السماء ،قال یاحصین اماانک لو اسلمت علمتک کلمتین تنفعانک ۔الحدیث(مشکواۃ:باب الاستعاذة الفصل الثانی: ۱:۲۱۷)۔اورحدیث،عکرمہؓ جوکہ امام نسائی وغیرہ نے نقل کیا ہے،اس باب میں زیادہ مشہور ہے۔ ان ایات اوراحادیث سے معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ بھی ان مصائب کے وقت صرف اللہ تعالی ہی کو پکارتے تھے،اورمصائب کے دور ہوجانے کے بعد اپنے معبودوں کو پکارنا شروع کردیتے تھے،لیکن پھربھی قوانین اسلامی کے رو سے مشرک تھے ،اورآج کل کے مشرک توان سے بھی بڑے ہوئے ہیں، ایسے مصائب کے وقت بھی اپنے ہی معبودوں کو پکارتے ہیں۔چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

بگرداب بلا افتاد کشتی مدد کن یا معین الدین چشتی

اورکوئی کہتا ہے: بہاؤالحق،بیڑا دھک۔(معاذ اللہ)۔

مسئلہ اثبات الٰہ

مشرکین مکہ اللہ تعالی کے وجود کے قائل تھے،اوراس کی ہستی اوربعض صفات کے منکر نہیں تھے،قران کریم میں اس کا ذکر کئی ایتوں میں موجود ہے:سورت عنکبوت :۶۱،۶۲،۶۳،سورت زخرف:۹،۸۷،سورت مومنون: ۸۴،۸۵، ۸۶،۸۷،۸۸،۸۹سورت یونس:۳۱۔ان ایات سے معلوم ہوا کہ اسمانوں اورزمین سے رزق دینے والا،کانوں اورانکھوں کا مالک ،یعنی ضامن ،کافر سے مومن پیدا کرنے والا، اورمومن سے کافر پیدا کرنے والا ،اورازاد سے غلام اورغلام سے ازاد پیدا کرنے والا ،اورتمام امور کی تدبیر کرنے والا ،اور ہر شے پرغالب اور بڑے علم والا،انسانوں کو پیدا کرنے والا، اور ہر شے کو قبضہ قدرت میں رکھنے والا،ہر شے کو پناہ دینے والا،جس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہ مل سکے،صرف اللہ ہی کو جانتے تھے،اورمذکورہ صفات میں ’’وحدہ لاشریک لہ‘‘ جانتے تھے۔

امام رازی اورابن کثیر وغیرہ نے اللہ تعالی کے وجود پرسورت بقرہ کی ایت نمبر۲۱، سے استدلال کیا ہے،اوراس کے متعلق مختلف واقعات نقل کئے ہیں،فرماتے ہیں:فی الواقع یہ آیت اللہ تعالی کے وجود پر بڑی دلیل ہے،زمین اورآسمان کی مختلف شکل وصورت ،ومختلف رنگ،مختلف مزاج،اورمختلف نفع کی موجودات،ان میں سے ہرایک کا نفع بخش ہونا،اوران کے خالق کے وجود کا خاص حکمت کا حامل ہونا،اوراس کی عظیم الشان قدرت،حکمت اورزبردست سطوت ،اورسلطنت

کا ثبوت ہے۔

کسی بدوی سے پوچھا گیا کہ اللہ تبارک وتعالی کے موجودگی کی کیا دلیل ہے؟ تو اس نے کہا ''**یاسبحان الله، ان البعر لیدل علی البعیر، وان اثر الاقدام لتدل علی المسیر، فسماء ذات ابراج، وارض ذات فجاج، وبحار ذات امواج، الایدل ذلک علی وجود اللطیف الخبیر**'' یعنی مینگنی سے اونٹ معلوم ہو سکے، اور پاؤں کے نشان کو زمین پر دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ کوئی آدمی گیا ہے، تو کیا یہ برجوں والا آسمان، یہ راستوں والا زمین، یہ موجیں مارنے والے سمندر۔ اللہ تعالی باریک بین اور باخبر کی وجود پر دلیل نہیں بن سکتے؟۔

امام مالکؒ سے ہارون الرشید نے پوچھا کہ اللہ تعالی کی وجود پر کیا دلیل ہے؟ آپ نے فرمایا زبانوں کا مختلف ہونا، اوازوں کا جداگانہ ہونا، نغموں کا الگ ہونا، ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ سے بھی یہی سوال ہوتا ہے، تو آپ جواب دیتے ہیں، کہ چھوڑو میں ابھی کسی اور سوچ میں ہوں، لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ایک بہت بڑی کشتی جس میں طرح طرح کی تجارتی چیزیں ہیں، نہ کوئی اسکا نگہبان ہے، نہ چلانے والا۔ باوجود اس کے وہ برابر آ جا رہی ہے، اور بڑی بڑی موجوں کو خود بخود چیرتی پھاڑتی گذر جاتی ہے، ٹھہرنے کی جگہ پر ٹھہر جاتی ہے، چلنے کی جگہ چلتی رہتی ہے، نہ کوئی اس کا ملاح ہے، نہ منتظم۔ سوال کرنے والے دہریوں نے کہا، آپ کیسی بات کرتے ہیں، کوئی ایسی بات کہہ سکتا ہے کہ اتنی بڑی کشتی اتنی بڑی نظام کے ساتھ تلاطم والے سمندر میں آئے جائے، اور کوئی اس کا چلانے والا نہ ہو؟ آپ نے فرمایا، افسوس تمہاری عقلوں پر، ایک کشتی تو بغیر چلانے والے نہ چل سکے، لیکن یہ ساری دنیا، اسمان وزمین کی سب چیزیں ٹھیک اپنے کام پر لگی رہیں، اور ان کا مالک، حاکم، خالق کوئی نہ ہو؟ یہ جواب سنکر وہ لوگ لاجواب ہو گئے، اور حق معلوم کر کے مسلمان ہو گئے۔

امام شافعیؒ سے بھی یہ سوال ہوا، تو آپ نے جواب دیا، کہ توت کی پتے ایک ہی ہیں، ایک ہی ذائقہ کے ہیں کیڑے اور شہد کی مکھی، اور گائیں، بکریاں، ہرن وغیرہ سب اس کو کھاتے، اور چرتے، چگتے ہیں، اسی کو کھا کر کیڑے میں سے ریشم نکلتا ہے، مکھی شہد دیتی ہے، ہرن میں مشک پیدا ہوتا ہے، اور گائے، بکریاں، مینگنیاں دیتی ہیں، کیا یہ اس امر کی صاف دلیل نہیں؟ کہ ایک پتے میں یہ مختلف خواص پیدا کرنے والا کوئی ہے؟ اور اس کو ہم اللہ تبارک وتعالی مانتے ہیں، وہی موجد اور صانع ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک مرتبہ وجود باری تعالی پر دلیل طلب کی جاتی ہے، تو آپ نے فرمایا: سنو! یہاں

ایک نہایت مضبوط قلعہ ہے جس میں کوئی دروازہ نہیں، نہ کوئی راستہ ہے، بلکہ سوراخ تک نہیں۔ باہر سے چاندی کی طرح چمک رہا ہے، اوراندر سے سونے کی طرح دمک رہا ہے۔اوراوپر، نیچے، دائیں بائیں، چاروں طرف سے بالکل بند ہے۔ہوا تک اس میں نہیں جاسکتی ،اچانک اس کی ایک دیوارگرتی ہے، اور جاندارانکھوں، کانوں والا خوبصورت بولتا چالتا،خوبصورت شکل اور پیاری بولی والا، چلتا پھرتا نکل آتا ہے،کہواس بند اور محفوظ مکان میں اسے پیدا کرنے والا کوئی ہے یانہیں؟ اور وہ ہستی انسانی ہستیوں سے بالاتر،اوراس کی قدرت غیر محدود ہے یانہیں؟ آپ کا مطلب یہ تھا کہ انڈھے کودیکھوں چوطرف سے بند ہے، پھراس میں پروردگار،خالق ، یکتا، جاندار بچہ پیدا کر دیتا ہے۔یہی دلیل ہے اللہ کے وجود پر،اوراس کا توحید پر۔

ابونواس سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو کہا، کہ اسمان سے بارش کا برسنا،اس سے درختوں کا پیدا ہونا،اوران ہری ہری شاخوں پرخوش ذائقہ میوں کا لگنا، ہی اللہ تعالی کے وجوداوراس کی وحدانیت کی کافی دلیل ہے۔

ابن المعتز کا قول ہے،افسوس اللہ تعالی کی نافرمانی اوراس کے تکذیب پرلوگ کیسی دلیری کر جاتے ہیں، حالانکہ ہر ہر چیز اس پروردگار کی ہستی اور لاشریک ہونے پر گواہ ہے۔

بعض علماء کا مقولہ ہے، کہ اسمانوں کودیکھوان کی بلندی ،ان کی وسعت، ان کے چھوٹے بڑے چمکیلے اورروشن ستاروں پرنظرڈالو،ان چمکنے اوردمکنے ،ان کے چلنے پھرنے اورٹھہرجانے، ظاہرہونے اورچھپ جانے کا مطالعہ کرو۔سمندروں کودیکھو جوموجیں مارتے ہوئے زمین کوگھیرے ہوئے ہیں۔پھراونچے نیچے مضبوط پہاڑوں کودیکھو، جوزمین میں گڑے ہوئے ہیں،اوراسے ہلنےنہیں دیتے۔جن کے رنگ،جن کی صورتیں مختلف ہیں، پھرقسم قسم کی اورمخلوقات پرنظرڈالو، پھرادھر سے ادھر پھرے جانے والی کھیتیوں اور باغوں کوشاداب کرنے والی خوشنما نہروں کودیکھو،کھیتوں اور باغوں کی سبزیوں اوران کے طرح طرح کے پھل پھول مزے مزے کے میووں پرغورکرو۔زمین ایک، پانی ایک،لیکن شکلیں ،صورتیں اورخوشبو میں، رنگت ،ذائقہ اور فائدہ میں الگ الگ ہیں،کیا یہ تمام مصنوعات تمہیں نہیں بتاتیں کہ ان کا صانع کوئی ہے؟ کیا یہ تمام موجودات باوآز بلندنہیں کہہ رہی ہیں کہ ان کا موجدکوئی ہے؟ کیا یہ ساری مخلوق اپنے خالق کی ہستی،اس کی ذات،اوراس کی توحید پردلالت نہیں کرتی ؟ یہ ہیں وہ زوردار دلائل جواللہ تعالی نے اپنی ذات کے منوانے کے لئے ہرنگاہ کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔جواس کی زبردست قدرتوں،اس کی پرزورحکمتوں،اس کی لاثانی رحمتوں،اس کے بینظیر انعاموں، اس کے لازوال احسانوں پردلالت کرنے کے لئے کافی وافی ہیں، ہمارا اقرار ہے، کہ اس کے سوا کوئی

پالنے پوسنے والا، نہ اسکے سوا کوئی پیدا کرنے ،اورحفاظت کرنے والا، نہ اس کے سوا کوئی معبود برحق ،نہ اس کے سوا کوئی مسجود لاشک ، ہاں دنیا کے لوگوں سن لو! میرا توکل اور بھروسہ اسی پر ہے ،میری انابت اورالتجا اسی کی طرف ہے۔ میرا جھکنا اور پست ہونا،اسی کے سامنے ہے،میری تمناؤں کا مرکز،میری امیدوں کا آسرا،میرا ماٗ وٰی اور ملجاو ہی ایک ہے،اسی کے دست رحمت کو دیکھتا ہوں۔

اسی طرح قران کریم میں لفظ''الہٰ'' کی کچھ معانی اور مصداقات ہیں : جیسا کہ سورت نمل :٦٠،٦١، ٦٢،٦٣،٦٤،٦٥، میں ۔ان ایات میں''الہٰ'' کے معانی یہ بتائے گئے ،کہ اسمانوں اورزمین کے پیدا کرنے کی طاقت، اسمانوں سے پانی اتارنے کی طاقت ، بارش سے درختوں کے پیدا کرنے کی طاقت ۔اسی طرح زمین کو پیدا کرنے کے بعداس کو برقرار رکھنے کی طاقت ،زمین سے پانی نکالنے کی طاقت، زمین پر پہاڑوں کو رکھ کراسے برقرار رکھنے کی طاقت ،مختلف ذائقوں کے دریاؤں کواکٹھا چلاکر درمیان میں پردہ ڈالنے کی طاقت ، پریشان آدمی کی پکار سننے کی طاقت، برائی دورکرنے کی اورزمین پرخلیفہ بنانے کی طاقت، دریاؤں اورخشکیوں میں راستہ نہ ملنے پر رہنمائی کرنے والا، باران رحمت آنے سے پہلے ٹھنڈی ہوائیں ،خوشخبری کے طور پر چلانے کی طاقت ۔اسی طرح تمام مخلوق کی پیدا کرنے کی طاقت، دوبارہ زندہ کرنے کی طاقت، اسمان اورزمین سے رزق دینے کی طاقت ۔ان معانی کے بیان کے ساتھ ساتھ مذکورہ ایتوں میں ان صفات کا ثبوت صرف اللہ تعالی کے لئے ،اوردوسروں سے نفی بھی بیان ہوئی ،اوراس کے باجود بعض مسلمان مذکورہ صفات میں اللہ تعالی کا شریک ٹھہراتا ہے، شاعر نے کیا خوب کہا:

وہ کیا ہے جو نہیں ملتا خدا سے جسے تم مانگتے ہو اولیاء سے

غیرحق راہر کہ خواندا ے پسر کیست درعالم از وگمراہ تر

تفسیر تنویر المقباس:٣١٦، میں لفظ''الہٰ'' کے کچھ معانی بیان کئے ہیں: تکمیل فائدہ کے لئے ہم ناظرین کے لئے نقل کرتے ہیں:''لاالہٰ'' کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: **لاضار ولانافع ولامانع ولامعطی ولامعزولامذل** الخ یعنی مجرم کوضرر دینے والا، دوستوں کوفائدہ پہنچانے والا،منع کرنے اوردینے والا،عزت اورذلت دینا''الہٰ'' کے معانی کو شامل ہیں۔

الـرَّحْـمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ إِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ
مہربان (اور) رحم والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن
الـلَّيْـلِ وَالـنَّهَـارِ وَالْـفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا
کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں
أَنْـزَلَ اللّٰـهُ مِنَ السَّـمَـآءِ مِنْ مَّـآءٍ فَأَحْيَـا بِـهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَـا
اور بادل جس کو اللہ تعالیٰ آسمان سے برساتا اور اُس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ (یعنی خشک ہونے کے بعد سرسبز) کر دیتا ہے
وَبَـثَّ فِيْهَـا مِـنْ كُـلِّ دَآبَّةٍ وَّتَـصْـرِيْفِ الـرِّيَـاحِ وَالسَّـحَابِ الْمُسَخَّرِ
اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو
بَيْـنَ السَّـمَـآءِ وَالْأَرْضِ لَآيٰـتٍ لِّـقَـوْمٍ يَّـعْـقِـلُـوْنَ ﴿۱۶۴﴾
آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں (ان سب میں) عقلمندوں کے لئے (اللہ تعالیٰ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں
وَمِـنَ الـنَّـاسِ مَنْ يَّتَّـخِـذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰـهِ أَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰـهِ
اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو (اللہ کا) شریک بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں
وَالَّـذِيْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَـوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْآ إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ
لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اور اگر ظالم لوگ جو بات عذاب کے وقت دیکھیں گے
أَنَّ الْـقُـوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًـا وَّأَنَّ اللّٰهَ شَدِيْـدُ الْعَـذَابِ ﴿۱۶۵﴾
(وہ بات) اب دیکھ لیتے کہ سب طرح کی طاقت اللہ ہی کو ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے
إِذْ تَبَـرَّأَ الَّـذِيْـنَ اتُّبِـعُـوْا مِـنَ الَّـذِيْـنَ اتَّبَـعُـوْا وَرَأَوُا الْـعَـذَابَ
اُس دن (کفر کے) پیشوا اپنے پیروی کرنے والوں سے بیزاری ظاہر کریں گے اور (دونوں) عذاب (الٰہی) دیکھ لیں گے

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً
اور اُن کے آپس کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ (یہ حال دیکھ کر) پیروی کرنے والے (حسرت سے) کہیں گے
فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا كَذٰلِكَ
کہ اگر ہمیں پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا کہ جس طرح یہ ہم سے بیزار ہو رہے ہیں اسی طرح ہم بھی اُن سے بیزار ہو جائیں
يُرِيْهِمُ اللّٰهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ
اس طرح اللہ اُن کے اعمال انہیں حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے
النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّباً وَّلَا تَتَّبِعُوْا
لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو
خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ
وہ تمہارا کھلا دشمن ہے ۔ وہ تو تمہیں بُرائی اور بے حیائی ہی کے کام کرنے کو کہتا ہے
وَالْفَحْشَآءِ وَأَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمُ
اور یہ بھی کہ اللہ کی نسبت ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں (کچھ بھی) علم نہیں ۔اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے
اتَّبِعُوْا مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَآءَنَا
کہ جو (کتاب) اللہ نے نازل فرمائی ہے اُس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ (نہیں) بلکہ ہم تو اُسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا
أَوَلَوْ كَانَ آبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾
بھلا اگرچہ اُن کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ سیدھے رستے پر ہوں (تب بھی وہ انہیں کی تقلید کئے جائیں گے)[۴۲]

[۴۲] مسئلہ تقلید

اکثر مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں مسئلہ تقلید ذکر کیا ہے۔ چونکہ آج کل اس مسئلہ کی وضاحت بہت ضروری ہے، تو اس وجہ سے ہم ان مفسرین کے اتباع میں یہ مسئلہ تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔ ایسے مضمون والے آیات قرآن مجید میں سورۃ مائدہ:۱۰۴، اور سورۃ لقمان:۲۱، میں بھی مذکور ہیں۔

تقلید کی لغوی اور اصطلاحی تعریف: عربی لغت میں تقلید، کسی کی گردن میں طوق ڈالنے کو کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ: ''قلائد،، ان جانوروں کو کہتے ہیں جن کے گلے میں رسی ڈال دی گئی ہو، اور حرم شریف کیلئے وقف کیا گیا ہو، سورۃ مائدہ کی شروع میں ہے (ولا القلائد) اور متفق علیہ حدیث میں ہے عائشہؓ سے کہ: فتلت قلائد بدن النبی ﷺ بیدیّ ثم قلدها واشعرها واهداها فماحرم علیه شئ کان احل له خ: ۱۶۹۶، م: ۱۳۲۱. ابوالوفاء ابن عقیل: الواضح فی اصول الفقہ: ۲۳۷/۵، میں لکھتا ہے: وحد التقلید، الرجوع الی قول الغیر بغیر حجة، ماخوذ من تقلیده بالقلادة وجعلها فی عنقه۔ غیاث اللغات میں تقلید کی تعریف یوں کی گئی ہے، گردن بند درگردن انداختن وکاربعھدۂ کسے ساختن وبرگردن خود کاربگرفتن۔ ومجازاً بمعنی پیروی کسی بے دریافت حقیقت آن: (۱۶۱) تقلید گلے میں رسی ڈالنے یا کسی کے ذمے کوئی کام لگانے کا نام ہے۔ اسی طرح اپنے ذمے کوئی کام لینا بھی تقلید کہلاتا ہے، اس کا مجازی معنی یہ ہے کہ حقیقت معلوم کئے بغیر کسی کی تابعداری کی جائے۔ شرح مختصر الروضۃ میں ابن سعید الطّوفی: ۶۵۰/۳، لکھتا ہے: التقلید لغة جعل شئ فی العنق محیطابه و الشئ قلادة، وشرعاقبول قول الغیر من غیر حجة، کأن المقلدیطوق المجتهداثم ماغشه به فی دینه وکتمه عنه من علمه، علی وجه الاستعارة (یعنی من التقلید اللغوی)۔

علماء تفسیر کی اصطلاح میں تقلید کی کئی تعریفیں کی گئی ہیں۔

(۱) ھوعمل بقول الغیر من غیر حجة: کسی دوسرے کے قول پر بغیر دلیل کے عمل کرنا تقلید کہلاتا ہے۔ یعنی کسی شخص کے اقوال پر یہ جانے بغیر عمل کرنا کہ یہ اقوال اس نے کتاب وسنت سے اخذ کئے ہیں یا کہیں اور سے۔ (ارشادالفحول: ۴۴۱، شرح قصیدہ امالیہ (ضوء المعالی) لملاعلی قاری حنفیؒ: ۸۳، مسلم الثبوت مع فواتح الرحموت: ۴۴۴/۲، قرطبی: ۲۱۱/۲)۔

(۲) التقلید، العمل بقول من لیس قوله احدی الحجج بلاحجة، تقلید ایسے شخص کی بات پر عمل کرنے کو

کہتے ہیں جس کی بات بغیر دلیل کے حجت نہیں ہے ،(التحریر مع التیسیر ،لابن ہمام:۴/۲۴۱،عقدالفرید،لملاحسن شرنبلالی :۱۵،معیارحق:۳۶)۔

(۳) علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: التقلیدعند العلماء ،حقیقته قبول قول بلاحجة: ۲/۲۱۱،وقال علمائنا،وقوة الفاظ هٰذه الاٰية تعطى ابطال التقليد :علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت کے الفاظ کی قوۃ تقلید کو باطل کرتے ہیں (قرطبی:۲/۲۱۱)۔

(۴) بحرالعلوم علامہ سیدامیر علی ملیح آبادی فرماتے ہیں ۔ایسے شخص کیلئے تقلید کرنا ممنوع ہے جونظر اوراجتھاد پر قدرت رکھتا ہو۔(اور رہا دین میں غیر آدمی کا اتباع کرنا کسی دلیل سے یہ جان کر کہ یہ محق ہے) جیسے انبیاء علیہم السلام یا مجتھدین فی الاحکام کی اتباع کرنا درحقیقت یہ تقلید نہیں ، بلکہ جواللہ تعالیٰ نے اتارا اسکا اتباع ہے ۔فعلیٰ ھذا تقلید یہ ہوئی کہ احکام دین میں غیر کا قول بلادلیل مان لینا (مواہب الرحمن:۲/۶۹)۔

(۵) صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:وفی الآیت دلیل على المنع من التقليدلمن قدر على النظر واما اتباع الغير فى الدين بعدالعلم بدليل مانه محق، فاتباع فى الحقيقت لما انزل اللهوليس من التقليد المذموم فى شىء(۲/۴۱)۔

(۶) صاحب بیضاوی لکھتے ہیں:وهودليل على المنع من التقليد لمن قدر على النظر والاجتهاد (۱/۴۴۷)مع حاشیہ کازرونی۔

۷) ابوسعودمحمد بن محمد العمادی لکھتے ہیں:هٰذه الآيت نزلت فى المشركين، امروااتباع القران وسائر ماانزل اللهتعالى من الحجج الظاهرة والبينات الباهرة فجنحواللتقليد(تفسیر ابوسعود:۱/۱۸۸)

(۸) ابوللیث نصر بن محمد السمر قندی لکھتے ہیں: فكأنه نهاهم عن التقليدوامرهم بالتمسك بالحجة (تفسیر سمرقندی:۱/۱۷۵)۔

(۹) امام عبدالرحمٰن بن محمد الثعالبی لکھتے ہیں:وقوة الفاظ هٰذه الاية تعطى ابطال التقليدواجمعت الامة علىٰ ابطاله فى العقائد(تفسیر ثعالبی:۱/۳۵۵)۔

(۱۰) امام رازی رقمطراز ہیں:انما ذكراللهتعالى 'هذه الآيت عقيب الزجر عن اتباع خطوات الشيطان تنبيها علىٰ انه لافرق بين متابعة وساوس الشيطان وبين متابعة التقليد ،وفيه اقوى دليل علىٰ

وجوب النظر والاستدلال، وترک التعویل علیٰ مایقع فی الخاطر من غیر دلیل، اوعلیٰ مایقوله الغیر من غیر دلیل،وعنده تفصیل (تفسیر کبیر:۲/۷۷و۸۷:۴)وغیرہ مواضع میں یہ مسئلہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

(۱۱) قاضی عبدالحق بن غالب بن عطیہ الاندلسی: اپنی تفسیر" المحرر الوجیز"میں لکھتے ہیں:و قـوة الفاظ هٰذه الایة تعطی ابطال التقلید(۴۵/۲)۔

(۱۲) ابوحیان محمد بن یوسف الاندلسی یوں فرماتے ہیں:وفی هٰذادلالة علیٰ ذم التقلید(البحر المحیط :۱۰۳/۲)۔

(۱۳) ابومنصور محمد بن محمد بن محمودالماتریدی تقلید کی ذم کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:وکـانـوا قـومـاسـفـهاءً اصحاب التقلید فقالوا انا قلدنا آبآئنافلانقلد غیرهم(تفسیر القرآن العظیم ،لہ:۱۱۹/۱)۔

(۱۴) ابن عادل لکھتے ہیں:لانتبـع ذالک وانــمـا نتبـع آبـآئـنـا واسـلافـنـا فـعـارضـوه بـالـتـقـلـیـد (اللباب:۱۵۸/۳)۔

(۱۵) ابن عجیبہ لکھتے ہیں :قال الحق جل جلاله ،ایتبعونهم تقلیداًوعمیً(البحر المدید:۱۷۴/۱)۔

یہاں اقوال مفسرین ہم نے اس وجہ سے بکثرت نقل کئے، کہ بعض کم علم لوگوں کو یہ شبہ ہے کہ اس آیت کا مسئلہ تقلید سے کوئی تعلق نہیں،اور یہ احبار ورھبان کے متعلق ہے،اور ہمارے ائمہ کرام تو ہدایت پر تھے،تو یہ قیاس مع الفارق ہے،اس وہم کے دفعہ کے لئے ابن عادل بہت تفصیل سے لکھتا ہے کہ:وصـح ان یـقـال انهـاللعطف(یعنی الواو)فالمعنی، والله اعـلـم، انهـاانکاراتباع آبائهم فی کل حال حتی فی الحالة اللتی لاتناسب ان یتبعوهم فیها،وهی تـلبسهـم بـعـدم الـعـقـل و الهـدایة ،ولـذلـک لایـجـوزحـذف هذه الواو الداخلة علی" لو"اذاکان تنبیهاعلی ان مابعدهالم یکن مناسباماقبلها. اللباب:۱۵۹/۳۔

جبکہ ابن ابی العزؒ اپنی کتاب الاتباع:۲۳،میں بھی فرماتا ہے،کہ اس آیت کا تعلق مسئلہ تقلید سے ہے :فرمایا. وان قـلـده فیـمـاتبیـن لـه فیـه أن الـدلیـل مخالف له او قدر علی النظر فی الدلیل وفهمه ولم یفعل، فهٰذا هـوالتـقـلـیـد الـمـذمـوم فان صاحبه داخل فی زمرة الذین قالوا :﴿انا وجدنا آبائنا علیٰ امة وانا علیٰ اثـارهم مقتدون﴾ [الزخرف:۲۳]والذین قال الله عنهم ﴿واذاقیل لهم اتبعوا ماانزل الله قالوا بل نتبع ماالفینا علیه آبائنا﴾۔

اورحافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: وقـد احتـج الـعـلـماء بهٰذه الآیة فی ابطال التقلید ولم یمنعهم کفر

اولئک من الاحتجاج بها، لان التشبیه لم یقع من جهة کفراحدهما وایمان الآخر، وانما وقع التشبیه بین المقلدین بغیر حجة للمقلَّد :یعنی علماء نے ان آیات سے ابطال تقلید پر استدلال کیا ہے انہیں (ان آیات میں مذکورین) کے کفر نے استدلال کرنے سے نہیں روکا، کیونکہ تشبیہ کسی کے کفر یا ایمان کی وجہ سے نہیں ہے، تشبیہ تو مقلدین میں بغیر دلیل کے (اپنے)مقلَّد (امام رہنما) کی بات ماننے میں ہے (اعلام الموقعین :۱۹۱/۲)اور ابن عبدالبر نے یہی تفصیل ذکر کی ہے: الجامع ۲۲۰/۲۔اسکی عربی عبارت بعد میں آئیگی۔

اور اس آیت سے اکثر علماء اصول نے بھی استدلال کیا ہے، بطور مثال ہم چند حوالہ جات ذکر کرتے ہیں: جن میں سے ایک جامع الاسرار والے ہیں اس نے لکھا ہے ,,لانه تعالی رد علی المقلدین بقوله ،الایة، ۴۴۴/۵،اسی طرح باجی نے بھی کتاب الاشارة:۱۳۹، میں ذکر کیا ہے، جبکہ سیوطی نے کتا ب الرد علی من اخلدالی الارض : ۱۲۴ ، میں اس ایٰت سے ردتقلید کیلئے استدلال کیا ہے،اور ولی الدین ابوزرعہ نے کتاب الغیث الھامع :۹۰۷/۳، میں اور ابن عقیل نے کتاب الواضح :۲۳۸/۵، میں: آیات سورة الزخرف :۲۲،۲۳، سے ذم تقلید کیلئے استدلال کیا ہے کہ:ان الله سبحانه ذم التقلیدفی کتابه بمثل قوله:اناوجدناابائنا،الایة۔

دوسرا جواب والد محترم نے تفسیر میں لکھا ہے: کہ لفظ ''لو'' وصلیہ ہے اور یہ ثبوت حکم محذوف پر بطریق ترقی دلالت کرتا ہے: یعنی:ایتبعون الآباء اصحاب الھدایة بغیر دلیل فکیف اذا اتبعوھم وھم ضلال، تفسیر احسن الکلام [۵۵۹/۱]:

ان آیات کے علاوہ اور آیات بھی ہیں، جن سے علماء کرام نے ردتقلید مذموم کے لئے استدلال کیا ہے۔

(۱)سورة اعراف:۲، میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿اتبعوا ماانزل الیکم من ربکم ولاتتبعوا من دونه اولیاء قلیلا ماتذکرون ﴾تفسیر قرطبی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے ''الی الکتاب والسنة'' یعنی ''ماانزل'' سے مراد کتاب وسنت ہے اور بس،اور ابن کثیر اس آیت کے تحت لکھتا ہے کہ :ودلت الآیة علیٰ ترک اتباع الآرآء مع وجود النص، یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے، کہ قرآن وحدیث کے دلائل کی موجودگی میں علماء کی آراء کو چھوڑ نا چاہئے۔تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ بغیر دلیل کے کسی بات کو ماننا (دین کے معاملے میں) حرام ہے۔

(۲)سورة بنی اسرائیل:۳۶، میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ولاتقف مالیس لک به علم ﴾اور جس کا تجھے علم نہ ہو اس کی پیروی نہ کر۔اس آیت کریمہ سے درج ذیل علماء نے تقلید کے باطل ہونے پر استدلال کیا ہے۔

ابوحامد محمد بن محمد الغزالی (المستصفی من علم الاصول:۳۸۹/۲) السیوطی (الرد علیٰ من اخلد الی الارض :۱۲۵،۱۳۰) ابن القیم (اعلام المؤقعین ۱۸۸/۲)۔

اورعلامہ قرطبی رقمطراز ہیں :التقلید لیس طریق للعلم، ولا موصولاله فی الاصول ولافی الفروع، وهو قول جمهور العقلاء والعلماء خلافا لما یحکی عن الجهال الحشویة الثعلبیة من انه طریق الی معرفة الحق :۲۱۲/۲،تقلید نہ تو علم کا راستہ ہے اور نہ اصول وفروع میں علم تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ ہوسکتا ہے، یہ قول تمام عقلاء اور علماء کا ہے، برخلاف جہال حشویہ اور ثعلبیہ کے جو تقلید کو حصول حق کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(۳)سورة توبہ:۳۱﴿اتخذوا احبارهم ورهبانهم ارباباً من دون الله﴾ یہود ونصاری نے اپنے مولویوں اور پیروں کو حاکم اور شارع کی حیثیت دی۔ یہ آیت اگر چہ یہود ونصاری کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن یہ بات بالاتفاق قانون کی حیثیت رکھتی ہے کہ :العبــــــــرة لعموم اللفظ لالخصوص السبب [التنبيه علی مشکلات الهداية: ۱۱۵۲/۳]و المستصفی: ۶۰/۲ ،کبیری:۱۸۹،یعنی لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ سبب کے خصوص (شان نزول) کا اعتبار۔اگر ایسا نہ ہو یعنی لفظ کے عموم کا اعتبار نہ کیا جائے ،تو پھر قرآن مجید کی کوئی آیت ہم پر صادق نہیں آئے گی۔دوسری بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ,,لتتبعن سنن من كان قبلكم ،،(بخاری :رقم:۷۳۲۰،مشکوٰۃ :۴۸۵/۲) یعنی تم ضرور میرے بعد اگلے لوگوں (یہود ونصاری) کی چالوں پر چلوگے۔اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنے علماء اور پیروں کو شارع کی حیثیت دی،اسی طرح اس امت کے مقلدین نے بھی اپنے ائمہ کو وہی حیثیت دی ہے۔اس آیت کی تفسیر حدیث کی رو سے ملاحظہ کریں۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں ,,الاكثرون من المفسرين قالوا ليس المراد من الارباب ،انهم اعتقدوا فيهم انهم الهة العالم، بل المراد انهم اطاعوهم فی اوامرهم ونواهيهم .ونقل ان عدی بن حاتم كان نصرانيا فانتهیٰ الی رسول الله ﷺ وهويقرأ ، سورة براءة،فوصل الی هٰذه الآية، قال فقلت لسنا نعبدهم، فقال أليس يحرمون مااحل الله، فتحرمونه ،ويحلون ماحرم الله، فتستحلونه ؟ فقلت بلی قال فتلك عبادتهم (کبیر:۳۷/۱۶) اکثر مفسرین کا قول ہے کہ اس آیت میں ,,اتخاذ ارباب ،، سے مراد ,,اتخاذ بالعبودية والالوهية ،، نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پیروں اور مولویوں کے کہنے پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بغیر دلیل کے مانا۔

حدیث میں آتا ہے، عدی بن حاتمؓ نصرانیت سے تائب ہوکر مشرف باسلام ہوئے، اور نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر سورۃ براءۃ کی یہ آیت سنی,,اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباًمن دون الله،،الخ۔تو نبی ﷺ سے سوال کیا کہ ہم نے تو ان کو الٰہ اور معبود نہیں بنایا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا. جب وہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کہتے تو تم ان کو حرام نہیں سمجھتے تھے؟ اور جب وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کہتے تو تم ان کو حلال نہیں سمجھتے تھے؟ عدی بن حاتمؓ نے فرمایا کہ ایسا ہی کرتے رہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا؛ یہی تو ان کی عبادت ہے۔

یہی تفسیر حذیفہؓ کی روایت میں بھی منقول ہے، جو کہ ابن عبدالبرؒ نے جامع بیان العلم :۲۱۹/۲، اور بیہقی نے سنن کبری:۱۱۶/۱۰، اور مدخل:۲۱۶، اور خطیب بغدادی نے کتاب الفقیہ والمتفقہ :۶۷، میں ابوالبختر ی سے نقل کیا ہے:قال قیل لحذیفةؓ فی قوله تعالی :اتخذوا احبارھم الایة[التوبه: ۳۱] أکانوا ایعبدونھم؟فقال لاولکن کانویحلّون لھم الحرام فیحلّونه ،ویحرّمون علیھم الحلال فیحرّمونه ۔یہ روایت ابن ابی حاتمؒ نے تفسیر:۱۷۸۴/۶، اور طبری نے،۱۶۶۸۹، میں نقل کی ہے۔

اور طبری نے رقم:۱۶۶۹۶، میں عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے اس آیت کی تفسیر میں، کہ آپ نے جواب میں فرمایا:زیّنوالھم طاعتھم، دوسری روایت میں ہے کہ:لم یأمروھم ان یسجدوالھم، ولکن امروھم بمعصیة الله فاطاعوھم، فسماھم الله بذلک اربابا۔تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر ابن کثیر :۳۴۸/۲، تبصیر الرحمٰن :۲۹۸/۲،جامع البیان :۱۶۶/۲ ،بیضاوی :۳۳۰/۲،مسند احمد:۴۶۴/۴، ترمذی :۱۴۰/۲ ،تفسیرابن جریرطبری :۳۹۵۷/۵، تفسیرالدرالمنثور: ۲۳۱/۳، جامع بیان العلم وفضله لابن عبدالبر: ۲۱۹/۲،۲۱۸، اعلام المؤقعین لابن القیمؒ: ۱۹۰/۲ ،الرد علی من اخلد الی الارض للسیوطی :۱۲۰ ،الفقیه والمتفقه للخطیب البغدادیؒ: ۶۷/۲ وبیهقی: ۱۱۶/۱۰، ومدخل:۲۱۶.

[۴]اوراسی طرح آیت سورة بقرہ:۱۶۶ ﴿اذتبرأ الذین اتبعوا من الذین اتبعوا ورأواالعذاب وتقطعت بھم الاسباب﴾ سے ابن عبدالبر ذم تقلید کے لئے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :ومثل ھٰذا فی القرآن کثیر من ذم التقلیدالآباء والرؤساء، وقد احتج العلماء بھٰذہ الآیات فی ابطال التقلید ،ولم یمنعھم کفر اولٰئک من الاحتجاج بھا، لان التشبیه لم یقع من جھة کفر احدھما وایمان الآخر، وانما وقع التشبیه بین التقلدین بغیر حجة للمقلَّد،کما لو قلد رجل فکفروقلد آخر فأذنب، فقلد

آخر فی مسئلة دنیاه فاخطأ وجهها ،کان کل واحد ملوما علیٰ التقلید بغیر حجة ، لأن کل ذالک تقلیدیشبه بعضه بعضا، وان اختلفت الاثام فیه ؛جامع بیان العلم و فضلہ:۲/۲۲۰۔

[۵]اورسورۃ بقرہ:۱۱۱،﴿قل هاتوا برهانکم ان کنتم صٰدقین ﴾ سے امام غزالیؒ نے(المستصفیٰ :۲/ ۳۸۹،السیوطی :الرد علیٰ من اخلد الی الارض : ۱۳۰) میں تقلید کے باطل ہونے کے لئے استدلال کیا ہے۔

[٦]اورسورۂ زخرف والی:۲۲،۲۳،آیت جو کہ پہلے گذر گئی،اوراس کے علاوہ اورآیات بھی ہیں جن سے ابن قیم نے اعلام الموقعین:۲/۱۷۲،میں استدلال کیا ہے۔

تقلید کا رد احادیث سے :۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تقلید مذاہب اربعہ وغیرہ بدعت ہے۔حافظ ابن قیم نے فرمایا:وانما حدثت هٰذه البدعة فی القرن الرابع المذموم علیٰ لسان رسول اللهﷺ,,اور(تقلید کی)یہ بدعت چوتھی صدی میں پیدا ہوئی ہے،جس(صدی)کی مذمت رسول اللہﷺ نے اپنی زبان(مقدس)سے بیان فرمائی ہے:[اعلام الموقعین :۲/ ۱۸۹، حجة اللهالبالغة، لشاه ولی اللهؒ: ۱/ ۱۵۲]،البحرالمحیط [۸/۳۴۳]الاتباع[ص:[۸۱] الرد علی من اخلد الی الارض [ص: ۱۳۳]، صون المنطق والکلام [ص:۱۲۶،الاحکام فی اصول الاحکام: لابن حزمؒ :۶/۱۴۳،اورکتاب الردعلی ابن النغریلة :۱۶۶،له ،قوت القلوب : ۱/۱۲۴] تفسیر أضوء البیان:۷/ ۵۰۹ ، بلکہ اس لفظ کے متعلق امام سیوطی ،صون المنطق:۱۷۱،میں لکھتا ہے کہ؛واما لفظ التقلید فلا نعرفه جاء فی شیء من الاحادیث واقوال السلف فیما یرجع الی الدین ،اوراسی طرح عبارت کتاب الحجة:۲/ ۱۱۹،میں بھی ہے.

بدعت کے بارے میں ارشادنبویﷺ ہے کہ:وکل بدعة ضلالة ,,اور ہر بدعت گمراہی ہے،،(صحیح مسلم کتاب الجمعةباب تخفیف الصلوٰةوالخطبة:[ح۸٦۸]۔

(۱)اور نبیﷺ نے قیامت سے پہلے کی ایک نشانی یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ :فیبقیٰ ناس جهال یستفتون فیفتون برأیهم، فَیُضِلُّوْنَ ویَضِلون [صحیح بخاری ،کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة،باب ما یذکر من ذم الرأی : ح،۷۳۰۷] پس جاہل لوگ رہ جائیں گے،ان سے مسئلے پوچھے جائیں گے،تو اپنی رائے سے

فتوی دیں گے، وہ خود بھی گمراہ ہوں گے،اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔اوراسی روایت کونقل کرنے کے بعدابن عبدالبر جامع بیان العلم[۲/۲۲۷] میں فرماتے ہیں:وھٰذاکله نفی للتقلید وابطال له، لمن فهمه وهدی لرشده.

(۲) حدثنا مطلب قال حدثنا عبدالله قال وبه حدثنی اللیث قا ل قال یحیٰ بن سعید حدثنی أبو حازم عن عمر بن مرة عن معاذ بن جبلؓ عن رسول اللهﷺ قال ایاکم وثلاثة ؛زلة عالم، وجدال منافق، ودنیا تقطع اعناقکم؛فأمازلة عالم فان اهتدیٰ فلاتقلدوه دینکم، وان زل فلاتقطعواعنه آمالکم [المعجم الاوسط : ۳۲۶/۹، ۳۲۷، شرح اصول اعتقاد اهل السنة : ۱۶۶/۱، ۱۱۷].

کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا تین چیزوں سے بچو، عالم کی غلطی ،منافق کا (قرآن لیکر) جھگڑا کرنا ،اور دنیا جوتمہاری گردنوں کوکاٹے گی۔رہی عالم کی غلطی،تواگروہ ہدایت پربھی ہوتو دین میں اس کی تقلید نہ کرو،اوراگروہ پھسل جائے تواس سے ناامید نہ ہونا۔

(۳) اوراسطرح ایک روایت معاذؓ سے موقوف منقول ہے، کہ معاذؓ نے فرمایا:یامعشر العرب کیف تصنعون بثلاث،دنیاتقطع اعناقکم ،وذلة العالم ،وجدال منافق بالقرآن ؟فسکتوا،فقال:اما العالم فان اهتدیٰ فلاتقلدوه دینکم، وان افتتن فلاتقطعوامنه اناتکم،فان المؤمن یفتتن ثم یتوب،واما القرآن فله منارکمنار الطریق،لاتخفی علی احد ،فماعرفتم منه فلاتسئلواعنه وماشککتم فکلوه الی عالمه . اما الدنیا،فمن جعل الله الغنی فی قلبه فقدافلح، ومن لا ،فلیس بنافعته دنیاه. [کتاب الزهد،لوکیع بن الجراح: ۲۹۹/۱، ۳۰۰، وابوداؤد فی الزهد :۱۷۷ ،وابونعیم فی الحلیة:۹۷/۵،جامع بیان العلم وفضله: ۲۲۲/۲].

(۴) اخبرناابو عبدالله الحافظ ثناابوالعباس محمدبن یعقوب ثنامحمدبن خالد ثنا احمدبن خالد الوهبی ثنا اسرائیل عن ابی حصین عن یحیٰ بن وثاب عن مسروق عن عبدالله ابن مسعودؓ أنه قال: لاتقلدوا دینکم الرجال فأن ابیتم فبالأموا ت لابالاحیاء۔

عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایادین میں لوگوں کی تقلید نہ کرو، پس اگرتم (میری بات کا) انکارکرتے ہو،تو مردوں کی (اقتداء) کرلو، زندوں کی نہ کرو[السنن الکبری:۱۰/۲] جبکہ طبرانی نے کبیر میں ابن مسعودؓ سے ان الفاظ میں مذکورہ روایت نقل کی ہے کہ؛ لایقلدنّ احدکم دینه رجلا فان اٰمن واٰمن وان کفر کفر، وان کنتم لابد مقتدین فاقتدوا

بالمیت فان الحی لایأمن علیه الفتنة [کبیر:۹/۱٦٦، جامع بیان العلم:۲/۲۲۷،ابوداؤد فی الزہد:۱۴۰،حلیۃ الاولیاء:۱/۱۳٦]۔

(۵) اسی طرح عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک اور روایت ابن عبدالبر نے (جامع میں) مختلف سندوں سے نقل کی ہے کہ ؛حدثنا عبدالرحمٰن بن یحیٰ قال حدثناعلی بن محمد قال حدثناأحمد بن داؤد قال حدثناسحنون قال حدثناابن وهب قال سمعت سفیان :یعنی :ابن عیینة یحدث عن عاصم بن بهدلة عن زربن حبیش عن ابن مسعودؓ أنه کان یقول: اغد عالما اومتعلما ولاتغد امعةفیمابین ذالک [جامع بیان العلم وفضلہ:۲/۲۲۳]۔

(٦) جبکہ ''امعہ'' کی تفسیر ابن عبدالبر نے خود ابن مسعودؓ سے متصل سند کے ساتھ نقل کی ہے:قال ابن وهب فسألت سفیان عن الامعة ؟فحدثنی عن ابی الزعراء عن ابی الاحوص عن ابن مسعودؓ قال کنا ندعوا الامعة فی الجاهلیة الذی یدعیٰ الیٰ الطعام فیذهب معه بغیره، وهوفیکم الیوم المحقب دینه الرجال، [جامع:۲/۲۲۳،وابوداؤد فی الزہد:۱۴۰،وحلیۃ الاولیاء:۱/۱۳۷]۔

(۷) جبکہ امام ترمذی نے حذیفہؓ سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے کہ:عن حذیفةؓ قال قال رسول اللهﷺ لاتکونوا امعة،تقولون ان احسن الناس احسنّا،وان ظلموا ظلمنا،ولکن وطّنوا انفسکم، ان احسن الناس ان تحسنوا،وان اساؤوا فلا تظلموا،[ترمذی مع التحفة : ١٣٥/٦].

(۸) اور ابوالبختری نے علیؓ سے نقل کیا ہے کہ :ایا کم والاستنان بالرجال، فان الرجل یعمل بعمل اهل الجنة،ثم ینقلب لعلم الله فیه ، فیعمل بعمل اهل النار،فیموت وهومن اهل النار ،وان ا لرجل لیعمل بعمل اهل النار فینقلب لعلم الله فیعمل بعمل اهل الجنة، فیموت وهو من اهل الجنة،فان کنتم لا بد فاعلین فبالاموات لابالاحیاء،[ابن عبدالبرفی جامع بیان العلم وفضله : ٢/٢٢٧] جبکہ شاطبی نے الاعتصام:۲/۳۵۸،۳۵۹، میں اس روایت میں یہ الفاظ بڑھا دیئے ہیں:واشار الیٰ رسول اللهﷺواصحابه الکرام ،تو اس سے بعض لوگوں کو عبداللہ بن مسعود والی روایت سے جو شبہ لاحق ہوا تھا وہ ختم ہوا، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے مقتدا بھی فوت شدہ ہیں۔

(۹) جبکہ خود عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ جواب منقول ہے:قال عبدالله بن مسعودؓ من کان مستنافلیستن بمن

قدمات ، فان الحي لاتؤ من عليه الفتنة،اولئک اصحاب محمدﷺ،کانوا افضل هٰذه الامة، ابرهاقلوبا،واعمقهاعلما، واقلها تکلفا، اختارهم الله لصحبةنبیه، ولاقامة دینه ،فاعرفوا لهم فضلهم، واتبعوا علی اثارهم ،تمسکوابمااستطعتم من اخلاقهم، وسیرهم، فانهم کانوا علی الهدی المستقیم [مشکوٰة المصابیح؛کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة رقم: ۱۹۲ ،وصون المنطق:۱۳۸ ،وتحریم النظر: ۴۴ ،والهروی : ۳۸/۴.جامع بیان العلم: ۱۹۶/۲ . اور:۱۹۵/۲، میں حسن بصریؒ سے یہ روایت نقل کیا ہے۔

(۱۰) اور یہی روایت ابونعیم نے حلیہ [۳۰۵/۱] میں عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ: من کان مستنافلیستن بمن قدمات اولئک اصحاب محمدﷺ کانوا اخیرهذه الامة،ابرهاقلوبا،واعمقهاعلما ،واقلهاتکلفا،قوم اختارهم الله لصحبة نبیه ونقل دینه، فتشبهوابااخلاقهم وطرائقهم،فهم اصحاب محمدﷺ کانوا علی الهدی المستقیم ،والله رب الکعبة، الحدیث۔

(۱۱) جبکہ ابن عبدالبر نے سلمان فارسیؓ سے نقل کیا ہے کہ:قال سلمان کیف أنتم عند ثلاث :زلة عالم ، وجدال منافق بالقرآن ،ودنیاتقطع أعناقکم ،فأمازلة العالم فأن اهتدیٰ فلاتقلدوه دینکم، وامامجادلة منافق بالقرآن، فان للقرآن منارا کمنار الطریق فما عرفتم منه فخذوه، ومالم تعرفوه فکلوه الیٰ الله،وامادنیا تقطع اعناقکم، فانظروا الیٰ من هو دونکم، ولاتنظروا الیٰ من هوفوقکم ، [جامع:۲۲۳/۲]۔

تقلید کارد علماء کرام کے اقوال سے

(۱) امام ابوحنیفہؒ نے قاضی ابویوسفؒ کوفرمایا: ویحک یایعقوب (هوابویوسف)لاتکتب کل ماتسمع مني، فأني قد اری الرأی الیوم واترکه غدا، واری الرأی غدا واترکه بعد غد۔

اے یعقوب (ابویوسفؒ) تیری خرابی ہو،میری ہر بات نہ لکھا کر،میری آج ایک رائے ہوتی ہے اورکل بدل جاتی ہے اور کل دوسری رائے ہوتی ہے،تو پھر پرسوں وہ بھی بدل جاتی ہے ،تاریخ یحی بن معین:۶۰۷/۲ ،وتاریخ بغداد:۴۲۴/۱۳۔

اوراسی طرح امام صاحب نے یہ بھی فرمایا:اذاصح الحدیث فهومذهبی ،،صحیح حدیث میرا مذہب ہے۔[الحاشیہ لابن عابدین:۶۳/۱،،رسم المفتی :۴/۱، ۲۴، ۲۷،فتاوی دارالعلوم دیوبند:۶۵/۱ ،ایقاض همم اولی الابصار:۶۲]

یہ بھی امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے: **لایحل لاحد ان یأخذ بقولنامالم یعلم من این اخذناہ**؛[ابن عبد البر فی الانتقاء :۲۶۷،وجامع الفصولین:۱/۱۵،اعلام المؤقعین :۳۰۹/۲،میزان الشعرانی :۵۸/۱،]مجموعۃ الرسائل (شامی):۲۸،۲۹،۱۳۵۔

امام صاحب یہ بھی فرماتے ہیں:**حرام علی من لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی فاننا بشر ،نقول الیوم ونرجع عنه غداً**،میزان الکبریٰ:۵۸.

(۲) امام ابوجعفر الطحاویؒ نے فرمایا ہے: **وھل یقلد الا عصبی اوغبی** :اورتقلید تو صرف وہی کرتا ہے جومتعصب ہو یا بے وقوف ہوتا ہے ۔رسم المفتی،ضمن مجموعۃ الرسائل لابن عابدین :۳۲/۱،لسان المیزان لابن الحجر: ۲۸۴/۱۔

(۳) علامہ بدرالدین عینیؒ نے فرمایا:**فالمقلدذھل والمقلد جھل وآفة کل شئی من التقلید**؛ پس مقلد غلطی کرتا ہے اور مقلِد جہالت کا ارتکاب کرتا ہے اور ہر چیز کی مصیبت تقلید کی وجہ سے ہے ۔[البنایہ شرح ہدایہ :۳۱۷/۱]۔عمدۃ القاری:۶۵/۱۳۔

(۴) امام زیلعیؒ نے فرمایا ہے:۔**فالمقلَد ذھل والمقلِدجھل**:[نصب الرایہ:۲۸۷/۱]۔

(۵) امام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ فرماتے ہیں:**فان شئت ان تری انموذج الیھود فانظر الیٰ علماء السوٓء من الذین یطلبون الدنیا ،وقد اعتادوا تقلید السلف واعرضوا عن نصوص الکتاب والسنة، وتمسکوا بتعمق عالم وتشدده واستحسانه، فاعرضوا کلام الشارع المعصوم وتمسکوا اباحادیث موضوعة وتاویلات فاسدة کانت سبب ھلاکھم** :

اگر تم یہودیوں کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہوتو علماء سوءکو دیکھو،جو دنیا کی طلب اور سلف کی تقلید پر جمے ہوئے ہیں ۔یہ لوگ کتاب وسنت کے نصوص سے منہ پھیرے اور کسی عالم کے تعمق،تشدد اور استحسان کو مظبوطی سے پکڑے بیٹھے ہیں،انہوں نے رسول اللہ ﷺ جو معصوم ہیں کے کلام کو چھوڑ کر موضوع روایات اور فاسد تاویلوں کو مظبوطی سے پکڑ لیا ہے اسی وجہ سے وہ لوگ ہلاک ہوگئے ہیں ۔[الفوزالکبیر فی اصول التفسیر:۱۰،۱۱]

(۶) صاحب شامی لکھتے ہیں:**فأخرج نفسک من ظلمة التقلید وحیرة الاوھام واستضئی بمصباح التحقیق، الخ**[۱۹۲/۲]۔

(۷) دیوبندیوں اور بریلویوں کا مشترک مقتدااورامام،فخرالدین الرازی کا قول بھی پیش کرتے ہیں: فثبت ان اختيار مذهب المعين ليس بشئی، وهو طريق العوام، ويؤيد ماقاله ا لصوفية، الكتاب والسنة ،واجمع عليه المحققون ،فالكتاب هوقوله تعالى: ﴿فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون﴾،والامربالسوال من غير تعين يدل على ان اختيار المذهب المعين بدعة، واما السنة ،فقوله عليه السلام اصحابی كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم، فالامربالاقتداء كالامر بالسوال فی ترک الاختيار ،واماالاجماع فهوظاهر، لان النظر فی اقوال العلماء المجتهدين واجب، حتى يميز العاقل دليل الراجح من المرجوح، والقوی من الضعيف، لزيادة الرشد فی الاصول، وهو طريق طلب العلم، وطلبه واجب بالاجماع، ولهٰذاورد فی الحديث، طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة، فاختيار المذهب المعين بالتقليد اغلاق لهذا الباب ،والقياس كذالک، لكونه ترجيحا بلا مرجح وحرجا فی حق المكلف كماذكروه[نزہۃ الخواطر:۱۰۸/۲]۔

جبکہ فقہاء ہند:۲۶۱/۱:والا اس عربی عبارت کا ترجمہ کچھ یوں کرتا ہے، کہ نبی ﷺ کے اس فرمان سے ثابت ہوا کہ، مذہب معین اختیار کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ عوام کا طریقہ ہے،صوفیا کے اس نقطہ نظر کی تائید کتاب وسنۃ سے واضح الفاظ میں ہوتی ہے،اور محققین کا اس پر اجماع ہے،قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون ،اس ایت کریمہ میں بلاکسی تعیین کے فقط اہل ذکر سے سوال کرنے کا حکم دینا اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ کسی مذہب معین کا اختیار کرنا بدعت ہے۔پھر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ،اصحابی كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم ؛کہ میرے صحابہ کرام ستاروں کی مانند ہیں،ان میں سے تم جس کی بھی اقتداء کروگے ہدایت پاجاؤ گے۔اس حدیث میں صحابہؓ کی اقتداء کا حکم اسی آیت کی طرح ہے،جس میں مشکل مسائل کے حل کیلئے اہل ذکر اور اصحاب بصیرت کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ اجماع امت بالکل ظاہر وواضح ہے، کیونکہ علماء مجتہدین کے اقوال وفرامین کو مطمح نظر ٹھرانا واجب ہے،تاکہ عاقل وفہیم شخص دلیل راجح کو مرجوح سے اور قوی کو ضعیف سے ممیّز کرسکے،اور اصول میں رشد وہدایت نکھر کر سامنے آسکیں،اور یہی طلب علم کا طریقہ ہے اور طلب علم واجب ہے۔حدیث میں ہے،طلب العلم فريضة على كل مسلم ،کہ طلب علم ہر مسلمان مرد وعورت پر واجب ہے۔آگے چل کر مولانا زرادی فرماتے ہیں،کسی مذہب معین کو از روئے تقلید اختیار کرنا اسکے دروازے بند کردینے کے مترادف ہیں کیونکہ یہ ترجیح

بلا مرجح اور مکلّف کے لئے حرج وتکلیف کا باعث ہے۔

(۸) امام مالکؒ نے فرمایا ہے:انما انا بشر اخطئی واصیب، فانظروا فی رأیی، فکل ماوافق الکتاب والسنة فخذوابه ،وکل مالم یوافق الکتاب والسنة فاترکوه،[ارشاد السالک:۱/۲۲۷، جامع بیان العلم وفضله لابن عبدالبر:۲/۷۰، مختصر المؤمل:۶۰، ۶۱، والاحکام لابن حزمؒ:۶/۱۴۹، والایقاظ:۲۷، اعلام الموقعین:۲/۷۵]۔ یقیناً میں بشر ہوں لہٰذا میری ہر رائے کو قرآن وسنت کی روشنی میں پرکھو، جو قرآن وحدیث کے موافق ہو اس کو قبول کرو، اور جو مخالف ہو اس کو چھوڑ دو۔ اسی طرح یہ بھی فرماتے ہیں:لیس احد الاویؤخذ من قوله ویرد علیه الاالنبیﷺ. نبی کریمﷺ کے علاوہ ہر ایک شخص کی بات کو قبول بھی کیا جاسکتا ہے اور رد بھی کیا جاسکتا ہے۔[جزء القرأة للبخاری :۱۴، مجموعة الفتاوی: ۲۰/۲۱۰]۔

(۹) اما شافعیؒ فرماتے ہیں؛؛ مامن احد الاوتذهب علیه سنة رسول اللهﷺ وتعزب عنه، فمهماقلت من قول اواصلت من اصل، فیه عن رسول اللهﷺ خلاف ما قلت، فالقول ماقال رسول اللهﷺ وهو قولی ۔ نبیﷺ کی تمام سنتوں کا کلی ادراک ناممکن ہے۔ طالب سنت سے کچھ سنتوں کا پوشیدہ رہ جانا لازمی امر ہے، لہٰذا میرا جو قول یا میرا اپنایا ہوا جو قاعدہ سنت نبویﷺ کے مخالف ہو تو اسکو چھوڑ دو، لیکن اللہ کے نبیﷺ کی سنت کو نہیں چھوڑنا اور جو سنت مجھ سے مخفی رہ گئی، وہی میرا مذہب ہے۔[اعلام الموقعین:۲/۳۶۲، ایقاظ همم اولی الابصار:۱۰۰، المجموع للنووی: ۱/۶۳، الحلیه: ۹/۱۰۷، الهروی فی ذم الکلام :۳/۴۷، ابن عبدالبر فی الانتقاء : ۷۵، آداب الشافعیؒ:۵۱]۔

اوراسی طرح یہ بھی فرماتے ہیں؛ اجمع المسلمون علی ان من استبان له سنته عن رسول اللهﷺ لم یحل له ان یدعها لقول احد ، پوری امت کا اس پر اتفاق ہے، کہ کسی امتی کے قول کے مقابلے میں نبیﷺ کی سنت کو چھوڑنا حرام ہے۔ اعلام الموقعین :۱/۷۔ نزہۃ الخاطر:۲/۴۳۸، مزید یہ بھی فرماتے ہیں کہ:اذا صح الحدیث فهو مذهبی، صحیح حدیث میرا مذہب ہے۔ البحر المحیط :۸/۳۴۴۔

(۱۰) امام احمدؒ کا قول: امام ابوداؤد السجستانیؒ فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا:لاتقلد دینک احداًمن هؤلاء." اپنے دین میں ان میں سے کسی ایک کی بھی تقلید نہ کر"[مسائل ابی داؤد :۲۷۷].و العدة لابی یعلیٰ:۴/۱۲۲۹ .والمسودة:للحرانیین ابن تیمیه ووالده وجده:۴۶۸.

(۱۱)ابوطالب مکی لکھتا ہے کہ:کان الفقهاء یکرهون التقلید [قوت القلوب : ۱/۳۲۷].

(رأیت احد عشرة کوکبا).

علماء کے اقوال ردتقلید میں بہت زیادہ ہیں، خاص کروہ علماء جنہوں نے اصول فقہ میں تصنیفات لکھی ہیں، ہرایک نے اپنی تصنیف کی آخر میں تقلید کا مسئلہ بمعہ تعریفات وحکم ذکر کیا ہے۔تو یہاں ہم صرف مذکورہ علماء کی عبارات پر اکتفاء کرتے ہیں۔

اب ہم ان لوگوں کے دلائل پرنظر ڈالتے ہیں جو کہ تقلید کے قائل ہیں:

پہلے ہم ان کے وہ دلائل ذکرکرتے ہیں جوآیات قرآنیہ ہیں :۔سورۃ نحل :۴۳،سورۃ الانبیاء:۷،النسآء :۵۹،۸۳،التوبۃ :۱۲۲ ۔ان آیات کی تفسیراپنی اپنی جگہ پرکی جائیگی ، یہاں اجمالی جواب یہ ہے کہ: ان آیات میں اتباع کا ذکر ہے تقلید کانہیں،اس لئے کہ ان مقلدین نے تقلید کی تعریف عملا کچھ یوں کی ہے: تمام مسائل میں امام ابوحنیفہؒ اور حنفی مفتیٰ بہا مسائل کی تقلید کرنا چاہیئے ،اگر چہ یہ مسائل قرآن وحدیث کے خلاف اورغیر ثابت بھی ہوں،مفتیٰ بہ قول کے مقابلے میں کتاب وسنت واجماع کورد کردینا۔اورقولا ،اس پردلائل ان کی کتابوں میں موجود ہیں ۔جیسا کہ ابن ابی العزالحنفیؒ فرماتے ہیں،واهل التقلید لایفعلون ذالک، بل یأ خذ أحدهم بمایجد فی کتب اصحاب ذالک الامام الذی قلده، ولایلتفت الی قول من خالفه کائنامن کان، ونص ذالک الامام والکتب عنده بمنزلة نص الشارع ، وکثیرا ما یکون ذالک النص من کلام بعض الاصحاب فی الفتاوی ،ولم یکن لذالک الامام فی تلک المسألة قول منقول[الاتباع :۳۱]

اوراس کی ایک زندہ مثال،شیخ الہند محمود الحسنؒ مقدمہ تقریر ترمذی:۳۶و۳۹، میں لکھتے ہیں۔,,فالحاصل ان مسئلة الخیار من مهمات المسائل، وخالف ابو حنیفة فیہؒ الجمهور، وکثیرا من الناس من المتقدمین والمتأخرین، وصنفوا رسائل فی تردید مذهبه فی هذه المسألة ،ورجح مولانا شاه ولی اللهالدهلوی قدس سره فی رسائله مذهب الشافعیؒ من جهة الاحادیث والنصوص ، وکذالک قال شیخنا بترجیح مذهبه ،وقال: الحق والانصاف ان الترجیح للشافعیؒ فی هٰذه المسألة ، ونحن مقلدون یجب علینا تقلید امامنا ابی حنیفةؒ،،۔

حاصل یہ ہے کہ خیار مجلس کا مسئلہ اہم مسائل میں سے ہے اورامام ابوحنیفہؒ نے (جو کہ اس کے قائل نہیں)اس

بارے میں جمہور کی مخالفت کی ہے۔متقدمین اور متأخرین میں سے اکثر علماء نے اس بارے کتابیں تصنیف کی ہیں۔جن میں اس مسئلے کے حوالے سے امام ابوحنیفہؒ کی تردید کی ہے اور امام شافعیؒ کے مذہب کو ترجیح دی ہے، کیونکہ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا موقف احادیث اور نصوص کی رو سے مدلل ہے، ہمارے شیخ بھی امام شافعیؒ کے مذہب کو راجح قرار دیتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے، حق اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ خیار مجلس میں امام شافعیؒ کے مذہب کو ترجیح دی جائے، (جبکہ شیخ الہند محمود الحسن فرماتے ہیں) لیکن ہم مقلدین ہیں اس لئے ہم پر امام ابوحنیفہؒ کی تقلید واجب ہے۔

اسی طرح ایک قول ابن نجیم حنفی نے البحر الرائق:۱۹۵/۵، میں لکھا ہے ,,**نعم نفس المؤمن تميل الیٰ قول المخالف في مسئلة السب، لكن اتباعناللمذهب واجب** . ہاں مومن کی رائے اس مسئلہ میں جانب مخالف کی طرف مائل ہوتی ہے، لکن ہم اپنے مذہب کے متبع ہیں۔ان کے متعلق سلطان العلماء عز الدین السلمیؒ، قواعد الاحکام :۱۳۵/۲، میں لکھتا ہے:**ومن العجب العجيب ان الفقهاء المقلدين يقف احدهم علی ضعف ماخذ امامه، بحيث لايجدلضعفه مدفعا،ومع هذايقلده فيه، ويترک من الكتاب و السنة والاقسية الصحيحة لمذهبه جموداًعلی تقليد امامه، بل يتحلل لدفع ظواهر الكتاب و السنة ويتاولهمابالتاويلات البعيدة الباطلة نضالاعن مقلَده** ،الخ۔اور اس سے یہ عبارت شاولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغۃ:۱۵۵، میں نقل کی ہے:

جبکہ موجودہ زمانے کا مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی، ارشادالقاری:۴۱۲/۱، میں رقمطراز ہیں، غرض یہ کہ یہ مسئلہ اب تک تشنۂ تحقیق ہے، مع هٰذا ہمارا فتویٰ اور عمل قول امام کے مطابق ہی رہیگا۔اس لئے کہ ہم امام کے مقلد ہیں اور مقلد کے لئے قول امام حجت ہوتا ہے، نہ کہ ادلہ اربعہ، کہ ان سے استدلال وظیفہ مجتہد ہے،۲۸۸، میں لکھتا ہے، کہ توسیع مجال کی خاطر اہل بدعت، فقہ حنفی کو چھوڑ کر قرآن وحدیث سے استدلال کرتے ہیں، اور ارخاء عنان کے لئے ہم بھی یہ طرز قبول کر لیتے ہیں، ورنہ مقلد کے لئے صرف قول امام ہی حجت ہوتا ہے۔

اسی طرح کا ایک قول مقدمہ کتاب دفاع امام ابوحنیفہؒ:۲۶، میں بھی موجود ہے۔

جبکہ امام ربانی نے بھی مکتوبات (مترجم اردو):۶۰۱/۱، مکتوب ۲۸۶، میں لکھا ہے کہ مقلد کو لائق نہیں کہ مجتہد کی رائے کے برخلاف کتاب وسنت سے احکام اخذ کرے اور ان پر عمل کرے (اصل فارسی نسخہ:۵۴۶/۱)۔

جبکہ یہ صاحب (شیخ الہندؒ) تعصب تقلید میں اتنا منہمک تھا، کہ آیت قرآنی میں تحریف کرنے لگا ,ایضاح الادلہ :۹۷، میں اہل حدیث پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں، اس طرح پر اطاعت انبیاء کرام علیہم السلام و جملہ اولی الامر بعینہ اطاعت

خداوند جل جلالہ خیال کیا جائیگی، اور متبعین انبیاء کرام علیہم السلام اور دیگر الوالامر کو خارج از اطاعت خداوندی سمجھنا ایسا ہوگا جیسا متبعین احکام، حکام ماتحت کو کوئی کم فہم خارج از طاعت حکام بالا دست کہنے لگے، یہی وجہ ہے کہ یہ ارشاد ہوا کہ ﴿فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول والی اولی الامر منکم﴾ (جبکہ صحیح آیت اس طرح ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً ﴿۵۹﴾ النساء) اور ظاہر ہے کہ اولوالامر سے مراد اس آیت میں سوائے انبیاء کرام علیہم السلام اور کوئی ہیں، سو دیکھئے اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام و جملہ اولی الامر واجب الاتباع ہیں، آپ نے آیۃ ﴿فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤ منون باللہ والیوم الاخر﴾ تو دیکھ لی، اور آپ کو یہ اب تک معلوم نہ ہوا کہ جس قرآن مجید میں یہ آیت ہے اسی قرآن میں آیت مذکورہ بالا، معروضہ احقر بھی موجود ہے، عجب نہیں کہ آپ تو دونوں آیتوں کو حسب عادت متعارض سمجھ کر ایک کے ناسخ اور دوسرے کے منسوخ ہونے کا فتویٰ لگانے لگیں۔

جناب مجتہد صاحب صحیح عرض کرتا ہوں، کہ ان آیات سے تقلید متنازع فیہ کے بطلان کی امید رکھنی ایسا قصہ ہے جیسا کسی بھوکے نے کہا تھا، دو اور دو چار روٹیاں ہوتی ہیں، سوا اس کے کہ اس قسم کے استدلالات سے آپ کی خوبی اجتہاد ظاہر ہوا ، اور کچھ نفع نہیں، اور آپکے اس قسم کے استدلالات سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کے نزدیک تمام مقتدیان دین وائمہ مجتہدین خلاف احکام خداوندی وارشادات نبوی حکم دینے والے ہیں، اور آیۃ ﴿ما آتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا﴾ حشر:۷، کی صریح مخالفت کرنے والے ہیں۔ اس پوری عبارت کو ہم نے اس وجہ سے ذکر کیا کہ بعض کو شبہ ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔

اوران کے نزدیک علماء کے کچھ طبقات ہیں جس کو شامی نے :۱/۱۶۵، میں ذکر کیا ہیں۔(۱) طبقہ مجتھدین فی الشرع : جیسے ائمہ اربعہ (۲) طبقہ مجتھدین فی المذھب : جیسا کہ امام ابو یوسفؒ ومحمدؒ وغیرہ ہیں (۳) طبقہ مجتھدین فی المسائل اللتی لانص فیھا عن صاحب المذھب جیسے ابوجعفر طحاوی وغیرہ۔(۴) طبقہ اصحاب التخریج، امام رازی وغیرہ جیسا علماء۔(۵) طبقہ اصحاب الترجیح، جیسے صاحب قدوری وغیرہ۔ (۶) طبقہ مقلدین (محققین) جو کہ صحیح وضعیف میں تمیز کرنے پر قادر ہو، جیسے صاحب کنز وغیرہ۔(۷) طبقہ مقلدین ، یہ وہ طبقہ ہے جو مذکورہ اشیاء میں کسی ایک پر بھی قادر نہ ہو، وکذافی فوائد البھیۃ:[۲۱،۲۲]۔

تو ان طبقات کو بیان کرنے سے معلوم ہوا کہ آج کل کوئی نہ اجتہاد کریگا اور نہ دلیل سے حکم معلوم کرنے کی اجازت ہے، اور نہ دوسرا مذہب اختیار کرنے کا، تو اس سے اب ان لوگوں کا دعوی ظاہر ہوا جو کہتے ہیں کہ ہم ان مسائل میں تقلید کرتے ہیں جو کہ اجتہادی اور غیر منصوصی ہوں، اور ائندہ تفصیل سے ان کا یہ وہم بھی دور ہو جائے گا۔

اب تقلید اور اتباع میں فرق واضح کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں کے اقوال پر کوئی اعتماد نہ کرے۔

تقلید اور اتباع میں فرق : التقلیدمعناه فی الشرع ، الرجوع الی قول لاحجةلقائله علیه ، وذالک ممنوع منه فی الشریعة ،والاتباع ماثبت علیه الحجة . شریعت میں تقلید ایسی بات ماننے سے تعبیر ہے جس پر کوئی دلیل نہ ہو، شریعت اس عمل کو سختی سے منع کرتی ہے۔ جبکہ اتباع ایسی بات ماننے کو کہتے ہیں جس پر دلیل ہو، [اعلام الموقعین :۲/ ۱۹۷، کتاب الرد علی من اخلد الی الارض للسیوطی :۱۲۰، ۱۲۳۔

اورتفسیر التحریر والتنویر میں:۷/ ۴۲۳:۔ لکھا ہے کہ ,,الاتباع فی الاصل، اقتفاء اثر الماشی ،ثم استعمل فی العمل بمثل عمل الغیر ،کمافی قوله تعالیٰ: والذین اتبعوهم باحسان۔ الایۃ (التوبۃ :۱۰۰)۔

اورنضرۃ النعیم میں:۲/ ۱۰:لکھا ہے کہ ,,قال الامام احمد بن حنبل ؒ،هو ان یتبع الرجل ماجاء عن النبی ﷺ وعن اصحابه ؓ ،اورتفسیر اضوٰ البیان:۷/ ۴۷۹، ۴۸۸، ۵۴۸، میں ہے کہ ,,الاتباع ماثبت علیه الحجة ،وهو اتباع کل من اوجب علیک الدلیل اتباع قوله ۔اورابن عبدالبر متعدد مواضع میں اس کا فرق بیان کرتے ہیں ,,التقلید معناه فی الشرع، الرجوع الی قول لاحجةلقائله علیه ،وذالک ممنوع منه فی الشریعة ،والاتباع ماثبت علیه حجة،،اور کچھ عبارت کے بعد لکھتا ہے:

,,کل من اتبعت قوله من غیر ان یجب علیک قوله لدلیل یوجب ذالک، فأنت مقلده ، والتقلید فی دین الله غیر صحیح ،وکل من اوجب علیک الدلیل اتباع قوله، فأنت متبعه، والاتباع فی الدین مسوغ والتقلید ممنوع [جامع بیان العلم وفضلہ:۲/ ۲۳۱] اور راہ سنت میں مولانا صفدر صاحب لکھتے ہیں، اور یہ بات طے شدہ ہے، کہ اقتداء اور اتباع اور چیز ہے اور تقلید اور۔ اور مولانا اشرف علیؒ نے امداد الفتاوی:۴/ ۲۰٦، میں مفصل فرق بیان کیا ہے۔

اس فرق بیان کرنے سے اب کوئی ان لوگوں کے دلائل بیان کرنے سے دھوکہ نہیں کھائے گا، کیونکہ مذکورہ آیات اور جو احادیث وغیرہ ان کے مستدلات ہیں، وہ اتباع کے متعلق ہیں۔

شبہات، اعتراضات، تناقضات

(۱) عوام کا کوئی متعین مذہب نہیں ہوتا:۔ العامی لامذھب له :حقیقت الفقہ :۳۴,,امی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ اس کا مذہب وہی ہوتا ہے جو اس کے مفتی کا ہوتا ہے، شامی: ۱/ ۱۳۰ ،اعلام المؤقعین : ۲/ ۲۷۳، شذرات الذھب ۴/ ۱۱۶، معیارحق: ۷۵،میزان الکبریٰ ،للامام الشعرانی :۳۴،اد ب المفتی والمستفتی لابن الصلاح: ۱۶۱ ،نھایة الوصول للھندی :۸/ ۳۹۲۱،آیات بینات: ۴/ ۳۸۰، تیسیر التحریر: ۴/ ۲۵۳ ،ادب الفتویٰ لابن الصلاح: ۳۹،الغیث الھامع، لابی زرعه احمدالعراقی:۳/ ۹۰۵، التقریر والتحبیر:۳/ ۳۵۱. بحرالرائق:۲/ ۱۴۸.

(۲) مقلد کا دلیل مجتہد کا قول ہے:اقوال المجتھدین فی حق المقلد کالادلة،فواتح الرحموت :۲/ ۴۴۴،نھایة السؤل:۴/ ۶۲۵ ،ارشاد القاری: ۲۱۴۔اس کی عبارت پہلے گزر گئی۔

(۳) ایک عالم کا دوسرے عالم کا تقلید کرنا باطل عمل ہے:۔ابوالولید الباجی نے إحکام الفصول میں عنوان لکھا ہے کہ ,,فصل فی ابطال تقلید العالم للعالم،،:۶۳۵۔وکتاب الاشارۃ،لہ:۱۳۷،

(۴) تقلید دلیل نہیں:۔ کاکی جامع الاسرار میں لکھتا ہے۔وھو قبول قول الغیربلادلیل لیس بحجة فی اصول الدین ولافی فروعه لانه تعالیٰ رد علی المقلدین بقوله أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لاَ يَعْقِلُونَ شَيْئاً وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾۵/ ۱۴۴۵۔

(۵) مقلد علم حاصل نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار رہے:۔ کاکی نے لکھا ہے ،واجمع العلماء علیٰ ان المقلد عاصٍ بترک الاستدلال : جامع الاسرار:۱۴۴۵/۵۔

(۶) تقلید طریقہ علم نہیں بلکہ جہل ہے: امام زرکشی نے فرمایا ہیں,,والتقلید جھل [البحرالمحیط :۳۲۱/۸، ۳۲۳،نفائس الاصول:۳۹۴۶/۹،اور سمعانی قواطع الادلہ فی اصول الفقہ میں لکھتے ہیں:و العلم لایحصل للمقلد

بتقليد غيره. قواطع الادلة:۲/۸۹۴،المستصفیٰ للغزالی:۲/۳۸۷،نصب الرایہ:۱/۲۱۹،۳/۲۲۸،فواتح الرحموت:۲/۴۴۶،الاشارۃ للباجی:۱۳۸،اصول الاحکام للامدی:۴/۲۲۴،الواضح:۵/۲۳۸،۲۴۵،کتاب الردعلی من اخلدالی الارض للسیوطی:۶۸،۱۱۷،۱۲۰،۱۲۲،۱۲۴،۱۳۸،۱۳۹،۱۴۵،تقویم الادلۃ للدبوسی الحنفی:۳۸۹،جبکہ ۳۹۰، میں لکھتا ہے فالمقلد فی حاصل امره ملحِق نفسه بالبهائم فی اتباع الاولادالامهات،علی مناهجها بالتميز، فان الحق نفسه بها لفقده آلة التميز فمعذور فيداوى ،ولايناظر وان الحقه بها ومعه آلة التميز فالسيف اولیٰ به حتیٰ يقبل على الآلة فيستعملها ويجيب خطاب الله تعالیٰ المفترض طاعته الخ،التحبیر ۸/۴۰۲۵،۴۱۱۳۔والعدۃ لقاضی ابی یعلی:۴/۱۲۱۸۔اوراسی کی قریب عبارت عبداللہ بن المعتز کا ہے آپ نے فرمایا,,لافرق بين بهيمة تنقاد وانسان يقلد :جامع بيان العلم وفضله، لابن عبدالبر:۲/۲۲۸،جبکہ ابن عبدالبر نے اس کے متعلق ایک لمبی نظم بھی کہی ہے،جس کا ایک بیت یہ ہے:

,,لافرق بين مقلد وبهيمــــة تنقاد بين جنادل ودعائر ،،

(۷) اُمی کا مفتی سے استفتاء طلب کرنا تقلید نہیں:۔ فظهـر انــه لـم يـجـعـل الاستفتـاء تـقليدا [۳۲۱،نفائس الاصول :۹/ ۳۹۱۹،المستصفیٰ: ۳۸۷، ۳۸۹،ایات بینات :۴/۳۵۸،فواتح الرحموت :۲/ ۴۴۴،تیسیر التحریر :۴/۲۴۱،شرح منتهیٰ الاصول، لسعدالدین تفتازانی :۳۰۶،شرح مختصر الاصول :لعضدالدين :۲/ ۳۰۵،اصول الاحکام للامدی:۴/ ۲۲۱،الغيث الهامع، لابی زرعه :۴/ ۸۹۴،البحر الحیط :۸/ ۳۱۸،۳۲۰،۳۲۱ ،نفائس الاصول :۹/ ۳۹۱۹،التقريروالتحبير :۳/ ۳۴۰،مسلم الثبوت :۲۸۹،التحبير :۸/ ۴۰۱۳،۴۰۱۵،شرح مختصر الروضة، لابن سعيد الطوفی :۳/ ۶۵۲،

(۸) قاضی کا عادل گواہوں کی گواہی یا خبر واحد قبول کرنا تقلید نہیں:۔ وقبول خبـر الـواحد وشهـــادة العدول لايسمى تقليدا. البحر المحيط للزركشی :۸/ ۳۲۱،نفائس الاصول :۹/ ۳۹۱۹، قواطع الادلة :۸۴۸،المستصفیٰ :۳۸۷،فواتح الرحموت :۲/ ۴۴۴،تيسير التحرير :۴/ ۲۴۱،شرح منتهیٰ الاصول :۲/ ۳۰۶،شرح مختصر الاصول ،لعضد الدين :۲/ ۳۰۵،اصول الاحكام، للامدی

:۴/ ۲۲۱،التقریر والتحبیر :۳/ ۳۴۰،مسلم الثبوت : ۲۸۹،

(۹)صحابی کا تقلید کرنا جائز ہے:۔ یجوز تقلید الصحابة فقط[الکافی،للسغناقی:۱۵۸۱/۴،نفائس الاصول:۴۰۳۸/۹،قال الامام ابو حنیفةؒ اقلد من کان من القضاة والمفتیین من الصحابةؓ :شرح ادب القاضی للخصاف :۱۸۳/۱،فواتح الرحموت :۳۴۹/۲،تقویم الادلة:۲۵۶، نهایة السؤل : ۵۹۱/۴،المعتمد لابی الحسین:[۳۶۶/۲]۔علاء الدین الحنفی ،افاضة الانوار میں لکھتا ہے:''وتقلید الصحابی واجب یترک به القیاس [ص:۲۰۷]وایضا المنار[ص:۲۰۸]والتقریر والتحبیر لامیر الحاج[۳۵۳/۳]۔شامی:۳۱/۳۔اوراس مسئلے کا تفصیل کتاب المدخل الی ارشاد الامة،محمد صبحی حسن حلاق کا:۲۲۷میں دیکھیں۔

(۱۰)عوام کو صحابہ کے اقوال کا اتباع نہیں کرنا چاہئے: .ان العامی لایقلده''البحر المحیط [۳۳۸/۸]اورامیر بادشاہ الحنفی نے تیسیر التحریر میں لکھا ہے کہ :''نقل الامام فی البرهان اجماع المحققین علی منع العوام من تقلید اعیان الصحابة.[۲۵۵/۴]ونهایة السؤل[۶۲۱/۴]

(۱۱)حدیث پر عمل کرنا تقلید نہیں ہے:۔ جیسا کہ امام زرکشی نے فرمایا ہے:العمل بقول النبی ﷺلیس بالتقلید [البحر المحیط :۳۱۶/۸،۳۲۳،نفائس الاصول : ۳۹۱۹/۹ ،فواتح الرحموت : ۴۴۴/۲، ۴۴۶،تیسیر التحریر:۲۴۱/۴،شرح منتهی الاصول :لسعدالدین تفتازانی :۳۰۶/۲،شرح المختصر، لقاضی عضدالملة والدین : ۳۰۵/۲،اصول الاحکام للامدی :۲۲۱/۴،التقریر والتحبیر :۳۴۰/۳،مسلم الثبوت : ۲۸۹،التحبیر:۴۰۱۳/۸،۴۰۱۵ ،شرح مختصر الروضة، لابن السعید الطوفی :۶۵۲/۳،العدة لقاضی ابی یعلیٰ:۱۲۱۶/۴ .

(۱۲)عوام کے لئے شریعت کے دلائل پر عمل کرنا جائز نہیں:۔ بانه لایتاهل للعمل بادلة الشرع ونصوصه وظواهره ۔البحر المحیط [۳۳۹/۸]احسن الفتاوی میں رشید احمد لدھیانوی لکھتے ہیں''رجوع الی الحدیث مقلد کا وظیفہ نہیں۔[۵۵/۳۔والتقریر والتحبیر :۳۵۴/۳۔والفصول للجصاص:۲۸۲/۴]صاوی لکھتا ہے:لأن الاخذ بظواهر

الکتاب والسنة من اصول الکفر۔[۱۰/۳](اس پر تفصیلی رد شنقیطی نے اضواءالبیان:[۷/۳۳۷] میں کیا ہے)

(۱۳)عوام ادلہ شرعیہ پر عمل کریں:۔ ملا ی علی القاری صلاۃ الجوائز میں لکھتے ہیں:فرضی اللہ عنہ حیث نبھنا علی ان الواجب علی الامة کافة من الائمة والعامة متابعة الکتاب والسنة فمن جاوز ھما فقد وقع فی الکفر او البدعة۔[ص۳۸]،البحر المحیط:[۳۳۴/۸]،تیسیر التحریر:[۲۵۵/۴]،

(۱۴)مقلد کے لئے فتویٰ دینا جائز نہیں:۔ المجتھد یجوز له الافتاء واماالمقلد فقال ابوالحسین البصری وغیرہ لیس له الافتاء مطلقا۔البحر المحیط:[۳۵۹/۸]والرد علی من اخلد الی الارض للسیوطی[ص:۸۳،۸۶،۱۱۸]ونہایۃ السؤل للاسنوی[۵۸۳/۴]،کتاب التحصیل للارموی[۳۰۱/۲]التحبیر للمرداوی[۴۰۷۱/۸]۔

(۱۵)حدیث کی تصحیح،تضعیف،تحسین،میں علماء کی بات ماننا تقلید نہیں:۔ابن ابی العزؒ نے فرمایا کہ:وانما قولنا "رواہ البخاری ومسلم" کقولنا"رواہ القراء السبع" و القرآن منقول بالتواتر،لم یختص ھٰؤلاء السبع بنقل الشئ منه، وکذلک التصحیح ،لم یقلد اھل الحدیث فیه البخاری ومسلمابل جمهور ماصححاہ وکان قبلهماعندائمة الحدیث صحیحا. الخ۔الاتباع:[ص۴۸]۔

(۱۶)غیر مجتہد عالم تقلید نہیں کریگا:۔ وقیل لا یقلد العالم وان لم یکن مجتهدا لان له صلاحیة اخذالحکم من الدلیل ۔ایات البینات للعبادی:۳۶۲/۴،احکام الفصول میں ہے کہ فانه لایجوز له ان یقلد من ھو مثله فی العلم ولامن ھوفوقه[ص۶۳۵]،قواعد الاحکام، لعزالدین السلمی[۱۳۵/۲]،الغیث الهامع، لابی زرعة[۸۹۲/۳،۸۹۳]التقریر والتحبیر[۳۵۱/۳]،نهایة السؤل[۵۸۶/۴].

اورامام ذہبی اپنی کتاب تذکرۃ الحفاظ:۱/۱۶،میں لکھتا ہے,,فیاللہ العجب من عالم یقلد دینه امامابعینه فی کل ماقال مع علمه بمایرد علی مذھب امامه من النصوص النبویة، فلاقوة الاباللہ۔

(۱۷)اُمی اور غیر اُمی کیلئے تقلید اور التزام مذہب معین لازم ہے:۔ ایات بینات[۳۶۱/۴،۳۸۲]،میں ہے کہ: ویلزم غیر المجتهدعامیا کان اوغیرہ الخ] مقلد جس کے قول پر عمل کرے تو کوئی مضائقہ نہیں:۔اور،احکام لابن حزم[۶۴۴/۶]میں ہے کہ:انمایقلد من یجهل الحکم فی النازلة الخ.

(۱۸)کسی انسان پر مذہب معین کا التزام لازم نہیں:۔ ابن امیر الحاج شرح تحریر ابن ہمام میں لکھتے ہیں"

وقيل لايلزم وهو الاصح ،كما في الرافعي وغيره،لأن التزامه غيرملزم، اذلاواجب الاماواجبه الله ورسوله، ولم يجب الله ورسوله على احدمن الناس ان يتمذهب بمذهب الرجل من الامة فيقلده في دينه۔۔۔الخ۔[۳۵۰/۳] شامی[۳۰/۱، ۱۶۳] نہایۃ السؤل[۶۱۹/۴] العدۃ لابی یعلی[۱۲۲۶/۴]۔

(۱۹) ایک مذہب سے دوسرے مذہب کو انتقال کرنا جائز نہیں:۔ ''ويحرم الانتقال من مذهب الى اخر حتى شدد بعض المتأخرين المتكلفين من الحنفية وقالوا ان الحنفي اذا صار شافعيايعزر ۔'' نہایۃ السؤل،للاسنوی[۶۱۸/۴] اور صاوی نے لکھا ہے ''فالخارج عن المذاهب الاربعة ضال ومضل وربما اداه ذالک الى الكفر ۔[۱۰/۳] اس کا تفصیلی رد شنقیطی نے اضواء البیان[۴۳۶/۷] میں کیا ہے۔

(۲۰) ایک مذہب سے دوسرے مذہب کو انتقال کرنا جائز ہے:۔ نہایۃ السؤل میں اسنوی نے لکھا ہے'' ويصح الانتقال من مذهب الى مذهب، وهذا هوالحق الذى ينبغى ان يؤمن به ويعتقد''[۶۱۸/۴]

(۲۱) مطلق خبر ماننا تقلید نہیں:۔ ''وذكر،الرجوع الى خبرالواحد فى حكاية حديث اواجماع اوفى اخبار عن نجاسة اناء اودخول فى وقت اوعين القبلة لايسمىٰ تقليدا''۔التحبیر [۴۰۱۴/۸، ۴۰۱۵]

(۲۲) دلیل سے حکم معلوم کرنا اجتہاد ہے:۔ ''واخذ القول مع معرفة دليله فهو اجتهاد ''ایات بینات:[۳۵۹/۴]۔

(۲۳) اُمی کا تعریف:۔ جس میں دلیل سے حکم معلوم کرنے کا صلاحیت نہ ہو:۔ایات بینات[۳۶۲/۴]،احکام الفصول[ص:۲۲۸/۴]،والواضح فى اصول الفقه لابن عقيل[۴۴۶/۵].

(۲۴) اُمی مستفتی وہ شخص ہے جو طرق احکام نہیں جانتے:۔''الذى لايعرف طرق الاحكام''تقريب الوصول[ص: ۱۶۰].

(۲۵) مفتی کی تعریف ,,یعنی مفتی کون ہوسکتا ہے: ۔''المفتى من استكمل فيه ثلاث شرائط الاجتهاد،والعدالة،والكف عن الترخيص والتساهل۔البحر المحیط [۳۵۸/۸] نفائس الاصول:[۳۹۱۹/۹] معین الحکام للطرابلسی[ص:۲۱۸] اور امیر بادشاہ الحنفی نے تیسیر میں لکھا ہے کہ:''واجمع الفقهاء ان المفتى يجب ان يكون من اهل الاجتهاد''[۲۵۱/۴]التقرير والتحبير[۳۴۱/۳، ۳۴۶، ۳۴۸] الواضح

[۴۵۶/۵]والرد علی من اخلد الی الارض[ص:۸۳]والتحبیر للمرداوی[۴۰۷۰/۸، ۴۰۷۱].

مجتہد مطلق کی تعریف مجتہد مطلق پر لازم ہے کہ وہ کسی کا تقلید نہیں کریگا۔ایات بینات[۳۶۲/۴،۳۸۰]اور قاضی ابویعلی نے العدۃ میں لکھا ہے کہ"فـامـاالـعـالـم هـو الـذی کـمـلـت لـه الات الاجتهـاد"[۱۲۳۸/۴]وکشف الاسرار[۱۴/۴]الواضح[۲۳۷/۵]ومسلم الثبوت[ص:۲۹۰]اور سیوطیؒ کتاب الرد علی من اخلد الی الارض:۱۱۳،میں لکھتا ہے:

فـالـمـجتهـد الـمستـقـل:شرطه ان یکون قیمابمعرفة الاحکام الشرعیة من الکتاب و السنة والاجماع و القیاس الخ۔

(۲۷)مقلدین کا یہ قبیح قول: ۔کہ ہر آیت یا حدیث یا قول صحابی جو کہ احناف کے رائے کا خلاف ہو تو یہ قابل قبول نہیں ہوگا۔اصول کرخی[ص:۱۱،۱۲]میں لکھتا ہے: الاصـل ان کل ایة تخالف قول اصحابنافانهاتحمل علی النسخ الخ ۔تفسیر صاوی[۱۰/۳]۔

(۲۸)اتباع کی بعض صورتوں پر تقلید کا اطلاق مجازی ہے: ۔علماء نے اتباع کی بعض صورتوں پر تقلید کا جو اطلاق کیا ہے تو وہ مجازی ہے جیسا کہ امام زرکشی نے لکھا ہے ویسـمیٰ تقلیدا مجازا [البحر المحیط:۳۱۷/۸، ۳۲۱، ۳۲۲،۱۱اور امام غزالی نے المستصفیٰ:۳۹۰/۲،میں لکھا ہے :فـان فـرض الـعـامی الاخذ بقول العالم، وانما نسمیه تقلیدا علی سبیـــل الـــمـــجـــاز والاتســـاع ،احکام:۶۴۲،شرح مختصر الاصول لعضد الدین:۳۰۵/۲،اصول الاحکام للامدی:۳۳۱/۴،التقریر والتحبیر:۳۴۰/۳،التحبیر: ۴۱۴/۸،العدۃ:۱۳۱۷/۴۔

(۲۹)علماء نے تقلید کو اضطراری حالت میں جائز قرار دیا ہے:۔ الواضح[۲۵۵/۵]اور شنقیطی نے تفسیر اضواء البیان[۵۵۳/۷]میں تقلید پر تفصیلی رد کرتے ہوئے فرماتا ہے"لاخـلاف بیـن اهـل الـعـلم فی ان الضرورة، لها احـوال خـاصة تستـوجـب احـکـاما غیر احکام الاختیار ،فکل مسلم الجأته ضرورة الی شیئ الجاء صـحیـحا حقیقیا فهو فی سعة من امره فیه وقد استثنی الله جل وعلا حالة الاضطرار فی خمس ایات مـن کتـابه ،ذکر فیه المحرمات الاربعه التی هی من اغلظ المحرمات تحریما، وهی المیتة، والدم ، ولـحـم الـخـنـزیر ،وماهل لغیر الله به ،فان الله تعالیٰ کلماذکر تحریمها استثنی منها حالة الضرورة فـاخـرج مـن حـکـم التـحـریـم."قـال الله تـعـالـی فـی سـورـة البقرة[۱۷۳]سورة مائده، [۳] سورة

انعام[۱۱۹، ۱۴۵]سورة النحل[۱۱۵]وبهذا تعلم ان المضطر للتقليد الاعمى اضطرارا حقيقيا بحيث يكون لاقدرة له البتة على غيره مع عدم التفريط لكونه لاقدرة له اصلا على الفهم اوله قدرة على الفهم وقد عاقته عوائق قاهرة عن التعلم اوهو فى اثناء التعلم ولكنه يتعلم تدريجا لأنه لايقدر على تعلم كل مايحتاجه فى وقت واحد اولم يجد كفئا يتعلم منه ونحو ذالک فهو معذور فى التقليدالمذكور للضرورة لأنه لامندوحة له عنه، اما القادر على التعلم المفرط فيه والمقدم اراء الرجال على ما علم من الوحى فهذا الذى ليس بمعذور.''

(۳۰)موجودہ صورۃ تقلید کوتقلید کا نام دینا صحیح نہیں:۔ یہ اصل میں ''تقلُّد'' باب تفعل ہے لیکن انہوں نے اس سے تقلید بنایا ہے جیسا کہ ابن ہمام (تحریرالامام) میں لکھتا ہے'وكان الوجه جعل المعرف بماذكر التقليدلأن المقلد جعل قوله(اى من قلّده) قُلادة فى عنقه وهذا تقلّد لاتقليد۔[۳۴۱/۳]

(۳۱)شریعت میں تقلید کا کوئی صورت ممدوح نہیں:۔ ويتخرج من هٰذا،انه لايتصور تقليد مباح فى الشريعة لافى الاصول، ولا فى الفروع ،اذالتقليد علىٰ ماعرفه القاضى، اتباع من لم يقم باتباعه حجة ولم يستند الىٰ علم الخ.''البحر المحيط للزركشى :[۳۲۰/۸، ۳۲۲]اورابوزرعہ نے الغیث الھامع ۸۹۴/۳، میں لکھاہے ,,ليس فى الشريعة تقليد، فانه قبول القول من غير حجة، واقوال المفتيين والحكام ،مقبولة بالاجماع لقيام الدليل الشرعى على وجوب العمل بها،والتقرير والتحبير :۳۴۰/۳،ويكفى فى ابطال التقليد ان القائلين به مقرون على انفسهم بالباطل، لان كل طائفة من الحنفية والمالكية والشافعية مقرة بان التقليد لايحل، وائمتهم الثلاثة قد نهواعن تقليدهم ،ثم مع ذالک خالفوهم وقلدوهم وهٰذاعجب مامثله عجب حيث اقروا ببطلان التقليد ثم دانوا الله بالتقليد الخ:كتاب الرد على من اخلد الى الارض للسيوطى :۱۳۳،كتاب التحصيل للارموى : ۳۰۳/۲، ۳۰۸. التلخيص للجوينى: ۵۳۰.

(۳۲)حدیث کی مقابلہ میں فقہاء کے قول کواختیار کرنا شرک ہے:۔ فتاوی عزیزی [ص ۱۶۲] میں شاہ عبدالعزیزؒ لکھتا ہے کہ: وفی الحقیقت اگر مقلدان مذہب تفحص کنندمی یابند کہ این بلاءتقلید ایشان رابحدے کشیدہ کہ قول ہر

یکے را از احاد فقہاء در مقابل حدیث می آرند وترجیح می دہند واین از ان قبیل است کہ علماء را بہ پیغمبرے رسانیدہ شود بلکہ بخدائے زیرا کہ درحدیث صحیح ترمذی آمدہ است کہ عدی ابن حاتمؓ از جناب نبوتﷺ درتفسیر آیۃ اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابامن دون الله ، عرض کرد کہ یارسول اللہ ایا ایشان را بخدائے می پرستید ندوخدا میدانستند فرمودند کہ بگفتہ ایشان حلال وحرام می دانستند گفت آرے فرمودند ہمین ست ارباب گرفتن وظاہرست کہ منصب ضرب تکلیف ونصب شریعت مخصوص بخدا است وبے نص قاطع او کسے را این منصب دادند شرک محض ست، نعوذ باللہ منها۔

(۳۳) تقلید کرنا کفر ہے: سیوطیؒ نے کتاب الردعلی من اخلد الی الارض:۱۳۹و۱۴۵، میں مختلف علماء سے نقل کیا ہے کہ تقلید کرنا کفر ہے، کہ، فنقول وبالله التوفيق ، التقليد هوان يقلدالغير ويتبعه من غيردليل ظهرله وانه من افعال الكفر، قال اللہ تعالی حاكياعنهم فی سورة زخرف:۲۳ وعنكبوت:۱۲

(۳۴) مقلدین کا یہ قول کہ ہم ان اماموں کی تقلید۔ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کے پاس دلائل تھے اور یہ قرآن وحدیث پر ہم سے زیادہ عالم تھے، تو اس کا جواب علی القاریؒ نے مرقات المفاتیح: [۸/۱۵۷] میں لکھا ہے ,,کہ،، قال الطيبی ولاريب ان الامام احمد بن حنبلؒ ماذهب الیٰ هذا القول الا بعد ماتلقی من الصحابة والتابعين ،علی انه امام من الائمة الكبار يجب أن يتلقی كلامه بالقبول ويحسن الظن به .. ۱۵،،وفيه ان عدم الريب فی تلقيه من الصحابةؓ والتابعين ،من علم الغيب، وان وجوب قبول كلامه انما يكون بالنسبة الیٰ مقلده لابالنسبة الیٰ العلماء المجتهدين الذين خرجوا عن ربقة التقليد ودخلوا فی مقام تحقيق الادلة والتسديد والتأييد ۔اور تفصیلی جواب تفسیر اضوء البیان: ۷/۵۳۳، میں مذکور ہے۔

(۳۵) مقلدین کا یہ قول کہ ہم فقہاء کی تقلید:۔ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ انہوں نے تمام مسائل مرتب اور جمع کر کے ہمارے لئے اسان بنادیا، اورفقہ کے کتابوں سے اخذ آسان ہے، جبکہ قران اورحدیث سے مشکل، غلط ہے، فیض الباری میں شاہ انورشاہ کشمیری: لکھتے ہیں: فمن زعم ان الدين كله فی الفقه بحيث لايبقی ورائه شی فقدحادعن الصواب: ۲/۱۰.

(۳٦) مقلد ہونے کے باوجود علم اصول سیکھنا:۔ امام ذہبیؒ رقمطراز ہیں: اصول الفقه لاحاجة لک به يامقلد، ويامن يزعم ان الاجتهادقدانقطع ومابقی مجتهد، ولافائدة فی اصول الفقه الاان

یصیر محصله مجتهدا،فاذاعرفه ولم یفک تقلیدامامه لم یصنع شیئابل اتعب نفسه ورکب علی نفسه الحجة فی مسائل،وان کان یقرأه لتحصیل الوظائف ولیقال،فهذامن الوبال،وهوضرب من الخبال.(کلمات فی العلم وادب الطلب للذهبی:۲۱۳،وبیان زغل العلم و الطلب:۲۰،۲۱)۔

(۳۷)مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کوئی تقلید نہیں اور یہی وجہ ہے کہ امام زرکشیؒ بحرمحیط:۳۲۲/۸،میں فرماتا ہے کہ:واعلم ان القاضی و الغزالیؒ یقولان لاتقلیدفی الدنیا الخ۔ التلخیص للجوینی:۵۳۰.

مذکورہ تفصیل سے حقیقت تقلید خوب واضح ہوا،کہ یہ ایک بدعت ہے،خیر القرون میں اس کا وجود نہیں تھا،اور یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ،اس لئے مسائل شرعیہ میں اگر چہ علماء کا اختلاف ہوتا رہتا ہے لیکن اختلاف تضاد تک نہیں پہنچتا،ہم نے دیکھا کہ مجتہد مطلق کا تعریف کرتے ہیں کہ کسی کا تقلید نہیں کریگا پھر کہتے ہیں صحابیؓ یا بوقت ضرورت دوسری مجتہد کا تقلید کرسکتا ہے،جبکہ بعض نے وجوب کا حکم بھی لگایا ہے،تقلید کی تعریف میں بھی اختلاف کیا ہے،یہ بھی معلوم نہیں کہ کون تقلید کریگا،اورکون نہیں کرے گا،کبھی کہتا ہے کہ عامی تقلید کریگا،پھراس کے دواقسام بناتے ہیں ایک عامی محض،دوسرا عالم غیر مجتہد،تو عامی کے متعلق کبھی کہتے ہیں کہ اس پر تقلید واجب ہے تو کبھی کہتے ہیں کہ اس کا تقلید سے کیا واسطہ،اس کا تو کوئی مذہب نہیں،عالم غیر مجتہد کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ تقلید کریگا،پھر لکھتے ہیں کہ دلائل سے استنباط کریگا،یہ بھی کہتے ہیں کہ مفتی کیلئے مجتہد ہونا ضروری ہے،جبکہ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں کی تعداد میں غیر مجتہد،مقلدین مفتیین موجود ہیں،اوپر گذر گیا کہ مقلد دلائل اربعہ سے استدلال نہیں کریگا،اور ہم دیکھتے ہیں ان مقلدین کو،کہ بحث ومناظرہ میں دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔اگر آپ لوگ مذکورہ عبارات اوران لوگوں کے کتابوں میں تقلید کی متعلق دیگر عبارات میں نظر عمیق سے دیکھیں اور سوچیں تو آپ کومختلف قسم کے تضادات نظر آئینگے،اورآپ یقین کرینگے کہ یہ اللہ تعالی کے اس قول کا مصداق ہے﴿ولو کان من عند غیر الله لوجدوا فیه اختلافا کثیرا﴾[النسآء:۸۲]تو ہم پر یہ عیاں ہوا کہ یہ تقلید دین الٰہی نہیں ہے اس وجہ سے اس میں اختلاف ہے۔بعض مقلدین چالاکی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم قرآن وحدیث واجماع کو مانتے ہیں اور مسائل منصوصہ میں تقلید نہیں کرتے،ہم تو صرف مسائل اجتہادیہ میں امام ابوحنیفہؒ اور حنفی مفتیٰ بھا مسائل کی تقلید کرتے ہیں،اوراگر قرآن وحدیث کے خلاف امام کی قول ہوتو ہم چھوڑ دیتے ہیں،یہ بات اگر چہ فی نفسہ بہت اچھی اور شرعی لحاظ سے مأمور بہ ہے،لیکن ان لوگوں کا یہ قول ان کے اعمال ظاہرہ سے خلاف ہے اور بعینہ منافقوں کی اس قول سے مشابہ ہے،جیسا کہ اللہ تعالی نے ان کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے

,,کہ﴿اذا جاء ک المنافقون قالوا نشهد انک لرسول الله، والله یعلم انک لرسوله، والله یشهد ان المنافقین لکاذبون ﴾[المنافقون:١] ہم ان کے اس دعوے کو جھوٹے ثابت کرنے کے لئے مزید وضاحت کرتے ہیں، اگر چہ اشارۃً مذکورہ تفصیل میں گذر چکا ہے، ہم ان سے اول یہ استفسار اور وضاحت طلب کرتے ہیں، کہ آپ کے فقہاء نے جو مراتب ذکر کیئے ہیں، آپ کون سی رتبہ میں ہیں، حالانکہ آپ کے بزرگوں نے یہ تصریح کیا ہے کہ ہم آخری طبقہ میں ہیں، دوسری وجہ یہ کہ پہلے گذر گیا کہ علماء غیر مجتہدین کا دلیل قول مجتہد ہے قرآن وسنت سے استدلال نہیں کریگا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ان لوگوں کے کتابوں میں کافی سارے مسائل قرآن وسنت سے خلاف ہیں، جن کے امثال ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین اور دیگر ان علماء نے، جنہوں نے تقلید کی رد میں کتابیں لکھی ہیں، تفصیل سے ذکر کی ہیں، مذکورہ تفصیل سے اس مسئلے کا وضاحت پوری طرح ہوئی اور کوئی خفاء نہ رہی، نصیحتاً سورۃ نجم کا یہ آیت ان کو پیش کرتے ہیں﴿ان یتبعون الاالظن وما تهو ى الانفس، ولقد جاء هم من ربهم الهدىٰ ﴾[٢٣]اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ یہ لوگ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ کرام کی تقلید نہیں کرتے بلکہ ھویٰ کے پجاری اور خواہش پرست ہیں، ورنہ ان کے اقول منع تقلید میں کتنے واضح ہیں۔ آخر میں ابن ابی العز الحنفی کا قول جو کہ اس نے کتاب الاتباع :[ص:٨٠] میں ذکر کیا ہے، نقل کرتے ہیں تا کہ ان لوگوں کا اعتراض ختم ہوجائے، کہ جب ہم تقلید چھوڑ دینگے تو کیا کرینگے، ہم تو مجتہدین اور علماء نہیں، فرمایا : ,,فان الامة قد اجتمعت علی انه لایجب طاعة احد فی کل شیء الا رسول اللهﷺ ،بل غایة مایقال انه یسوغ او ینبغی اویجب علی العامی ان یقلد واحدا من الائمة من غیر تعیین زید او عمرو، واما ان یقول قائل انه یجب علی الامة تقلید فلان دون غیره، فهٰذا هو المحذور ،فمن تعصب لواحد من الائمة دون الباقین فهو بمنزلة من تعصب لواحد من الصحابة دون الباقین کالرافضی الذی تعصب لعلیؓ دون الخلفاء الثلاثة، فهٰذه طرق اهل الهوىٰ ،نسأل الله السلامة والعافیة،وهذا رفض وتشنیع لکنه تشنیع فی بعض الطوائف والعلماء لافی تفضیل بعض الصحابةؓ.والواجب علی کل مسلم یشهد ان لااٰله الا الله وان محمد ارسول الله ان یکون اصل قصده توحید اللهبعبادته وطاعة رسوله، ویعلم ان افضل الناس بعد الرسول هم الصحابة، فلا ینتصر لشخص انتصارا عاما مطلقا الالرسوله ﷺولالطائفة انتصاراعامامطلقا الاللصحابةؓ ،فان الهدی یدور مع الرسول ومع اصحابه دون اصحاب غیره، فاذاا جمعوا لم یجمعوا علی خطأ ،فان الدین

الـذی بـعـث اللہ بـه رسـولـه لیـس مسلما الی عالم واحد واصحابه ،ولو کان کذالک لکان ذالک الشـخـص نـظیـراً لـرسـول اللہ ﷺوهـو شبیـــه بـقـول الرافضة .وائمة الاسلام ابو حنیفةؒ ومالکؒ والشـافـعـیؒ واحـمـدؒ وغیرهم رضی اللہ عنهم کل منهم ذهب الی ما ذهب الیه عن اجتهاد، واما ان یـقـال الـمـجتهـد تارة یخطئی وتـــارة مصیب، وهٰذا هوالحق، فما اختلفوا فیه علی قولین او اکثر فأ حـدهـم مـصیـب وهـو صـاحب الاجرین، ومن خالفه مخطئی وله اجر علی اجتهاده، وخطأه مغفور، وهٰـذا فی کل مسألة حصل فیها اختلاف ،ولیس الصواب وقفا علی احدهم بعینه ،والخطأ وقفا علی الباقین .ومن اعتقدهٰذا فلیر اجع عقله فان هٰذه غفلة عظیمة واذا کان الامر کذالک فما من امام الا وقـد فـاتـه الـصواب ولو فی مسألة، لانه غیر معصوم ومایؤمن من قلده فی مسألة قد خالفه فیها غیره فـحـکـم بهـا وافتـی ان تکون تلک المسألة هی التی اخطأ فیها امامه، فعلیه ان یعرضها علی الدلیل ولایـقتـصـر علی ماقاله اصحابه فی الکلام علیها لاحتمال ان یکون عند من خالفه من الدلیل ما لیس عـنـدهـم لاناقد امرنا ان نرد ماتنازعنا فیه الی اللہ والرسول، والاخلال بهٰذاالواجب هوالذی اوجب الافتـراق الـمـذموم .وهٰذه کانت طریقة الصحابة والتابعین وتابعیهم، اهل القرون الثلاثة، المفضلة ،اعـنـی رد المتنازع فیه الی اللہ والرسول، ولم یکن فیهم من یأخذ بقول واحد معین منهم دون غیره، غیر رسول اللہ ﷺوهی طریقة التابعین لهم باحسان الی یوم الدین .

اورصفحہ:۸۸میں طلباءکووصیت خاصہ فرماتاہے :فـالـواجـب عـلـی مـن طـلب العلم النافع ان یحفظ کتـاب اللہ ویتـدبره ،وکذالک من السنة ماتیسر له ویطلع منها ویتروی ویأخذ معه من اللغة والنحو مـایصلح به کلامه ویستعین به علی فهم الکتاب والسنة، وکلام السلف الصالح فی معانیها، ثم ینظر فـی کـلام عـامة العلماء الصحابة،ثم من بعدهم ماتیسر له من ذالک من غیر تخصیص،فمااجتمعوا عـلیـه لایتـعداه، ومااختلفوا فیه نظر فی ادلتهم بغیر هوی ولاعصبیةثم بعد ذالک ﴿من یهد اللہ فهو الـمهتـد ومـن یـضلل فلن تجدله ولیا مرشدا﴾[الکهف :۱۷]اور قرطبی :۲/۲۱۲:.مسألہ سادسہ میں لکھتاہے کہ:فـرض علی العامی الذی لا یشتغل باستنباط الاحکام من اصولها لعدم اهلیته فیما لایعلمه من امر دینه ویحتاج الیه ان یقصد اعلم من فی زمانه وبلده فیسأله عن نازلته فیتمثل فیها فتواه ،لقوله

تـعالىٰ ﴿فأسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون﴾وعليه الاجتهاد فی اعلم اهل وقته بالبحث عنه حتی یقع علیه الاتفاق من الاکثر من الناس، وعلی العالم ایضا فرض ان یقلد عالمامثله فی نازلة خفی علیه فیها وجه الدلیل والنظر، واراد ان یجد دالفکر فیها والنظر، حتی یقف علی المطلوب فضاق الوقت عـن ذالک،وخـاف عـلی العبـــادة ان تفوت اوعلی الحکم ان یذهب ، سواء کان ذالک المجتهد الآخر صحابیا اوغیره ،والیه ذهب القاضی ابوبکروجماعة من المحققین۔

مذکورہ عبارات کا حاصل یہ ہے، جوشخص عامی محض اور جاہل ہے وہ علاقے کی عالم سے مسائل پوچھتا رہے گا،اور جو عالم ہے وہ بوقت ضرورت دوسرے عالم سے معلومات حاصل کرسکتا ہے،اور یہ اتباع ہے تقلید نہیں ،اگرچہ بعض نے اس کوتقلید مجازی یاتقلید ممدوح کا نام دیا ہے۔ان بھائیوں کیلئے نصیحت جوکہ کہتے ہیں کہ وہ قرآن وسنت کے متبع ہیں اورکسی کی تقلید نہیں کرتے ۔ان پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے اس دعوی میں سچے ہوں کہ وہ قرآن وسنت پرعمل کرتے ہیں، کہ اتباع قرآن وسنت ان کے ظاہراور باطن میں نمایاہوں،اور مقلدین جیسے نہ ہوں، جو کہ چند احادیث کو مانتے ہیں اور اکثریت سے پہلوتہی کرتے ہیں ،یہی وصیت عباد الخواص الشامی نے اپنے شاگردوں کوفرمایا تھا:ولاتـکـفـوا مـن السـنة بـانتـحـالها بالقول دون العمل بها ،فان انتحال السـنة دون الـعـمـل بهـا کذب بالقول مع اضاعة العمل[دارمی:۳/۱۷۴]اوربغیرعمل کےصرف نسبت کرنا اللہ تعالیٰ کےغضب کی سبب ہے،جیسا کہ سورۃ الصّف میں ہے﴿یٰٓاَ یُّهَـا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَـالَا تَـفْـعَـلُـوْنَ ﴿۲﴾ کَبُـرَمَـقْتـاً عِـنْـدَ اللّٰـهِ اَنْ تَـقُـوْلُـوْا مَـا لَا تَـفْـعَـلُوْنَ ﴿۳﴾﴾ اورسورۃ بقرہ میں یہ یھودیوں کی صفت ذکرکیا گیا ہے﴿ اَتَـاْمُـرُوْنَ الـنَّـاسَ بِـالْبِـرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُـمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلاتَعْقِلُوْن ﴿۴۴﴾﴾اوررسول اللہﷺ نے بغیرعمل کے قول کوقیامت کی نشانیوں میں شمارکیاہے۔عن عبـدالـلـه بن عمرو عن رسول الله ﷺ أنه قال :مـن اقتراب الساعة أن ترفع الاشرار وتوضع الأخیار ویفتح القول ویخزن العمل ویقرأ بـالـقـوم المثنـــاة ،لیس فیهم احد ینکرها قیل وما المثنـــاة؟ قال:مااکتتبت سوی کتاب الله عزوجل. (مستدرک:۵/۷۶۷)اتباع سنت کی تفصیل بعدمیں ائے گا:۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَالَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً

جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ سن نہ سکے

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا

(یہ) بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے کہ (کچھ) سمجھ ہی نہیں سکتے ۔اے اہلِ ایمان!

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں اُن کو کھاؤ اور اگر اللہ ہی کے بندے ہو تو اُس (کی نعمتوں) کا شکر بھی ادا کرو

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَا أُهِلَّ بِهٖ

اُس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سؤر کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام کر دیا ہے۔

لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ

ہاں جو ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اُس پر کچھ گناہ نہیں

إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتَابِ

بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے [۴۳]۔ جو لوگ (اللہ کی) کتاب سے اُن (ہدایتوں) کو جو اُس نے نازل فرمائی ہیں

---

[۴۳] اس ایت کریمہ میں ان چیزوں کی حرمت کا بیان فرماتا ہے جن کو مشرکین حلال سمجھتے تھے، اس ایت میں حصر کے ساتھ چار چیزوں کی حرمت بیان کی گئی ہے (۱) مردار (۲) بہنے والا خون (۳) خنزیر (۴) نذر لغیر اللہ:۔ اب ایک اشکال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ایت میں ''انما'' کلمہ حصر استعمال کر کے حرام چیزوں کو صرف چار میں بند کر دیا ہے، حالانکہ ان چار چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں ،جن کی حرمت خود قرآن میں اپنی اپنی جگہ مذکور ہے، تو پھر اس حصر کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں چوپایوں کی حلت وحرمت کا کوئی قانون بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ مقصود صرف مشرکین کی خود ساختہ تحلیل کی تردید ہے، مشرکین میں بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ وغیرہ کو جن کا ذکر سورۂ مائدہ میں

آئے گا اپنی طرف سے حرام کر رکھا تھا، تو ان کے جواب میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ جن چیزوں کو تم نے حرام ٹھہرا رکھا ہے وہ حرام نہیں ہیں، بلکہ حرام تو صرف یہ اشیاء ہیں۔ لیس المرادمن الایة قصر الحرمة علی ماذکر مطلقاکماهو الظاهر ....بل مقیدبمااعتقدوه حلالا. روح المعانی.

میتة: سے مراد ہر وہ جانور ہے جو ذبح کئے یا ہلاک کئے بغیر از خود مر جائے، یا اسے ذبح تو کیا جائے لیکن وہ ذبحہ شرعی طریقہ کے مطابق نہ ہو۔ وهی التی ماتت من غیر ذکاة شرعیة. روح المعانی، جس طرح مردار کا گوشت کھانا حرام ہے اسی طرح اس کے باقی تمام اجزاء سے فائدہ اٹھانا بھی جائز نہیں۔ البتہ اس کے بال، ہڈی بشرطیکہ اسے تمام رطوبتوں سے پاک صاف کرلیا گیا ہو، اور اس کا چمڑہ دباغت (رنگائی) کے بعد پاک ہیں، ان کا استعمال جائز ہے۔

اور دم (خون) سے، دم مسفوح مراد ہے یعنی وہ خون جو جانور کے بدن کے کسی حصہ سے بہہ کر نکلے، جیسا کہ ذبح کے وقت رگوں سے خون نکلتا ہے۔

''ولحم الخنزیر''، خنزیر کے تمام اجزاء یعنی گوشت، کھال، ہڈی، چربی، بال، وغیرہ سب حرام ہیں، اس کے بدن کے کسی حصہ سے انتفاع جائز نہیں۔ کیونکہ وہ نجس العین ہے، اور گوشت کی تخصیص صرف اس لئے کی گئی ہے کہ گوشت ہی جانور کا مقصودی اور ضروری حصہ ہوتا ہے، جب وہ حرام ہے تو باقی اجزاء بطریق اولی حرام ہونگے۔

ان محرمات میں سے چوتھی چیز ''مااهل به لغیر الله'' ہے ''اہل'' اہلال سے ہے، جس کے معنی اواز بلند کرنے اور شہرت دینے کے ہیں ''الاهلال اصله رفع الصوت (کبیر) اهل اهلال'' سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے چنانچہ عربی محاورات میں کہا جاتا ہے '' اهل الرجل، یااهل المعتمر، اذارفع صوته بالتلبیة '' یعنی عمرہ ادا کرنے والے نے بلند آواز سے تلبیہ پڑھا۔ لسان العرب: ۱۱/۷۰۱۔

''لغیر الله'' بحذف مضاف ای لتعظیم غیر الله اور ''به''، میں ''باء'' بمعنی علی ہے اس جملے میں کئی احتمالات ہیں:

ا: یعنی ''ما'' سے مراد وہ چوپایہ ہے جسے غیر اللہ (پیغمبر، ولی، فرشتہ یا جن وغیرہ) کو متصرف وکارساز، غیب دان اور مافوق الاسباب حاجت اور مشکل کشا سمجھ کر اس کی تعظیم کے پیش نظر اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے نذر و منت کے طور پر متعین اور نامزد کر دیا جائے یہ نذر غیر اللہ ہے اور حرام ہے، اس طرح یہ جانور حرام ہو جاتا ہے، اگر اسے

اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے تب بھی یہ حرام ہی رہتا ہے اور حلال نہیں ہوتا، اور اس کا حکم بالکل وہی ہے جو مردار کا ہے، نذر غیر اللہ کی حرمت کا مسئلہ قران مجید میں مختلف انداز بیان کے ساتھ کئی جگہ مذکور ہے مثلا:

سورة مائده: (۳) میں اوفسقااهل به لغير الله، سورۂ انعام: [۱۴۵، ۱۳۶] إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّهِ بِهِ، سورۂ نحل: ۱۱۵۔

اسی طرح علیؓ سے ایک روایت منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سنا: لعن الله من ذبح لغير الله ولعن الله من آوى محدثا، ولعن الله من لعن والديه ولعن الله من غيّر تخوم الارض. يعنى المنار ۔ جس شخص نے غیر اللہ کے لئے ذبح کیا اس پر اللہ کی لعنت ہے اور جس نے بدعتی کو پناہ دی اس پر اللہ کی لعنت ہے اور جس نے اپنے والدین پر لعنت کی اس پر اللہ کی لعنت ہے اور جس نے زمین کی حد بندی کے نشانات تبدیل کئے اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ اس روایت کو مسلم نے: ۱۹۷۸، میں نقل کیا ہے: واخرجه ابن ابی شيبه ۵۶۶/۶ ـ ۵۶۷ ـ ومسند بزار: ۳۹۱ ومسند ابی یعلی: ۶۰۲، وسنن کبری بیہقی: ۹۹/۶ والنسائی: ۲۳۲/۲، والحاکم: ۱۵۳/۴۔

طارق ابن شہاب سلمان رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ نقل کرتے ہیں کہ: دخل الجنة رجل فى ذباب ودخل النار رجل فى ذباب، قالوا وما الذباب؟ فرأى ذباباعلى ثوب انسان فقال هذا الذباب، قالوا وكيف ذاك؟ قال مر رجلان مسلمان على قوم يعكفون على صنم لهم، فقالوا لهما، قربا لصنمنا قرباناقالا لانشرك بالله شيئا، قالوا اقرباماشئتما، ولو ذبابا، فقال احدهمالصاحبه ماترى؟ فقال احدهمالااشرك بالله شيئافقتل فدخل الجنة، فقال الاخر بيده على وجهه فاخذذبابافالقاه على الصنم فدخل النار. ابن ابى شيبة: ۳۵۸/۱۲، وابونعيم فى الحلية ۲۰۳/۱، كتاب الزهد: ۱۵ الدر المنثور: ۷۵/۶، كفاية: ۱۸۵. شعب الايمان: ۴۵۷/۹، المعجم لابن الاعرابى: ۸۶۲/۲، یعنی ایک آدمی مکھی کی وجہ سے جنت میں داخل ہوا، اور دوسرا جہنم میں، انہوں نے پوچھا یہ کیسے؟ اس نے جواب میں کہا: کہ دو مسلمانوں کا ایک قوم پر گذر ہوا، وہ ایک بُت کی عبادت کر رہے تھے، تو ان لوگوں نے ان دونوں مسلمانوں کو کہا: اس بُت کے نام کوئی چیز نذر کر کے دیدو۔ تو ان دونوں نے کہا: ہم اللہ تعالی کے علاوہ کسی اور کے نام نذر نہیں دیتے (یعنی اس عبادت میں اللہ تعالی کا شریک نہیں ٹھہراتے، تو انہوں نے کہا کہ آپ کو ضرور دینا پڑے گا۔ اگر چہ ایک مکھی ہو۔ تو ان دونوں میں ایک نے انکار کیا تو ان مشرکوں نے اس کو قتل کر دیا، جس کی وجہ سے وہ جنت میں داخل ہوا، دوسرے نے قریب ایک مکھی کو پکڑ

کربُت کی طرف پھینکا تو موت کے بعد وہ جہنم میں داخل ہوا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے، جو کہ ثابت بن ضحاکؓ سے نقل ہے کہ: **نذر رجل علی عهد النبی ﷺ ان ینحر ابلا ببوانة ،فاتی النبی ﷺ فقال انی نذرت ان انحر ابلا ببوانة ،فقال النبی ﷺ هل کان فیها وثن من اوثان الجاهلیة یعبد؟قالوا لا ،قال هل کان فیها عید من اعیادهم؟قالوا لا ،قال رسول الله ﷺ اوف بنذرک، فانه لا وفاء لنذر فی معصیة الله ،ولا فیما لا یملک ابن آدم** ۔ابوداؤد: ۱۹۹/۳،ابن ماجہ: حدیث ۲۱۳۱،مسند احمد: ۱۹۵/۲۴۔

یعنی ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نذر مانی کہ وہ بوانہ مقام میں اونٹ ذبح کرے گا، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ کو خبر دی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس میں جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت تھا کہ اس کی عبادت کی جاتی تھی؟ صحابہ کرام نے کہا نہیں ،فرمایا اس میں کافروں کی کوئی عید تھی؟ کہا نہیں۔فرمایا اپنی نذر پوری کر، اس لئے کہ گناہ کی نذر کو پورا کرنا جائز نہیں اور جس میں آدم کا بیٹا مالک نہیں اس کا پورا کرنا بھی جائز نہیں۔

امام بخاری ایک عنوان لکھتا ہے "**باب ما ذبح علی النصب و الاصنام**" اور اس میں موحد جاہلیت کا واقعہ نقل کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ زید بن عمرو ابن نفیل سے بلدح کے نشیب میں ملے۔**وذاک قبل ان ینزل علی رسول الله ﷺ الوحی، فقدم الیه رسول الله ﷺ سفرة لحم،فابی ان یأکل منها،ثم قال انی لا اکل مما تذبحون علی انصابکم، ولا آکل الا ما ذکر اسم الله علیه۔**

یہ اس وقت کا ذکر ہے کہ جب آپ پر وحی نہیں اتری تھی ،پیغمبر نہیں ہوئے تھے، رسول ﷺ نے زید کے سامنے ایک دسترخوان رکھا (یہ دسترخوان مشرکوں نے بواسطہ رسول اللہ ﷺ آپ کو پیش کیا، اس لئے آپؐ نے مشرکوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ جملہ فرمایا: از فتح) جس پر گوشت تھا، زید نے اس کے کھانے سے انکار کیا پھر کہنے لگے میں ان جانوروں کا گوشت نہیں کھاتا جن کو تم بتوں کے تھانوں پر ذبح کرتے ہو، میں تو اسی جانور کا گوشت کھاتا ہوں جو اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے۔بخاری مع الفتح: ۱۸/۱۱۔

ابن کثیر اور ابن ابی حاتم نے تفسیر سورۂ مائدہ میں ابوالطفیل سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آدم علیہ السلام کے وقت سے لیکر آج تک یہ چاروں چیزیں حرام رہی ہیں، کسی وقت ان میں سے کوئی بھی حلال نہیں ہوئی۔ مردار، خون، سور کا گوشت، اللہ تعالی کے سوا دوسرے کے نام کی چیز۔

اسی طرح ابن کثیر وابن ابی حاتم نے تفسیر سورۂ مائدہ میں علیؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے: قال کان رجل من بنی ریاح یقال له ابن وثیل، وکان شاعرا، نافر "غالبا" ابا الفرزدق ،بماء بظهر الکوفة، علی ان یعقر هذامائة من ابله، وهذامائة من ابله، اذاوردت الماء، فلماوردت الماء قاما الیهابالسیوف، فجعلا یکسفان عراقیبهما، قال فخرج الناس علی الحمرات و البغال یریدون اللحم ،قال وعلیؓ بالکوفة ،قال فخرج علیؓ علٰی بغلة رسول الله البیضاء وهوینادی یاایها الناس لاتأکلوامن لحومهافانمااهل به لغیر الله. اور یہ قالی نے کتاب امالی میں: ۲/۱۱۷، وذیل الامالی: ۳/۵۴، میں نقل کیا ہے۔

علیؓ جب کوفہ کے حاکم تھے، اس وقت قبیلہ بن ریاح کا ایک شخص جو شاعر تھا، فرزدق کے دادا غالب سے مقابل ہوا، اور یہ طے پایا کہ دونوں آمنے سامنے ایک ایک سو اونٹوں کی کوچیں کاٹیں گے، چنانچہ کوفہ کی پشت پر پانی کی جگہ یہ آئے اور جب وہاں ان کے اونٹ آئے تو یہ اپنی تلواریں لے کر کھڑے ہوگئے۔ اور اونٹوں کی کوچیں کاٹنی شروع کیں اور دکھلاوے، سناوے اور فخر وریاکاری کے لئے دونوں اس میں مشغول ہوگئے۔

کوفیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ اپنے گدھوں اور خچروں پر سوار ہوکر گوشت لینے کے لئے آنے لگے، اتنے میں جناب علی المرتضی رسول اللہ کے سفید خچر پر سوار ہوکر یہ منادی کرتے ہوئے وہاں پہنچے کہ لوگو، یہ گوشت نہ کھانا یہ جانور "مااهل به لغیر الله"، میں داخل ہیں۔ اور قرطبی نے یہ واقعہ: ۲/۲۲۴، میں مختصر نقل کیا ہے۔

عائشہؓ سے امام قرطبیؒ ۲/۲۲۴، ایک واقعہ نقل کرتا ہے: ۲/۲۲۴: قالت امــرأة عندذلک من الناس: یاام المؤمنین ان لناأظأرا من العجم لایزال یکون لهم عید، فیهدون لنامنه، أفنأکل منه شیئا؟ قالت اماماذبح لذلک الیوم فلاتأکلوا ولکن کلوامن اشجارهم۔ یعنی ایک عورت نے ام المومنین عائشہؓ سے سوال کیا کہ ام المؤمنین، ہمارے کچھ رشتہ دار عجمی لوگوں میں سے ہیں اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا رہتا ہے یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ (تحفہ) ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں یا نہ؟ اس پر عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا: جو جانور اس عید کے دن کے لئے ذبح کیا گیا ہو وہ نہ کھاؤ، لیکن ان کے درختوں کے پھل وغیرہ کھا سکتے ہو۔

اور اسی طرح قرطبی نے حسنؒ سے مذکورہ صفحہ میں ایک فتویٰ نقل کیا ہے: انه سئل عن امرأة مترفة صنعت للعبهاعرسافنحرت جزورا، فقال الحسن لایحل أکلهافانهاانمانحرت لصنم۔ یعنی ایک مالدار عورت اپنی گڑیوں کے نکاح پر اونٹ وغیرہ ذبح کرتی ہے تو یہ حلال ہیں؟ تو حسن نے فتوی دیا کہ اسے نہ کھانا چاہئے اس لئے کہ یہ ایک

تصویر کے لئے ذبح کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ابن عطیہ نے محرر الوجیز:۵۰/۲، میں بھی ذکر کیا ہے۔

اس کے متعلق اکثر مفسرین نے یہی مسئلہ ذکر کیا ہے کہ جوشخص غیر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اس کی تعظیم بجالانے کے لئے جانور ذبح کرے، وہ ملعون اور مرتد ہے۔ تفسیر غرائب القرآن میں اس آیت کے تحت نظام الدین نیسا پوری اور شیخ زادہ حاشیہ بیضاوی:۴۸۱/۱، میں لکھتا ہے: **قال العلماء لو ان مسلماذبح ذبيحة وقصد بذبحها التقرب لغير الله،صارمرتدا ،وذبيحته ذبيحة مرتد .**

یعنی علما نے کہا ہے کہ اگر کسی مسلم نے ایک جانور کو ذبح کیا اور اس سے غیر اللہ کے تقرب کا قصد کیا تو وہ مرتد ہو گیا، اور اس کا مذبوحہ مرتد کا مذبوحہ ہے۔ اور ایسی عبارت امام رازی نے تفسیر کبیر:۱۱/۵، میں لکھی ہے۔ وفتاوی عزیزیہ:۵۰/۱۔

اور شاہ عبد العزیزؒ فتاوی عزیزیہ:۶۵/۱، میں لکھتا ہے: کہ درحدیث صحیح وارد شدہ کہ ملعون من ذبح لغیر اللہ یعنی ہر کہ بذبح جانور تقرب بغیر خدا نماید ملعون است خواہ دروقت ذبح خدا بگیرد یا نہ، زیرا کہ جون شہرت داد کہ این جانور برائے فلان است ذکر نام خدا بوقت ذبح فائدہ نہ کرد چہ آن جانور منسوب بآں غیر گشت وخبث درو پیدا شد کہ زیادہ ازخبث ومرداراست وہرگاہ این خبث دروے سرایت کرد، دیگر بذکر نام خداوند حلال نمی شود مانند سگ وخوگ کہ اگر بنام خداوند مذبوح شوند حلال نمی گردند۔

یعنی صحیح حدیث میں ہے کہ ہر شخص جانور ذبح کرنے سے تقرب لغیر اللہ چاہے وہ ملعون ہے، ذبح کے وقت اللہ کا نام لے یا نہ لے، کیونکہ جب اس نے مشہور کر دیا کہ یہ جانور فلاں فلاں غیر اللہ کے لئے ہے، تو ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، جب وہ جانور بطور نذر ومنت غیر کی طرف منسوب ہو گیا ہو تو اس میں مردار سے بھی بڑھکر نجاست پیدا ہوگئی اور اس میں اس طرح گھس جائے گی کہ اب وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے سے حلال نہیں ہوگا۔ جس طرح کتا اور خنزیر ذبح کرنے سے حلال نہیں ہوتے۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب اس پر اللہ تعالی کا نام ذبح کرنے کے وقت لیا جائے تو پھر جانور حلال اور پاک ہوتا ہے تو اس کا جواب تبصیر الرحمٰن میں علی مہائمیؒ دیتے ہیں: **وماا هل لغير الله به فانه وان ذكر معه اسم الله فقدعارض المطهرفيه المنجس مع نجاسته بالموت وان لم يذكرفقدزيدفى تنجيسه** ۔ اور معارف القرآن والے نے ۲۹/۳، میں لکھا ہے: وہ جانور جو غیر اللہ کے لئے نام زد کیا گیا ہو پھر اگر ذبح کے وقت بھی اس

پر غیر اللہ کا نام لیا ہے تو وہ کھلا شرک ہے۔اور یہ جانور باتفاق مردار کے حکم میں ہے۔جیسا کہ مشرکین عرب اپنے بتوں کے نام پر ذبح کیا کرتے تھے، یا بعض جاہل کسی پیر فقیر کے نام پر، اور اگر بوقت ذبح نام تو اللہ کا لیا، مگر جانور کسی غیر اللہ کے نام پر نذر کیا ہوا اور اس کی رضا مندی کے لئے قربان کیا ہے، تو جمہور فقہا نے اس کو بھی ''**ما اهل به لغير الله**'' کے تحت حرام قرار دیا ہے۔

بعض لوگ اعتراض میں ملاجیون کی یہ عبارت نقل کرتے ہیں: **ومن ههنا علم ان البقرة المنذورة للاولياء كما هو الرسم فى زماننا حلال طيب، لانه لم يذكر اسم غير الله عليها وقت الذبح ،وان كانوا ينذرونها له**۔تفسیرات احمدی:۴۵۔تو اس کا جواب مولانا اشرف علی تفسیر بیان القران:۱/۹۷، میں اور فتاوی امدادیہ:۴/۹۰ میں دیتا ہے۔

بعض لوگوں کو تفسیر احمدی کی عبارت سے یہ شبہ ہو گیا ہے، اس کا جواب اس کے منہیہ سے ظاہر ہے کہ انہوں نے تاویل ایصال ثواب کی بناء پر حلت کا حکم فرمایا ہے، اور بلا تاویل حلال نہیں کہتے ،جیسا کہ اسی قسم کی تاویل سے نووی نے ابراہیم مروزی کے قول کے بعد رافعی کا قول نقل کیا ہے تو جہاں یہ تاویل یقیناً منفی ہو اس کو کیسے حلال کہا جاوے گا، اور عوام کا یہ فعل یقیناً قابل تاویل نہیں ،دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر اس جانور کے بدلے اس سے دوگنی قیمت انکو دیکر کہا جاوے کہ بجائے اس جانور کے اس چیز سے ایصال ثواب کردو، ہرگز وہ گوارہ نہ کریں اور استبدال میں اندیشہ ناراضی ان بزرگوں کا کریں جس سے فساد نیت یقینی ہے اور یہی مدار تھا حرمت کا۔

اور یہی جواب مفتی رشید احمد نے:احسن الفتاوی:۱/۴۹، میں دیا ہے، جب کہ بحر العلوم علامہ سید امیر علی تفسیر مواہب الرحمٰن :۲/۷۷، میں بہت تفصیل کے بعد لکھتا ہے، اور صاحب تفسیر احمدی نے جو اس مقام پر تساہل کیا، وہ سخت خطاء ہے، اللہ تعالی ہم کو اور ان کو عفو کرے اور بخشدے اور:۵/۴۳، میں اس کا سخت جواب دیتا ہے: پس عجب ان لوگوں سے کہ خالی منطق وفلسفہ پڑھ کر فتوی پر قلم اٹھاتے ہیں اور شیخ صدو کے نام کا بکرا اور مانند اس کے جائز بتاتے ہیں، یہ خلاف مذاہب ائمہ حنفیہ رحمہم اللہ تعالی، بلکہ خلاف مذہب فقہاء وائمہ مجتہدین ہے، جس کا گناہ تا قیامت اپنے سر پر لیتے ہیں۔اور معنی بھی یہ لکھتے ہیں کہ ہر وہ چیز حرام کی گئی کہ غیر اللہ کے لئے پکاری گئی ہو۔

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہے کہ پھر تو مہمانوں وغیرہ کے لئے ذبح کرنا بھی ناجائز ہے، تو اس کا جواب درمختار اور رد المختار (شامی): کتاب الذبائح ۹/۳۷۵، میں دیتا ہے: **ذبح لقدوم الامير ونحوه كواحد من العظماء يحرم لانه**

''اهـل بـه لـغير الله''،ولو ذكر اسم الله،ولو ذبح للضيف لايحرم ،لانه سنة الخليل عليه السلام ،واكرام الـضيف اكـرام اللہتـعـالـی،و الفارق انه ان قدمهاليأكل منهاكان الذبح لله تعالى، و المنفعة للضيف، اولـلـولـيـمة، اولـلـربـح ،وان لـم يقدمهاليأكل منهابل يدفعهالغيره كان لتعظيم غيرالله فتحرم، وهل يكفر؟قولان۔

یعنی کسی کے آنے پر جانور کوذبح کرنا حرام ہےاس لئے کہ یہ[مااهل به لغيرالله] کامعنی اس کوشامل ہےاگر چہ ذبح کے وقت اس پراللہ کا نام لیاجائے ۔اوراگر ذبح کے وقت یہ ارادہ ہوکہ مہمان کے لئے ضیافت میں ذبح کرنا ہے تو پھرحرام نہ ہوگا،کیونکہ یہ سنت ابراہیمی ہے،اورمہمان کااکرام اللہ ہی کا اکرام ہے،اس میں فرق واضح ہے، کہ اگرمہمان کے کھانے کے لئے ذبح کیاجائے تو ذبح اللہ تعالی کے نام ہے،اورکھانے کا فائدہ مہمان وغیرہ کے لئے ہے،اوراگراس کوکھانے نہ دیاصرف اس کی تعظیم کے لئے ذبح کر کے دوسروں کودیا،تواس میں تعظیم لغیر اللہ ہے،اور یہ حرام ہے،جبکہ کفر میں علماء کااختلاف ہے۔

اوراسی طرح تفسیر مواہب الرحمٰن :۲؍۷۷، میں بھی فرماتا ہےاور یہ جوبعض لوگوں کووہم ہوا کہ مہمان کے لئے ذبح کرتے ہیں۔جواب یہ ہے کہ اگراس کےتقرب کے لئے ہوتومرتدوکافر ہےکمافی الفتاوی، بلکہ یہ تو مہمان کی ضیافت کے لئے اللہ کے نام پرذبح ہوتاہےجیسے روز بازار میں ہزاروں جانورذبح ہوکرفروخت ہوتے ہیں،الخ۔

مولاناعبدالحی فرنگیؒ نے مجموعہ فتاوی:۲؍۸۹، میں لکھاہے کہ ''مـااهـل بـه لـغيـر الله'' سے مرادوہ جانور ہے جوبقصدتقرب الی غیراللہ ذبح کیاجاوے،اورمقصود اراقۃ الدم سےتعظیم غیرخداہو،اورجان دیناخاص غیر کےلحاظ سے ہووے ایساجانورحرام ہے،اگر چہ وقت ذبح کےبسم اللہ اس پرکہی جاوے، ذبـح لـقـدوم الاميـر ونحوه كواحدمن العظماء يحرم لانه اهل به لغيرالله ولوذكراسم الله عليه ولو ذبح للضيف لايحرم۔

مولانااشرف علی تھانویؒ نے :فتاوی امدایہ:۴؍۸۹، میں فرمایاہے (جس کا حاصل یہ ہے) کہ: بزرگوں کی نذرونیاز کا جانوراگرکسی واسطے ذبح کیاجاوے کہ وہ بزرگ ہم سے خوش ہوں، اورہمارا کام کردیں، اوران کومتصرف فی التکوین سمجھے، اوران سےتقرب کے لئے ذبح کرے اورذبح سے وہی مقصود ہوں، چنانچہ اس زمانہ میں اکثر جہاں کا یہی عقیدہ ہوتاہے،تو یہ عقیدہ رکھنے والامشرک اوروہ ذبیحہ بالکل حرام ہے،اگر چہ بوقت ذبح اللہ کا نام لیاجاوے۔

''ومااہل بہ لغیر اللہ'' اوراگراللہ کےواسطے دیکراس کا ثواب کسی بزرگ کی روح کوبخشد یاتو یہ جائز ہےفقط۔

''ما'' کی تفسیر میں دوسرا احتمال یہ ہے جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر عزیزی میں فرمایا ہے کہ ''ما'' عام ہے اوراس کی مراد بھی عام ہے، خواہ جانور ہو یا غلہ یا مٹھائی ہو یا کوئی اور چیز جو غیراللہ کے تقرب کے لئے دی جائے سب اس میں شامل ہیں، اگر ''ما'' سے صرف ذبیحہ مراد لیا جائے تو پھر اس کے بعد ''ماذبح علی النصب'' کی ضرورت باقی نہیں رہتی، لہٰذا جن لوگوں نے ''ما'' سے صرف ذبیحہ مراد لیا ہے انہوں نے مااہل کی صرف ایسی صورت بیان کی ہے جو مشرکین میں اس وقت رائج تھی، ورنہ یہ بات وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مشرکین مکہ جانوروں کے علاوہ غلہ وغیرہ کی نذریں بھی غیراللہ کے لئے مانتے تھے، جیسا کہ ﴿ وجعلوا لله مماذرأمن الحرث و الانعام نصيبا﴾ الخ سے معلوم ہوتا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ **وماذبح على النصب** سے صرف ذبیحہ مراد ہو اور مااھل سے مراد عام ہو، یعنی جانور، غلہ وغیرہ پہلی اور دوسری دونوں تفسیروں کی صورت میں ''ب'' کو بمعنی علی لینا پڑیگا۔

یہی معنی نواب صاحب نے تفسیر ترجمان القران اور شاہ عبدالعزیز نے اور صاحب فتح المجید نے بھی: ۱۴۰، میں اختیار کیا ہے اور مفتی رشید احمد احسن الفتاوی: ۵۲/۱، میں لکھتا ہے کہ: **مااھل به لغير الله** ، کے عموم میں مٹھائی وغیرہ بھی داخل ہے، اور **ماذبح على النصب** کا بالاستقلال ذکر اس پر قرینہ ہے کہ، **مااھل به لغير الله** حیوان وغیر حیوان دونوں کو شامل ہے، اور اگر اسے حیوان کے ساتھ خاص رکھا جائے تو غیر حیوان کی حرمت ثابت بالقیاس ہوگی، **بعلة التقرب الى غير الله**۔

اوراسی طرح مفتی محمد شفیع صاحب معارف القرآن: ۴۲۴/۱، میں لکھتا ہے کہ: یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے، جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً، مٹھائی کھانا وغیرہ جن کو غیراللہ کے نام پر نذر کے طور سے ہندو لوگ بتوں پر، اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں، فقہاء نے اس کو بھی اشتراک علت یعنی تقرب الی غیراللہ کی وجہ سے "**مااھل به لغير الله**" کے حکم میں قرار دیکر حرام کہا ہے۔

فقہاء احناف مسئلہ نذر لغیر اللہ کے متعلق لکھتے ہیں، خصوصاً ابن نجیم بحرالرائق: ۵۲۱/۲، میں لکھتا ہے: **وقد قدمنا ان النذر لايصح بالمعصية" للحديث" (لانذرفي معصية الله تعالى)** . یہ روایت امام مسلم نے کتاب النذر حدیث نمبر ۸، ابوداوٗد نے **كتاب الايمان باب: ۲۱، ۹** ، امام ترمذی نے کتاب النذور باب اول امام نسائی نے **كتاب الايمان: ۱۷، ۳۱** ، ابن ماجہ نے کتاب الکفارات باب: ۱٦، اور مسند احمد نے: ۲۰۷/۲، اور ٦/۲۴۷، میں نقل کیا ہے.

فقال الشيخ قاسم في شرح الدرر،واما النذر الذى ينذره اكثر العوام على ماهومشاهد،كان يكون للانسان غائب،اومريض، اوله حاجة ضرورية، فيأتى الى بعض الصلحاء ويجعل على رأسه سترة ،ويقول ياسيدى فلان ان ردالله‌غائبى اوعوفى مريضى اوقضيت حاجتى، فلك من الذهب كذا،اومن الفضة اومن الطعام كذا،اومن الماء كذا،اومن الشمع كذا،اومن الزيت كذا،فهذا النذرباطل بالاجماع لوجوه:منهاانه نذرمخلوق و النذرللمخلوق لايجوز،لانه عبادة ،و العبادة لاتكون لمخلوق.ومنهاان المنذورله ميت، و الميت لايملك، ومنهاانه ظن ان الميت يتصرف فى الاموردون الله‌تعالى ،واعتقاده ذلك كفر.

پھر کچھ عبارت کے بعد لکھتا ہے:ولايجوزلخادم الشيخ اخذه، ولااكله، ولا التصرف فيه، بوجه من الوجوه الاان يكون فقيرااوله عيال فقراء عاجزون عن الكسب ،وهم مضطرون فيأخذون على سبيل الصدقة المبتدأة، فاخذه ايضامكروه مالم يقصدبه الناذر التقرب الى الله‌تعالى وصرفه الى الفقراء ويقطع النظرعن نذرالشيخ ،فاذاعلمت هذافمايوخذمن الدراهم و الشمع والزيت وغيرها،وينقل الى ضرائح الاولياء تقربا اليهم، فحرام باجماع المسلمين مالم يقصدوبصرفهاللفقراء الاحياء قولاواحدا.اوریہی عبارت فتح المجید والے نے:١٥٧، میں نقل کی ہے۔

اوراسی طرح درمختار جوکہ شامی کامتن ہے اس میں لکھتا ہے:٣٧٩/٣،واعلم، ان النذر الذى يقع للاموات من اكثر العوام ومايوخذمن الداراهم و الشمع وا لزيت ونحوها،الى ضرائح الاولياء الكرام تقربا ا ليهم، فهوبالاجماع باطل وحرام ،مالم يقصدواصرفهاالفقراء الانام وقدابتلى الناس بذلك، ولاسيمافى هذه الاعصار.وقدبسطه العلامة قاسم فى شرح درر البحار،ولقدقال الامام محمدؒ لوكانت العوام عبيدى، لاعتقتهم واسقطت ولائى ،وذلك لانهم لايهتدون فالكل بهم يتعيرون۔اوراس کی شرح میں ابن عابدین شامی لکھتا ہے: صاحب بحرالرائق کی عبارت نقل کرنے کے بعد: امالونذرزيتالايقادقنديل فوق ضريح الشيخ اوفى المنارة كمايفعل النساء من نذر الزيت لسيدى عبد القادرويوقدفى المنارةجهة المشرق فهوباطل، واقبح منه النذربقرأة المولدفى المنائرومع اشتماله على الغناء و اللعب وايهاب ثواب ذلك الى حضرة المصطفىﷺ:٣٨٠/٣۔

یعنی حاصل عبارت یہ ہے کہ ایک حنفی عالم شیخ قاسم اپنی کتاب ''شرح دررالبحار'' میں لکھتے ہیں: کہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر لوگ کسی ولی یا بزرگ کی قبر پر اس کے سرہانے کھڑے ہو کر نذر مانتے ہیں اور ان میں سے ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ اے جناب! اگر میرا گم شدہ مل جائے، یا میرا مریض صحت یاب ہو جائے، یا اپنی کسی حاجت کا نام لیکر کہتا ہے کہ میری یہ ضرورت اور حاجت پوری کر دے گا، تو میں اتنا سونا یا اتنی چاندی تیری نذر کروں گا، یا اتنا کھانا یا اتنا دودھ یا فلاں فلاں شے اتنی مقدار میں تجھے دوں گا، یا اتنا تیل تیری قبر پر جلاؤں گا۔ یاد رکھیئے: یہ نذر بالا جماع باطل قرار پائے گی جس کی کئی وجوہ ہیں۔

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ یہ نذر مخلوق کے لئے ہے اور مخلوق کے لئے نذر ماننا ناجائز ہے کیونکہ نذر بھی ایک قسم کی عبادت کا نام ہے اور عبادت اگر چہ کسی قسم کی ہو کسی مخلوق کے لئے نہیں کی جا سکتی۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ نذر میت کے لئے مانی گئی ہے اور میت کو کسی چیز پر بھی قدرت اور تصرف حاصل نہیں ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ نذر ماننے والے نے یہ خیال کیا کہ میت کو معاملات میں تصرف حاصل ہے اور یہ عقیدہ رکھنا کفر ہے۔

علامہ قاسم الحنفیؒ مزید فرماتے ہیں کہ، مندرجہ بالا دلائل معلوم ہونے کے بعد جو شخص نقدی، یا شمع یا تیل وغیرہ اولیاء اللہ کی قبر پر اس لئے لے جاتا ہے کہ وہاں سے تبرک حاصل کرے گا، تو یہ فعل اور عمل باجماع المسلمین حرام ہے، اس عبارت کو ابن نجیم، شامی، اور شیخ صنع اللہ الحنفیؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔

اور اسی طرح کی عبارات اور کتابوں میں بھی زیادہ ہیں، لیکن مذکورہ عبارات پر اکتفاء کرتے ہیں، البتہ دیگر کتابوں کے صرف حوالہ جات نقل کرتے ہیں: **غاية الاماني: ۲/ ۳۱، ۳۱۲، اغاثة اللهفان: ۱/ ۳۰۵، حاشية الطحطاوى على الدر المختار: ۱/ ۴۷۱، البلاغ المبين: ۲۹، جلاء العينين: ۴۹۰، ۵۰۳، منهاج التاسيس: ۴۱۷، روح المعانى: ۱۳/ ۶۷، ۱۷/ ۲۱۲، ابداع: ۸۹، مجموعة الفتاوى لعبد الحى: ۲/ ۸۹، ۲۹۹، ۱۵۱، ۳۹۰اور ۳/ ۱۰۵، ۱۲۴. كتاب سيف الله ۶۹، تيسير العزيز الحميد: ۲۰۳، تلخيص كتاب الاستغاثة: ۹۰، ۲۹۷، رساله زيارة القبور للبركوى: ۷، ۲۲. ۲۹، ۵۲، مجالس الابرار ۱۱۹، كشاف القناع: ۶/ ۲۷۶، الفروع لابن مفلح: ۶/ ۳۵۹، الدين الخالص: لصديق حسن خان: ۲/ ۱۸۹، ۱۹۱، ۳/ ۴۸، ۵۰، ۵۲، ۵۶، ۶۵، ۶۶. ومدارج السالكين: ۱/ ۳۴۵**

مغنی المحتاج للشربینی: ۴/ ۳۷۱، ومجموعة الفتاویٰ لشیخ الاسلام: ۲۴/ ۳۱۹، ۲۶/ ۳۰۷، ۲۷/ ۷۷، ۱۴۶، وفتح المعین: شرح شرح ملا مسکین علی الکنز: ۴۵۰، واقتضاء الصراط المستقیم: ۲/ ۶۷۱، ۸۰۴، ۴۰۰، ۷، و الروض الندی: شرح کافی المبتدی: ۵۰۲، وغمز عیون البصائر لابن نجیم المصری: ۲۳۱، الفتاوی الحامدیه: ۳۱، شفاء الصدور: ۶۶، ۶۷۔ جبکہ امام سیوطیؒ کتاب الامر بالاتباع: ۱۳۴، میں لکھتا ہے:۔

لایحل اسراج القبورو لا النذرلسرجهاو کذلک ایقاد المصابیح کالسرج و الشمع و القنادیل فی هذه المشاهدو الترب لایجوزبلاخلاف ،للنهی الواردفی ذلک وفاعله ملعون علی لسان رسول اللهﷺ حیث قال: لعن الله زائرات القبورو المتخذین علیها المساجدو السرج. یہ روایت ابوداود نے کتاب الجنائز رقم: ۳۲۳۶، اورترمذی نے کتاب الصلوٰۃ رقم ۳۲۰، امام نسائی نے کتاب الجنائز: ۹۴/۴، ۹۵، ابن ماجہ نے کتاب الجنائز رقم ۱۵۷۵، ابن ابی شیبہ نے: ۳۴۴/۳، مسند احمد: ۲۲۹/۱، ۲۸۷، ۳۲۴، ۳۳۷۔ مسند طیالسی رقم: ۲۷۳۳، ابن حبان: رقم: ۳۱۶۹، معجم کبیر: ۱۴۸/۱۲، مستدرک: ۳۷۴/۱، سنن کبری بیھقی: ۷۸/۴، تاریخ بغداد: ۷۰/۸، ۱۷، شرح السنۃ: ۴۱۶/۲، وغیرہ نے عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔

اس کے بعد امام سیوطی لکھتا ہے: ولایجوز الوفاء بمانذرلهامن زیت وشمع وغیرذلک ۔جبکہ :۱۱۷، پر لکھتا ہے: واقبح من ذلک ان ینذرلتلک البقعة، دهنالتنویرها اوشمعاویقول: انهاتقبل النذور کمایقوله بعض الضالین ۔اور ۱۱۸، پر لکھتا ہے: اوینذرذلک لقبرای قبرکان ،فان هذانذرمعصیة باتفاق العلماء لایجوز الوفاء به، بل علیه کفارة یمین عندکثیرمن العلماء ،منهم احمدوغیره۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ''ما'' عام ہے تو بعض مفسرین نے اس سے صرف ذبیحہ کیوں مراد لیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل عرب کے یہاں لفظ اہلال کا زیادہ تر استعمال مذبوحہ پر ہوتا تھا، اس کے پیش نظر انہوں نے ''ما'' سے مذبوحہ مراد لیا، اس سے ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مذبوحہ کے علاوہ باقی اشیاء سے غیر اللہ کی نیاز جائز ہے، بلکہ ان مفسرین کے نزدیک جس طرح جانوروں سے غیر اللہ کا نیاز حرام ہے اسی طرح باقی اشیاء، غلہ، کپڑا وغیرہ سے بھی حرام ہے۔

اور آیت کے مفہوم میں ایک تیسرا احتمال بھی ہے، وہ یہ کہ ما سے مراد کلام ہو، جس سے غیر اللہ کے تقرب کے لئے

جانور نامزد کیا گیا ہو، مطلب یہ ہے کہ ایسا کلمہ بھی حرام اور مشرکانہ ہے جسے غیر اللہ کی نذر ومنت مانتے وقت بلند کیا جائے۔حاصل مطلب اس کا بھی وہی ہوگا جو شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے اس صورت میں ''بــــہ'' کی ''ب'' اپنے اصل پر رہے گی۔اور اسے علی کے معنی میں لینے کی ضرورت نہیں ہوگی جیسا کہ کہا جاتا ہے: اهللت بالتلبية و اهللت بالتسمية على الذبيحة .

صراح میں ہے: اهـل الـمعتـمر اذا رفع صوته بالتلبية و التسمية على الذبيحة، جیسے کہ پہلے لسان العرب سے منقول ہو چکا ہے:فـمـجـرورا لبـاء هـو لـفظ يرفع به الصوت اى اسم الله مثلا،فالمراد من قوله تـعـالـى ''ومـا اهـل بـه'' اى لفظ رفع به الصوت لتعظيم غير الله و التقرب اليه، حاصل یہ کہ اس کلام سے تکلم اور اس قول کا تلفظ بھی حرام کر دیا جس سے غیر اللہ کا تقرب مقصود ہو،اور اسی وجہ سے ہر وہ چیز بھی حرام ہوگی جس سے غیر اللہ کا تقرب مطلوب ہو،اور بعینہ انـه رجـس اور فسـقـا اهـل لـغيـر الله به (الانعام) میں فسقا سے بھی کلمہ تقرب ہی مراد ہے جس کے ذریعے غیر اللہ کی نذر ومنت مانی جائے۔

طبری نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے بعض علماء یہ استدلال کرتے ہیں کہ نذر لغیر اللہ کا کھانا حلال ہے اور یہ فعل حرام ہے۔حـدثـنـا ابـن حـمـيـد قـال حـدثـنـا سـلـمة عن ابن اسحاق عن يعقوب بن عتبـه قـال، فـلـمـا خـرجوا من عند رسول الله ﷺ وتوجهوا الى بلادهم راجعين، بعث رسول الله ﷺ اباسفيان بن حـرب و الـمغيره بن شعبه فى هدم الطاغية، فخرج مع القوم حتى اذا قدموا الطائف، اراد المغيرةؓ ان يقدم اباسفيان،فابى ذلک ابو سفيان عليه ،وقال ادخل انت على قومک ،واقام ابو سفيان بماله بذى الهـرم، فلما دخل المغيرةؓ علاها يضربها بالمعول وقام قومه دونه، بنو متعب ،خشية ان يرمى اويصاب كما اصيب عروة وخرج نساء ثقيف حسرا يبكين عليها ويقلن:

الا ابكين دُفّاع☆اسلمها الرُّضاع☆لم يحسنوا المِصاع.

قـال : ويقول ابو سفيان و المغيرة يضربها بالفأس واهالک، واهالک، فلما هدمها المغيرةؓ اخذ مالها وحـليهـا وارسـل الـى ابـى سـفيــان وحـليهـا مـجـمـوع ومـالهـا من الذهب والجزع ،وكـان رسول الله ﷺ امر اباسفيان ان يقضى من مال اللات دين عروة و الاسود ابنى مسعود فقضى منها دينهما .وفى هذه السنة غزا رسول الله ﷺ غزوة تبوک۔تاریخ طبری:۲/۱۸۱۔

راوی کہتے ہیں کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس سے نکل گئے اور چلے اور جب اپنے گاؤں واپس ہونے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیانؓ اور مغیرۃ بن شعبۃؓ کو بتوں کو توڑنے کیلئے بھیجا، تو یہ دونوں اپنی قوم کے ساتھ نکل گئے حتی کہ یہ طائف تک پہنچے، تو مغیرہؓ نے ابوسفیانؓ کو آگے کرنے کا ارادہ کیا، ابوسفیانؓ نے ایسا کرنے سے انکار کیا، اور کہنے لگا کہ تم اپنے قوم کے پاس چلے جاؤ، اور ابوسفیانؓ اپنے مال کے ساتھ ذی ہرم مقام پر ٹھر گیا اور مغیرہؓ جب داخل ہوئے تو اوپر چڑھ کر ہتھوڑے سے مارنے لگا، اور اس کی قوم بنو متعب یہاں ٹھرے، اس خوف سے کہ ان کو مارا جائے گا یا عروہ جیسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے (یعنی یہ معبود ان کو ضرر پہنچائے گا) تو بنو ثقیف قبیلہ کی کچھ خواتین ننگے سر نکل گئیں جو کہ اس پر گریہ کر کے یہ اشعار کہتی رہیں ۔ضرور روئینگے دفاع کرنے والے ☆ اسکو دے دیا لئیم لوگوں نے ☆ اور انہوں نے تلوار کے واروں میں اچھا مقابلہ نہیں کیا۔

راوی کہتا ہے کہ ابوسفیانؓ نے فرمایا کہ مغیرہؓ طاغیہ (یعنی معبود) کو کلہاڑی سے مارتے رہے اور یہ کہتے رہے، تعجب ہے تم پر، تعجب ہے تم پر، اور جب مغیرہؓ نے اس کو توڑ کر گرایا تو اس کے مال اور زیورات لے لئے، ابوسفیان کو پیغام بھیجا، جبکہ اس نے ان کے زیورات کو جمع کیا ہوا تھا، اس کے مال میں سونا اور موتیاں تھیں، تو رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کو حکم دیا کہ لات (بت) کے مال سے مسعودؓ کے دو بیٹوں عروہ اور اسود کا قرضہ ادا کرے، تو ابوسفیانؓ نے اس مال سے دونوں کا قرضہ اداء کیا اور اسی سال میں غزوہ تبوک بھی پیش آیا تھا۔

یہ واقعہ امام طبری نے محمد بن حمید سے نقل کیا ہے جس کے متعلق امام ذہبی سیر اعلام النبلاء: ۵۰۳/۱۱، میں لکھتا ہے: کہ یہ منکر الحدیث تھا۔ اس کا استاد سلمہ ابن الفضل ہے یہ اگرچہ مغازی میں قوی تھا لیکن احادیث میں یہ غیر معتبر ہیں، سیر اعلام النبلاء: ۵۰/۹، تیسرا راوی محمد بن اسحاق ہے جو کہ مختلف فیہ ہے۔ آخری راوی جو کہ یہ واقعہ ذکر کرتا ہے امام ذہبی نے: ۲۴/۶، میں اور ابن حجر نے: تہذیب التہذیب: ۴۱۰/۱۰، میں لکھا ہے کہ یہ تابعی تھا۔ مذکورہ سند میں ہم دیکھتے ہیں کہ یعقوب بن عتبہ تابعی ہے امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء: ۱۲۴/۶، ابن حجر نے تہذیب التہذیب: ۴۱۰/۹، میں اور امام مزی نے: تہذیب الکمال: ۳۵۰/۳۲، میں اس کے احوال نقل کیے ہیں، جس میں لکھتا ہے کہ اس نے سائب بن یزیدؓ کو دیکھا ہے اور ۱۲۸ ھجری میں وفات ہوا ہے جبکہ ابوسفیانؓ بیس ۲۰، ہجری میں وفات ہوا ہے۔ (سیر اعلام النبلا: ۲۰۵/۱۔ تو یہ روایت منقطع ہے۔

یہی واقعہ ابن ہشام نے السیرۃ النبویۃ: ۱۹۵/۴، میں نقل کیا ہے بغیر سند کے۔ فرمایا ہے: قال ابن اسحٰق

فـلـمـافـرغوا الخ ۔اوراسی طرح ایک واقعہ طبقات ابن سعد:۳۳۱/۲، میں ذکر ہے فرماتا ہے:قـالـوا بعث رسول اللهﷺ عـلـی ابـن ابی طالبؓ فی خمسین ومائة رجل من الانصارعلی مائة بعیروخمیسن فرساومعه راية سـوداء ولواء ابیض الی الفلس لیهدمه فشنو الغارة علی محلةآل حاتم مع الفجرفهدموا الفلس وخـربـوه ومـلاؤاایـدیهـم من السبی و النعم و الشاء وفی السبی اخت عدی بن حاتم وهرب عدی الـی الشـام ووجـدفـی خـزانة الـفلس ثلاثة اسیاف رشوب و المحذم وسیف یقال له الیمانی وثلاثة ادراع واستعمل رسول اللهﷺعلی السبی اباقتادة واستعمل علی الماشية و الرثة عبداللهبن عتیک فـلـمـانـزلـواركک اقتسموا الغنائم وعزل للنبی ﷺ صفیارسوبا و المحذم ثم صارله بعد السیف الاخروعزل الخمس وعزل آل حاتم، فلم یقسمهم حتی قدم بهم المدینة۔

انہوں نے کہا کہ رسول اللہﷺ نے علیؓ کو بمعہ ۱۵۰، سپاہیوں کے بھیجا، اور علیؓ کے ساتھ ایک بڑا کالا جھنڈا، جبکہ سفید چھوٹا جھنڈا بھی تھا، تاکہ فلس معبود کو توڑ ڈالے۔انہوں نے صبح کے وقت حاتم طائی کے قبیلہ پرحملہ کیا اور فلس معبود کو نیست و نابود کردیا۔جبکہ مال غنیمت میں جانور، بکریاں حاصل کیں اور لوگوں کو قیدی بنایا، اور ان قیدیوں میں حاتم طائی کی بیٹی بھی تھی جبکہ بیٹا شام (دمشق) کو فرار ہوا، اور اس معبود کے خزانہ میں تین تلواریں تھیں، جس میں سے ایک کا نام رسوف، یعنی بہت تیز دھاروالی اور دوسرے کا نام مخذم، یعنی کٹائی کرنے والا، اور تیسرے کو یمانی کہا جاتا تھا اور تین زرے بھی تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے ان قیدیوں کا انتظام ابوقتادہ کے حوالے کیا۔اور جانوروں و دیگر اشیاء کو عبداللہ بن عتیک کے سپرد کیا۔جب رکک کے مقام پر پہنچے، تو مال غنیمت کو تقسیم کیا اور رسول اللہﷺ کے حصے میں تینوں تلواریں آگئیں جبکہ انہوں نے اس کے ساتھ خمس بھی الگ کیا اور حاتم طائی کے قبیلے والوں کو بغیر تقسیم مدینہ لے آئے۔

ان دونوں واقعات سے بعض علماء استدلال کرتے ہیں کہ نذر لغیر اللہ کا جو مال ہے اس کا استعمال جائز ہے لیکن ان کا یہ قول صحیح نہیں اس لئے کہ یہ دونوں مستدل ضعیف ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابن سعد نے یہ واقعہ بلفظ قالوا نقل کیا ہے نزدیک صفحات پر قائلین تو معلوم نہیں البتہ جزء ثانی کے اول میں کچھ روات نقل کئے ہیں غالب یہ ہے کہ ضمیر ان کو راجع ہوگا جس میں، پہلا محمد بن عمر بن واقد الاسلمی ہے یعنی واقدی جو مشہور کذاب ہے۔دوسرا راوی رویم بن یزید المقر ی ہے جو کہ مجہول ہے۔امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء:۲۳۵/۱۴، میں لکھا ہے کہ:کـان فـی ایـام الـمامون اور یہ ہارون بن ابی عیسی سے نقل کرتا ہے جس کے متعلق ابن حجر تہذیب التہذیب

:۹/۱۱۱، میں لکھتا ہے: کہ یہ ضعیف راوی ہے۔تیسرا راوی حسین بن محمد ہے جو کہ مجہول ہے، اور ابومعشر سے نقل کرتا ہے امام ذہبی نے سیر: ۷/۴۳۷، میں اس کے متعلق منکر الحدیث لکھا ہے۔چوتھا راوی اسماعیل بن عبداللہ ہے ابن حجر تہذیب التہذیب: ۱/۳۲۱، میں اس کے متعلق تفصیل سے لکھتا ہے،جس کا حاصل یہ ہے کہ متکلم فیہ ہے،اس کا استاد اسمٰعیل بن ابراہیم ہے جو کہ ثقہ ہے تہذیب التہذیب: ۱/۲۸۹۔اور اس کا استاد موسی بن عقبہ ہے وہ تو ثقہ ہے لیکن یہ چوٹھا تابعی تھا۔تاریخ ابن ابی خیثمہ: ۲/۳۱۳، میں اس کا قول نقل کرتا ہے کہ **قال موسی فلم اسمع احدایقول قال النبی ﷺ الام خالد** یعنی ام خالد کے علاوہ کسی صحابی سے اس کی روایت نقل کرنا صحیح نہیں ہے۔اس سند کے بعد ابن سعد لکھتا ہے **دخل حدیث بعضهم فی حدیث بعض** ۔یعنی یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ روایت کس کی ہے؟ اور سند متصل بھی نہیں بلکہ منقطع اور مرسل ہے جو کہ اقسام ضعیف میں سے ہے۔

بعض علماء نے ان واقعات کی تصحیح کی ہے، لیکن یہ تصحیح باعتبار سیرت ہے نہ کہ باعتبار احادیث، جبکہ دونوں میں فرق واضح ہے۔جیسا کہ سیر اعلام النبلاء: ۷/۴۰، میں امام ذہبی نے محمد بن اسحاق کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں:

قلت لسنا ندعی فی ائمة الجرح و التعدیل، العصمة من الغلط النادر،ولامن الكلام بنفس حادٍّفيمن بينهم وبينه شحناء واحنة، وقدعلم ان كثيرامن كلام الاقران بعضهم فی بعض مهدرلاعبرة به ولاسيمااذاوثّق الرجل جماعة يلوح علی قولهم الانصاف،وهذان الرجلان كل منهماقدنال من صاحبه، لكن اثّر كلام مالک فی محمدبعض اللين ولم يؤثر كلام محمدفيه، ولاذرة ،وارتفع مالک وصار كالنجم ،والاخرفله ارتفاع بحسبه ،ولاسيمافی السير،وامافی احاديث الاحكام فينحط حديثه فيهاعن رتبة الصحة الی رتبة الحسن.الافيماشذفيه فانه يعدمنكرا،هذا الذی عندی فی حاله "والله اعلم"۔

اس لئے ان علماء کی تصحیح پر بعض کو غلطی ہوئی اور اس سے استدلال کرنے لگے، جبکہ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ مذکورہ واقعات میں یہ تصریح نہیں ہے، کہ یہ مال ان معبودوں کے نام نذر کیا گیا تھا، یہ احتمال ہے کہ ان لوگوں نے مرمت کے لئے جمع کئے ہونگے ،ہم یہ جواب بھی کرتے ہیں کہ حربی کافروں کا ہر قسم مال حاصل ہوجائے تو اس کا حکم مال غنیمت کا ہوتا ہے۔جبکہ دوسرے واقعہ میں یہ تصریح موجود ہے۔اس بحث کے آخیر میں ایک روایت سائب بن ابی السائب کی نقل کرتے ہیں جس کو طبرانی نے: ۷/۱۳۹، میں اور دارمی نے: ۱/رقم ۳، پر اور مسند احمد نے: ۳/۴۲۵، میں نقل کیا ہے، اس میں یہ صحابی (سائب بن عبداللہ) بتلاتے ہیں کہ نذر لغیر اللہ مشرکانہ عمل ہے۔=

وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا أُولٰٓئِكَ مَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ إِلَّا النَّارَ

چھپاتے اور اُن کے بدلے تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیاوی منفعت) حاصل کرتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھرتے ہیں

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾

ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ کلام کرے گا اور نہ اُن کو (گناہوں سے) پاک کرے گا اور اُن کے لئے دکھ دینے والا عذاب ہے

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی اور بخشش چھوڑ کر عذاب خریدا یہ (آتشِ) جہنم کی

فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ

کیسی برداشت کرنے والے ہیں ۔یہ اس لئے کہ اللہ نے کتاب سچائی کے ساتھ نازل فرمائی

وَإِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتَابِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ لَيْسَ

اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا وہ ضد میں (آ کر نیکی سے) دُور (ہوگئے) ہیں۔نیکی یہی نہیں

= فرماتا ہے کہ:بعث معی اهلی قدح لبن وزبد الی الهتهم فذهبت به فلقدخفت ان اکل منه شیئا،ووضعته اذجاء کلب فشرب اللبن واکل الزبدوبال علی الصنم.وهو اساف ونائلة ۔یعنی مجھے اپنے گھر والوں نے کچھ مکھن اور دودھ دیکر کہا: کہ یہ معبود کو دیکر آنا میں یہ لے کر گیا اور ڈر کی وجہ سے کچھ بھی اس سے نہ کھایا۔ جب میں نے یہ چیزیں اپنے معبود کے قریب رکھ دیں تو ایک کتے نے آ کر وہ کھالی۔اور پھر معبود پر چڑھ کر پیشاب کیا۔

اور انسؓ سے ایک روایت مشہور ہیں کہ: لاعقرفی الاسلام، وکانوا یعقرون الابل علی قبور الموتیٰ ، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:اسلام میں عقر نہیں ہے،عبدالرزاق نے کہا جاہلیت میں لوگ قبروں کے پاس جا کر اونٹ یا بکری کو ذبحہ کرتے تھے،اسی کو عقر کہتے ہیں،اسلام میں اس کی ممانعت ہوئی ہے۔مسند الفردوس:۱۳۲۵/۵ ابوداوٗد:۱۶۶/۳،اس بحث کا اختتام مندرجہ بالا حدیث پر ہوا۔

الْبِـرَّ أَنْ تُـوَلُّـوْا وُجُـوْهَـكُـمْ قِبَـلَ الْـمَشْـرِقِ وَالْـمَـغْـرِبِ وَلٰـكِنَّ الْبِرَّ
کہ تم مشرق یا مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ
مَـنْ آمَـنَ بِـاللّٰـهِ وَالْيَـوْمِ الْآخِـرِ وَالْـمَلَآئِـكَةِ وَالْـكِتَـابِ وَالنَّبِيِّيْنَ
اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور فرشتوں پر اور (اللہ کی) کتابوں پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں
وَآتَـى الْـمَـالَ عَـلٰـى حُبِّهٖ ذَوِىْ الْقُـرْبٰـى وَالْيَـتَـامٰـى وَالْمَسَـاكِيْنَ
اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں
وَابْـنَ السَّبِيْـلِ وَالسَّـآئِـلِيْـنَ وَفِى الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ
اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں (کے چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں
وَالْـمُـوْفُـوْنَ بِـعَـهْـدِهِـمْ إِذَا عَـاهَـدُوْا وَالـصَّـابِـرِيْـنَ فِـى الْبَـأْسَـآءِ
اور جب عہد کر لیں تو اُس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں
والـضَّـرَّآءِ وَحِيْـنَ الْبَـأْسِ أُوْلٰـئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ أُوْلٰـئِكَ هُمُ
اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں یہی لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں
الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِىْ الْقَتْلٰى
جو (اللہ سے) ڈرنے والے ہیں اے مومنو! تمہیں مقتولوں کے بارے میں قصاص (یعنی خون کے بدلے خون) کا حکم دیا جاتا ہے
الْـحُــرُّ بِــالْـحُــرِّ وَالْـعَبْـدُ بِـالْـعَبْـدِ وَالْأُنْثٰـى بِـالْأُنْثٰـى
(اس طرح پر کہ) آزاد کے بدلے آزاد (مارا جائے) اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت
فَـمَـنْ عُـفِـىَ لَـهُ مِـنْ أَخِيْـهِ شَـىْءٌ فَـاتِّبَـاعٌ بِـالْـمَعْـرُوْفِ
اور اگر قاتل کو اس کے (مقتول) بھائی سے کچھ معاف کر دیا جائے تو (وارث مقتول کو) پسندیدہ طریق سے پیروی کرنا

وَأَدَآءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ

اور (قاتل) کو خوش خوئی کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔ یہ رب کی طرف سے تمہارے لئے آسانی او رمہربانی ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ

جو اس کے بعد زیادتی کرے اُس کیلئے دردناک عذاب ہے ۔ اور اے اہل عقل!

فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ

(حکم) قصاص میں (تمہاری) زندگانی ہے کہ تم (قتل وخونریزی سے) بچو۔تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے

إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ

کسی کوموت کا وقت آجائے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ جانے والا ہوتو ماں باپ اور رشتہ داروں کیلئے دستور کے مطابق وصیت کر جائے

بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ

(اللہ سے) ڈرنے والوں پر یہ ایک حق ہے۔جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے تو اس (کے بدلنے) کا گناہ انہیں

عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوصٍ

لوگوں پر ہے جو اُس کو بدلیں اور بیشک اللہ تعالیٰ سنتا (اور) جانتا ہے اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے

جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ

(کسی وارث کی) طرفداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہوتو اگر وہ (وصیت کو بدل کر) وارثوں میں صلح کرادے تو اُس پر کچھ گناہ نہیں

إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۸۲﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ

ہے بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا (اور) رحم والا ہے ۔ اے مومنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾

جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بنو ۔

أَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُم مَّرِيْضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ

(روزوں کے دن) گنتی کے چند روز ہیں تو جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کا شمار پورا کر لے

مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ

اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں [۴۴] (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں

---

[۴۴] اس ایت میں اللہ پاک نے مومنوں کو یہ حکم دیا ہے کہ تم روزہ رکھا کرو، یعنی کھانے پینے جماع کرنے سے خالص اللہ کی نیت سے رک جاؤ، اس میں پاکی وپاکیزگی ہے، جی کی اخلاط ردیہ واخلاق رزیلہ سے یہ روزہ کچھ تمہیں پرانوکھا فرض نہیں ہوا ہے، جو امتیں تم میں سے پہلے تھیں ان پر بھی فرض تھا، تم کو اس نیک کام میں ان کی پیروی کرنا چاہیے، بلکہ اس فرض کے ادا کرنے میں تم انکی نسبت زیادہ کشش وکوشش رکھو: کما قال تعالی: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ط وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ الاية (مائده: ۴۸)۔

اور یہاں جو کہا "لعلكم تتقون" اسلئے کہ روزے میں بدن کا پاک کرنا شیطان کے راستوں کو بند کرنا ہے، اسی لئے صحیحین میں آیا ہے، اے گروہ جوانوں کے، جو کوئی تم میں بیاہ کر سکے وہ کریں، جو نہ کر سکے، وہ روزہ رکھے، یہ روزہ اس کے لئے خصی ہونا ہے، پھر یہ فرمایا کہ روزہ کچھ ہر دن مقرر نہیں ہے۔ کہ جی پر شاق گذرے یا اس کے ادا کرنے بجالانے میں ضعف پیدا ہو، بلکہ کئی دن ہیں گنتی کے۔ شروع اسلام میں ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھتے تھے پھر صوم رمضان سے وہ حکم منسوخ ہو گیا۔ معاذؓ وابن مسعودؓ وابن عباسؓ وعطاءؒ وقتادہؒ ضحاکؒ نے کہا ہے، کہ زمانہ نوح علیہ السلام سے ابتک یہی دستور تھا کہ ہر مہینے میں تین روزے ہوتے، اللہ نے وہ حکم روزہ رمضان سے اٹھادیا، مگر حسن بصری نے کہا ہے: واللہ ہر امت گذشتہ پر یہی ایک ماہ کامل کے روزے فرض تھے، جس طرح ہم پر فرض ہیں۔

"ايــام مـعـدو دات" سے مراد عدد معلوم ہے، ابن عمرؓ سے مرفوعا آیا ہے، رمضان کا روزہ اللہ نے اگلے امتوں پر فرض کیا تھا، الحدیث بطولہ، رواہ ابن ابی حاتم۔ یہ بھی ابن عمرؓ نے کہا ہے کہ اگلی امتوں پر یہ فرض تھا، کہ جب نماز شب پڑھ کر سور ہیں تو ان پر کھانا پینا عورتوں سے ملنا ائندہ شب تک حرام ہو جاتا۔ یہی قول ہے ایک جماعت صحابہ وتابعین کا۔ ابن

عباسؓ نے کہا ہے مراد اگلوں سے اس جگہ اہل کتاب ہے، یہی بات شعبی وسدی وعطاء خراسانی سے بھی مروی ہے، پھر اللہ نے ابتداء اسلام کا ذکر کیا، کہ اس زمانے میں مرض وسفر میں قضاء کرنا درست تھا، مقیم صحیح جس کو طاقت تھی اس کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ چاہے روزہ رکھے چاہے افطار کرے۔ افطار کے بدلے ایک فقیر کو ہر روز کھانا کھلا دیا کرے، یا ایک سے زیادہ کو۔ اور جو روزہ رکھے تو افضل ہے، یہی قول ہے ابن عباسؓ ومجاہد وطاؤس وغیرہ سلف کا۔

امام احمد نے معاذ بن جبلؓ سے روایت کیا ہے کہ نماز، روزے نے تین پلٹے کھائے، جب رسول اللہ ﷺ مدینے میں آئے تو سترہ مہینے تک نماز طرف بیت المقدس کے پڑھا کئے، پھر اللہ نے حکم کعبے کا دیا، یہ ایک پلٹا ہوا، دوسرا پلٹا یہ تھا کہ جب نماز کے لئے جمع ہوتے، تو ایک دوسرے کو پکارتے، یہاں تک کہ ناقوس بجانے کی ٹھیرتی تھی کہ اتنے میں عبداللہ بن زید نے خواب میں آذان سنی، رسول اللہ ﷺ نے اس کو جاری کیا، اسی طرح کے دوسرے خواب عمر بن خطابؓ نے دیکھے تھے، یہ دو پلٹے ہوئے۔

تیسرا پلٹا یہ تھا کہ جب نماز کو آتے اور رسول اللہ ﷺ بعض رکعات پڑھ چکے ہوتے تو ایک نمازی دوسرے نمازی سے اشارۃ پوچھتا کہ کتنے رکعتیں ہو چکی ہیں؟ وہ کہتا ایک یا دو، اس پر وہ شخص اتنی نماز پڑھ کر پھر جماعت میں داخل ہوتا، معاذؓ آئے انہوں نے کہ نہیں، ہم جس حال پر رسول اللہ ﷺ کو پائینگے وہی کرینگے، پھر جو نماز ہم سے پہلے ہو چکی ہے اس کو پورا کرینگے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا، جناب ﷺ نے فرمایا یہ سنت تمہارے لئے معاذؓ نے نکالی ہے، سو تم ایسا ہی کیا کرو، یہ تین حال ہوئے نماز کے، رہا روزہ سو جب رسول ﷺ مدینے میں آئے تو ہر ماہ میں تین روزے اور ایک روزہ عاشورہ کا رکھتے تھے، پھر اللہ نے یہ ایت اتاری، اس پر یہ ٹھیری کہ جس کا جی چاہے وہ روزے رکھے، جو نہ رکھے وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، اس کے بعد ایت ائندہ: ﴿شهر رمضان الذى﴾ الایۃ آئی فليصمه تک، اس پر ہر مقیم وصحیح پر ایک ماہ کا صوم ثابت ہوا، مریض ومسافر کو رخصت ملی، بوڑھے کو جسے طاقت روزہ رکھنے کی نہیں ہے کھانا دینا ٹھیرا، یہ دو پلٹے ہوئے، تیسرا پلٹہ یہ تھا کہ جب تک رات کو نہ سوتے تب تک کھاتے پیتے عورتوں کے پاس جاتے جب سو گئے تو رک جاتے، ایک شخص انصاری صرمہ نام روزے رکھتا، مزدوری کر تا رات کو گھر آیا نماز عشا پڑھکر سو گیا، نہ کچھ کھایا نہ پیا، صبح کو روزہ دار اٹھا، جناب ﷺ نے اسکو سخت تکلیف میں دیکھ کر حال پوچھا، اس نے یہ قصہ حال بتلایا، ادھر تو یہ ہوا، ادھر عمرؓ بعد سو جانے کے جماع کر بیٹھے، پھر جناب ﷺ سے حال کہا، اس پر یہ ایت اتری: اس حدیث کو ابوداؤد نے سنن (کتاب الصلاۃ) میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔

صحیحین میں عائشہ سے نقل ہے، کہ عاشورے کا روزہ مقرر تھا، جب رمضان فرض ہوا، تو اب جسکا جی چاہتا وہ رکھتا اور جسکا جی نہ چاہتا وہ نہ رکھتا، اس کو بخاری نے ابن عمرؓ وابن مسعودؓ سے بھی روایت کیا ہے۔

معاذؓ نے کہا ابتداء امر میں جو کوئی چاہتا روزہ رکھتا، نہ رکھتا تو ہر روز ایک مسکین کو کھلا دیتا، بخاری نے سلمہ بن الاکوعؓ سے اتنا اور زیادہ روایت کیا ہے کہ پھر ایت مابعد اتری، اس نے اس حکم منسوخ کر دیا۔ ابن عمرؓ کا بھی یہی قول ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اسی طرح عبداللہ نے بھی کہا ہے کہ ایت ﴿ فمن شهد منكم الشهر فليصمه ﴾ اس کی ناسخ ہے، ہاں بخاری میں ابن عباسؓ سے ایا ہے کہ یہ ایت منسوخ نہیں ہے، بلکہ بوڑھے مرد وعورت کے لئے، جن کو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں، وہ ہر دن ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، یہ روایت ابن عباسؓ سے کئی طریق سے آئی ہے، ابن ابی لیلی کہتے ہیں میں عطا کے پاس گیا رمضان میں، اور وہ کہہ رہے تھے، کہ مجھے کہا ابن عباسؓ نے، یہ ایت اتری اس نے پہلی ایت کو منسوخ کر دیا مگر کبیر فانی اگر چاہے تو ہر روز ایک مسکین کو کھلا دے، خود افطار کریں، ابن کثیر نے کہا حاصل امر یہ ہوا کہ نسخ حق میں صحیح مقیم کے ثابت ہے، روزہ رکھنا اس پر واجب ہے لقولہ تعالی: فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ .

رہا شیخ فانی بوڑھا جو روزہ نہیں رکھ سکتا، وہ افطار کرے، اس پر قضا نہیں، اس لئے کہ اس کو ایسا وقت کہاں آویگا کہ وہ اس وقت میں قضا کر سکے، وہ تو روز بروز کمزور ہوتا جاتا ہے، رہی یہ بات کہ جب اس نے افطار کیا تو ہر روز ایک مسکین کا کھلانا اس پر اگر مقدور رکھتا ہے واجب ہے یا نہیں، اس میں علماء کی دو قول ہیں: قول صحیح جس پر اکثر اہل علم ہیں، یہی ہے کہ فدیہ دینا عوض ہر دن کے واجب ہے، جس طرح ابن عباسؓ وغیرہ سلف نے "یطیقونہ" کی تفسیر کیا ہے، ساتھ لفظ "یتجشمونہ" کے یہی قول ابن مسعودؓ کا ہے، اسی کو بخاری نے بھی اختیار کیا ہے لفظ بخاری کا یہ ہے کہ جو شیخ کبیر طاقت صوم نہ رکھتا ہو، وہ کھانا کھلا دے۔

انسؓ نے جب بوڑھے ہو گئے ایک یا دو سال تک ہر دن ایک مسکین کو گوشت روٹی کھلائی، اور خود افطار کیا، یہ بات جس پر بخاری ہیں، اس کو حافظ ابو یعلی موصلی نے مسند کیا ہے یعنی ایوب بن ابی تمیمہ نے کہا ضعیف ہو گئے انسؓ روزے رکھنے سے، ایک بڑا طباق ثرید کا تیار کر کے تیس مسکین کو بلا کر کھلا دیا، یہ روایت انسؓ کی کئی طریق سے آئی ہے، اسی حکم میں حامل ومرضع کو بھی رکھا ہے، جب ان کو اپنی جان یا بچے کی جان کا ڈر ہو تو افطار کرے، فدیہ دیں، قضاء رکھیں، بعض کا قول یہ ہے کہ فقط فدیہ دیں، قضاء نہ رکھیں، بعض نے کہا بلکہ قضا بلا فدیہ واجب ہے۔

روزہ ایک عبادت قدیم ہے جو آدمؑ سے لیکر اس دم تک یکساں فرض رہی، اللہ نے کسی امت کو فرضیت صیام سے

خالی نہ چھوڑا، یہ بات نہیں ہے کہ نرے مسلمانوں ہی پر فرض کیا ہو، ہاں یہ اور بات ہے کہ قدر ووقت صوم میں اختلاف ہو۔ اہل کتاب پر تو یہی رمضان کا روزہ فرض تھا، مگر انہوں نے بدل ڈالا دغفل بن حنظلہؓ مرفوعا کہتے ہیں کہ نصاری پر صوم رمضان فرض تھا، اتفاقا انکا بادشاہ بیمار ہوا، انہوں نے کہا اگر اللہ اس کو شفا دیگا تو ہم دس روزے زیادہ رکھا کریں گے، پھر دوسرا شخص بادشاہ ہوا اس نے گوشت کو کھایا منہ دکھنے لگا، اس نے کہا اگر مجھکو شفا ہوگئی تو سات روزے اور رکھوں گا، پھر تیسرا بادشاہ ہوا، اس نے کہا ان تین دن کو بھی پورا کرنا چاہے، ہم ربیع میں روزہ رکھیں گے، سو ایسا ہی کیا، پچاس روزے ہو گئے۔

بیمار کو اگر طاقت صوم نہیں ہے تو افطار عزیمت ہوگا اور جو ہے مگر مشکل کے ساتھ تو رخصت ہے، جمہور کا یہی قول ہے، جمہور کہتے ہیں جو سفر مبیح افطار ہے، وہ بقدر مسافت قصر صلوٰۃ ہوتا ہے، قدر مسافت میں جو اختلاف ہے، وہ معروف ہے، پھر بعض نے ایسے مقادیر بیان کئے ہیں، جن پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوتی، حق یہ ہے کہ جس پر مسمی سفر صادق آتا ہے وہی مبیح افطار ہے، اسی طرح جس پر مسمی مرض صادق آوے، اس میں افطار کرے۔

سفر طاعت میں افطار کرنے پر تو اجماع ہے، لکن سفر مباح میں اختلاف ہے، حق یہ ہے کہ سفر مباح میں بھی رخصت فطر ثابت ہے، سفر معصیت مختلف فیہ ہے۔

لفظ "یطیقونہ" کو مخفف و مشدد دونوں طرح پڑھا ہے، مخفف کے بنیاد پر آیت منسوخ ہے، تشدید واو کی بنیاد پر محکم ہے، تشدید کے معنی تکلیف ومشقت کے ہوتے ہیں، اگر ہمزہ باب افعال کا اس جگہ واسطے سلب کے ٹھیرایا جاوے، تو بھی ہوسکتا ہے، اس صورت میں حاجت تقدیر کرنے صرف لائے نفی کی بھی نہوگی، ایت بھی محکم رہے گی، ورنہ منسوخ ٹھیریگی، فدیے کے مقدار میں اختلاف ہے، کسی نے کہا گیہوں ہر دن نصف صاع، غیر گندم ایک صاع۔ بعض نے کہا فقط ایک مد، غالب قوت بلد سے دے، ابن عباسؓ نے کہا ہر مسکین کو صبح وشام کا کھانا دے، اپنی ام ولد سے کہا تو انہیں کے حکم میں ہے، جن کو طاقت روزہ رکھنے کی نہیں ہے، تو کھانا دے روزہ نہ رکھ، وہ حامل تھی یا مرضعہ۔ ابن عمرؓ کی ایک بیٹی نے سوال کیا کہ میں روزہ رمضان کا رکھوں، وہ حامل تھی، کہا افطار کر، ہر دن ایک مسکین کو کھلا، اسی طرح ایک جماعت تابعین سے مروی ہے، عرضیکہ حامل ومرضع وشیخ فانی وشیخہ فانیہ فدیہ دیکر افطار بلا قضا کر سکتے ہیں، اسی طرح سفر مرض، حیض نفاس، عذر فطر ہے لکن ان پر قضا واجب ہے نہ کہ فدیہ۔

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

اور جو کوئی شوق سے نیکی کرے تو اُس کے حق میں زیادہ اچھا ہے اور اگر سمجھو تو روزہ رکھنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے

﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ

(روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ (ہے) جس میں قرآن (اوّل اوّل) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے

وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ

اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (جو حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے۔ تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو

فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

تو چاہیئے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (روزے رکھ کر) ان کا شمار پورا کرلے

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ

اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا اور (یہ آسانی کا حکم) اس لئے (دیا گیا ہے) کہ تم روزوں کا شمار پورا کرلو

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

اور اُس احسان کے بدلے کہ اللہ نے تمہیں ہدایت بخشی ہے تم اُس کو بزرگی سے یاد کرو اور اُس کا شکر ادا کیا کرو

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَإِنِّىْ قَرِيْبٌ

اور (اے پیغمبر ﷺ!) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں

أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ

جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہیئے کہ میرے احکام کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى

تاکہ نیک رستہ پائیں ۔ روزوں کی راتوں میں تمہارے لئے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا ہے

نِسَآئِكُمْ ط هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ

وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم اُن کی پوشاک ہو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم (اُن کے پاس جانے سے) اپنے حق میں خیانت

أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوْهُنَّ

کرتے تھے پس اُس نے تم پر مہربانی کی اور تمہاری حرکات سے درگزر فرمایا اب (تمہیں اختیار ہے کہ) اُن سے مباشرت کرو

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ

اور اللہ نے جو چیز تمہارے لئے لکھ رکھی ہے (یعنی اولاد) اُس کو (اللہ سے) طلب کرو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری

الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوْا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ

(رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے پھر روزہ (رکھ کر) رات تک پورا کرو

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِى الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ

اور جب مسجدوں میں اعتکاف کے واسطے بیٹھے ہو(۴۵) تو اُن سے مباشرت نہ کرو یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جانا۔

فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تا کہ وہ پرہیز گار بنیں

---

(۴۵) اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن وسنت میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے، لفظ ''فی المساجد'' کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہوسکتا ہے، فقہاء کرام نے جو یہ شرط بیان کی ہے کہ اعتکاف صرف اس مسجد میں ہوسکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو، غیر آباد مسجد جہاں جماعت نہیں ہوتی، اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دُکان مکان وغیرہ میں ہوسکتی ہے۔

فائده

اور یہ جوحدیث حذیفہؓ کا ہے جو کہ امام طحاوی وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ:۔عن هشام بن عمار قال حدثنا سفيان بن عيينة،عن جامع بن ابی راشد،عن ابی وائل قال:قال حذیفةؓ لعبدالله ،عكوف بين دارک و دار ابی موسیؓ لاتغیّر؟ وقدعلمت ان رسول اللهﷺقال:لااعتكاف الافی المساجد الثلاثة ، المسجد الحرام، ومسجد النبیﷺ ، ومسجدبيت المقدس،قال عبداللهؓ لعلک نسيت وحفظوا، واخطأت و اصابوا، تو اس کا جواب خود امام طحاوی مشکل الاثار:۷/۲۰۱، میں دیتا ہے کہ:قال ابو جعفر فتأملناهذ ا الحديث فوجدنافيه إخبار حذيفةؓ ،ابن مسعودؓ انه قدعلم ماذكره له عن النبیﷺوترک ابن مسعودؓانكارذلک عليه ،وجوابه اياه بمااجابه به فی ذلک من قوله ''لعلهم حفظوا''نسخ ماقدذكرته فی ذلک، واصابوا فيماقدفعلوا ،وكان ظاهرالقرآن يدل على ذلک ،وهوقوله عزوجل: ﴿ولاتباشروهن وانتم عاكفون فی المساجد﴾.فعم المساجد كلهابذلک، وكان المسلمون ،عليه من الاعتكاف فی مساجدبلدانهم، امامساجد الجماعات اللتی تقام فيها الجُمُعات، واماهی وماسواهامن المساجد اللتی لهاالائمة و المؤذنون على ماقاله اهل العلم فی ذلک. والله عزوجل نسأله التوفيق.

اوراس کتاب کا محقق شعیب الارنووط،اس حدیث کی تحقیق میں لکھتا ہے کہ:هشام بن عمار قال فيه ابوحاتم صدوق،لما كبرتغيرحفظه ،وكلمادفع اليه قرأه، وكلمالقّن تلقّن.

ورواه البيهقی :۴/۳۱۶،و الذهبی فی سير اعلام النبلاء:۱۵/۸۱،من طريق محمودبن آدم المروزیؒ (ولم يوثقه غير ابن حبان).حدثناسفيان بن عيينه بهذا الاسناد،ولفظه: وقدعلمت ان رسول اللهﷺ قال:لااعتكاف الافی المسجد الحرام ،اوقال، الافی المساجد الثلاثة ،وقال عبداللهؓ: لعلک نسيت وحفظوا،اواخطأت واصابوا،الشک

منى.وقول الذهبى باثره ،صحيح غريب عال، يريد بالغرابة غرابة متنه، ورواه الاسماعيلى فى معجمه : ٣٣٦، ٤٢١،من طريق محمدبن الفرج (وهوصدوق) عن سفيان بن عيينةبه ،(ولكن فيه عباس بن احمد الوشاء، وهومجهول الحال)فهؤلاء الثلاثة هشام بن عمارومحمود بن آدم ومحمدبن الفرج رفعوا الحديث، وقدخالفهم من هواوثق منهم، فرواه على الشك سعيد بن منصورفى سننه، فيمانقله عنه ابن حزم فى المحلى: ١٩٥/٥ ،حدثناسفيان بن عيينه عن جامع بن ابى راشدعن شقيق بن سلمة قال، قال:حذيفةؓ لعبدالله بن مسعودؓ قدعلمت ان رسول اللهﷺ قال:لااعتكاف الافى المساجد الثلاثة،اوقال مسجدجماعة،(وكذافى الغيلانيات: ٢٧٩)قال ابن حزم هذاشک من حذيفةؓ اوممن هودونه،ولايقطع على رسول اللهﷺ بشک ،ولوانه عليه السلام قال:لا اعتكاف الافى المساجد الثلاثة ،لحفظه الله عليه ،ولم يدخل فيه شكا،فصح يقينا انه عليه السلام لم يقله قط .

ورواه موقوفاعلى حذيفةؓ، عبد الرزاق:٨٠١٦،ومن طريقه الطبرانى فى الكبير: ٩٥١١،عن سفيان بن عيينه بهذا الاسناد،و رواه عبد الرزاق:٨٠١٤،ومن طريقه الطبرانى: ٩٥١٠،وابن ابى شيبة :٩١/٣ ،عن سفيان الثورى عن واصل الاحدب عن ابراهيم النخعى ،قال جاء حذيفةؓ الى عبداللهؓ،فقال الااعجبک من ناس عكوف بين دارک وبين دار الاشعرىؓ،؟ قال عبداللهؓ، فلعلهم اصابوا واخطأت ،فقال حذيفةؓ مابالى ،أفيه اعتكف اوفى بيوتكم هذه ؟،انماالاعتكاف فى هذه المساجد الثلاثة، مسجد الحرام،ومسجد المدينة و المسجد الاقصى،وكان الذين اعتكفوافعاب عليهم حذيفةؓ فى مسجد الكوفة الاكبر،وهذااسنادرجاله ثقات، رجال الشيخين،ولايضره ان ابراهيم النخعى ارسله عن حذيفةؓ وعبداللهؓ،فقدثبت عنه ،كمافى تهذيب الكمال انه قال:اذاحدثتكم عن عبداللهؓ،فهو الذى سمعت ،واذاقلت قال عبداللهؓ،فهوعن غيرواحد عن عبداللهؓ، قال الحافظ ابن رجب فى شرح

العلل: ۱/ ۲۹۴، ۲۹۵،وهذایقتضی ترجیح المرسل علی المسندلکن عن النخعی خاصة فیماارسله عن ابن مسعودؓخاصة. قلت وهذا الحدیث منها،فروایة من رواه علی الشک، وروایة من وقفه علی حذیفةؓ، اصح واقوی واثبت .ورواه الطبرانی : ۹۵۰۹،عن علی بن عبد العزیز البغوی ،حدثناحجاج بن منهال ،حدثناابوعوانه،عن مغیره،عن ابراهیم ان حذیفةؓقال لابن مسعودؓ الاتعجب من قوم بین دارک ودار ابی موسیؓ یزعمون انهم معتکفون قال فلعلهم اصابوااخطأت، اوحفظوا ونسیت، قال امانا فقدعلمت انه لااعتکاف الافی مسجدجماعة.

وقال امام البخاری فی صحیحه فی اول کتاب الاعتکاف:۴/ ۲۷۱، بشرح الفتح باب الاعتکاف فی العشر الاواخروالاعتکاف فی المساجدکلها لقوله تعالی:"ولاتباشروهن وانتم عاکفون فی المساجد"قال الامام العینی فی عمدة القاری : ۱۱/ ۱۴۱،قیدالاعتکاف بالمساجد، لانه لایصح فی غیر المساجدوجمع المساجدواکثرهابلفظ کلهااشارة الی ان الاعتکاف لایختص فی مسجددون مسجدوفیه خلاف.فقال حذیفةؓ لااعتکاف الا فی المساجد الثلاثة، مسجدمکة، ومدینة ،والاقصی،وقال سعیدبن المسیب، لااعتکاف الافی مسجد نبی، وفی الصوم لابن ابی عاصم باسناده الی حذیفةؓ لااعتکاف الافی مسجدرسول الله.

وذهبت طائفة الی انه لایصح الاعتکاف الافی مسجدتقام فیه الجمعة، روی ذلک عن علیؓ وابن مسعودؓ وعروة وعطاء و الحسن و الزهری،وهوقول مالک فی المدونة ،قال امامن تلزمه الجمعة فلایعتکف الافی الجامع،وقالت طائفة، الاعتکاف یصح فی کل مسجد،روی ذلک عن النخعی وابی سلمة و الشعبی،وهوقول ابی حنیفة و الثوری و الشافعی فی الجدید،واحمد واسحاق وابی ثور وداود، وهوقول مالک فی المؤطاء ، وهوقول الجمهور،و البخاری ایضا،حیث استدل بعموم الایة ،فی سائر المساجدقال صاحب الهدایة الاعتکاف لایصح الافی مسجد الجماعة ،وعندابی حنیفة انه لایصح الافی مسجد

يـصلى فيه الصلوات الخمس .و قال الزهرى و الحكم وحماد،هومخصوص بالمساجد اللتى يـجـمع فيها، وفى الذخيرة للمالكية قال مالك ،يعتكف فى المسجدسواء اقيم فيه الجماعة ام لا.وفـى الـمـنـتـقـى:عـن ابـى يـوسف، الاعتـكـاف الـواجـب لايجوزاداء ه فى غيرمسجد الـجـمـاعة، و الـنـفـل يـجـوزادائـه فـى غيـرمسجد الجماعة .وفى الينابيع،لايجوزالاعتكاف الواجب الافى مسجدله امام ومؤذن معلوم، ويصلى فيه خمس صلوات .

ورواه الـحسن عن ابى حنيفةؒ، وروى عبد الرزاق فى المصنف : ٨٠٠٩،عن الثورى عـن جـابـر الـجعفى ،عن سعدبن عبيدة ،عن ابى عبد الرحمٰن السلمى،عن على بن ابى طالبؓ قـال لا اعتـكـاف الافـى مسجدجماعة ،ورواه ابن ابى شيبة:٣/ ٩١،عن وكيع عن سفيان،عن ابـى اسـحاق،عن الحارث الاعور،عن علىؓ ،وعن جابر الجعفى عن سعدبن عبيدة عن ابى عبد الـرحـمٰـن،عـن عـلـىؓ .قـلـت و الـحـارث الاعور وجابر الجعفى ضعيفان.وروى عبد الرزاق : ٨٠١٠،عن معمر،عن رجل ،عن الحسن،وعن هشام بن عروة ،عن ابيه،قال لااعتكاف الافى مسـجـدجـماعة. و السند الثانى صحيح على شرطهما.وروى ابوداود:٢٤٧٣،عن وهب بن بـقية اخبـرنـاخالدعن عبدا لرحمٰن بن اسحاق ،عن الزهرى عن عــروة ،عن عائشةؓ انهاقالت، السـنة على المعتكف الايعودمريضا، ولايشهدجنازة، ولايمس امــرأة، ولايباشرها،ولايخرج لـحـاجة الالـمالابدمنه، ولااعتكاف الابصوم،ولااعتكاف الافى مسجدجامع ،وهذااسندقوى، رجـاله ثقات ،رجال الصحيح، غيرعبد الرحمٰن بن اسحاق ، فقدروى له مسلم فى الشواهد و البـخـارى فـى ادب الـمـفـرد،واصحاب السنن ، وهوصدوق،وجَانَبَ الثواب من قال انه على شـرط مسـلـم. ورواه البيهـقـى:٤/ ٣١٥،مـن طـريـق عبيـدبـن شريک ،حدثنايحى بن بكير حـدثـناليث،عن عقيم عن ابن شهاب عن عروة بن زبير،وفيه، و السنة فى المعتكف الايخرج الالـلـحـاجة الـلتـى لابـدمـنهـا،ولايعودمريضا،ولايمس امرأة ،ولايباشرها،ولااعتكاف الافى

مسجد جماعة،و السنة فيمن اعتكف ان يصوم.ورواه الدارقطنی:۲/ ۲۰۱،و البیهقی ،عن عبد الملک بن جریج ،عن محمدبن شهاب عن سعیدبن مسیب ،وعروة بن زبیر،عن عائشةؓ انها اخبرتهماان رسول الله کان یعتکف العشر الاواخر،فی شهررمضان حتی توفاه الله،ثم اعتکفن ازواجه من بعده،وان السنة للمعتکف ان لایخرج الالحاجة الانسان ،ولایتبع جنازة ،ولایعود مریضا،ولایمس امرأة ولایباشرها،ولا اعتکاف الافی مسجدجماعة ویأمرمن اعتکف ان یصوم .یعنی، سفیان بن عیینہ نے ایک حدیث،عن جامع بن ابی راشدعن ابی وائل قال حذیفةؓ ان رسول الله ﷺ قال لااعتکاف الافی المساجد الثلاثة ، المسجد الحرام، ومسجد النبی ﷺ، ومسجدبیت المقدس ،بیان کی ہے،جس کامفہوم درج ذیل ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:تین مسجدوں کے علاوہ اعتکاف نہیں ہوتا،مسجدحرام،مسجد النبی ﷺ،اورمسجد اقصی (بیت المقدس)۔(شرح مشکل الاثارللطحاوی: ۷/ ۲۰۱ ح ۲۷۷۱، السنن الکبری للبیهقی: ۴/ ۳۱۶، سیراعلام النبلاء للذهبی: ۱۵/ ۸۱،وقال الذهبی صحیح غریب عال، معجم الاسماعیلی: ۳۲۶،سفیان بن عیینه سےاسے تین روایوں:محمودبن آدم المروزی، ہشام بن عماراورمحمد بن الفرج نے روایت کیاہے۔اور یہ سب صدوق (سچے) راوی تھے۔جامع بن ابی راشد ثقہ فاضل تھے۔تقریب التہذیب۷۸۷،وهو من رجال الستة ۔ابووائل شقیق بن سلمہ ثقہ تھے۔تقریب التہذیب: ۲۸۱۶،وهو من رجال الستة ومن المخضرمین)۔یہ روایت سفیان بن عیینہ کی تدلیس (عن) کی وجہ سے ضعیف ہے۔امام بخاری نے عنوان لکھاہے کہ:باب الاعتکاف فی العشر الاواخر(کتاب الصوم). والاعتکاف فی المساجد کلها،لقوله تعالی :﴿ولاتباشروهن وانتم عاكفون فی المساجد﴾ الایة ،یعنی باب ہے رمضان کے اخیر میں اعتکاف کرنا،اوراعتکاف ہرمسجد میں درست ہے کیونکہ اللہ تعالی نے سورۂ بقرہ میں فرمایا الایۃ ۔اوریہی قول وعلت امام مالک نے مؤطاء میں ذکرکیاہے۔اس تفصیل سے ان لوگوں کا یہ وہم دفع ہواجن کاقول تھاکہ مساجدثلاثہ کےعلاوہ کہیں بھی اعتکاف کرناصحیح نہیں۔

وَلَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤاور نہ اُس کو (رشوۃً) حاکموں کے پاس پہنچاؤ

لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر کھا جاؤ اور (اسے) تم جانتے بھی ہو ۔

يَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ

(اے محمد ﷺ!) لوگ تم سے نئے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے) کہہ دو کہ وہ لوگوں کے (کاموں کی میعادیں)

وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا

اور حج کے وقت معلوم ہونے کا ذریعہ ہےاور نیکی اس بات میں نہیں کہ (احرام کی حالت میں) گھروں میں اُن کے پچھواڑے کی طرف سے آ ؤ

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ

بلکہ نیکوکار وہ ہے جو پرہیز گار ہو۔ اور گھر میں اُن کے دروازوں سے آیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ نجات پاؤ

تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا

ور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی اللہ کی راہ میں اُن سے لڑو مگر زیادتی نہ کرنا

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ

کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ۔ اور ان (کافروں) کو جہاں پاؤ قتل کر دو

وَأَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے وہاں سے تم بھی اُن کو نکال دو اور (دین سے گمراہ کرنے کا)

وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ

فساد قتل وخونریزی سے کہیں بڑھ کر ہےاور جب تک وہ تم سے مسجد محترم (یعنی خانہ کعبہ) کے پاس نہ لڑیں تم بھی وہاں اُن سے نہ لڑنا

فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَإِنِ انْتَهَوْا

ہاں اگر وہ تم سے لڑیں تو تم اُن کو قتل کر ڈالو۔ کافروں کی یہی سزا ہے ۔ اور اگر وہ باز آ جائیں

فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ

تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے ۔ اور اُن سے اُس وقت تک لڑتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے

وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

اور (ملک میں) اللہ ہی کا دین ہو جائے اور اگر وہ (فساد سے) باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں (کرنی چاہیے)

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى

ادب کا مہینہ ادب کے مہینے کے مقابل ہے اور ادب کی چیزیں ایک دوسرے کا بدلا ہیں۔ پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے

عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا

تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اُس پر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ

أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَأَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ

اللہ ڈرنے والوں کیساتھ ہے ۔ اور اللہ کی راہ میں (مال) خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو

إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوْا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ

اور نیکی کرو بیشک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۔ اور اللہ (کی خوشنودی) کیلئے حج اور عمرے کو پورا کرو

وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوْا

اور اگر (راستے میں) روک لئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کر دو) اور جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے

رُؤُسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا أَوْ بِهٖ أَذًى

سر نہ منڈاؤ اور اگر کوئی تم میں بیمار ہو یا اُس کے سر میں کسی طرح کی تکلیف ہو تو (اگر وہ سرمنڈا لے تو)

مِّــنْ رَّأْسِــهٖ فَـفِـدْيَةٌ مِّـنْ صِيَــامٍ أَوْ صَـدَقَةٍ أَوْ نُسُـكٍ ۚ فَـإِذَآ أَمِـنْتُـمْ

اُس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے پھر جب (تکلیف دُور ہو کر) تم مطمئن ہو جاؤ

فَـمَـنْ تَـمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ

توجو(تم میں) حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے اور جس کو

فَـصِيَـامُ ثَلَاثَةِ أَيَّـامٍ فِـى الْـحَـجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

(قربانی) نہ ملے وہ تین روزے ایامِ حج میں رکھے اور سات جب واپس ہو۔ یہ پورے دس ہوئے۔

ذٰلِكَ لِـمَـنْ لَّـمْ يَـكُـنْ أَهْـلُـهُ حَـاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

اور یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جس کے اہل و عیال مکہ میں نہ رہتے ہوں اور اللہ سے ڈرتے رہو ۔

وَاعْـلَـمُـوْا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ اَلْـحَـجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ

اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔حج کے مہینے (معیّن ہیں جو) معلوم ہیں تو جو شخص ان مہینوں میں

فَـرَضَ فِيْهِـنَّ الْـحَـجَّ فَلَا رَفَـثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِـدَالَ فِـى الْحَجِّ ط

حج کی نیت کر لے تو حج (کے دنوں) میں نہ عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی بُرا کام کرے نہ کسی سے جھگڑے ۔

وَمَـا تَـفْـعَـلُـوْا مِـنْ خَيْـرٍ يَّـعْـلَـمْـهُ اللّٰـهُ وَتَـزَوَّدُوْا فَإِنَّ خَيْـرَ الـزَّادِ

اور جو نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کو معلوم ہو جائے گا۔اور زادِراہ (یعنی رستے کا خرچ) ساتھ لے جاؤ کیونکہ بہتر (فائدہ) زادِ

التَّـقْـوٰى وَاتَّـقُـوْنِ يٰـأُولِـى الْأَلْبَـابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْـسَ عَـلَيْـكُـمْ جُـنَـاحٌ

راہ (کا) پرہیز گاری ہے اور اے اہل عقل مجھ سے ڈرتے رہو ۔ اس کا تمہیں کچھ گناہ نہیں کہ

أَنْ تَبْتَـغُـوْا فَـضْلًا مِّـنْ رَّبِّـكُـمْ فَـإِذَآ أَفَـضْتُـمْ مِّنْ عَـرَفَـاتٍ

(حج کے دنوں میں بذریعہ تجارت) اپنے رب سے روزی طلب کرو اور جب عرفات سے واپس ہونے لگو

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰكُمْ وَإِنْ

تو مشعر حرام (یعنی مزدلفہ) میں اللہ کا ذکر کرو اور اس طرح ذکر کرو جس طرح اُس نے تمہیں سکھایا ہے اور اُس سے

كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ أَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ

پیشتر تم لوگ (ان طریقوں سے) محض ناواقف تھے۔ پھر جہاں سے اور لوگ واپس ہوں وہیں سے تم بھی واپس ہو۔

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ

اور اللہ سے بخشش مانگو بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ پھر جب حج کے تمام ارکان پورے کر چکو

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَآءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ

تو (منیٰ میں) اللہ تعالیٰ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور بعض لوگ ایسے ہیں

مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾

جو (اللہ سے) التجا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں (جو دینا ہے) دنیا ہی میں عنایت کر اور ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً

اور بعض ایسے ہیں کہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہمیں دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت عطا فرمانا

وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا

اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھنا۔ یہی لوگ ہیں جن کیلئے ان کے کاموں کا حصہ (یعنی نیک اجر تیار) ہے

وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ أَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ

اور اللہ تعالیٰ جلد ہی حساب لینے والا ہے۔ اور (قیامِ منیٰ کے) دنوں میں (جو) گنتی کے (دن ہیں)

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ

اللہ کو یاد کرو اگر کوئی جلدی کرے (اور) دو ہی دن میں (چل دے) تو اُس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو بعد تک ٹھہرا رہے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں

لِمَنِ اتَّقٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

اور یہ باتیں اُس شخص کیلئے ہیں جو (اللہ سے ڈرے) اور تم لوگ اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ تم سب اُس کے پاس جمع کئے جاؤ گے

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ

اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو دنیا کی زندگی میں تمہیں دلکش معلوم ہوتی ہے اور جو اُس کے دل میں ہے اس پر

عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ

اللہ کو گواہ بناتا ہے حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے ۔ اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے تو زمین میں دوڑتا پھرتا ہے

لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

تا کہ اس میں فتنہ انگیزی کرے اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کر دے اور اللہ تعالیٰ فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ

اور جب اُس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے خوف کر تو غرور اُس کو گناہ میں پھنسا دیتا ہے سو ایسے کو جہنم سزاوار ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے

﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ

اور کوئی شخص ایسا ہے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے

بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً

مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ

وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾

اور شیطان کے پیچھے نہ چلو وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے ۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

پھر اگر تم احکام روشن پہنچ جانے کے بعد لڑکھڑا جاؤ تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غالب (اور) حکمت والا ہے

﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ

کیا یہ لوگ اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان پر اللہ (کا عذاب) بادل کے سائبانوں میں آ نازل ہو اور فرشتے بھی (اتر آئیں)

وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۲۱۰﴾ سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ

اور کام تمام کر دیا جائے اور سب کاموں کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے۔ (اے محمد ﷺ!) بنی اسرائیل سے پوچھو

كَمْ آتَيْنَاهُمْ مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ وَّمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَإِنَّ اللّٰهَ

کہ ہم نے اُن کو کتنی کھلی نشانیاں دی اور جو شخص اللہ کی نعمت کو اپنے پاس آنے کے بعد بدل دے تو اللہ

شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ

سخت عذاب دینے والا ہے۔ اور جو کافر ہیں ان کیلئے دنیا کی زندگی خوشنما کر دی گئی ہے اور وہ مومنوں سے تمسخر کرتے ہیں

مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ

لیکن جو پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن اُن پر غالب ہوں گے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے

بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ

(پہلے تو سب) لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا (لیکن وہ آپس میں اختلاف کرنے لگے) تو اللہ نے (اُن کی طرف) بشارت

مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

دینے اور ڈر سنانے والے پیغمبر بھیجے اور اُن پر سچائی کیساتھ کتابیں نازل کیں تا کہ جن اُمور میں لوگ اختلاف کرتے تھے اُن کا ان میں فیصلہ کر دے

فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ

اور اُس میں اختلاف بھی انہیں لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی باوجودیکہ اُن کے پاس کھلے ہوئے احکام آ چکے تھے

الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ

(اور یہ اختلاف انہوں نے صرف) آپس کی ضد سے (کیا) تو جس امرِ حق میں وہ اختلاف کرتے تھے

بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

اللہ نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اُس کی راہ دکھا دی اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ (یونہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تم کو پہلے لوگوں کی سی (مشکلیں)

مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ

تو پیش آئی ہی نہیں اُن کو (بڑی بڑی) سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ (صعوبتوں) میں ہلا ہلا دیئے گئے یہاں تک کہ پیغمبر

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

اور مومن لوگ جو اُن کیساتھ تھے سب پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد آنے والی ہے۔ دیکھو اللہ کی مدد عنقریب (آیا چاہتی) ہے

يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ

(اے محمد ﷺ!) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کس طرح کا مال خرچ کریں؟ کہہ دو کہ

فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ

(جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا ہو وہ (درجہ بدرجہ اہلِ استحقاق یعنی) ماں باپ کو اور قریب کے رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو

وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

اور مسافروں کو (سب کو دو) اور جو بھلائی تم کرو گے اللہ تعالیٰ اُس کو جانتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْــًٔا

(مسلمانو) تم پر (اللہ کے رستے میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے وہ تمہیں ناگوار تو ہوگا اور یقیناً ایک چیز تمہیں بُری لگے

وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْــًٔا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور یقیناً ایک چیز تم کو بھلی لگی اور وہ تمہارے لئے مضر ہو اور (ان باتوں کو) اللہ ہی بہتر جانتا ہے

وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ
اورتم نہیں جانتے (اے محمد ﷺ!) لوگ تم سے عزت والے مہینوں میں لڑائی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں
قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَّصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
تو کہہ دو کہ اُن میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اُس سے کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ میں جانے)
وَإِخْرَاجُ أَهْلِهٖ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللهِ وَالْفِتْنَةُ
سے (بند کرنا) اور اہلِ مسجد کو اُس میں سے نکال دینا (جو یہ کفار کرتے ہیں) اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ (گناہ) ہے اور فتنہ انگیزی
أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ
خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر طاقت رکھیں تو تمہیں تمہارے دین
إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ
سے پھیر دیں اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر کر (کافر ہو) جائے گا اور کافر ہی مرے گا
فَأُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ
تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں
النَّارِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿٢١٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا
جس میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو لوگ ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ کیلئے (اپنا) وطن چھوڑ گئے اور (کفار سے) جنگ کرتے رہے
فِي سَبِيلِ اللهِ أُولٰٓئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللهِ وَاللهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾
وہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا (اور) رحمت کرنے والا ہے۔
يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ
(اے پیغمبر) لوگ تم سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں تو کہہ دو کہ اُن میں نقصان بڑا ہے

وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا وَيَسْئَلُوْنَكَ

اور لوگوں کیلئے کچھ فائدے بھی ہیں مگر اُن کے نقصانات فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں

مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْآيٰتِ

کہ (اللہ کی راہ میں) کونسا مال خرچ کریں تو کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام کھول کھول کر بیان فرماتا ہے

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى

تا کہ تم سوچو۔(یعنی) دنیا اور آخرت (کی باتوں) میں (غور کرو) اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں

قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَّإِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ

تو کہہ دو کہ اُن کی (حالت کی) اصلاح بہت اچھا کام ہے اور اگر تم اُن سے مل جل کر رہنا (یعنی خرچ اکٹھا رکھنا) چاہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَأَعْنَتَكُمْ

اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ خرابی کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں تکلیف میں ڈال دیتا

إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ

بیشک اللہ تعالیٰ غالب (اور) حکمت والا ہے ۔اور (مومنو) مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں

وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ

(اُن سے) نکاح نہ کرنا کیونکہ مشرک عورت خواہ تمہیں کیسی ہی بھلی لگے اُس سے مومن لونڈی بہتر ہے

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا

اور (اسی طرح) مشرک مرد جب تک ایمان نہ لائیں مومن عورتوں کو اُن کی زوجیت میں نہ دینا کیونکہ

وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ أَعْجَبَكُمْ أُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ إِلَى

مشرک (مرد) خواہ وہ تمہیں کیسا ہی بھلا لگے (اُس سے) مومن غلام بہتر ہے یہ (مشرک، لوگوں کو) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں

النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوَ إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ آيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
اور اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے بہشت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور اپنے حکم لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ
يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ أَذًى
نصیحت حاصل کریں ۔ اورتم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ وہ تو نجاست ہے ۔
فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ
سو ایامِ حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو اور جب تک پاک نہ ہو جائیں اُن سے مقاربت نہ کرو۔
فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ
ہاں جب پاک ہو جائیں تو جس طریق سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ارشاد فرمایا ہے اُن کے پاس جاؤ کچھ شک نہیں ہے
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ
کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔ اور اپنے لئے (نیک عمل) آگے بھیجو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو
وَاعْلَمُوْا أَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾
اور جان رکھو کہ (ایک دن) تمہیں اُس کے روبرو حاضر ہونا ہے اور (اے پیغمبر) ایمان والوں کو بشارت سنا دو ۔
وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا
اور اللہ (کے نام) کو اس بات کا حیلہ نہ بنانا کہ (اُس کی) قسمیں کھا کھا کر نیک سلوک کرنے اور پرہیزگاری کرنے
وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ
اور لوگوں میں صلح وسازگاری کرانے سے رک جاؤ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۔ اللہ تمہاری لغو قسموں پر تم سے

فِیۡۤ اَیۡمَانِکُمۡ وَلٰکِنۡ یُّؤَاخِذُکُمۡ بِمَا کَسَبَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ

مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جو قسمیں تم قصدِ دلی سے کھاؤ گے اُن پر مواخذہ کرے گا اور اللہ بخشنے والا بُردبار ہے ۔

﴿۲۲۶﴾ لِلَّذِیۡنَ یُؤۡلُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِہِمۡ تَرَبُّصُ اَرۡبَعَۃِ اَشۡہُرٍ فَاِنۡ فَآءُوۡ

جولوگ اپنی عورتوں کے پاس جانے سے قسم کھالیں اُن کو چار مہینے تک انتظار کرنا چاہئیے اگر (اس عرصے میں قسم سے) رجوع کرلیں تو

فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۲۷﴾

اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۔ اور اگر طلاق کا ارادہ کر لیں تو بھی اللہ سنتا اور جانتا ہے ۔[۴۶]

---

[۴۶] ایلاء کہتے ہیں قسم کھانے کو،اوراصطلاح شرع میں اس کو کہتے ہیں کہ کوئی مرد یہ قسم کھائے کہ میں چار مہینہ یااس سے زائد (مثلاپانچ مہینہ یاچھ مہینہ) تک اپنی بیوی سے جماع نہیں کروں گا،لہذااگراس مردنے اپنی بیوی سے جماع نہیں کیا،یہاں تک کہ چار مہینے گذر گئے،تواس صورت میں اکثر صحابہ کےقول کے مطابق اس مرد کی بیوی پرمحض چار مہینے گذرجانے سے طلاق نہیں پڑے گی،بلکہ ایلاء کرنے والےکو"ٹھہرایا" جائے گا،یعنی حاکم وقاضی اس کو محبوس کرے گا،اوراس سے یہ کہے گا کہ یاتواپنی عورت سے رجوع کرو،یعنی اس سے جماع کرلو،یااپنی بیوی کوطلاق دےدو۔چنانچہ امام مالکؒ امام شافعیؒ اورامام احمدؒ کا مسلک یہی ہے،نیزامام شافعی یہ فرماتے ہیں کہ اگروہ مرد،حاکم وقاضی کی اس بات پرعمل نہ کرےیعنی نہ توعورت سے رجوع کرے اورنہ طلاق دےتوحاکم کواختیارہے کہ وہ اس کی بیوی کوطلاق دےدے۔جیسا کہ صاحب مشکوات(رقم:۳۲۳۲)نے سلیمان بن یسارؒ سے نقل کیاہےکہ:ادرکت بضعة عشر من اصحاب النبیﷺ کلهم یقول:یوقف المولی(مسند الشافعیؒ: ۱۳۹،ودارقطنی: ۴/۶۲) یعنی سلمان بن یسارؒ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریمﷺ کے دس بلکہ اس سے بھی زیادہ صحابیوں کو پایاہے،وہ سب یہ فرمایا کرتے تھے،کہ ایلاء کرنے والےکوٹھہرایاجائے۔اورامام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے،اس صورت میں اگراس مردنے چار مہینے کے اندراپنی بیوی سے رجوع کرلیاتواس کاایلاءساقط ہوجائے گا،مگراس پرقسم پوری نہ کرنے کا کفارہ لازم آئے گا۔اوراگراس نے جماع نہ کیایہاں تک کہ چار مہینے گذرگئے،تواس کی بیوی پرایک طلاق بائن پڑجائے گی،ایلاء کےدیگرمسائل اوراس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ

اور طلاق والی عورتیں تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں

أَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

اوراگر وہ اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتی ہیں تو اُن کو جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ اُن کے شکم میں پیدا کیا ہے اُس کو چھپائیں

وَبُعُوْلَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ إِنْ أَرَادُوْٓا إِصْلَاحًا ؕ

اور اُن کے خاوند اگر پھر موافقت چاہیں تو اس (مدت) میں وہ ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ

اورعورتوں کا حق (مردوں) پر ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے البتہ مردوں کوعورتوں پر فضیلت ہے

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ۪

اور اللہ تعالیٰ غالب (اور) صاحبِ حکمت ہے۔ طلاق (صرف) دو بار ہے (یعنی جب دو دفعہ طلاق دیدی جائے تو) پھر

فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوْا

(عورت کو) یا تو بطریق شائستہ (نکاح میں) رہنے دینا ہے یا بھلائی کیساتھ چھوڑ دینا ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ جو مہر تم

مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا إِلَّآ أَنْ يَّخَافَآ أَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ

اُن کو دے چکے ہو اُس میں سے کچھ واپس لے لو۔ ہاں اگر زن وشوہر کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا

تو اگر عورت (خاوند کے ہاتھ سے) رہائی پانے کے بدلے میں کچھ دے ڈالے تو (دونوں پر) کچھ گناہ نہیں

فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ

یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں ان سے باہر نہ نکلنا اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے باہر نکل جائیں گے

فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ ﴿۲۲۹﴾ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ

وہ گنہگار رہوں گے۔ پھر اگر شوہر (دو طلاقوں کے بعد تیسری) طلاق عورت کو دیدے تو اُس کے بعد جب تک عورت کسی

حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا

دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے اُس (پہلے شوہر) پر حلال نہ ہوگی ہاں اگر دوسرا خاوند بھی طلاق دیدے اور عورت اور پہلا خاوند

أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ

پھر ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لیں تو اُن پر کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ دونوں یقین کریں کہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے

وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۲۳۰﴾

اور یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کو وہ اُن لوگوں کیلئے بیان فرماتا ہے جو دانش رکھتے ہیں ۔[۴۷]

---

[۴۷] ان آیات کے ذیل میں تفسیر لطائف البیان والے نے خوب تفسیر کیا ہے ہم ناظرین کے لئے اس کو پیش کرتے ہیں: اس آیت میں تین مسئلے ارشاد فرمائے، ایک مسئلہ طلاق کا، دوسرا خلع کا، اور تیسرا حلالہ کا، موضح قران میں لکھا ہے کہ عدت تک مرد چاہے تو عورت کو پھر رکھ لے، یہ بات پہلی طلاق میں ہے، دوسری میں بعد اس کے نہ پھر سکے گی، تو موافق شرع اس کے حق ادا کر سکے تو رکھے، کہ پھر قضیہ نہو، نہ رکھ سکے تو رخصت کرے، اس نیت سے نہ اٹکاوے کہ عاجز ہوکر جو میں نے دیا تھا وہ پھر جاوے، یہ تب روا ہے کہ ناچاری ہو کسی طرح دونوں کی خو نہ ملے، مرد کی طرف سے ادائے حق میں قصور نہ ہو، اس وقت سب لوگ ملکر عورت سے کچھ پھر وادیں، مرد کو راضی کر کے طلاق دلوادے، اس کو خلع کہتے ہیں۔

تیسری طلاق کے بعد پھر نہیں سکتی، بلکہ دونوں کی خوشی ہو تو بھی نکاح نہیں بندھ سکتا، جبتک کہ بیچ میں اور خاوند کی صحبت نہ ہو چکے انتہے، اس کو حلالہ کہتے ہیں۔

ابن کثیر نے کہا، اس آیت نے اس دستور کو جو شروع اسلام میں تھا اٹھا دیا، وہ دستور یہ تھا، کہ مرد گو سو طلاق دے، جبتک عورت عدت میں ہے تب تک رجعت کا حقدار رہتا تھا، اس میں عورتوں کا نقصان ہوتا، اللہ تعالی نے تین طلاق میں حصر کر دیا، ایک دو طلاق تک رجعت کو مباح رکھا، تیسری طلاق کے بعد بالکل جدا کر دیا۔

عروۃ نے کہا ایک شخص نے اپنی جورو سے کہا تھا کہ میں کبھی تجھ کو طلاق نہ دونگا، نہ تیرے پاس رہونگا، اس نے کہا یہ کیونکر ہوگا، کہا طلاق دونگا جب مدت پوری ہونے لگے گی رجوع کرلونگا، اس نے آکر یہ بات جناب ﷺ سے کہی، اس پر یہ آیت اتری کہ طلاق دو بار تک ہوتی ہے، رواہ ابن ابی حاتم، اس کو ابن جریر وعبد ابن حمید نے بھی روایت کیا ہے، کہا اس آیت کے اترنے پر لوگوں نے درستی طلاق کی شروع کردی، جس نے دی تھی یا نہ دی تھی، یہ حدیث کئی طریق سے نزدیک ابن مردویہ وترمذی وحاکم کے آئی ہے۔ حاکم نے اس کو صحیح الاسناد کہا ہے، عائشہؓ نے کہا پہلے طلاق کا کوئی وقت نہ تھا، اللہ نے وقت مقرر کردیا، کہ تیسری طلاق کے بعد رجعت نہیں ہے، جبتک کہ دوسرا خصم نہ کرے، یہی قول قتادہ وسدی وابن زید کا ہے، اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے،

حاصل یہ ہوا کہ گنتی اس طلاق کی جس کے بعد رجعت ہوسکتی ہے دو بار ہے۔ لفظ "مرتان" سے یہ نکلا کہ طلاق مرۃ بعد مرۃ ہو، نہ ایک دفعہ میں دو طلاق، ایک جماعت مفسرین اسی طرف گئی ہے، پھر جب ایک طلاق دی یا دو بار میں دو طلاق تو بقائے عدت تک اختیار ہے، چاہے بنیت اصلاح واحسان پھیر لے یا چھوڑ رکھے، عدت گذر جانے پر وہ جدا ہوجائے گی، یہ جدائی ساتھ بھلائی کے، چاہیئے کوئی حق اس کا ضائع نہ کرے، نہ اس کو نقصان پہونچاوے۔ ابن عباسؓ نے کہا جب مرد نے عورت کو دو بار طلاق دیدی، تو اب تیسری طلاق پر اللہ سے ڈرے، یا تو دستور کے موافق روکے اور اچھا برتاؤ رکھے، یا احسان کے ساتھ بدون کسی ظلم کے رخصت کردے یعنی ستاوے نہیں۔

حدیث ابورزین میں مرفوعاً آیا ہے کہ رخصت کرنا یہی تیسری طلاق ہے (رواہ ابن ابی حاتم وعبد بن حمید واحمد وغیرہم) کسی نے کہا کہ امساک سے مراد رجعت ہے، بعد دوسری طلاق کے "تسریح" سے مراد ترک رجعت ہے، بعد تیسری طلاق کے یہانتک کہ عدت گذر جائے لیکن اظہر یہ ہے کہ مراد تیسری طلاق کا دینا ہے، بدون اضرار کے، ابوعمرو نے کہا علماء کا اجماع ہے اس بات پر کہ "تسریح" سے تیسری طلاق دینا ہے بعد دو طلاق کے، یہی مطلب ہے اس ارشاد کا "فان طلقها فلا تحل له" الایة، اسمیں اختلاف ہے کہ تینوں طلاق کا ایک بار دینا کیسا ہے؟ وہ تین ہونگی یا ایک؟ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ تین ہونگی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد حافظ ابن القیم اور قاضی محمد بن علی شوکانی اور ایک جماعت محققین کا یہ مذہب ہے کہ وہ ایک ہی طلاق ہوئی، یہی حق ہے، عمر بن خطاب رضی عنہ نے کسی مصلحت سے ایسی طلاق کو تین طلاق ٹھیرا دیا تھا، ورنہ زمانہ ابوبکر صدیقؓ وہ عہد نبوت میں وہ ایک ہی طلاق سمجھی جاتی تھی، یہ مسئلہ بڑے جھگڑے کا ہے، اس باب میں مستقل کتابیں، رسالے ہیں، بڑی لمبی چوڑی بحث ہے،

مذہب مشہور ائمہ اربعہ مطابق مذہب جمہور ہے، لکن ہر ایک مذہب کے بعض محققین اسی طرف گئے ہیں، جو مختار شیخ الاسلام ہے، حتی کہ بعض حنفیہ بھی جس طرح اعلام الموقعین وغیرہ میں حکایت کیا ہے۔ سو جب اللہ کی نہر آئی تو اب عقل کی نہر سے کیا کام رہا، آیت شریف اس بات پر بھی دلیل ہے کہ طلاق دینے پر عورت سے کوئی چیز تنگ کر کے واپس نہ لے، بہت ہو یا کم، جو دیا سو دیا، تنکیر لفظ شیئ'' سے یہ نکلا کہ کچھ بھی نہ لے، جب ذرا سا لینا بھی جائز نہ ہوا، تو بہت لینا تو بالا ولی ناجائز ٹھیریگا، پھر جب مہر کا واپس کرنا حلال نہ ہوا، تو جو مال خاص ملک اس عورت کا ہے اس کا لینا تو کسی طرح جائز نہیں۔ یہ خطاب ازواج کو ہے، بعض نے کہا حکام کو، پہلا قول ٹھیک ہے یہ آیت مثل اس آیت کے ہے: يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا .لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (النساء: ۱۹). ہاں اگر عورت پھر اپنی خوشی سے کچھ دیدے تو پھر وہ روا ہے۔

دوسرا مسئلہ خلع

دوسرا مسئلہ خلع کا بیان فرمایا: کہ جب باہم میاں بیوی کے شقاق ونفاق ہو، عورت حقوق مرد کے ادا نہ کرے، بلکہ اس کو دشمن رکھے، اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کر سکے، تو جو مال شوہر نے دیا تھا، وہ اپنی جان چھڑانے میں دیکر الگ ہو جاوے، اس بذل مال میں نہ کچھ حرج عورت پر ہے، نہ اس کے لینے میں کوئی حرج خاوند پر آتا ہے، جمہور کا مذہب یہی ہے، بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ جمیلہ زن ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے اکر کہا، میں ثابت سے کسی خلق یا دین کے سبب سے روٹھی نہیں ہوں، لیکن بغض کی وجہ سے مجھے اسکے دیکھنے کی تاب وطاقت نہیں، میں کفر کو اسلام میں مکروہ رکھتی ہوں، فرمایا تو اس کا باغ اس کو پھیرتی ہے؟ کہا ہاں، ثابت سے کہا، باغ لے ایک طلاق دیدے، ابن ماجہ کا لفظ یہ ہے کہ باغ لے لیں، زیادہ نہ لیں، اس باب میں بہت سے حدیثیں آئی ہیں، معلوم ہوا کہ یہ امر ایجابی تھا نہ ارشادی، یہ بھی ثابت ہوا کہ جو دیا ہو اس سے زیادہ نہ لے، کہ اس میں عورت کا ضرر ہے، بعض نے کہا ظاہر قران سے جواز اخذ زائد ظاہر ہے، اس لئے کہ کسی مقدار معین کی قید نہیں لگائی ہے، مالک رحمہ اللہ وشافعی وابوثور اسی طرف گئے ہیں۔ ایک جماعت صحابہ وتابعین سے بھی یوں ہی روایت ہے۔ طاوس وعطاء واوزاعی واحمد واسحق کہتے ہیں زیادہ لینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ میں

مرفوعا روایت ہے:امرہ ان یأخذ ماساق ولا یزداد .رواہ ابن بطۃ وابن مردویه وابن ماجة۔ ابن کثیر نے کہا: اسناد ابن ماجہ جید وصحیح ہے ۔ یہ بھی نکلا کہ خلع اسی صورت میں جائز ہے کہ جب کسی طرح نباہ نہ ہو سکے، ایک کو دوسرے کی صورت بُری لگے، خوف کفر کا ہو۔ حدیثیں مذمت مختلعات میں بہت آئی ہیں، ثوبانؓ نے کہا ہے کہ جناب ﷺ نے فرمایا، جس عورت نے اپنے شوہر سے بے کسی کھٹکے کے طلاق مانگی، تو اسپر جنت کی بو حرام ہے، خلع کرنے والیاں منافقات ہیں، رواہ ابن جریر۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے، حاکم نے کہا صحیح ہے، رواہ احمد وابوداؤد، وابن ماجۃ والبیہقی ایضا۔ عقبہ بن عامرؓ کا لفظ یہ ہے کہ خلع کرنے والیاں الگ تھلگ ہونیوالیاں منافقات ہیں، رواہ ابن جریر، اس کی سند ضعیف ہے اس کو امام احمد نے بھی ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، ابن عباسؓ کا لفظ نزدیک ابن ماجہ کے مرفوعا یوں ہے، نہیں مانگتی کوئی عورت طلاق اپنے شوہر سے، بغیر کسی گناہ کے پھر وہ جنت کی بو بھی پاوے، حالانکہ بو جنت کی چالیس برس کی راہ سے پائی جاتی ہے۔

ایک جماعت سلف وائمہ خلف نے یہ کہا ہے کہ جائز نہیں ہے خلع جبتک کہ طرف سے عورت کے شقاق ونشوز نہو۔ جب ہو تو مرد کو جائز ہے کہ فدیہ لیکر چھوڑ دے بدلیل: ''الاان یخافاالایقیماحدود الله''، معلوم ہوا کہ سوا اس حالت کے خلع درست نہیں ہے کسی اور حالت میں خلع نکرے مگر دلیل سے، اور دلیل موجود نہیں ہے، یہی مذہب ہے ابن عباس طاؤس ابراہیم عطاء حسن وجمہور کا، یہاں تک کہ مالکؒ واوزاعیؒ نے کہا ہے کہ اگر شوہر نے کچھ اس سے لے لیا ہے اور عورت کا نقصان ہوتا ہے تو پھر دینا اس کا واجب ہے، یہ طلاق رجعی ٹہریگی، مالکؒ نے کہا ہم نے علماء کو اسی بات پر پایا ہے،

شافعیؒ کہتے ہیں نہیں بلکہ خلع جب حالت شقاق میں جائز ہوا تو حالت اتفاق میں بالاولی جائز ہوگا۔ یہی قول ساری اصحاب شافعی کا، مگر پہلی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے، مزنی نے کہا خلع منسوخ ہے۔ بقوله تعالی: '' وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ زَوۡجٍ وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰىهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـًٔا ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ''(نساء: ۲۰)۔ ابن کثیر نے کہا یہ قول ضعیف یا ماخذ مردود ہے، قائل پر شوکانیؒ نے کہا یہ قول خارج ہے اجماع سے، دونوں آیتوں میں کوئی منافات نہیں ہے، ابن جریر نے کہا یہ آیت حق ثابت بن قیس میں اتری ہے، کئی طریق سے آئی ہے، انکی جورو کا نام حبیبہ بنت عبداللہ تھا۔ بخاری میں جمیلہ آیا ہے، موطأ میں حبیبہ بنت سہل انصاری کہا ہے، عائشہؓ کا لفظ یہ ہے کہ ثابتؓ نے اس کو مارا تھا، بعض جسم اس کا ٹوٹ گیا، اس نے نبی ﷺ سے کہا، آپؐ نے

ثابتؓ کو بلایا، فرمایا: کچھ مال لے کر اس کو جدا کر دے، کہا یہ ہوسکتا ہے فرمایا ہاں کہا میں نے اس کو دو باغ دئے ہیں، وہ اسکے ہاتھ میں ہیں، فرمایا دونوں لیلے، اس کو چھوڑ دے، اس نے یہی کیا، رواہ ابن جریر وہذا لفظہ وابو داؤد۔ دوسرا لفظ ابن جریر کا یہ ہے، کہ نبی ﷺ نے جمیلہ سے کہا، تو اس سے کس بات پر ناخوش ہے؟ کہا نہ دین پر اور نہ خلق پر، مگر مجھ کو اس کی بدصورتی بری لگتی ہے، فرمایا تو اس کا باغ واپس دیگی؟ کہا ہاں، اس نے باغ پھیر دیا، دونوں میں تفریق کر دی۔ ابن عباسؓ نے کہا سب سے پہلے اسلام میں یہی خلع ہوا، کہ وہ پاس رسول اللہ ﷺ کے آئی، اور کہا اے رسول اللہ! کوئی شی کبھی اس کے اور میرے سر کو یکجا نہ کرے گی، میں نے ایک جانب خیمہ سے اس کو دیکھا کہ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ آتا تھا، سب سے زیادہ کالا سب سے زیادہ قد میں چوٹا سب سے زیادہ صورت میں بد ہے، شوہر نے کہا میں نے اس کو افضل مال جو میرا باغ تھا دیا ہے، یہ اس کو پھیر دے، فرمایا تو کیا کہتی ہے، کہا ہاں، اگر اور کچھ چاہے تو وہ بھی دوں، اس پر نبی ﷺ نے دونوں کے بیچ میں فراق کرا دیا۔ رواہ ابن جریر۔

معلوم ہوا کہ یہ امر ارشادی نہ تھا، بلکہ ایجابی تھا، یہ بھی ثابت ہوا کہ وعدہ زیادت، عورت نے اپنی طرف سے کیا، کچھ جناب ﷺ نے اس کو نہیں فرمایا، جناب ﷺ نے تو فقط واپسی اسی باغ کی کرائی، پھر یہ بھی ثابت نہیں کہ اس نے کچھ زیادہ دیا ہو، اور جناب ﷺ نے مقرر رکھا ہو، بلکہ حدیث اول میں صاف زیادہ لینے سے منع فرمایا ہے، اطلاق ایت شریف مقید ہے ساتھ اس حدیث مذکور کے، مگر جمہور کہتے ہیں قولہ تعالی "فلاجناح علیہمافیماافتدت بہ" عام ہے، لیکن یہ کچھ منافی ایت باب نہیں ہے، کہ حجت ہو سکے، بلکہ قرأت ربیع بن انسؓ یوں ہے "فیماافتدت بہ منہ" اسی لئے بعد اس کے یہ فرمایا ہے کہ تم اللہ کے قاعدے سے آگے نہ بڑھو اگر بڑھو گے ظالم ہوگے، ابن ماجہ کے نزدیک عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے یوں آیا ہے: کہ ثابت ایک بدشکل آدمی تھے حبیبہؓ نے کہا اے رسول اللہ واللہ اگر ڈر اللہ کا نہ ہوتا تو جب وہ میرے پاس آتا میں اس کے منہ پر تھوک دیتی، الحدیث، اس حدیث میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ تفریق بحکم رسول اللہ ﷺ ہوئی، ابن کثیر نے کہا ائمہ کا اختلاف ہے اس باب میں کہ مرد کو زیادہ لینا مقدار عطاء سے جائز ہے یا نہیں جمہور کہتے ہیں جائز ہے یہی قول ہے ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، مجاہد، عکرمہ، ابراہیم نخعی، قبیصہ، حسن بن صالح، عثمان بتی، کا، اسی طرف مالک، لیث، شافعی، ابوثور، بھی گئے ہیں، اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے، اصحاب ابوحنیفہؒ نے کہا، اضرار اگر طرف زوجہ کے ہو تو جتنا دیا ہے اتنا لے لیں، زیادہ لینا درست نہیں، اگر زیادہ دیا ہے تو قضا میں جائز ہے اور اگر اضرار طرف زوج سے ہو تو کچھ بھی نہ لے، اگر لے لیا ہے تو قضا میں جائز ہے، امام احمد، ابوعبیدہ، وابن

راہویہ کا یہ قول ہے، کہ جتنا دیا ہے، اس سے زیادہ لینا درست نہیں ہے، اسی طرف ایک جماعت تابعین کی بھی گئی ہے، ابن کثیر کا میلان خاطر بھی اسی طرف ہے، عطاء نے کہا جناب ﷺ نے عطاء سے زیادہ لینے کو مکروہ رکھا ہے۔

ابن عباسؓ نے کہا؛ جس شخص نے اپنی عورت کو دو طلاقیں دیں، پھر اس عورت نے اس مرد سے خلع کیا تو وہ مرد اگر چاہے تو پھر اس سے نکاح کر لے، اس لئے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ طلاق دو بار تک ہوتی ہے، عکرمہ نے کہا ہر شی جس کو مال نے جائز رکھا ہے، وہ طلاق نہیں ہے۔ ابراہیم بن سعد بن ابی وقاص نے یہی مسئلہ ابن عباسؓ سے پوچھا تھا، کہا خلع طلاق نہیں ہے اللہ نے ذکر طلاق کا اول اور آخر آیت میں کیا ہے خلع کا درمیان میں، خلع کوئی چیز نہیں ہے (یعنی طلاق بلکہ یہ فسخ ہے) پھر یہ آیت پڑھی: ''اَلطَّلاَقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ'' ۔ پھر یہ پڑھا ''فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره''۔ یہ مذہب ابن عباسؓ کا ہے کہ خلع طلاق نہیں ہے بلکہ فسخ ہے۔ اسی طرف عثمانؓ، ابن عمرؓ، وطاؤس، وعکرمہ، احمد بن راہویہ، ابوثور داؤد ظاہری، شافعیؒ بھی گئے ہیں، ابن کثیر کہتے ہیں ظاہر آیت کریمہ بھی یہی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خلع طلاق بائن ہے، مگر یہ کہ زیادہ کی نیت کرے، یہی قول ہے ایک جماعت صحابہ وتابعین و مالک وابوحنیفہ وشافعی کا، قول جدید میں حنفیہ کہتے ہیں اگر نیت ایک یا دو طلاق کی کی ہے، یا چھوڑ دیا ہے تو یہ ایک ہی طلاق بائنہ ہوئی، اور جو تین کی نیت کی ہے تو تین طلاقیں ہوئیں، شافعی کا تیسرا قول یہ ہے کہ جب خلع بلفظ طلاق نہ ہوگا اور وہ نیت سے بالکل عاری ہوگا تو وہ بالکل کچھ چیز نہیں ہے، شوکانی پہلے اس بات کے قائل تھے کہ خلع طلاق ہے پھر اس کو فسخ ٹھیرایا۔

ائمہ اربعہ وابن راہویہ نے یہ کہا ہے عدت مختلعہ کی مثل مطلقہ کے تین حیض ہیں، اگر حیض آتا ہو، اسی طرف ایک جماعت کثیر صحابہ وتابعین کی بھی گئی ہے، ترمذی نے کہا ہے یہی قول ہے اکثر اہل علم کا صحابہ وغیرہم سے ان کا ماخذ یہ ہے کہ جب خلع طلاق ٹھیری تو مثل سائر مطلقات کے عدت کرنا چاہئیے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عدت مختلعہ کی ایک حیض ہے، اس میں استبراء رحم کا ہو جاتا ہے، عثمانؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، وعکرمہ۔

اور وہ لوگ جو خلع کو فسخ کہتے ہیں سب اسی طرف گئی ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ جناب ﷺ نے عورت ثابت بن قیسؓ کو ایک ہی حیض کی عدت کا حکم دیا تھا، اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے، ترمذی نے حسن غریب کہا ہے۔ دوسرا لفظ ترمذی کا یہ ہے کہ ربیع بنت معوذ نے عہد نبوت میں خلع کیا، اس کو جناب ﷺ نے حکم دیا کہ وہ ایک حیض کی عدت کرے،

مخالع کو رجوع کرنا طرف مختلعہ کے عدت میں بغیر اس کی رضامندی کے جائز نہیں ہے، ائمہ اربعہ، وجمہور علماء اسی طرف گئے ہیں، اسلئے کہ وہ مال خرچ کر کے اپنی جان کی مالک ہوچکی ہے۔ابن ابی اوفی وماہان حنفی نے کہا اگر مال پھیر دے تو بغیر رضا بھی رجعت اندر عدت کی درست ہوگی، اسی کو ابوثور نے بھی اختیار کیا ہے، ثوری نے کہا کہ اگر خلع بغیر لفظ طلاق ہوا ہے تو یہ فرقت ہوئی، اب کوئی راہ شوہر کو طرف اس کے نہیں ہے، اور اگر برائے نام طلاق ہے تو وہ عدت تک مالک رجعت ہے، اسی طرف داؤدظاہری بھی گئے ہیں، سب کا اس بات پر اتفاق ہے، کہ مختلع کو نکاح کرنا مختلعہ سے عدت میں جائز ہے، ایک گروہ نے کہا کہ نہیں جائز ہے۔ابن کثیر نے کہا یہ قول شاذ ومردود ہے۔رہی یہ بات کہ مختلع اس کو عدت میں دوسری طلاق بھی دے سکتا ہے یا نہیں اس میں علماء کے تین قول ہیں:

ایک یہ کہ نہیں، اس لئے کہ وہ اپنی جان کی مالک ہوگئی، اس سے چھوٹ گئی، ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ عکرمہ، جابر بن زید، حسن بصری، شافعیؒ احمد، ابن راہویہ، ابوثور، اسی کے قائل ہیں۔دوسرا قول مالک کا یہ ہے کہ اگر خلع کے ساتھ ہی طلاق بھی کہدی ہے دونوں کے بیچ میں سکوت نہیں کیا تو طلاق پڑ یگی، اور اگر سکوت کیا ہے تو نہیں پڑ یگی۔ابن عبد البر نے کہا عثمانؓ سے اسی طرح مروی ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ طلاق ہر حال میں پڑ جاوے گی، جبتک کہ عدت میں ہے۔ابوحنیفہ وثوری واوزاعی وابن مسعودؓ وابوالدرداءؓ وغیرہم اسی کے قائل ہیں، مگر ابن عبد البر کہتے ہیں کہ ان دونوں صحابہ سے یہ قول ثابت نہیں ہے، پھر اللہ پاک نے بعد اس کے یہ فرمایا، کہ یہ شرائع جو بیان کئے گئے ہیں، اللہ کے قواعد ہیں، ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، حدیث صحیح میں آیا ہے، اللہ نے حدیں باندھی ہیں، تم اس سے اگے نہ بڑھو، اللہ نے فرائض مقرر کئے ہیں، تم ان کو برباد نہ کرو، اللہ نے محارم ٹھیرائے ہیں تم اس کا ہتک نہ کرو، کچھ چیزوں سے سکوت کیا ہے بغیر نسیان کے تم ان کو مت پوچھو،

اس ایت سے بعض نے یہ استدلال کیا ہے کہ جمع کرنا تین طلاق کا ایک کلمہ میں حرام ہے، مالکیہ اور جو لوگ ان کے موافق ہیں اسی طرف گئے ہیں، ان کے نزدیک سنت یہ ہے کہ ایک طلاق دے، لقولہ تعالیٰ: ''**الطلاق مرتان**'' پھر فرمایا ''**تلک حدو دالله فلاتعتدوها** ''الایة، پھر اس قول کو مؤید کیا ہے، حدیث محمود بن لبید سے جو نزدیک نسائی کے اس لفظ سے آئی ہے، کہ خبر ملی جناب ﷺ کو، ایک شخص نے اپنی جورو کو اکھٹی تین طلاقیں دی ہیں، نہایت غضبناک کھڑے ہوکر فرمایا: کیا اللہ کی کتاب کو کھیل تماشا بنایا ہے؟ اور میں درمیان تمہارے موجود ہوں، یہاں تک کہ ایک آدمی نے کہا، اگر حکم ہو تو میں اس کو مار ڈالوں، مگر اس سند میں انقطاع ہے۔

تیسرا مسئلہ تحلیل کا ہے کہ جب کوئی مرد اپنی جورو کو تیسری طلاق دیدے بعد اس کے کہ دو طلاق پہلے دے چکا ہو، تو وہ عورت اس پر حرام ہو جاتی ہے، جب تک دوسرا خاوند نہ کرے، اور وہ اس سے صحبت نہ کرے بنکاح صحیح، کیونکہ اگر وطی بغیر نکاح کے ملک یمین میں کی ہے، تو پہلے مرد کو حلال نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ اس کا شوہر نہوا، اسی طرح اگر بیاہ کرلیا لیکن لیکن مدخولہ نہ ہوئی تو بھی زوج اول کے لئے حلال نہ ہوگی، بہت سے فقہاء میں یہ مشہور ہے کہ سعید بن مسیّب کا یہ قول ہے کہ مجرد عقد کے ہمراہ ثانی کے مقصود تحلیل حاصل ہوجاتا ہے، لیکن اس قول کی صحت میں نظر ہے، اگرچہ ابن عبدالبر نے استذکار میں ذکر اس کا کیا ہے کیونکہ امام احمد نے بطریق سعید بن مسیّب ابن عمرؓ سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ جناب ﷺ نے فرمایا کہ پہلی شوہر کو نہیں مل سکتی، جب تک کہ دوسرے شوہر کا شہد نہ چکھ لے، ابن جریر کا لفظ ابن مسیّب سے حدیث مذکور میں مرفوع یوں ہے: **قال لا، حتی تذوق عسیلته ویذوق عسیلتها** ۔ اس کو نسائی و ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ سو یہ حدیث مخالف حکایت مذکور ہے یہ بات بعید ہے کہ راوی خلاف روایت بغیر کسی مستند کے کرے، دوسرا لفظ احمد و نسائی کا حدیث ابن عمرؓ سے یوں ہے: کہ جناب ﷺ سے پوچھا کہ ایک آدمی نے اپنی جورو کو تین طلاقیں دیدی ہیں، اس نے دوسری مرد سے نکاح کیا دروازہ بند کرکے پردہ چھوڑا، پھر طلاق دی دخول نہ کیا، کیا زوج اول کے لئے حلال ہوگی؟ فرمایا اول پر حلال نہیں جب تک کہ اس دوسرے کا شہد نہ چکھ لے، یہ لفظ احمد کا ہے۔

ان کی تیسری روایت میں انس بن مالکؓ سے یوں آیا ہے: **قال لاحتی یکون الاخر قدذاق من عسیلتها وذاقت من عسیلته** ، ابن جریر کا لفظ ابو ہریرہؓ سے مرفوعا یہ ہے: **حتی یذوق الاخر عسیلتها** ، دوسرا لفظ ابن جریر کا حدیث عائشہ سے یہ ہے: کہ فرمایا: **لاحتی یذوق من عسیلتها کماذاق الاول**، اس کو شیخین و نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ تیسرا لفظ ان کا عائشہؓ سے یہ ہے: **قال لاتحل لزوجها الاول حتی یذوق الاخر عسیلتها، وتذوق عسیلته**، اس کو ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے، صحیحین میں یہ حدیث کئی طرق سے آئی ہے، عائشہؓ نے کہا: رفاعہ قرظی نے ایک عورت سے نکاح کیا، پھر طلاق دی، اس نے دوسرا بیاہ کیا، پھر آکر جناب ﷺ سے کہا: کہ وہ میری پاس نہیں آتا ہے، اس کے پاس تو کچھ نہیں مگر مثل ہدبہ ثوب کے، یعنی جیسے ایک لتا کپڑے کا، فرمایا: **لاحتی تذوقی عسیلته ویذوق عسیلتک** ۔

امام احمد کی روایت میں آیا ہے کہ یہ شکایت نسبت عبدالرحمٰن بن زبیرؓ کی تھی، یعنی وہ جماع پر قادر نہیں ہے۔ جناب نے کہا تو چاہتی ہے کہ رفاعہ کے پاس پھر جاوے، یہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ کچھ شہد اس کا اور وہ کچھ شہد تیرا چکھ نہ لے، اس

کو شیخین ونسائی نے روایت کیا ہے، یہ قصہ بھی کئی طرح سے نزدیک مالک وغیرہ ہم کے آیا ہے، غرض کہ بات یہ ٹھیری کہ مجرد خلوت کافی نہیں ہے، صحبت کا ہونا ضروری ہے زوج ثانی سے، مقصود ہے کہ وہ عورت میں راغب ہو، نکاح بقصد دوام عشرت کرے، کیونکہ مشروع تزویج میں یہی امر ہے۔

امام مالک نے یہ بھی شرط کیا ہے کہ وطی مباح ہو، یہ نہ ہو کہ وطی محرم ہو، یا وہ صائمہ یا معتکفہ یا حائض یا نفساء ہو، یا زوج ثانی صایم یا محرم یا معتکف ہو، کہ ان صورتوں میں وہ پہلے شوہر کے لئے حلال نہ ہوگی، اسی طرح اگر دوسرا خاوند ذمی ہے تو اس کے نکاح کرنے سے پہلے شوہر مسلم کے لئے حلال نہیں ہوسکتی کیونکہ کفار کے نکاح نزدیک مالک کے باطل ہیں، حسن بصری نے یہ شرط بھی زیادہ کی ہے کہ زوج ثانی منزل بھی ہوجاوے شاید یہ بات لفظ عسیلہ سے سمجھی ہے، مگر اس بنیاد پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ عورت بھی منزل ہو، مگر مراد عسیلہ سے منی نہیں ہے، اس لئے کہ احمد ونسائی نے عائشہؓ سے مرفوعا روایت کیا ہے، **الاان العسیلة الجماع**۔

یعنی مراد شہد سے صحبت ہے نہ انزال، پھر اگر زوج ثانی نے وہ نکاح اس قصد سے کیا ہے کہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہوجاوے تو محلل ٹھیرا، احادیث میں محلل کی مذمت، اس پر لعنت آئی ہے، وقت عقد اگر اس امر کی تصریح کرے گا تو نزدیک جمہور ائمہ کے سرے سے نکاح ہی نہ ہوگا، باطل ہوگا، حدیث ابن مسعودؓ میں آیا ہے، کہ جناب ﷺ نے فرمایا: کہ لعنت ہے محلل اور محلل لہ پر، الحدیث، رواہ احمد، والنسائی، اور ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے، اسی پر عمل ہے اہل علم کا، صحابہ سے ان میں عمرؓ وعثمانؓ وابن عمرؓ ہیں، یہی قول ہے، فقہائے تابعین کا، یہی مروی ہے علی وابن عباسؓ وابن مسعودؓ سے۔

دوسرا لفظ ابن مسعودؓ کا یہ ہے جناب ﷺ نے فرمایا ''**لعن ا الله المحلل و المحلل له**'' **رواہ احمد**، یعنی لعنت کرے اللہ دونوں پر، محلل سے زوج ثانی مراد ہے، محلل لہ سے زوج اول، تیسرا لفظ ان کا مرفوعا یہ ہے کہ محلل اور محلل لہ ملعون ہیں، زبان محمد ﷺ پر، قیامت تک، رواہ احمد، والنسائی۔

عقبہ بن عامر نے کہا کہ جناب ﷺ نے فرمایا: کہ کیا خبر نہ دوں میں تم کو تیس مستعار سے؟ کہا ہاں، وہ محلل ہے لعنت کرے اللہ محلل ومحلل لہ پر، رواہ ابن ماجہ، دوسرا لفظ ابن ماجہ کا ابن عباس سے مرفوعا یوں ہے: **لعن رسول الله ﷺ المحلل و المحلل له** ۔ اس حدیث کو امام احمد نے ابو ہریرہؓ سے بھی روایت کیا ہے، ابن عمرؓ نے کہا ہم اس کو عہد رسالت میں زنا گنتے تھے، حاکم نے کہا یہ اسناد صحیح ہے، عمرؓ نے کہا محلل ومحلل لہ میرے پاس آئیں گے، تو میں ان کو رجم

کروں گا، رواہ الاثرم وابن ابی شیبہ،ایک آدمی نے حلالہ کیا،یعنی واسطے حلال کرنے کے زوج اول پر،عثمانؓ نے دونوں میں تفریق کرادی۔

اس طرح علیؓ وابن عباسؓ وغیرہما سے بھی مروی ہے،اس باب میں بہت حدیثیں آئی ہیں،سات حدیثیں تو ابن کثیر نے لکھی ہیں،ابن قیم نے اعلام الموقعین واغاثۃ اللھفان میں اس پر بڑا غل مچایا ہے لعنت کی دھوم دھام ثابت کی ہے۔ پھر اللہ نے فرمایا: کہ اگر دوسرے خاوند نے بعد دخول کے طلاق دی ہے،تو پھر دونوں پر کچھ گناہ نہیں ہے، اگر وہ گمان کرتے ہیں کہ باہم اچھا برتاؤ رہے گا،اور اگر اس بات کا یقین نہیں ہے کہ اللہ کے حدود قائم رہیں گے یا تردد ہے،ایک کو میاں بیوی میں سے،یا دونوں کو،پھر اس نکاح میں پھنسنا مظنہ معصیت اور حرام میں گرفتار ہونا ہے،یہ ہیں شرائع احکام اللہ کے،جن کو واسطے جاننے والوں کے بیان فرمایا ہے۔

ایک آدمی نے ایک یا دو طلاق دیکر عورت کو چھوڑ دیا،عدت گذر گئی اس نے دوسرے سے نکاح کرلیا،اس نے اس کو بعد دخول کے پھر طلاق دیدی، عدت پوری ہوئی، پھر زوج اول نے اس سے نکاح کرلیا،تو وہ عورت اس کو معہ ایک طلاق باقی کے مل سکتی ہے، یا کیا ہوگا اس میں ائمہ کا اختلاف ہے، مالک شافعی احمد ایک گروہ صحابہ نے کہا یہ عود مع طلاق باقی کی ہوگا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ زوج ثانی نے طلاق سابق کو توڑ ھا دیتا ہے،اب جو پہلے کو ملی ہے تو تینوں طلاق سمیت ملے گی،ابوحنیفہ کا مذہب یہی ہے،اس دلیل سے کہ جب دوسرا شوہر تینوں طلاق کو ڈھا دیا تھا ہے تو پھر تین سے کم کو بطریق اولی ڈھا دیگا واللہ اعلم۔ابن المنذر نے کہا علماء کا اجماع ہے اس بات پر کہ جب کسی آزاد مرد نے تین طلاقیں دیں،عدت گذر گئی ،اس نے دوسرا خصم کرلیا، پھر اس دوسرے نے بعد دخول کے طلاق دیدی، پھر اس سے اگلے خاوند نے نکاح کیا،تو وہ عورت پاس اس کے تین طلاق پر رہی۔تکمیل فائدہ کے لئے ہمارے جامعہ کے مفتی نے طلاق ثلاثہ کے متعلق ایک فتوی جاری کیا ہے،ہم اسکو ادھر لکھتے ہیں:

متن فتویٰ

مذکورہ مسئلہ میں اگرچہ علماء کرام کا اختلاف ہے،لیکن اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ تین طلاق واقع ہوئے ہیں، اور اس کو طلاق مغلظ سمجھا جاتا ہے،تو احتیاط اس میں ہے کہ اس بیوی کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کیا جائے،لیکن اگر کسی وجہ کی بناء پر اس بیوی سے جدائی اختیار کرنا مشکل ہو،اور اس کو حلال کرنے کے لئے مختلف تدابیر اور حیل اختیار کرتے ہیں،تو پھر

اس سے بہتر یہ ہے کہ ان علماء کے قول پر عمل کیا جائے جن کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں ایک طلاق واقع ہوتی ہے، ان علماء کا قول اگر چہ اکثریت کے قول کے خلاف ہے، لیکن قران وحدیث سے مؤید ہے اور دین میں اکثریت کو اعتبار نہیں بلکہ دلیل کا اعتبار ہے۔

چونکہ قرآن مجید سورت بقرہ ایت: ۲۲۹، میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: '' الطلاق مرتان فامساک بمعروف اوتسریح باحسان '' آیت کا معنے ابن ابی العز نے شرح ہدایہ میں لکھا ہے: فان قوله "مرتان" لایفهم منه مرة الامرة بعداخرى ،فاذاقال انت طالق ثلاثاهذامرة كمن رمى الجرمة بحصاتين اواكثررمية واحدة كانت له مرة حتى لورماهابسبع جملة ،كانت له رمية، وبقى عليه رمية ستة حصياة، ستة مرات ،ولو قال عقيب الصلاة سبحان الله ثلاثاوثلاثين مرة هكذامن غيرتكريرو الحمدلله ثلاثلا وثلاثين ،كذالك والله اكبر اربعا وثلاثين كذلك ،لم يكن بهذا، كمالوكرر التسبيح و التحميد و التكبير ،بهذا العدد الخ.

اس قول کا حاصل یہ ہے کہ آیت سے مراد یہ ہے کہ ایک جگہ جتنی بھی عدد طلاق دی جائے اس کو ایک بار ہی مانا جائے گا۔'' قرآن کے اس لفظ کی رو سے''۔ اور ایسا ہی حدیث میں بھی ہے، جس کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے: ان ابا الصهباء قال لابن عباسؓ اتعلم ان ماكانت الثلاث تجعل واحدة على عهد النبیﷺ وابى بكرؓ وثلاثامن امارة عمرؓ وقال ابن عباسؓ نعم : ۱۰۹۹/۲ .

اور اسی صفحہ پر مسلم کی دوسری روایت میں بھی ہے: فلما كان فى عهد عمرؓ تتابع الناس فى الطلاق فاجازهم عليه. حدیث کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہﷺ اور ابو بکرؓ اور تین سال خلافت عمرؓ میں عدد کے اعتبار سے جتنی بار طلاق دی جاتی تو وہ ایک ہی طلاق واقع ہوتی تھی۔ لیکن عمرؓ نے یہ سنت کچھ وقت کے لئے ترک کر کے بطور تعزیر حکم میں سختی کی، اور ایک مجلس میں تینوں طلاقوں کو تینوں ہی پر محمول کیا، تاکہ لوگ اس فعل سے منع ہو جائیں، جیسے کہ ابن ابی العز اس کی طرف اشارہ کر کے لکھتا ہے: ولايدل عليها قول عمرؓ، كماادعى ،وانما يدل قوله على ان الله تعالى شرع الطلاق مرة بعداخرى للحاجة ،فالذى يطلق ثلاثايقصداستعجال ايقاعها،وكان لهم عن ذلک غنية، فان الغرض يحصل بالواحدة فزيادة الثانية و الثالثة زيادة على المشروع من غيرحاجة، ولهذا يحصل لهم الندم غالبا،فرأى عمرؓ

الزامهم بتعجیل ماقصدوا تعجیله من ایقاع الثانیة و الثالثة، لیرتدعوا عن الطلاق، بمنزلة التعزیرلمن یفعل ذلک ،فان التعزیرالی رأی الامام، وعمرؓ رأی ان التعزیربالزامهم بحکمهارادع لهم عن ایقاعها،لاانه غیّرحکم الطلاق عماکان علیه. ١٢٩٩/٢.

اوراسی وجہ سے بعض علماء کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ عمرؓ نے تعزیرا کیا ہے تو اصل مسئلہ کو رجوع کر کے ایک وقت میں تین طلاقوں کو ایک ہی قرار دیا، چونکہ یہ مشہور قاعدہ ہے کہ قران وحدیث کو رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی بھی منسوخ نہیں کرسکتا، خواہ اجماع صحابہ کیوں نہ ہو جیسا کہ ابن ابی العز۳/۱۲۰۴، میں رقمطراز ہیں: وان ارادبه انه کان ثابتابالسنة، و ان الصحابة بعدرسول اللهﷺاجمعواعلی نسخه، فممنوع فان النسخ لایکون بعدرسول الله.

اوریہی وجہ ہے کہ جب عمر نے حج کے متعلق حکم کیا کہ تمتع نہ کرواور حج افراد کروتوان کے بیٹے نے اس کے خلاف فتویٰ دیا، جیسا کہ مسند احمد میں ہے کہ :کان عبدالله بن عمریفتی بالذی انزل الله عزوجل من الرخصة بالتمتع، وسنّ رسول اللهﷺ فیه ،فیقول ناس لابن عمرؓ، کیف تخالف اباک وقدنهی عن ذلک؟ فیقول لهم عبداللهویلکم ! الاتتقون الله؟ان کان عمرؓنهی عن ذلک ،فیبتغی فیه الخیر ،یلتمس به تمام العمرة ،فلم تحرمون ذلک وقداحلّه الله، وعمل به رسول اللهﷺ،افرسول الله احق ان تتبعوا سنته ام سنة عمرؓ؟۔مسند احمد:۹/۵۱۰۔

اس طرح مسلم میں ہے کہ: عن وبـــــرة قال سأل رجل ابن عمرؓ اطوف با البیت وقداحرمت بالحج ،فقال ومایمنعک ؟قال انی رأیت فلانا یکرهه، وانت احب الینامنه، رأیناه قد فتنته الدنیا،وقال واینااوایکم لم تفتنه الدنیا؟ثم قال رأینارسول اللهﷺاحرم بالحج، وطاف بالبیت ، وسعی بین الصفاو المروة، وسنة الله وسنة رسوله احق ان تتبع من سنة فلان، ان کنت صادقا. صحیح مسلم :٩٠٥/٢.

مقصد یہ ہے کہ اگرکوئی صحابی ایک عمل کرے اوراس کے مقابل رسول اللہ ﷺ کی حدیث موجود ہو، تو ہمیں چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث پر عمل کریں، اوراس کے بارے میں مفصل حدیث مسند ابی یعلی میں نقل ہے، اوروہ بھی ابن عباس سے منقول ہے: عن ابن عباسؓ قال طلق رکانة بنت عبدیزیدفی مجلس ثلاثا،فحزن علیهاحزناشدیدا،فقال له رسول اللهﷺکم طلقتهایارکانة؟فقال ثلاثا،فی مجلس واحد،فقال رسول

اللهفانهاواحدة.

اوراگرکوئی اعتراض کرے کہ ابن عباسؓ نے اس روایت کے خلاف قول کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اعتبار روایت کو ہے نہ کہ کسی کی رائے کو، جیسے کہ آگے بیان ہو چکا ہے، اور تفصیل کے لئے دیکھئے: ''التنبیہ'' وہاں فرماتے ہیں کہ: واذاامکن ان تکون المخالفة عن رأی واجتهاد،وهومأجور،ومغفورله، فالعبرة حينئذ لماروى لالمارأى، فانمامارواه ثابت عن قائل معصوم، ومارأى عنه غيرثابت عن قائل غيرمعصوم ،وقداخذ الاصحاب فی مواضع بروایة من افتی من الصحابة بخلاف روایته ،کمافی حدیث ابی هریرةؓ فالبحرهو الطهورماؤه :٣٦٦/١ .

اوراسی طرح علماء احناف سے بھی ضرورت کے وقت تین طلاقوں کا ایک طلاق واقع ہونا ثابت ہے ۔جیسا کہ مولانا عبدالحی (صاحب مجموع الفتاوی) لکھتے ہیں: علماء دین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں؟ کہ زید نے اپنی عورت کو حالت غضب میں کہا: کہ میں نے طلاق دیا، میں نے طلاق دیا، میں نے طلاق دیا۔پس اس تین بار کہنے سے تین طلاق ہونگے یا نہیں؟ اوراگر حنفی مذہب میں واقع ہوں، اور شافعیؒ میں مثلاً واقع نہ ہوں، تو حنفی کو شافعی مذہب پر اس صورت خاص میں عمل کرنے کی اجازت دی جاوے گی یا نہیں؟ ۔الجواب: اس صورت میں حنفیہ کے نزدیک تین طلاق واقع ہونگی، اور بغیر تحلیل کے نکاح درست نہ ہوگا۔مگر بوقت ضرورت، کہ اس عورت کا علیحدہ ہونا اس کے لئے دشوار ہو، اوراحتمال مفاسد زائدہ کا ہو۔تقلید کسی اورامام کی اگر کریگا تو کچھ مضائقہ نہ ہوگا، نظیر اس کی مسئلہ نکاح زوجہ مفقود وعدت ممتدة الطهر موجود ہے، کہ حنفیہ عندالضرورت امام مالکؒ کے قول پر عمل کرنے کو درست رکھتے ہیں، چنانچہ ردالمحتار میں تفصیلاً ذکر ہے، لیکن اولیٰ یہ ہے کہ وہ شخص کسی شافعی عالم سے استفسار کر کے اس کے فتوے پر عمل کرے۔ والله اعلم. حرره عبد الحی عفی عنه :نسخه اردو: ٥٣، ٥٤/٢ . ونسخہ فارسی:٢/٤٧۔

اوراسی طرح ملاعلی قاری نے کتاب شرح الفاظ الکفر ص:١٧٩: میں بھی لکھا ہے کہ بوقت ضرورت دوسرے عالم کے رائے پر عمل ہوسکتا ہے۔

هذاماعندی والله اعلم بالصواب۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ

اور جب تم عورتوں کو (دو دفعہ) طلاق دے چکو اور اُن کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں یا تو حسنِ سلوک سے نکاح میں رہنے دو یا بطریق شائستہ رخصت کردو

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ

اور اس نیت سے اُن کو نکاح میں نہ رہنے دینا چاہیئے کہ اُنہیں تکلیف دو اور اُن پر زیادتی کرو اور جو ایسا کرے گا

فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوا آيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا

وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اور اللہ کے احکام کو ہنسی (اور کھیل) نہ بناؤ ۔

وَّاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ

اوراللہ نے تمہیں جو نعمتیں بخشی ہیں اور تم پر جو کتاب اور دانائی کی باتیں نازل کی ہیں ۔

يَعِظُكُمْ بِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوآ أَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾

جن سے وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے اُن کو یاد کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اُن کو دوسرے شوہروں کیساتھ جب

إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ذٰلِكَ يُوعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ

وہ آپس میں جائز طور پر راضی ہو جائیں نکاح کرنے سے مت روکو۔ اس (حکم) سے اُس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں

يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذٰلِكُمْ أَزْكٰى لَكُمْ وَأَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا

سے اللہ اور روزِ آخرت پر یقین رکھتا ہے۔ یہ تمہارے لئے نہایت خوب اور پاکیزگی کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم

تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٢﴾ وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ

نہیں جانتے ۔ اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں یہ (حکم) اُس شخص کیلئے ہے جو پوری مدت تک دودھ

أَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
پلوانا چاہئے اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق باپ کے ذمے ہو گا۔
لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا
کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی (تو یاد رکھو کہ) نہ تو ماں کو اُس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے۔
وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهُ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ
اور نہ باپ کو اُس کی اولاد کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے۔ اور اسی طرح (نان نفقہ) بچے کے وارث کے ذمے ہے۔
فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا
اور اگر دونوں (یعنی ماں باپ) آپس کی رضامندی اور صلاح سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو اُن پر کچھ گناہ نہیں۔
وَإِنْ أَرَدْتُّمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوْا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا
اور اگر تم اپنی اولاد کو دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ تم دونوں پلانے والیوں کو دستور کے مطابق اُن کا حق
آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْآ أَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٣﴾
جو تم نے دینا تھا دیدو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس کو دیکھ رہا ہے
وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ
اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں تو عورتیں چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں
وَّعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ أَنْفُسِهِنَّ
اور جب (یہ) عدت پوری کر چکیں اور اپنے حق میں پسندیدہ کام (یعنی نکاح) کر لیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں
بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٣٤﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ اگر تم (اشارے) کنائے کی باتوں میں عورتوں کو

عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِىْ أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ

نکاح کا پیغام بھیجو یا (نکاح کی خواہش کو) اپنے دلوں میں مخفی رکھو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ اللہ کو معلوم ہے

أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا

کہ تم اُن سے (نکاح کا) ذکر کرو گے مگر (ایام عدت میں) اس کے سوا کہ دستور کے مطابق کوئی بات کہہ دو۔

إِلَّا أَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ

پوشیدہ طور پر اُن سے قول و اقرار نہ کرنااور جب تک عدت پوری نہ ہو جاے نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا۔

حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِىْ أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ

اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ کو سب معلوم ہے تو اس سے ڈرتے رہو۔

وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٣٥﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ

اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور حلم والا ہے۔ اور اگر تم عورتوں کو اُن کے پاس جانے یا اُن کا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دیدو

مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ

تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ ہاں اُن کو دستور کے مطابق کچھ خرچ ضرور دو (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے

وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٢٣٦﴾

اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔ نیک لوگوں پر یہ ایک طرح کا حق ہے۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ

اور اگر تم عورتوں کو اُن کے پاس جانے سے پہلے طلاق دیدو لیکن مہر مقرر کر چکے ہو تو آدھا مہر دینا ہو گا۔

مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَّعْفُوْنَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ

ہاں اگر عورتیں بخش دیں یا مرد جن کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے (اپنا حق) چھوڑ دیں (اور پورا مہر دیدیں تو اُن کو اختیار ہے)

وَأَنْ تَعْفُوْا أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ

اور اگر تم مرد لوگ ہی اپنا حق چھوڑ دو تو یہ پرہیزگاری کی بات ہے۔ اور آپس میں بھلائی کرنے کو فراموش نہ کرنا۔

إِنَّ اللهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٧﴾ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ والصَّلٰوةِ

کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے۔ (مسلمانو) سب نمازیں خصوصًا درمیانی نماز (یعنی نمازِ عصر)

الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا

پورے التزام کیساتھ ادا کرتے رہو اور اللہ کے آگے ادب سے کھڑے رہا کرو۔ اگر تم خوف کی حالت میں ہو تو پیادے

أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوْا اللهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ

یا سوار (جس حال میں ہو نماز پڑھ لو) پھر جب امن ہو جائے تو جس طریق سے اللہ نے تمہیں سکھایا ہے۔

مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ

جو تم پہلے نہیں جانتے تھے اللہ کو یاد کرو ۔ اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں ۔

وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ

وہ اپنی عورتوں کے حق میں وصیت کر جائیں کہ اُن کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔

فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْ أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ

ہاں اگر وہ خود گھر سے نکل جائیں اور اپنے حق میں پسندیدہ کام (یعنی نکاح) کر لیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔

وَاللهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى

اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے۔ اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق نان ونفقہ دینا چاہئیے پرہیزگاروں پر (یہ بھی) حق ہے

الْمُتَّقِيْنَ ﴿٢٤١﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ آيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾ أَلَمْ

اسی طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو ۔ بھلا

تَــرَ إِلَــى الَّــذِيْـنَ خَــرَجُـوْا مِـنْ دِيَــارِهِـمْ وَهُـمْ أُلُـوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو (شمار میں) ہزاروں ہی تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے۔

فَـقَـالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰـكِنَّ

تو اللہ نے اُن کو حکم دیا کہ مر جاؤ۔ پھر اُن کو زندہ بھی کر دیا کچھ شک نہیں کہ اللہ لوگوں پر مہربانی رکھتا ہے لیکن

أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْآ أَنَّ اللّٰهَ

اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ۔ اور (مسلمانو!) اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور جان رکھو کہ اللہ (سب کچھ)

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّـذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ

سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے۔ کوئی ہے کہ اللہ کو قرضِ حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اُس کو کئی حصے زیادہ دے گا

أَضْعَـافًـا كَثِيْــــرَةً وَّاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

اور اللہ ہی روزی کو تنگ کرتا اور کشادہ کرتا ہے اور تم اُسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے ۔

أَلَـمْ تَـرَ إِلَـى الْمَلَاِ مِنْ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى إِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ

بھلا تم نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا جس نے موسیٰ کے بعد اپنے پیغمبر سے کہا

ابْـعَـثْ لَـنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ

کہ آپ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیں تا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ پیغمبر نے کہا کہ اگر تمہیں جہاد کا حکم دیا جائے

الْـقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ

تو عجب نہیں کہ لڑنے سے پہلوتہی کرو۔ وہ کہنے لگے کہ ہم اللہ کی راہ میں کیوں نہ لڑیں گے جب کہ ہم وطن سے

دِيَـارِنَـا وَأَبْـنَـآئِـنَـا فَـلَـمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ

اور بال بچوں سے جدا کر دیئے گئے۔ لیکن جب انہیں جہاد کا حکم دیا گیا تو چند لوگوں کے سوا سب پھر گئے اور اللہ تعالیٰ ظالموں

عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ

سے خوب واقف ہے ۔ اور پیغمبر نے ان سے (یہ بھی) کہا کہ اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔

مَلِكًا قَالُوْا أَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ

وہ بولے کہ اُسے ہم پر بادشاہی کا حق کیونکر ہو سکتا ہے؟ بادشاہی کے مستحق تو ہم ہیں

وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً

اور اُس کے پاس تو بہت سی دولت بھی نہیں۔ پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے اُس کو تم پر (فضیلت دی ہے اور بادشاہی کیلئے) منتخب فرمایا ہے

فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهُ مَنْ يَّشَآءُ

اُس نے اُسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن بھی (بڑا عطا کیا ہے) اور اللہ (کو اختیار ہے) جسے چاہے بادشاہی بخشے

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ

اور وہ بڑا وسعت والا اور دانا ہے۔ اور پیغمبر نے اُن سے کہا کہ اُن کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے ۔

أَنْ يَّأْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا جس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس میں تمہارے رب کی طرف سے تسلی

وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوْسٰى وَآلُ هَارُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ

ہو گی اور کچھ اور چیزیں بھی ہوں گی جو موسیٰ اور ہارون چھوڑ گئے تھے۔

إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ

اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے لئے ایک بڑی نشانی ہے ۔ جب طالوت فوجیں لیکر روانہ ہوا

بِالْجُنُوْدِ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ

تو اُس نے کہا کہ اللہ ایک نہر سے تمہاری آزمائش کرنے والا ہے۔ جو شخص اُس میں سے پانی پی لے گا

فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّيْ إِلَّا

(اُس کی نسبت تصور کیا جائیگا کہ) وہ میرا نہیں اور جو نہ پیئے گا وہ (سمجھا جائیگا کہ) میرا ہے۔ ہاں اگر کوئی

مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا

ہاتھ سے چلو بھر پانی لے لے (تو خیر جب وہ لوگ نہر پر پہنچے) تو چند اشخاص کے سوا سب نے پانی پی لیا۔

جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ

پھر جب طالوت اور مومن لوگ جو اُس کیساتھ تھے نہر کے پار ہو گئے تو کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت

وَجُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُمْ مُّلٰقُو اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ

اوراُس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔ جولوگ یقین رکھتے تھے کہ اُن کواللہ کے روبرو حاضر ہونا ہے وہ کہنے لگے کہ بسااوقات تھوڑی سی جماعت نے

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے اور اللہ استقلال رکھنے والوں کیساتھ ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا

اور جب وہ لوگ جالوت اور اُس کے لشکر کے مقابلے میں آئے تو (اللہ سے) دعا کی کہ اے اللہ ہم پر صبر کے دہانے کھول دے

وَّثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

اور ہمیں (لڑائی میں) ثابت قدم رکھ اور (لشکر) کفار پر فتح عطا فرما۔

﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِإِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوْتَ وَآتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ

تو طالوت کی فوج نے اللہ کے حکم سے اُن کو ہزیمت دی اور داوٗد نے جالوت کو قتل کر ڈالا اور اللہ نے اُس کو بادشاہی

وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ

اور دانائی بخشی اور جو کچھ چاہا سکھایا۔ اور اللہ لوگوں کو ایک دوسرے پر (چڑھائی اور حملہ کرنے) سے نہ ہٹاتا

لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰـكِنَّ اللهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ

تو ملک تباہ ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ اہلِ عالم پر بڑا مہربان ہے - یہ

آيٰتُ اللهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں سچائی کیساتھ پڑھ کر سناتے ہیں (اور اے محمد ﷺ!) تم بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہو۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللهُ

یہ پیغمبر (جو ہم وقتاً فوقتاً بھیجتے رہے ہیں) اُن میں سے ہم نے بعضکو بعض پر فضیلت دی ہے۔ بعض ایسے ہیں جن سے اللہ نے گفتگو فرمائی

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَآتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَأَيَّدْنٰهُ

اور بعض کے (دوسرے اُمور میں) مرتبے بلند کئے۔ اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے کھلی ہوئی نشانیاں عطا کیں

بِرُوْحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَآءَ اللهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ

اور روح القدس سے اُن کو مدد دی اور اگر اللہ چاہتا تو اُن سے پچھلے لوگ اپنے پاس کھلی نشانیاں آنے کے بعد

مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ

آپس میں نہ لڑتے لیکن اُنہوں نے اختلاف کیا تو اُن میں سے بعض تو ایمان لے آئے اور بعض کافر ہی رہے

وَلَوْ شَآءَ اللهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰـكِنَّ اللهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ باہم جنگ و قتال نہ کرتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۔

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ

اے ایمان والو جو (مال) ہم نے تمہیں دیا اُس میں سے اُس دن کے آنے سے پہلے پہلے خرچ کرلو جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہو

وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اَللهُ لَآ إِلٰـهَ إِلَّا هُوَ

اور نہ دوستی اور نہ سفارش ہو سکے اور کفر کرنے والے لوگ ظالم ہیں ۔ اللہ (وہ معبود برحق ہے کہ) اُس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں

الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

۔زندہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔اُسے نہ اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اُسی کا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ

کون ہے کہ اُس کی اجازت کے بغیر اُس سے (کسی کی) سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے روبرو ہو رہا ہے۔

وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَآءَ

اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہو چکا ہے اُسے سب معلوم ہے۔اور یہ لوگ اُس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَؤُدُهُ

ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے اُس کی بادشاہی آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے۔ اور اُسے اُن کی حفاظت کچھ بھی دشوار نہیں

حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾

اور وہ بڑا عالی رتبہ اور جلیل القدر ہے۔[۴۸]

[۴۸] یہ ایت قران کریم کی عظیم ترین آیت ہے،احادیث میں اس کے بڑے فضائل و برکات مذکور ہیں،مسند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو سب ایات سے افضل فرمایا ہے،اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابی بن کعبؓ سے دریافت کیا کہ قران کریم میں کونسی ایت سب سے زیادہ عظیم ہے؟ ابی بن کعبؓ نے عرض کیا،ایت الکرسی، نبی کریم ﷺ نے ان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا،اے ابوالمنذر تمہیں علم مبارک ہو۔

ابوذرؓ نے رسول پاک ﷺ سے دریافت کیا: یارسول اللہ قران میں عظیم ترایت کونسی ہے؟ فرمایا،ایت الکرسی (ابن کثیر عن احمد فی المسند)۔

ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورت بقرہ میں ایک ایت ہے جو سیدۂ ایات قرآن ہے،وہ جس گھر میں پڑھی جائے،شیطان اس سے نکل جاتا ہے۔نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص ہر نماز فرض کے بعد ایت الکرسی پڑھا کرے تو اس کو جنت میں داخل ہونے کے لئے بجز موت کے کوئی مانع نہیں ہے، یعنی

موت کے بعد فوراوہ جنت کے اثار اور راحت وآرام کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔اس آیت میں اللہ جل شانہ کی توحید ذات وصفات کا بیان ایک عجیب وغریب انداز میں بیان کیا گیا ہے۔جس میں اللہ جل شانہ کا موجود ہونا،زندہ ہونا،سمیع وبصیر ہونا،متکلم ہونا۔واجب الوجود ہونا، دائم وباقی ہونا،سب کائنات کا موجد وخالق ہونا،تغیرات اور تاثرات سے بالاتر ہونا،تمام کائنات کا مالک ہونا،صاحب عظمت وجلال ہونا،کہ اس کے آگے کوئی بغیر اس کی اجازت کے بول نہیں سکتا،ایسی قدرت کاملہ کا مالک ہونا،کہ سارے عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے،باقی رکھنے،اوران کا نظام محکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتا ہے نہ سستی،ایسے علم محیط کا مالک ہونا،جس سے کوئی کھلی یا چھپی چیز کا کوئی ذرہ یا قطرہ باہر نہ رہے،یہ اجمالی مفہوم ہے،اس آیت کا اب تفصیل کے ساتھ اس الفاظ کے معنی سنئے:اس آیت میں دس جملے ہیں:

پہلا جملہ: ''**اللہ لاالـــہ الاھـو** '' اس میں ''اللہ'' اسم ذات ہے،جس کے معنی ہیں''وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک ہے''**لاالـــــہ الاھـــو**'' میں اسی ذات کا بیان ہے کہ قابل عبادت،اس ذات کے سوا کوئی چیز نہیں۔

دوسرا جملہ ہے ''**الـحـی الـقیـوم**''، لفظ''حی'' کے معنی عربی زبان میں ہیں''زندہ''اسمائے الٰہیہ میں سے یہ لفظ لاکر یہ بتلانا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے،وہ موت سے بالاتر ہے۔

لفظ''قیوم''قیام سے نکلا ہے،قیام کے معنی کھڑا ہونا،قائم کھڑا ہونے والے کو کہتے ہیں،**قیّوم**، اور، **قیّام** مبالغہ کے صیغے کہلاتے ہیں،انکے معنی ہیں وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا،اور سنبھالتا ہے،قیوم حق تعالی کی خاص صفت ہے،جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہوسکتی،کیونکہ جو چیزیں خود اپنے وجود وبقاء میں کسی دوسرے کی محتاج ہوں وہ کسی دوسری چیز کو کیا سنبھال سکتی ہیں؟

اس لئے کسی انسان کو قیوم کہنا جائز نہیں۔جو لوگ عبدالقیوم کے نام کو بگاڑ کر صرف قیوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔اللہ جل شانہ کے اسمائے صفات میں حی وقیوم کا مجموعہ بہت سے علماء کے نزدیک اسم اعظم ہے۔علیؓ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر میں،میں نے ایک وقت یہ چاہا کہ نبی کریم ﷺ کو دیکھوں،آپ ﷺ کیا کر رہے ہیں؟پہونچا،تو دیکھا کہ آپ ﷺ سجدہ میں پڑے ہوئے بار بار''**یاحی، یاقیوم، یاقیام**''کہہ رہے ہیں۔

تیسرا جملہ : ”لاتـأخذه سنة ولا نوم“ ہے لفظ ”سنة“ میں ”س“ کے زیر کے ساتھ اونگھ کو کہتے ہیں، جو نیند کے ابتدائی اثار ہوتے ہیں، اور نوم مکمل نیند کو، اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ جل شانہ اونگھ اور نیند سب سے بری و بالا ہے، پچھلے جملے میں لفظ ”قیوم“ نے جب انسان کو یہ بتلایا کہ اللہ جل شانہ سارے اسمانوں، اور زمینوں، اور ان میں سمانے والی تمام کائنات کو تھامے اور سنبھالے ہوئے ہیں، اور ساری کائنات اسی کے سہارے قائم ہے، تو ایک انسان کا خیال اپنی جبلت وفطرت کے مطابق اس طرف جانا ممکن ہے کہ جو ذات پاک اتنا بڑا کام کر رہی ہے، اس کو کسی وقت تھکان بھی ہونا چاہئے، کچھ وقت ارام اور نیند کے لئے بھی ہونا چاہیئے، اس دوسرے جملے میں محدود علم وبصیرت اور محدود قدرت رکھنے والے انسان کو اس پر متنبہ کر دیا کہ اللہ جل شانہ کو اپنی او پر یا دوسری مخلوقات پر قیاس نہ کرے، اپنا جیسا نہ سمجھے، وہ مثل ومثال سے بالاتر ہے، اس کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ سارے کام نہ کچھ مشکل ہیں نہ اس کے لئے تھکان کا سبب ہیں، اور اس کی ذات پاک تمام تاثرات اور تھکان وتعب اور اونگھ اور نیند سے بالاتر ہے۔

چوتھا جملہ: ”لـه مـافـي السمٰوات ومافي الارض“ اس کے شروع میں لفظ ”لہ“ کا لام تملیک کے معنی کے لئے آیا ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام چیزیں جو اسمانوں یا زمین میں ہیں سب اللہ کی مملوک ہیں، وہ مختار ہے، جس طرح چاہے ان میں تصرف فرماوے۔

پانچواں جملہ ہے: ”مَن ذَا الَّـذِیْ یَشْـفَعُ عِندَهُ إِلاَّ بِإِذْنِهِ“ یعنی ایسا کون ہے جو اس کے آگے کسی کی سفارش کر سکے۔ بدون اس کی اجازت کے، اس میں چند مسائل بیان فرما دیئے ہیں، اول یہ کہ جب اللہ تعالی تمام کائنات کا مالک ہے، کوئی اس سے بڑا اور اس کے اوپر حاکم نہیں، تو کوئی اس سے کسی کام کے بارے میں باز پرس کرنے کا بھی حق دار نہیں، وہ جو حکم جاری فرمائیں اس میں کسی کو چون وچرا کی مجال نہیں، ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص کسیکی سفارش وشفاعت کرے، سو اس کو بھی واضح فرما دیا، کہ بارگاہ عزت وجلال میں کسی کو مجال دم زدن نہیں، ہاں کچھ اللہ تعالی کے مقبول بندے ہیں جن کو خاص طور پر کلام اور شفاعت کی اجازت دیدیجائیگی، غرض بلا اجازت کوئی کسی کی سفارش وشفاعت بھی نہ کر سکے گا، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ محشر میں سب سے پہلے ساری امتوں کی میں شفاعت کروں گا، اسی کا نام مقام محمود ہے، جو رسول ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔

چھٹا جملہ ہے: ''یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ أَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ''یعنی اللہ تعالی ان لوگوں کے آگے پیچھے کے تمام حالات وواقعات سے واقف وباخبر ہے، اگے اور پیچھے کا یہ مفھوم بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات وواقعات حق تعالی کے علم میں ہیں، اور یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ آ گے سے مراد وہ حالات ہے جو انسان کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور پیچھے سے مراد اس سے مخفی واقعات وحالات ہوں، تو معنی یہ ہونگے کہ انسان کا علم تو بعض چیزوں پر ہے اور بعض پر نہیں، کچھ چیزیں اس کے سامنے کھلے ہوئی ہیں کچھ چھپی ہوئی، مگر اللہ جل شانہ کے سامنے یہ سب چیزیں برابر ہیں اس کا علم ان سب چیزوں کو یکساں محیط ہے، اوران دونوں مفہوموں میں کوئی تعارض نہیں، آیت کی وسعت میں یہ دونوں داخل ہیں:

ساتواں جملہ ہے: ''وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ إِلَّا بِمَا شَاۤءَ'' یعنی انسان اور تمام مخلوقات اللہ کے علم کے کسی حصہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے ،مگر اللہ تعالی ہی خود جس کو جتنا حصہ علم عطا کرنا چاہیں صرف اتنا ہی اس کو علم ہوسکتا ہے، اس میں بتلا دیا گیا کہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط صرف اللہ جل شانہ کی خصوصی صفت ہے۔ انسان یا کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں ہوسکتی۔

آٹھواں جملہ ہے: ''وَسِعَ کُرۡسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡأَرۡضَ ''یعنی اس کی کرسی اتنی بڑی ہے جس کی وسعت کے اندر ساتوں اسمان اور زمین سمائے ہوئے ہیں، اس قسم کی آیات کو اپنے معاملات پر قیاس نہ کیا جائے، اس کی کیفیت وحقیقت کا ادراک انسانی عقل سے بالاتر ہے، البتہ مستند روایات حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور کرسی بہت عظیم الشان جسم ہیں، جو تمام اسمان اور زمین سے بدر جہا بڑے ہیں۔

ابن کثیر نے بروایت ابوذر غفاریؓ نقل کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ کرسی کیا اور کیسی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ساتوں اسمانوں اور زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی حلقہ انگشتری جیسا ڈال دیا جائے۔ اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ عرش کے سامنے کرسی کی مثال بھی ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں انگشتری کا حلقہ۔ **نواں جملہ ہے:**

''وَلَا یَؤُدُهٗ حِفۡظُهُمَا ''یعنی اللہ تعالی کو ان دونوں عظیم مخلوقات آسمان زمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں=

لَآ إِكْـرَاهَ فِـي الـدِّيْـنِ قَـدْ تَّبَيَّـنَ الـرُّشْـدُ مِـنَ الْـغَـيِّ فَـمَنْ

دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے ہدایت (صاف طور پر ظاہر اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے تو جو شخص

يَّـكْـفُـرْ بِـالـطَّـاغُـوْتِ وَيُـؤْمِـنْ بِـاللّٰهِ فَقَـدِ اسْتَمْسَكَ

غیراللہ سے اعتقاد نہ رکھے اور اللہ پر ایمان لائے اُس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی ہے

بِـالْـعُـرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ (سب کچھ) سنتا اور جانتا ہے ۔[۴۹]

= معلوم ہوتی، کیونکہ اس قادر مطلق کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ سب چیزیں نہایت آسان ہیں۔

دسواں اخری جملہ ہے: ''وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ '' یعنی وہ عالیشان اور عظیم الشان ہے، پچھلے نو جملوں میں حق تعالی کی ذات وصفات کے کمالات بیان ہوئے ہیں ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ہر عقل رکھنے والا انسان یہی کہنے پر مجبور ہے کہ ہر عزت وعظمت اور بلندی وبرتری کی مالک وسزاوار وہی ذات پاک ہے (تلک عشرۃ کاملۃ) ان دس جملوں میں اللہ جل شانہ کی صفات کمال اور اس کی توحید کا مضمون پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ آ گیا۔امام بقاعی نے اس آیت کی تفسیر میں ایک مکمل جلد لکھی ہے۔

[۴۹] اسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاکت اور محرومی سے محفوظ رہتا ہے اس لئے اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تام کر گرنے سے مامون رہتا ہے، اور جس طرح ایسی رسی کے ٹوٹ کر گرنے کا خطرہ نہیں اور یوں کوئی رسی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے، اسی طرح اسلام میں کسی قسم کی ہلاکت اور خسران نہیں ہے، اور خود کوئی اسلام کو ہی چھوڑ دیں تو اور بات ہے۔ (بیان القران)۔

اس ایت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں زبردستی نہیں ہے، حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم اس کے معارض ہے۔اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبول ایمان پر مجبور کرنے کے لئے نہیں =

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

جولوگ ایمان لائے ہیں اُن کا دوست اللہ تعالیٰ ہے کہ اُن کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے اور جو کافر ہیں

أَوْلِيَآؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ إِلَى الظُّلُمٰتِ أُوْلَـٰئِكَ

اُن کے دوست شیطان ہیں جو اُن کو روشنی سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔ یہی لوگ

أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِىْ حَآجَّ إِبْرَاهِيْمَ فِىْ رَبِّهٖ

اہلِ دوزخ ہیں کہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ بھلا تم نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جو اس سبب سے کہ اللہ نے اُسکو سلطنت بخشی تھی ابراہیم سے رب

أَنْ آتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيْمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ قَالَ أَنَا

کے بارے میں جھگڑنے لگا۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ وہ بولا کہ

أُحْىٖ وَأُمِيْتُ قَالَ إِبْرَاهِيْمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ

جلانا اور مارنا تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے

فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۸﴾

آپ اُسے مغرب سے نکال دیجئے (یہ سن کر) کافر حیران رہ گیا۔ اور اللہ بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا [۵۰]

= ہے، ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی ذمہ داری میں رکھنے اور ان کی جان و مال وابرو کی حفاظت کرنے کے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے، بلکہ دفع فساد کے لئے ہے کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، جس کے درپے کافر رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "ویسعون فی الارض فسادا و اللہ لایحب المفسدین". (مائدة: ٦٤). یہ لوگ زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دور کرنے کا حکم دیا ہے، پس ان لوگوں کا قتل ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بچھو اور دیگر موذی جانوروں کا قتل، اسلام نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہج وغیرہ کے قتل

کو عین میدان جہاد میں بھی سختی سے روکا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی ان لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا ہی جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہو گئے ہوں۔

اسلام کے اس طرز عمل سے واضح ہو جاتا ہے، کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس سے وہ دنیا میں ظلم وستم کو مٹا کر عدل وانصاف اور امن وامان قائم رکھنا چاہتا ہے، عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی عوت دی، تو اس کے جواب میں اس نے کہا: انا عجوز کبیرۃ و الموت الیّ قریب، یعنی میں ایک قریب المرگ بڑہیا ہوں، اخری وقت میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں؟ عمرؓ نے یہ سنکر اس کو ایمان پر مجبور نہیں کیا۔ بلکہ یہی آیت تلاوت فرمائی: ''لا اکرہ فی الدین'' یعنی دین میں زبردستی نہیں ہے۔ درحقیت ایمان کے قبول پر جبر واکراہ ممکن بھی نہیں ہے اس لئے کہ ایمان کا تعلق ظاہری اعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر واکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے، اور جہاد وقتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہذا اس کے ذریعے سے ایمان کے قبول کرنے پر جبر ممکن نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آیات جہاد وقتال ایت ''لا اکـــــرہ فـــی الـــدیـــن'' کے معارض نہیں ہیں۔ (مظہری، قرطبی)۔

[۵۰] اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو ضد وعناد کی وجہ سے کفر پر رہنا چاہتے ہیں، اور اپنے اختیار سے کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، اللہ تعالی ان سے ایمان کی توفیق چھین کر شیطانوں کو ان پر مسلط کر دیتا ہے، جو ان کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے دل شبہات کی سیاہی سے بالکل ڈھک جاتے ہیں اور ان سے فطری نور چھین لیا جاتا ہے اور ان کے دلوں پر مہر جباریت لگ جاتی ہے۔

''اولـئـک'' کا اشارہ ''الـذیـن کـفـروا'' کی طرف ہے یعنی وہ لوگ جنہوں نے عنادا اور اختیارا کفر قبول کیا ہے، وہ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے بعد اللہ نے تین قصے بیان فرمائے ہیں۔

''الـــم تـــر'' الایۃ یہ پہلا واقعہ ہے اور اسکو بطور تمثیل ذکر کیا گیا ہے۔ کہ ضدی اور معاند آدمی کو وضوح حق کے باوجود قبول حق کی توفیق نہیں ملتی۔ جیسا کہ نمرود کے سامنے ابراہیم علیہ السلام نے ٹھوس اور اطمینان بخش دلائل سے اللہ کی توحید واضح کر کے اس پر حجت الٰہی قائم کر دی، مگر اس کے باوجود اس نے اسے قبول نہ کیا، کیونکہ وہ ضد وعناد کے وجہ سے قبول حق کی استعداد سے محروم ہو چکا تھا۔ جس شخص سے ابراہیم علیہ السلام کے مناظرے کا یہاں ذکر ہے، مفسرین نے اس

سے نمرود مراد لیا ہے، جو اس زمانے کا بڑا ظالم وجابر اور سرکش بادشاہ تھا، اور خود کو اللہ کا شریک سمجھتا تھا۔ "هذا الذی حاج ابراهیم فی ربه" وهو ملک بابل نمرود بن کنعان بن کوش بن سام بن نوح (ابن کثیر، قرطبی)۔

"اَنْ" سے پہلے لام تعلیلیہ محذوف ہے، یعنی اللہ کے بارے میں اس کے جھگڑنے کا سبب یہ تھا کہ اللہ نے اس کو حکومت دی، اقتدار بخشا، اور وہ نشۂ اقتدار سے مخمور ہو کر غرور کرنے لگا، اور اللہ کا شریک بن بیٹھا۔ لان اتاه الله، یعنی ان ایتاء الملک ابطره واورثه الکبر فحاج لذلک (مدارک)۔ "اِذْ" ظرف "حاج" کے متعلق ہے، ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نمرود کے سوال کا جواب ہے، نمرود نے سوال کیا تھا کہ وہ رب کونسا ہے جس کی توحید کی تو دعوت دیتا ہے؟ قاله اثر قول نمرود من ربک الذی تدعو الیه؟ (روح)۔ ابراھیم علیہ السلام نے جواب میں اللہ کی دو ایسی صفتوں کا ذکر کیا جو بالکل واضح تھیں، اور جن کا روز مرہ کی زندگی میں نمرود بھی مشاہدہ کرتا تھا، یعنی زندہ کرنا، پیدا کرنا، اور مارنا۔ موت وحیات اللہ کے اختیار میں ہے وہ جسے چاہتا ہے زندگی عطا کرتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے زندگی سلب کر لیتا ہے۔

"قال انا احی وامیت" اس ضدی ملعون نے ان کے قول کو غلط مفہوم میں لیا اور کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ جس کو زندگی دیتا یا جس سے زندگی چھینتا ہے وہ ظاہری اسباب ہی کے ذریعے ایسا کرتا ہے، اور اس طرح ظاہری اسباب کے ذریعے تو میں بھی ایسا کر سکتا ہوں۔ مثلاً جسے چاہوں معاف کر دوں اور جسے چاہوں قتل کرا دوں۔ نمرود خوب جانتا تھا کہ موت وحیات اس کے قبضہ میں نہیں، مگر محض ضد وعناد اور ڈھٹائی کی بناء پر اس نے یہ جواب دیا۔

وانما اراد ان یدعی لنفسه هذا المقام عنادا ومکابرة (ابن کثیر)۔ ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ وہ ضد اور ڈھٹائی پر تلا ہوا ہے، اس لئے فوراً ایسی دلیل پیش کر دی، جس کے سامنے وہ بالکل بے بس ہو گیا، اور اس کی ضد وڈھٹائی کی بھی پیش نہ چل سکی، جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا، ان کی پہلی دلیل اس سرکش پر کارگر نہیں ہوئی تو فوراً دوسری دلیل پیش فرما دی، جس طرح طبیب حاذق جب دیکھتا ہے کہ مریض کو ایک نسخہ سے فائدہ نہیں ہوا تو اس کے لئے دوسرا نسخہ تجویز کر دیتا ہے، اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ تو سورج کو مشرق کی طرف سے نکالتا ہے اگر تو اله ہے تو اسے مغرب کی طرف سے نکال کر دکھا دے۔ "فبهت الذی کفر" اس پر وہ کافر جھگڑالو حیرت زدہ ہو گیا اور اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔ "والله لا یهدی القوم الظالمین" جو لوگ ضد وعناد کے وجہ سے حق قبول نہیں کرتے، اور اپنے لئے عذاب جہنم کا سامان مہیا کرتے ہیں، ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت قبول کرنے کی توفیق نہیں دیتا۔

أَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا

یا اسی طرح اُس شخص کو (نہیں دیکھا) جسے ایک گاؤں میں جو اپنی چھتوں پر گرا پڑا تھا اتفاقِ گزر ہوا تو اُس نے کہا کہ

قَالَ أَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ

اللہ اس (کے باشندوں) کو مرنے کے بعد کیونکر زندہ کرے گا تو اللہ نے اُس کی روح قبض کر لی (اور) سو برس تک (اُس کو مردہ رکھا)

ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ

پھر اُس کو جلا اٹھایا اور پوچھا کہ تم کتنا عرصہ (مرے) رہے ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ ایک دن یا اُس سے بھی کم۔

قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّه

اللہ نے فرمایا کہ (نہیں) بلکہ سو برس (مرے) رہے ہو۔ اور اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ (اتنی مدت میں مطلق) گلی سڑی نہیں

وَانْظُرْ إِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ

اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو (جو مرا پڑا ہے) غرض (ان باتوں سے) یہ ہے کہ ہم تم کو لوگوں کیلئے (اپنی قدرت کی) نشانی بنائیں

وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا

اور (ہاں گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم اُن کو کس طرح جوڑ دیتے اور اُن پر گوشت پوست چڑھا دیتے ہیں۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

جب یہ واقعات اُس کے مشاہدے میں آئے تو بول اٹھا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے [۵۱]

---

[۵۱] یہ دوسرا واقعہ ہے اور ''او'' تنویعیہ ہے یعنی دوسری نوع کے بیان کے لئے ہے یہ قصہ اس کی تمثیل ہے کہ جو لوگ اللہ کی طرف انابت کرتے ہیں۔ حق وصداقت اور اطمینان باطن کے متلاشی ہیں۔ اللہ تعالی کس طرح ان کی دستگیری کرتا، اور ان کے اطمینان کا سامان مہیا کرتا ہے۔ استشهاد على ما ذكر من ولايته تعالى للمؤمنين وتقرير له. (ابو السعود)۔

"کالذی" میں "ک" تمثیل کے لئے ہے، یعنی اس کے منجملہ شواہد میں سے ایک یہ ہے، اس قسم کے اور بھی کئی واقعات ہو چکے ہیں، مثلا ایک واقعہ، الم تر الی الذین خرجوا (بقرہ: ۲۴۳) میں مذکور ہوا ہے، کہ بعض مومنوں کو قتال نہ کرنے کی وجہ سے اللہ تعالی نے مار کر پھر زندہ فرمایا۔

یا "ک" زائدہ ہے، "الذی مر" کے بارے میں اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ عزیر علیہ السلام تھے، والمار هو عزير بن شرخيا كما اخرجه الحاكم عن عليؓ، واسحاق بن بشر عن ابن عباسؓ وعبدالله بن سلام واليه ذهب قتادة وعكرمة و الربيع و الضحاک و السدی وخلق كثير (روح)۔

اور قریہ سے مراد بیت المقدس ہے جسے بخت نصر نے تباہ و برباد کیا تھا، وقال عكرمة و الربيع ووهب هي بيت المقدس وكان قدخربهابخت بنصر وهذاهو الاشهر (روح المعانی، بحر)۔

انہوں نے جب اس کی تباہی کا منظر دیکھا تو اظہار تأسف کے طور پر کہا کہ اللہ تعالی اس بستی والوں کو دوبارہ کس طرح زندہ کرے گا؟ مطلب یہ نہیں کہ انہیں ان کے دوبارہ جی اٹھنے کا یقین نہیں تھا، بلکہ وہ کیفیت احیاء کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ "فاماته الله" تو اللہ تعالی نے انہیں کیفیت احیا کا مشاہدہ کرانے کے لئے ان پر موت وارد کردی، اور وہ پورے سوسال اسی حالت میں زمین کے اوپر ہی پڑے رہے، اور سوسال کا عرصہ گزر جانے کے بعد اللہ نے ان کو زندہ کیا، "قال كم لبثت" یہ سوال وجواب احاطہ صفات سے ان کے عجز کے اظہار کے لئے کیا گیا ہے۔

عزیر علیہ السلام نے حالت موت کی مدت صرف ایک دن یا اس سے بھی کم بتائی، یہ محض ان کا اندازہ اور تخمینہ تھا، سوسال کا عرصہ انہیں یک روزہ خواب کی طرح معلوم ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ حالت موت میں یہ جلیل القدر پیغمبر علیہ السلام اختلاف لیل ونہار اور انقلابات زمانہ سے بالکل بے خبر تھا۔

اگر انہیں ان چیزوں کا احساس ہوتا تو مدت کا یہ تخمینہ بیان نہ کرتے، بلکہ ان کو پوری مدت کا ٹھیک ٹھیک علم ہوتا، اس واقعہ سے سماع موتی کی نفی ہوتی ہے، کیونکہ عزیر علیہ السلام دنیا میں ہونے والے تمام انقلابات سے بے خبر تھے۔ سوسال کے عرصہ میں نہ تو رات دن کے اختلاف کا ان کو پتہ چلا، اور نہیں انہیں بیرونی اوازیں سنائی دیں، نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وفات کے بعد انبیاء علیہم السلام کی ارواح طیبہ ان کے ابدان مبارکہ میں موجود نہیں رہتیں، اور ان کی حیات دنیوی ناسوتی نہیں ہوتی بلکہ برزخی ہوتی ہے۔

یعنی تم تو پورے سوسال حالت موت میں رہے ہو مگر دیکھ لو اس کے باوجود تمہارا کھانا پینا خراب نہیں ہوا، اس =

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ

اور جب ابراہیم نے (اللہ سے) کہا کہ اے رب مجھے دکھا کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ کریگا تو اللہ نے فرمایا کہ

أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ

کیاتم نے (اس بات کو) باور نہیں کیا؟ انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں لیکن (میں دیکھنا) اس لئے (چاہتا ہوں) کہ میرا دل

قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ

اطمینانِ کامل حاصل کر لے۔ اللہ نے فرمایا کہ چار پرندے پکڑوا کر اپنے پاس منگوا لو (اور ٹکڑے ٹکرے کروا دو)

ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ

پھر اُن کا ایک ایک حصہ ہر ایک پہاڑ پر رکھوا دو پھر اُن کو بلاؤ تو وہ تمہارے پاس

يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٦٠﴾

دوڑتے چلے آئیں گے اور جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے ۔ [۵۲]

=میں کسی کا قسم تغیر اور بو پیدا نہیں ہوئی، بلکہ وہ آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے جس طرح آج سے سو سال پہلے تھا۔

"وانظر الی حمارک" الخ عزیر علیہ السلام جب یہاں سے گزرے تھے اس وقت گدھے پر سوار تھے، آرام کرنے کے لئے گدھے کو چھوڑ کر لیٹ گئے، اور حالت نوم ہی میں ان کی روح قبض کر لی گئی، ادھر گدھا بھی مر گیا، اور اس اثناء میں اس کا گوشت، پوست تو مٹی نے کھالیا، مگر ہڈیاں صحیح سلامت پڑی رہیں، تو اللہ تعالی نے فرمایا اپنے گدھے کی طرف بھی دیکھ، ہم اسے کس طرح زندہ کرتے ہیں تا کہ ہم تمہیں بعث بعد الموت یعنی دوبارہ جی اٹھنے پر لوگوں کے لئے دلیل اور برہان بنادیں۔

"ولنجعلک آیة للناس" ودلالة علی البعث بعد الموت (قرطبی) ۔انشاز کے معنی ہلانے اور جنبش دینے کے ہیں ہماری قدرت کاملہ کا اپنی آنکھوں سے نظارہ کرلو اور مشاہدہ کرلو کہ ہم کس طرح گدھے کی ہڈیوں کو گوشت

پوست پہنا کر اور اس میں روح پھونک کر اسے دوبارہ زندہ کرتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالی نے ان کے دیکھتے ہی دیکھتے بگد ھے کو زندہ کر دیا۔علم سے یہاں علم مشاہدہ اور معاینہ مراد ہے، کیونکہ اللہ تعالی کی قدرت کا علم ویقین تو انہیں پہلے بھی حاصل تھا، مگر وہ علم مشہود نہیں تھا، قال مکی انہ اخبر عن نفسہ عندماعاین من قدرة اللّٰہ تعالی فی احیائہ الموتی فتیقن ذلک بالمشاھدة. (قرطبی)۔

[۵۲] اس واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ خلیل اللہ نے حق تعالی سے یہ درخواست کی کہ مجھے اس کا مشاہدہ کرادیجئے، کہ آپ مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ حق تعالی نے ارشاد فرمایا کہ اس درخواست کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو ہماری قدرت کاملہ پر یقین نہیں؟ کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے، ابرہیم علیہ السلام نے اپنا واقعی حال عرض کیا کہ یقین کیسے نہیں ہوتا، کیونکہ آپ کی قدرت کاملہ کے مظاہر ہر لحظہ ہر آن مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں، اور غور وفکر کرنے والے کے لئے خود اس کی ذات میں اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن انسانی فطرت ہے کہ جس کام کا مشاہدہ نہ ہو خواہ وہ کتنا ہی یقینی ہو اس میں اس کے خیالات منتشر رہتے ہیں، کہ یہ کیسے اور کس طرح ہوگا؟ یہ ذہنی انتشار سکون قلب اور اطمینان میں خلل انداز ہوتا ہے، اس لئے یہ مشاہدہ کی درخواست کی گئی کہ احیاء موتی کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں ذہنی انتشار واقع نہ ہو کر قلب کو سکون واطمینان حاصل ہو جائے۔

حق تعالی نے ان کی درخواست قبول فرما کر ان کے مشاہدہ کی بھی ایک ایسی عجیب صورت تجویز فرمائی، جس میں منکرین کے تمام شبہات وخدشات کے ازالہ کا بھی مشاہدہ ہو جائے، وہ صورت یہ تھی کہ آپ کو حکم دیا گیا کہ چار پرندے (جانور) اپنے پاس جمع کر لیں، پھر ان کو پاس رکھ کر آموختہ کر لیں، کہ وہ ایسے آموختہ ہو جائیں کہ آپ کے بلانے سے آجایا کریں، اور ان کی پورے طرح شناخت بھی ہو جائے۔ یہ شبہ نہ رہے کہ شاید کوئی دوسرا پرندہ آ گیا ہو، پھر ان چاروں کو ذبح کر کے اور ہڈیوں اور پروں سمیت ان کا خوب قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کر دیں۔ اور پھر اپنے تجویز سے مختلف پہاڑوں پر اس قیمہ کا ایک ایک حصہ رکھ دیں، پھر ان کو بلائیں، تو وہ اللہ تعالی کی قدرت کاملہ سے زندہ ہو کر دوڑے دوڑے آپ کے پاس آ جائیں گے۔

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ: قال النبی ﷺ نحن احق بالشک من ابراھیم اذقال ﴿ رَبِّ أَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِيْ الْمَوْتَى ﴾ ویرحم اللّٰہ لوطا، لقد کان یأوی الی رکن شدید، ولو لبثت فی السجن طول مالبث یوسف، لاجبت الداعی. (بخاری: ۳۳۷۲، مسلم: ۲۳۷۱)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے لائق ہیں، جب انہوں نے کہا تھا (ترجمہ) اے پروردگار! مجھے دکھادے کہ تو مردوں کو کس طرح جلائے گا، اوراللہ تعالی لوط علیہ السلام پر رحم کرے جو رکن شدید کا سہارا پکڑے ہوئے تھے۔۔اوراگر میں جیل خانے میں اتنی طویل مدت تک رہتا جتنی مدت یوسف علیہ السلام رہے تو میں یقیناً بلانے والے کی دعوت قبول کر لیتا۔

اس حدیث میں ابراہیم علیہ السلام کے جس شک کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا تذکرہ قرآن کریم کی اس آیت میں ہے: اوراس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ، ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے لائق ہیں، تواس کی وضاحت یہ ہے کہ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام میں سے کچھ لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی عظمت اور برتری ظاہر کرنے کے لئے کہا، کہ یہ شک ابراہیم علیہ السلام کو ہوا، ہمارے نبی کریم ﷺ نے اس طرح کا شک ظاہر نہیں کیا۔ نبی کریم ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے لائق ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے ظاہری اسلوب سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نہ صرف ابراہیم علیہ السلام کے لئے بلکہ اپنی ذات کے لئے بھی مذکورہ شک کا اثبات کیا، حالانکہ دونوں کا اس طرح کے شک میں مبتلا ہونا امر محال ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام جن کی ذات ایمان وایقان کا اولین مظہر بلکہ اصل اور بنیاد ہوتی ہے، اور جن کا وجود طمانیت وعرفان کا سرچشمہ ہوتا ہے، فطری طور پر شک وتردد سے محفوظ و مامون ہوتے ہیں، ان میں عدم ایقان اور شک وشبہ کے وجود کے کوئی معنی نہیں، لہذا مذکورہ ارشاد سے رسول اللہ ﷺ کی مراد وہ نہیں ہے جس کا تقاضا ظاہری اسلوب کرتا ہے، بلکہ آپ ؐ کی اصل مراد یہ ہے کہ اس آیہ کریمہ سے یہ نہ سمجھنا چاہئے ، کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگا سے جو درخواست کی اس کا تحریک احیاء موتی کے نفس وقوع میں کوئی شک وشبہ تھا، وقوع پر توان کو پورا ایمان وایقان تھا، وہ صرف مراتب عرفان اور کمالات ایقان میں ترقی کے طلب گار تھے، علم الیقین سے اور آگے بڑھ کر عین الیقین اورحق الیقین کے درجہ پر پہنچنے کے متمنی تھے، جس کو اطمینان قلبی سے تعبیر کیا، یعنی ان کا مدعا یہ تھا کہ احیاء موتی کے وقوع پر ایمان کے درجہ تک تو یقین اب بھی حاصل ہے، صرف یہ چاہتا ہوں کہ مشاہدہ بھی حاصل ہوجائے ، تاکہ اطمینان قلب کی دولت میں اوراضافہ ہو، ان صحابہ پر اسی بات کو واضح کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے یہ پیرایہ بیان اختیار فرماتے ہیں کہ دیکھو شک وتردد اگر ابراہیم علیہ السلام میں راہ پاسکتا تو یقیناً ہم میں بھی راہ پاتا، اورتم یہ جانتے ہی ہو کہ ہم میں شک وتردد کا کسی طرح گذر نہیں ہوتا، لہذا جان لو! کہ ابراہیم علیہ السلام بھی ہماری ہی طرح کمال ایقان وعرفان کے درجہ پر فائز تھے، اوران کے دل ودماغ میں بھی کسی طرح کا کوئی شک وتردد راہ پائے ہوئے نہیں تھا۔

تفسیر روح المعانی میں بسند ابن المنذر حسنؒ سے روایت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ پھر ان کو پکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی، پر سے پر، خون سے خون، گوشت سے گوشت، ملکر سب اپنی اپنی اصلی ہیئت میں زندہ ہوکر دوڑتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کے پاس آ گئے، حق تعالی نے فرمایا، کہ اے ابراہیم قیامت کے روز اسی طرح سب اجزاء واجساد کو جمع کر کے ایک دم سے ان میں جان ڈالدوں گا۔

قران کے الفاظ میں یـأتینک سعیا آیا ہے کہ پرندے دوڑتے ہوئے آئیں گے جس سے معلوم ہوا کہ دوڑ کر نہیں آئیں گے کیونکہ آسمان میں اڑھکر آنے میں نظروں سے اوجھل ہوکر بدل جانے کا شبہ ہوسکتا ہے زمین پر چل کر آنے بالکل سامنے رہیں گے اس واقعہ میں حق تعالی نے قیامت کے بعدحیات بعد الممات کا ایسا نمونہ خلیل اللہ کو دکھا دیا جس نے مشرکین اور منکرین کے سارے شبہات کا ازالہ مشاہدہ سے کرادیا۔

حیات بعد الممات اور عالم اخرت کی زندگی پر سب سے بڑا اشکال منکرین کو یہی ہوتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد مٹی ہوجا تا ہے، پھر یہ مٹی کہیں ہوا کے ساتھ اڑ جاتی ہے، کہیں پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے، کہیں درختوں اور کھیتوں کی شکل میں برامد ہوتی ہے، پھر اس کا ذرہ ذرہ دنیا کے اطراف بعیدہ میں پھیل جاتا ہے، ان منتشر ذروں اور اجزاء انسانی کو جمع کر دینا اور پھر ان میں روح ڈال دینا سطحی نظر والے انسان کی اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سب کو اپنی قدرت اپنی حیثیت پر قیاس کرتا ہے، وہ اپنے سے مافوق اور ناقابل قیاس قدرت میں غور نہیں کرتا۔

حالانکہ اگر وہ ذرا سا اپنے ہی وجود میں غور کرلے، تو اسے نظر آئے کہ آج بھی اس کا وجود ساری دنیا میں بکھری ہوئے اجزاء وذرات کا مجموعہ ہے، انسان کی آفرینشن جن ماں اور باپ کے ذریعے ہوتی ہے، اور جن غذاؤں سے ان کا خون اور جسم بنتا ہے، وہ خود جہاں کے مختلف گوشوں سے سمٹے ہوئے ذرات ہوتے ہیں، پھر پیدائش کے بعد انسان جس غذا کے ذریعے نشو ونما پاتا ہے جس سے اس کا خون اور گوشت پوست بنتا ہے۔ اس میں غور کرے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو تمام دنیا کے مختلف ذرات سے بنی ہوئی ہے، دودھ پیتا ہے تو وہ کسی گائے، بھینس یا بکری کے اجزاء ہیں، اور ان جانوروں میں یہ اجزاء اس گھاس، دانے سے پیدا ہوئے، جو انہوں نے کھائے ہیں، یہ گھاس، دانے، معلوم نہیں کس کس خطہ زمین سے آئے ہیں، اور ساری دنیا میں پھرنے والی ہواؤں نے کہا کہاں کے ذرات کو ان کی تربیت میں شامل کر دیا ہے، اسی طرح دنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور ترکاریاں اور انسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کا جزو بنتی ہیں، وہ کس کس گوشہ عالم سے کس کس طرح حق تعالی کی قدرت کاملہ اور نظام محکم نے ایک انسان کے بدن میں جمع

فرمادیئے ،اگر غافل اور کوتاہ نظر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنی ہی تن بدن کی تحقیق کرنے بیٹھ جائیں تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا وجود ایسے بے شمار اجزاء سے مرکب ہے جو کوئی مشرق کا ہے کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دنیا کا، کوئی شمالی حصے کا، آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اجزاء قدرت کے نظام محکم نے اس کے بدن میں جمع فرمادیئے ہیں، اور مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر اسی طرح منتشر ہو جائیں گے تو اب دوسری مرتبہ پھر ان کا جمع فرمادینا اس کی قدرت کاملہ کے لئے کیا دشوار ہے جس نے پہلی مرتبہ اس کے وجود میں ان منتشر ذرات کو جمع فرمادیا تھا۔

واقعہ مذکورہ پر چند سوالات مع جوابات

آیت متذکرہ بالا کے مضمون میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں اول یہ کہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا، جبکہ وہ حق تعالی کی قدرت کاملہ پر ایمان لانے میں اس وقت کی ساری دنیا سے زیادہ یقین پر تھے؟ اس کا جواب اس تقریر کے ضمن میں آچکا ہے جو اوپر کی گئی ہے کہ درحقیقت خلیل اللہ علیہ السلام کا سوال کسی شک وشبہ کی بناء پر تھا ہی نہیں، بلکہ سوال کا منشاً صرف یہ تھا کہ حق تعالی قیامت میں مردوں کو زندہ کریں گے، ان کی قدرت کاملہ سے یہ کسی طرح بھی مستبعد یا حیرت انگیز نہیں، بلکہ یقینی ہے، لیکن مردہ کو زندہ کرنے کا کام انسان کی طاقت سے باہر ہے، اس نے کبھی کسی مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں، اور مردہ کو زندہ کرنے کی کیفیات اور صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں، انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہے، جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام اطمینان ہے۔ اس کے لئے خلیل اللہ علیہ السلام نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔

اسی سے معلوم ہو گیا کہ ایمان اور اطمینان میں فرق کیا ہے؟ ایمان اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسول ﷺ کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جائے، اور اطمینان سکون قلب کا نام ہے بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقین کامل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان ویقین تھا، سوال صرف کیفیت احیاء کے متعلق تھا۔

اس کے متعلق ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ علم کے تین مرتبے ہیں، (۱) **علم الیقین ،وھو ماعلمہ بالسماع و الخبر و القیاس (۲) عین الیقین ،وھو ماشاھدہ وعاینہ بالبصر (۳) حق الیقین ،وھو ماباشرہ ووجدہ**

و ذاقه و عرفه بالاعتبار ،وهذا اعلی من الکل ،مجموعة الفتاوی: ۱۰ / ۶۴۵ ۔یعنی علم کے تین رتبے ہیں۔

(۱)علم الیقین جو کہ خبر، قیاس وغیرہ سے حاصل ہوا ہو، کمافی سورۃ التکاثر:۵۔

(۲)عین الیقین ، جو کہ دیکھنے اور مشاہدہ سے حاصل ہوا ہو، کمافی التکاثر:۷۔

(۳)حق الیقین ، کمافی واقعہ:۹۵، یہ وہ علم ہے جس میں مذکورہ وجوہ یعنی اسباب علم تمام کے تمام جمع ہوئے ہو۔ اور یہ سب سے اعلی رتبہ ہے۔تو ابراہیم علیہ السلام اس رتبے کا خواہشمند تھا، جبکہ عزیر علیہ السلام اور حواریین جن کا ذکر سورۃ مائدہ:۱۱۳، میں ہے، بھی اس رتبہ کے طلبگار تھے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کا سوال زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق تھا، اصل حیات بعد الموت میں اس کی کوئی شک وشبہ نہ تھا، تو پھر ارشاد ربانی ’’ اولم تؤمن ‘‘یعنی کیا آپ کو یقین نہیں فرمانے کا کوئی موقع نہیں رہتا۔

جواب یہ ہے کہ جو سوال خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام نے پیش فرمایا کہ اصل واقعہ میں کوئی شک نہیں، لیکن اس سوال کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ زندہ کرنے کی کیفیت دریافت کرنا منظور ہے۔انہی الفاظ سوال کا دوسرا مفہوم بھی ہوسکتا ہے، جو اصل قدرت میں شبہ یا انکار سے پیدا ہوا کرتا ہے، جیسے آپ کسی بوجھ کے متعلق یقین رکھتے ہیں کہ فلاں آدمی اس کو نہیں اٹھا سکتا، اور آپ اس کا عاجز ہونا ظاہر کرنے کے لئے کہیں کہ دیکھیں تم کیسے اس بوجھ کو اٹھاتے ہو، چونکہ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا یہ غلط مفہوم بھی کوئی لے سکتا تھا، اس لئے حق تعالی نے خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کو اس غلط بات سے بری ثابت کرنے کے لئے ہی یہ ارشاد فرمایا’’اولم تؤمن‘‘ تاکہ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام اس کے جواب میں ’’بلی‘‘، فرماکر افتراء پردازوں کی زد سے نکل جائیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس سوال ابراہیمی سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر اطمینان حاصل نہ تھا حالانکہ علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر عالم غیب سے پردہ اٹھادیا جائے تو میرے یقین واطمینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، کیونکہ مجھے ایمان بالغیب ہی سے اطمینان کامل حاصل ہے، تو جب بعض امتیوں کو درجہ اطمینان حاصل ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہ اللہ کے خلیل کو اطمینان کا درجہ حاصل نہ ہو۔اس کے متعلق یہ سمجھنا لینا چاہئے کہ اطمینان کے بھی بہت سے درجات ہیں، ایک وہ اطمینان ہے جو اولیاء اللہ اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے اعلی مقام اطمینان ہے جو عام انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے بھی مافوق ہے جو خاص خاص کو=

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن (کے مال) کی مثال

كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَّاللهُ

اُس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اُگیں اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں اور اللہ جس (کے مال) کو چاہتا ہے

يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ

زیادہ کرتا ہے اور وہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال اللہ کے رستے میں خرچ کرتے ہیں

فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ أَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ

پھر اُس کے بعد نہ اُس خرچ کا (کسی پر) احسان رکھتے ہیں اور نہ (کسی کو) تکلیف دیتے ہیں اُن کا صلہ

عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٦٢﴾

اُن کے رب کے پاس (تیار) ہے اور (قیامت کے روز) نہ اُن کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا أَذًى

جس خیرات دینے کے بعد (لینے والے کو) تکلیف دی جائے اُس سے تو نرم بات کہہ دینی اور (اُس کی بے ادبی سے) درگزر کرنا بہتر ہے

= بصورت مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے جیسا کہ پہلے ابن تیمیہ سے نقل کی گئی۔ علی کرم اللہ وجہہ کو جو درجہ اطمینان کا حاصل تھا وہ بلاشبہ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کو حاصل تھا، بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ اطمینان جو مقام نبوت کے ساتھ خاص ہے اس اطمینان میں خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام اور سب امتیوں سے فائق تھے۔ پھر جس کو وہ طلب فرما رہے ہیں وہ سب سے اعلیٰ مقام اطمینان ہے، جو خاص خاص انبیاء کو عطا فرمایا جاتا ہے، جیسے سرور کائنات سید الانبیاء ﷺ کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرا کر اطمینان خاص بخشا گیا۔ الغرض اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان حاصل نہ تھا، یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اطمینان کامل جو مشاہدہ سے حاصل ہوا کرتا ہے وہ نہ تھا، اسی کے لئے یہ درخواست فرمائی تھی۔

وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ﴿۲۶۳﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی

اور اللہ بے پرواا ور بُردبار ہے۔ مومنو! اپنے صدقات (وخیرات) احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کردینا

كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ

جو لوگوں کو دکھانے کیلئے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اُس (کے مال) کی مثال

كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا

اُس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اُس پر زور کا مینہ برس کر اُسے صاف کر ڈالے

لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ

(اسی طرح) یہ (ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کرسکیں گے۔ اور اللہ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا

﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ

اور جو لوگ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اور خلوصِ نیت سے اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال

اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ فَاِنْ لَّمْ

ایک باغ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو۔ (جب) اُس پر مینہ پڑے تو دُگنا پھل لائے اور اگر مینہ نہ بھی پڑے

یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ

تو خیر پھوار ہی سہی۔ اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے ۔ بھلا تم میں کوئی یہ چاہتا ہے

اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس میں نہریں بہہ رہی ہوں ۔

لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ

اور اس میں اُس کیلئے ہر قسم کے آمدنی موجود ہوں اور اُسے بڑھاپا آ پکڑے اور اُس کے ننھے منھے بچے بھی ہوں

فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الآيٰتِ

تو (ناگہاں) اُس باغ پر آگ کا بھرا ہوا بگولہ چلے اور وہ جل (کر راکھ کا ڈھیر ہو) جائے۔ اس طرح اللہ تم سے اپنی آیتیں

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا

کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سوچو (اور سمجھو)۔ مومنو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کماتے ہو اور جو چیزیں ہم تمہارے

كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ

لئے زمین سے نکالتے ہیں اُن میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اور بُری اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرنا کہ اگر وہ

وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ

چیزیں تمہیں دی جائیں تو بجز اس کے کہ (لیتے وقت) آنکھیں بند کرلو اُن کو کبھی نہ لو۔ اور جان رکھو کہ اللہ غنی اور قابلِ ستائش ہے

﴿٢٦٧﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ

(اور دیکھنا) شیطان (کا کہا نہ ماننا وہ) تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا اور بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے۔ اور اللہ تم سے اپنی

مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ

بخشش اور رحمت کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْأَلْبَابِ

اور جس کو دانائی ملی بیشک اُس کو بڑی نعمت ملی۔ اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں۔

﴿٢٦٩﴾ وَمَآ أَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهُ

اور تم (اللہ کی راہ میں) جس طرح کا خرچ کرو یا کوئی نذر مانو اللہ اُس کو جانتا ہے۔

وَمَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ

اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اگر تم خیرات ظاہراً دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی اہلِ حاجت کو تو وہ خوب تر ہے

وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ

اور (اس طرح کا دینا) تمہارے گناہوں کو بھی دور کر دے گا۔

سَيِّـئٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٧١﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلٰكِنَّ

اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے ۔ (اے محمد ﷺ!) تم ان لوگوں کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو بلکہ

اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ

اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔اور (مومنو) تم جو مال خرچ کرو گے تو اُس کا فائدہ تمہیں کو ہے اور تم تو جو خرچ کرو گے

إِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ

اللہ کی خوشنودی کیلئے کرو گے اور جو مال تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا دیدیا جائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہ کیا جائے گا

﴿٢٧٢﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ أُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي

(اور ہاں تم جو خرچ کرو گے تو) اُن حاجتمندوں کیلئے جو اللہ کی راہ میں رُکے بیٹھے ہیں اور زمین میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے

الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ

(اور مانگنے سے عار رکھتے ہیں) یہاں تک کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص اُن کو غنی خیال کرتا ہے۔

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْأَلُوْنَ النَّاسَ إِلْحَافًا

اور تم چہرے سے اُن کو صاف پہچان لو (کہ حاجتمند ہیں اور شرم کے سبب) لوگوں سے چمٹ کر نہیں مانگ سکتے

وَّمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢٧٣﴾ اَلَّذِيْنَ

اور تم جو مال خرچ کرو گے کچھ شک نہیں کہ اللہ اُس کو جانتا ہے ۔ جولوگ

يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

اپنا مال رات اور دن اور پوشیدہ اور ظاہر (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے رہتے ہیں اُن کا صلہ اللہ کے پاس ہے۔اور اُن کو

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا
(قیامت کے دن)نہ کسی طرح کا خوف ہو گا اور نہ غم ۔ جو لوگ سود کھاتے ہیں
لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ
وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گی جیسے کسی کو جن نے چھو کر دیوانہ بنا دیا ہو۔
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا
یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی تو (نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سود (لینا) حالانکہ تجارت کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام
فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ
تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اُس کا اور (قیامت میں)
وَاَمْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ
اُس کا معاملہ اللہ کے سپرد۔ اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے ۔
﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ
اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو دوست
كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ
نہیں رکھتاہے ۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے اور نماز پڑھتے
وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ
اور زکوٰۃ دیتے رہے اُن کو اُن کے کاموں کا صلہ اللہ کے ہاں ملے گا اور اُن کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے
﴿۲۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ
مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سُود باقی رہ گیا ہے اُس کو چھوڑ دو ۔

مُّؤْمِنِينَ ﴿۲۷۸﴾ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَإِنْ تُبْتُمْ

اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کیلئے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کر لو گے

فَلَكُمْ رُؤُسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَإِنْ كَانَ

(اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا نقصان۔ اور اگر

ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلٰى مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوْا

قرض لینے والا تنگدست ہو تو (اُسے) وسعت (کے حاصل ہونے تک) مہلت (دو) اور اگر (زرِ قرض) بخش ہی دو

خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ

تو تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے بشرطیکہ سمجھو۔ اور اُس دن سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ

اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی کا کچھ نقصان نہ ہو گا۔ مومنو!

آمَنُوْا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ

جب تم آپس میں کسی میعاد معین کیلئے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اُس کو لکھ لیا کرو اور لکھنے والا تم میں (کسی کا نقصان نہ کرے

كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ

بلکہ) انصاف سے لکھے نیز لکھنے والا جیسا اُسے اللہ نے سکھایا ہے لکھنے سے انکار بھی نہ کرے اور دستاویز لکھ دے۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ

اور جو شخص قرض لے وہی (دستاویز کا) مضمون بول کر لکھوائے اور اللہ سے جو کہ اُس کا رب ہے خوف کرے

وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا أَوْ ضَعِيْفًا

اور زرِ قرض میں سے کچھ کم نہ لکھوائے۔ اور اگر قرض لینے والا بے عقل یا ضعیف ہو

أَوْ لا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ

یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہوتو جو اُس کا ولی ہو وہ انصاف کیساتھ مضمون لکھوائے اور اپنے میں سے دو مردوں کو

مِنْ رِّجَالِكُمْ فَإِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ

(ایسے معاملے کے) گواہ کرلیا کرو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ پسند کرو (کافی ہیں)

مِنَ الشُّهَدَآءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرٰى

کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دے گی اور جب گواہ (گواہی کیلئے) طلب کئے جائیں

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا وَلَا تَسْأَمُوْآ أَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا أَوْ كَبِيْرًا

تو انکار نہ کریں۔ اور قرض تھوڑا ہو یا بہت اُس (کی دستاویز) کے لکھنے لکھانے میں کاہلی نہ کرنا۔

إِلٰىٓ أَجَلِهٖ ذٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنٰى أَلَّا تَرْتَابُوْا

یہ بات اللہ کے نزدیک نہایت قرین انصاف ہے۔اور شہادت کیلئے بھی یہ بہت درست طریقہ ہے۔اس سے تمہیں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں پڑے گا

إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

ہاں اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو اگر (ایسے معاملے کی) دستاویز نہ لکھو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔

أَلَّا تَكْتُبُوْهَا وَأَشْهِدُوْا إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ

اور جب خرید وفرخت کیا کرو تو بھی گواہ کرلیا کرو اور کاتبِ دستاویز اور گواہ (معاملہ کرنے والوں کا) کسی طرح نقصان نہ کریں

وَإِنْ تَفْعَلُوْا فَإِنَّهُ فُسُوْقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللهُ

اگر تم (لوگ) ایسا کرو تو یہ تمہارے لئے گناہ کی بات ہے اور اللہ سے ڈرو اور (دیکھو کہ) وہ تمہیں (کیسی مفید باتیں) سکھاتا ہے۔

وَاللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝٢٨٢ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا

اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے ۔ اور اگر تم سفر پر ہو اور (دستاویز) لکھنے والا نہ مل سکے

فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ ؕ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا
تو (کوئی چیز) رہن باقبضہ رکھ کر (قرض لے لو) اور اگر کوئی کسی کو امین سمجھے
فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ
تو امانتدار کو چاہئے کہ صاحبِ امانت کی امانت ادا کر دے۔ اور اللہ جو کہ اُس کا رب ہے اُس سے ڈرے۔
وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
اور (دیکھنا) شہادت کومت چھپانا۔ جواُس کو چھپائے گا وہ دل کا گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے
عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ
جو کچھ آسمانوں میں اور جوکچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم اپنے دلوں کی بات کو ظاہر کرو گے
أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ
یا چھپاؤ گے تو اللہ تم سے اُس کا حساب لے گا۔ پھر وہ جسے چاہے مغفرت کرے اور جسے چاہے عذاب دے
يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْهِ
اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ رسول (اللہ) اس کتاب پر جو اُن کے رب کی طرف سے اُن پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں
مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَآئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ
اور مومن بھی۔ سب اللہ پر اور اُس کے فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں
لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا
(اور کہتے ہیں کہ) ہم اُس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ اور وہ عرض کرتے ہیں کہ ہم نے (تیرا حکم) سنا
وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾
اور قبول کیا۔ اے رب ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا

اللہ کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اچھے کام کرے گا تو اُس کو اُن کا فائدہ ملے گا اور بُرے کرے گا تو اُسے

مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَآ أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا

اُن کا نقصان پہنچے گا اے رب اگر ہم سے بھول چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کرنا۔ اے اللہ

وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا

ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نےہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے اللہ

وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا

جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہمارے سر پر نہ رکھنا اور (اے اللہ) ہمارے گناہوں سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے

وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا مالک ہے اور ہمیں کافروں پر غالب فرما(۵۳)

---

(۵۳) ان آیتوں کی فضیلت

عن ابن عباسؓ قال بینما جبرئیل علیه السلام قاعد عند النبی ﷺ وسلم سمع نقیضا من فوقه فرفع رأسه فقال هذا باب من السماء، فتح الیوم لم یفتح الا الیوم، فنزل منه ملک، فقال هذا ملک نزل الی الارض لم ینزل قط الا الیوم، فسلم فقال ابشر بنورین اوتیتهما لم یؤتهما نبی قبلک، فاتحة الکتاب، وخواتیم سورة البقرة، لن تقرأ بحرف منهما الا اعطیته (رواه مسلم: ٢٨٩، و الترمذی: ٣٢٧٦).

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) جب جبرئیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے

تھے،توانہوں نے (یعنی جبرئیل نے)اوپر کی طرف دروازہ کھلنے کی سی آواز سنی،چنانچہ انہوں نے اپنا سراوپر اٹھالیا، اور کہا کہ، یہ اسمان کا دروازہ کھولا گیا ہے،آج کے علاوہ اور کبھی یہ نہیں کھولا گیا ہے، جب ہی اس دروازے سے ایک پرشتہ اترا، جبرئیلؑ نے کہا کہ یہ فرشتہ آج سے پہلے کبھی زمین پرنہیں اترا ہے، پھراس فرشتے نے نبی کریمﷺ کوسلام کیااور کہا کہ خوشخبری ہو کہ آپ کووہ دونور عطافرمائے گئے ہیں جوآپﷺ سے پہلےاور کسی نبی کونہیں دئے گئے،اوروہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کا آخری حصہ ہیں۔ان میں سے آپﷺ کی طرف پڑھے گئے ایک ایک حرف کے عوض آپﷺ کوثواب ملے گا، یا آپﷺ کی دعا قبول کی جائی گی۔

عن ابی مسعودؓ قال:قال رسول اللهﷺ الايتان من آخرسورة البقرة من قرأبهمافی ليلة كفتاه .متفق عليه. (بخاری:۴۰۰۸،مسلم:۸۰۷). ابومسعودؓ راوی ہیں کہ نبی کریمﷺ نےفرمایا، جوشخص رات میں سورۂ بقرہ کی آخری دوآیتیں یعنی''امن الرسول'' سے آخرتک پڑھتا ہےتواس کے لئے وہ کافی ہیں۔

عن جبيربن نفيرؓ ان رسول اللهﷺ قال ان الله ختم سورة البقرة بايتين اعطيتهمامن كنزه الذی تحت العرش فتعلموهن وعلموهن نسائكم ،فانهاصلاة وقربان ودعاء . (دارمی:۳۳۹۰، وحاکم: ۱/۵۶۲)

جبیربن نفیرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نےفرمایااللہ تعالی نےسورۂ بقرہ کودوآیتوں(یعنی امن الرسول سے آخرتک) پرختم فرمایاہے۔یہ دوآیتیں مجھےاس خزانے سے عطافرمائی گئی ہیں جوعرش کے نیچے ہے،لہذاان آیتوں کوتم سیکھواوراپنی عورتوں کوسکھلاؤ، کیونکہ وہ آیتیں رحمت ہیں (اللہ کے) قرب کا ذریعہ ہیں، اورتمام دینی ودنیوی بھلائیوں کےحصول کے لئے دعاء ہیں۔

''کافی ہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ رات میں ان آیتوں کے پڑھنے کی وجہ سےانسان وجنات کےشرارت وایذاء سے محفوظ رہتا ہے،گویایہ آیتیں اس لئے دافع شروبلا ہوجاتی ہیں، یایہ مطلب ہے کہ یہ دوآیتیں اس کےحق میں قیام لیل وعبادت،ذکر کے لئے شب بیداری کا قائم مقام بن جاتی ہیں۔





مصنف کی دیگر تصنیفات

۱۔ اختلاف المطالع (اردو)

۲۔ اختلاف المطالع (پشتو)

۳۔ اداب السلام (اردو)

۴۔ کتاب الاذکار (اردو)

۵۔ کتاب الاذکار مختصر (پشتو)

۶۔ کتاب الاربعین (پشتو)

۷۔ نیل المفازۃ (پشتو)

۸۔ تحفۃ العروس (پشتو)

۹۔ سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ (پشتو ترجمہ)

۱۰۔ کتاب التمائم

دچاپ ځائے
دارالکتب
پرنټنګ ایجنسی موبائل: +92-333-9084990